صدائے رُستاخیز

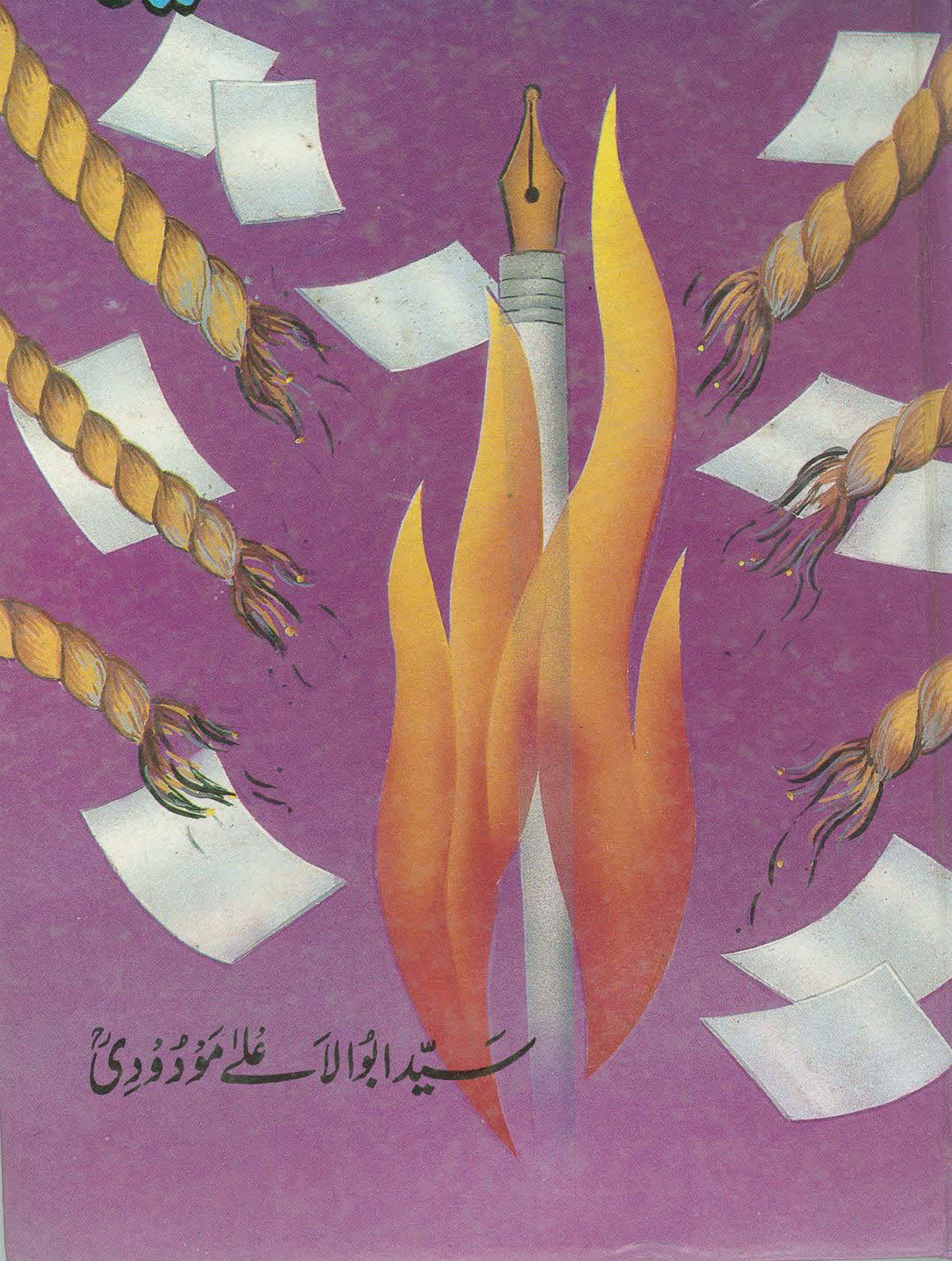

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم الله الرحمن الرحيم

حامد

ادارۂ معارف اسلامی

- یہ ادارہ اسلامی علوم و معارف کی ترویج و تحقیق کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد دور حاضر کے عظیم مفکر، قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جولائی ۱۹۶۳ء میں رکھی تھی اور اس کا پہلا مرکز کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۷۹ء میں مولانا مرحوم نے لاہور کو اس کا دوسرا مستقر بنایا۔ اب کراچی اور لاہور، ادارہ معارف اسلامی کے دونوں مرکز داخلی طور پر خود مختارانہ اور مقصدی اور آئینی طور پر ہم آہنگی سے کام کر رہے ہیں۔ جن مقاصد کے لیے یہ دونوں مراکز کوشاں ہیں وہ یہ ہیں:۔
- اسلامی تعلیمات کو پوری تحقیق اور علمی جستجو کے بعد جدید ترین اسلوب اظہار کو اختیار کرتے ہوئے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کرنا۔
- علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیب نو، تشریح و توضیح اور اشاعت، اسی طرح قدیم خزانوں تک آج کے طالب علموں کی رسائی ممکن بنانا۔
- عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔
- اسلامی موضوعات پر دور حاضر کے مسلم علماء کے نمایاں کارناموں کی وسیع اشاعت اور نفوذ کی خاطر دنیا کی اہم زبانوں، بالخصوص عربی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں تراجم اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے کے لیے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظام تعلیم کے ارتقاء کی راہ ہموار کرنے کے لیے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

ابوالاعلیٰ مودودیؒ

صدائے رستاخیز

(الجمعیت دہلی میں ۱۹۲۵ء میں چھپنے والے اداریے اور مضامین)

(۲۲) سالہ نوجوان صحافی کی آتشیں تحریریں

جمع وترتیب ـــــ **خلیل احمد حامدی**

* * * * *

ادارۂ معارفِ اسلامی
منصورہ ـــ لاہور ـــ پاکستان

{ جملہ حقوق محفوظ }

نام کتاب	صدائے رستاخیز
تصنیف	مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ
ترتیب و تدوین	مولانا خلیل احمد الحامدی
کمپوزنگ و پرنٹنگ	مازن پرنٹرز
اشاعت اول	جنوری ۱۹۹۳ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	۱۵۰ روپے

تقسیم کنندہ:

المنار بک سنٹر
منصورہ ملتان روڈ - لاہور - 54570
فون: 430033_447913

فہرست مضامین

پیش لفظ 15

دنیائے اسلام پر ایک نظر 17

- شمالی افریقہ کا مغربی حصہ 18
- مراکش، الجزائر، تیونس، طرابلس 22
- مصر 28
- ترکی 35
- عرب 40
- وسط ایشیا 45
- افغانستان 51
- ہندوستان 54
- چین 59
- جزائر شرق الہند 63

درد اور اس کا علاج 70
مولانا عبدالباری صاحب کا انتقال 75
تپش مرحوم 76
سیام کے مسلمانوں پر مظالم 76
وسط ایشیا کا بھوت اور رہنمایان ہنود 78
ایک شدید غلط بیانی 79
دیباچہ ملوکیت 81
موپلوں کی جلاوطنی 82

☐ غازیان ریف کے دم خم 84
☐ وفد حجاز کی مراجعت 85
☐ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کا عطیہ شاہانہ 86
☐ مولانا عین القضاۃ کا انتقال 88
☐ حکومت کی چال ہے یا انقلاب پسند جماعتوں کی حرکت 89
☐ اجمیر شریف کے عرس پر حرکات مذبوحی 90
☐ ہفتہ معراج اور مجاہدین ریف 92
☐ بعض ہندو اخبارات کا قابل اعتراض رویہ 93
☐ دارالعلوم ندوہ 95
☐ دمودر ساورکر اور ڈاکٹر مونجے کا رویہ 96
☐ فلاکت زدہ موپلوں کی قابل رحم حالت 97
☐ کیا اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے 98
☐ شب برات اور آتش بازی 98
☐ مسودہ قانون حج 100
☐ جدہ قناصل کا رویہ 100
☐ دیانند شتابدی کی برکات 102
☐ حجاز میں مداخلت کی کوشش 102
☐ قانون حج کا آخری فیصلہ 103
☐ گاؤ پرستی کی حقیقت 104
☐ لارڈ ریڈنگ کا مقصد سفر 106
☐ برطانوی ارتجاعیت کا افسوسناک مظاہرہ 107
☐ قومی امتیاز 110
☐ دہلی کا فساد 112
☐ فساد کی ابتدا اور اس کے اسباب 113
☐ پہلا فساد اور اس کی ذمہ داری 114
☐ دوسرے دن کا فساد اور اس کی ذمہ داری 115

☐ حق اور انصاف کی بات 116

☐ حجاز ریلوے 118

☐ لارڈ کرزن 119

☐ لالہ ہردیال کی زہر افشانی 121

☐ فرنگیانہ مذہبیت 125

☐ نمک کا محصول 126

☐ عدل اور سیاست 128

☐ خزاں کا پیش خیمہ 128

☐ مسٹر یعقوب کا عذر گناہ 129

☐ زاغلول پاشا کو بدنام کرنے کی کوشش 133

☐ وائسرائے کی مطلق العنانی 134

☐ تحریف القرآن کی ایک نئی کوشش 135

☐ مسئلہ برار کا فیصلہ 136

☐ ریف میں جنگ کا آغاز 137

☐ مجاہدین ریف کی کامیابیاں 138

☐ ملکی صنعت پر محصولات کا ناجائز دباؤ 138

☐ ہندوستان پر انگریزوں کے احسانات 141

☐ علمائے ہند اور تعدد ازدواج 143

☐ فریضہ حج اور حکومت 145

☐ لارڈ بالفور کا ورود فلسطین 147

☐ آگ کے ساتھ کھیل 148

☐ اتحاد اسلامی کا حیرت انگیز مظاہرہ 149

☐ سنگھٹن اور خون 150

☐ حکومت اور انتظام حج 151

☐ ہنگامہ کلکتہ 153

☐ مسلمانوں کے نقصانات 154

☐ بینک کا سود اور اس کا مصرف 154
☐ ہندوستان میں عیسائیت کی ترقی 156
☐ امتیاز نسل و رنگ 158
☐ ایک غلط فہمی کا ازالہ 160
☐ تخلیہ مصر کا مسئلہ 161
☐ حکومت اور مسئلہ حج 162
☐ حج کے انتظامات 164
☐ ایک مفید تجویز 165
☐ حجاز کی جدید اطلاعات 167
☐ رائیگان طلبی 167
☐ بشارت حج 168
☐ جدہ کے برطانوی قونصل کی غلط بیانی 169
☐ حجاز کے لیے مشترک وفد 170
☐ وحدت اسلامی کے لئے ایک مبارک تحریک 172
☐ مجاہدین ریف کے لیے یوم الدعا 173
☐ مجاہدین ریف اور ہندوستانی مسلمانوں کا فرض 174
☐ مالوی جی اور دولت آصفیہ 176
☐ عجیب و غریب منافقت 182
☐ مصر میں قادیانی فطرت 183
☐ وحدت کلمہ اسلام کی ایک مبارک کوشش 185
☐ باجی راؤ اول کی برسی اور اس کے اخلاقی اثرات 190
☐ زعمائے اسلام کا اجتماع 194
☐ اہل حجاز کی امداد 196
☐ مسلمانوں کی غیرت ملی پر ایک تازہ حملہ 197
☐ حکومت مصر اور حج 202
☐ پنجاب ہندو کانفرنس 205

☐ اجتماع امرتسر 205
☐ ہندو عورتوں کا اغواء 223
☐ موپلا قوم کی تباہی 223
☐ حضور نظام سے ایک التجا 224
☐ مولانا عبدالجبار خیری اور احمدی جماعت 226
☐ رابغ پر علی کا حملہ 227
☐ حاجیوں کی حفاظت اور برطانیہ کی ذمہ داری 229
☐ ترکی میں جمہوری استبداد 231
☐ دہلی کا امن 234
☐ شریفانہ مفاہمت 237
☐ مفاہمت کی شرائط 241
☐ ایک مفید تجویز 242
☐ ایک عجیب غلط فہمی 243
☐ موپلوں کی مظلومی 245
☐ مسیحی خطرہ 245
☐ اٹلی اور افغانستان 246
☐ عرب میں تبلیغ مسیحیت 249
☐ ایران اور جمعیت اقوام 250
☐ مولانا عبدالجبار خیری 252
☐ کلکتہ نیو مارکیٹ کی قبر 254
☐ حضور نظام کے خلاف پروپیگنڈا 255
☐ موپلوں کے لیے دام تزویر 255
☐ مشکلات حج اور حکومت 257
☐ مسلمانوں کو ایک عجیب مشورہ 262
☐ ترک قربانی کی تجویز 264
☐ حکومت کی طامعانہ پالیسی 264

☐ وفد ہاشمی کا ورود 265
☐ اصل بنائے کشیدگی 267
☐ ہندو سبھا کی پوزیشن 269
☐ امیر علی کی زود پشیمانی 270
☐ عازمین حج کی شکایات 272
☐ محکمہ حفاظت حج کے عمال 273
☐ حاجیوں کے لیے بندرگاہ کا افتتاح 274
☐ مسودہ دولت متحدہ ہند 276
☐ اتحاد اسلامی کی بے نظیر قوت 277
☐ مولانا محمد علی کی علالت 278
☐ انتقال پرملال 279
☐ سید حبیب کو سزا 279
☐ ہنگامہ کلکتہ اور ہندو سبھا 280
☐ یوم عاشورہ 282
☐ آل مسلم پارٹیز کانفرنس 291
☐ ایک نیا مرزائی فتنہ 291
☐ مولانا شوکت علی کو مبارکباد 306
☐ حرمت حجاز کے لیے ایک شدید خطرہ 307
☐ عقبہ کی سیاسی اہمیت 307
☐ حکومت حجاز کی مجرمانہ بددیانتی 308
☐ وفد حجاز کے اعذار باردہ کی حقیقت 310
☐ ہنگامہ پانی پت 311
☐ فقیر کی قبر کا معاملہ 312
☐ ہندو لیڈروں کے گمراہ کن بیانات 313
☐ آل مسلم پارٹیز کانفرنس اور جماعت علماء 316
☐ ریف اور فرانس 319

☐ بعض مسلمانوں کی دین فروشی 323

☐ لارڈ ریڈنگ کی تقریر 323

☐ قضیہ موصل 325

☐ مسئلہ حجاز 326

☐ عرب میں برطانیہ کی چالیں 338

☐ **مدینتہ الرسول ﷺ** 339

☐ مولوی مظہرالدین کا افسوسناک رویہ 345

☐ سیٹھ چھوٹانی کی گستاخی 346

☐ موپلوں کی جلاوطنی 347

☐ حامیان شریف کی باطل پرستی 349

☐ ہندو دھرم میں قربانی گاؤ 355

☐ حجاز کے لیے ایک وفد 363

☐ مولانا عبدالحلیم صدیقی کی تصریحات 364

☐ مولانا عبدالباری صاحب کی تصریح 365

☐ بہتان و افتراء کا طوفان 366

☐ ہندوستان کے خلاف شریفی پروپیگنڈا 367

☐ سفر حجاز کی وبا 368

☐ وفد حجاز 368

☐ مسلم آؤٹ لک اور ہم 369

☐ مسلمانوں کی غیرت ملی پر ایک شدید حملہ 370

☐ حضرت سلطان غازی 374

☐ فتح مدینہ 375

☐ مسئلہ موصل 377

☐ بینک کا سود اور اس کا مصرف 380

☐ علی گڑھ ہندو مسلم فساد 382

☐ تنظیم اور جمعیت العلماء 384

☐ ایک قابل اعتراض اشتہار 390
☐ جہل مرکب 392
☐ مولانا حسرت موہانی کا خطبہ صدارت 393
☐ فساد علی گڑھ 413
☐ مجاہدہ ریف 413
☐ ٹائمز کی جہالت 416
☐ شام پر فرانس کا برائے نام اقتدار 417
☐ جنگ مراکش اور جمعیتہ اقوام 418
☐ میسور میں گاؤ کشی کی ممانعت 418
☐ نادان عورتیں 420
☐ حسن پرستی کا مظاہرہ 423
☐ جے پور میں ہندوؤں کی چیرہ دستی 427
☐ غازی عبدالکریم کی شرائط صلح 427
☐ انڈمان میں موپلوں کی حالت زار 429
☐ جمعیت اقوام کی مسیحی حمیت 429
☐ مجاہدین ریف کی نمایاں فتح 430
☐ دمشق کی بربادی 431
☐ شام اور فرانس 435
☐ ایران کا انقلاب 441
☐ اسلامی ریاستوں کے لیے درس عبرت 442
☐ ہندو مہاسبھا کی فساد پروری 443
☐ فساد آفرینی کی نئی کوششیں 444
☐ ایک مسلمان رئیس کی بے جا مخالفت 445
☐ اسلام پر سوامی شردہانند کے اعتراضات 447
☐ اشاعت تہذیب کے جدید طریقے 452
☐ مارشل پی تین کا اعلان 453

☐ مسٹر بالڈون کا اعتراف 454
☐ ایک عجیب مشورہ 454
☐ شام کا نیا ہائی کمشنر 457
☐ ایک معاصرانہ شکایت 458
☐ فرانسیسی مال کا مقاطعہ 459
☐ ہمدرد کی سال گرہ 460
☐ برطانیہ اور ابن سعود 460
☐ شاہ ایران کا احتجاج 462
☐ تفرقہ پردازی کا جدید منتر 463
☐ مسئلہ اصلاح اور ترکی مدبرین 465
☐ عجیب رواداری 476
☐ فکر معکوس 477
☐ ایس ایس آر لائن پر مسلمانوں کی تکالیف 478
☐ خیبر ریلوے 479
☐ مستقبل حجاز اور ابن سعود 483
☐ دہلی میں آریوں کی تازہ شرارت 486
☐ مصر میں حریت و استبداد کی کشمکش 488
☐ شام میں برطانوی مداخلت 490
☐ ایک مبارک تحریک 490
☐ آفریدیوں کا مطالبہ 491
☐ برطانیہ و فرانس کا اتحاد عمل 491
☐ مجاہدین شام کے خلاف مسیحی پروپیگنڈا 501
☐ قومی غداری کی سزا 502
☐ اکسائز ڈیوٹی کی تنسیخ 503
☐ ترکی میں افراط و تفریط کا ہنگامہ 505
☐ ارباب عمائم کے جرائم 507

☐ میسور میں انسداد گاؤ کشی کا قانون 508
☐ موسیو ژودونیل کی عیاری 510
☐ مسلم پریس کانفرنس 511
☐ لالہ لاجپت رائے کا خطبۂ صدارت 512
☐ ہندوستان اور انگلستان کا فرق 513
☐ حضور نظام کا گراں قدر عطیہ 514
☐ جنگ ریف کا اصلی نقشہ 515
☐ فتح مدینہ 519
☐ جنرل لیڈونر کی رپورٹ 526
☐ بیرون ہند کے ہندوستانیوں کا خطرناک مستقبل 527
☐ موصل کا فیصلہ 528
☐ جزیرہ عرب میں برطانوی وسائل 531
☐ موصل کا مستقبل 532
☐ جدہ کی فتح 533
☐ نجد و برطانیہ کا معاہدہ 534
☐ ترکی و روس کا معاہدہ 535
☐ مسز نائیڈو کا خطبہ صدارت 537

* * *

پیش لفظ

صدائے رستاخیز ان آتشیں تحریروں کا ریکارڈ ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے الجمعیتہ دہلی میں (۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء) اداریوں اور مضامین کی صورت میں قلمبند کی ہیں۔ یہ ریکارڈ موجودہ صدی کی پہلی چوتھائی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ مسلم تاریخ کا یہ دورانیہ حالات و واقعات کا ایسا بھنور تھا جس کی گرہ آسانی سے نہ ملتی تھی۔ اور اس میں اترنے والا، خود بھی نخچیر گرداب ہو جاتا تھا۔ تاریخ کا یہ وہی حصہ ہے جس میں عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور خلافت کی قبا ترک ناداں کے ہاتھوں چاک ہو گئی۔ پھر مسلمانوں پر تہذیب فرنگ کا وہ سیاسی و فکری سیلاب ٹوٹ پڑا کہ وہ ذہنی طور پر اس تہذیب سے بری طرح مسحور و مغلوب ہو گئے، اور خود اسلام بطور دین حق شکوک و شبہات کے نرغے میں آ گیا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) مزید سیلاب بلا لے کر آئی۔ استعماری طاقتیں مسلمانوں پر جھپٹ پڑیں۔ انگریزوں نے عراق، فلسطین اور مصر کو اپنی کالونی بنالیا، سوڈان ان کے زیر نگیں تھا، ہندوستان کی سنہری چڑیا پہلے ہی ان کے پنجہ استبداد میں کراہ رہی تھی، لبنان پر فرانس کی اجارہ داری ہو گئی اور مراکش میں فرانس اور اسپین کی چیرہ دستیاں مسلم مجاہدین سے پنجہ آزما تھیں۔ یہ استعماری پیش رفت مسلم جغرافیے کے گھیراؤ تک محدود نہ تھی، بلکہ سیاست و اخلاق، تہذیب و ثقافت اور فکر و نظر کی پہنائیوں کو بھی مغلوب و مقہور کر رہی تھی۔

یہ تمام حالات ہندوستان پر پوری شدت کے ساتھ اثر انداز ہو رہے تھے۔ اس کی وجہ سے ایک طرف یاس و قنوطیت کے تاریک سائے چھا رہے تھے، اور دوسری طرف مغلوب اقوام کی جو بیماریاں ہمیشہ سے تاریخ دیکھتی رہی ہے، وہ مسلم معاشرت کے اندر پیدا ہو چکی تھیں۔ مذہبی جھگڑے، سیاسی تنازعات، تہذیب غالب کی تقلید اور محدود مفادات کے لئے برتر مصلحت کی قربانی، یہ سب باتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ مزید برآں ہندو اپنی اکثریت کے زعم اور اپنے ہندومت کے احیاء کے جذبے سے مسمانوں کو نہ صرف کچوکے لگا رہے تھے، بلکہ وہ انگریزی استیلاء کے جانشین بن کر مسلمانوں پر اپنی مستقل برتری کے منصوبے بنا رہے تھے۔

صدائے رستاخیز کا ریکارڈ انہی حالات و مسائل کا آئینہ پیش کرتا ہے۔ عالم اسلام کے مسائل پر اس ریکارڈ میں جو گفتگو کی گئی ہے وہ اس دور کے گھمبیر حالات کی عینک سے دیکھنی چاہیے، اور یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جس طرح آج تیز تر ذرائع مواصلات ہمیں نصیب ہیں

اس وقت نہ تھے۔ آج بھی ہم سریع الحرکت ذرائع مواصلات کے باوجود حالات کی تہ تک بمشکل پہنچ پاتے ہیں' تو پھر اندازہ لگائیے کہ آج سے ۷۰ سال پیشتر کسی قضیہ کے پوست کندہ حالات معلوم کرنا کس قدر دشوار اور اس کے لیے ذہانت و بصیرت کا کتنا سرمایہ درکار ہوگا۔

یہ بھی پیش خاطر رہے کہ صدائے رستاخیز کا مصنف ۲۲ سال کا نوجوان قلم کار ہے۔ بیشہ صحافت میں اترے ہوئے اسے چار سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ وہ اپنی والدہ اور بھائیوں کا کفیل بھی ہے اور تلاش روزگار کے ساتھ جستجوئے علم میں مگن بھی۔ معاشی زبوں حالی کے باوجود قدرت اسے ایسے راستے پر ڈال رہی ہے کہ آئندہ چل کر یہ نوجوان اخبارات و رسائل کے صفحات پر جولانیاں دکھانے تک محدود نہ رہے' بلکہ امت مسلمہ کی آنکھوں کا تارا اور کشتی ملت کے لیے باد موافق بن کر اٹھے۔ صدائے رستاخیز اسی ۲۲ سالہ نوجوان کے جوش جذبات' جوش قلم اور جوش تنقید کا شاہکار ہے۔ مگر معلومات اور دلائل کا حیرت انگیز انبار۔ یہ نوجوان سید ابوالاعلی مودودیؒ ہیں۔

آپ ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی' پھر تکمیل تعلیم کے لیے حیدر آباد آگئے۔ ۱۹۲۰ء میں جب والد وفات پا گئے تو تعلیم چھوڑ کر تلاش روزگار میں نکلے۔ پہلے مدینہ بجنور کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ پھر جریدہ تاج میں فرائض ادارت سرانجام دیئے۔ ۱۹۲۱ء میں مسلم اور ۱۹۲۵ء میں ہندوستان کے نامور اخبار سہ روزہ الجمعیتہ دہلی میں چیف ایڈیٹر لگ گئے۔ قیام دہلی کے دوران اخبار کی ذمہ داریوں کے ساتھ وہاں کے نامور علماء سے عربی ادب و بلاغت' تفسیر و حدیث' فقہ اور منطق و فلسفہ کا درس لیا۔ ۱۹۲۸ء کے وسط میں الجمعیتہ کو خیرباد کہہ دیا اور حیدر آباد چلے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" نکالا' اور اس میں اپنی اس دعوت کا آغاز کیا جو بعد میں ایک عالمی اسلامی تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔

صدائے رستاخیز کا یہ پورا ریکارڈ ہم نے حیدر آباد دکن کے ایک فاضل نوجوان ڈاکٹر رفیع الدین فاروقی سے بڑی محنت کے ساتھ حاصل کیا ہے۔ اس کو منصہ ظہور پر لانے کے لئے مختلف مراحل میں عزیزم زید احمد الحامدی کا تعاون نصیب رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ اہم تاریخی سرمایہ بیسوی صدی کے اختتام کو چھونے والے قاری کو بیسویں صدی کے آغاز کی مکمل تصویر دکھا دے گا۔

۲۵ر دسمبر ۱۹۹۲ء

خلیل احمد الحامدی
ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی ۔ منصورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دنیائے اسلام پر ایک نظر

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

{ ۱۵ر رجب المجرب ۱۳۴۳ھ }

عظمت و شان کے واقعات کا ذکر جو صفحات تاریخ پر مطلا و مذہب حروف میں درخشاں اور نمایاں ہوتے ہیں ان قعر مذلت اور گمنامی کی تاریک گھاٹیوں میں گری ہوئی قوم کو بیدار کرسکتے ہیں۔ اسلاف عظام کے کارناموں کا ذکر مردہ رگوں میں زندہ خون پیدا کرسکتا ہے۔ کسی قوم کی تاریخ اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین سامان مہیا کیا کرتی ہے۔ لیکن اس قوم کا کیا کیجئے جس کی تاریخ اگرچہ نہایت پر شکوہ اور غضب کی شاندار ہے، جس کے اسلاف صالحین کے کارنامے زندہ جاوید اور درس بصیرت ہیں، جس کے تمدن کی دنیا قائل، جس کے علوم و فنون کا زمانہ مداح اور جس کی شان حکومت کا آسمان شاہد اور زمین گواہ ہے اس کے بچے اپنی تاریخ سے بے بہرہ، اپنے بزرگوں کے حالات سے بے خبر، غیروں کی عظمت سے ترساں اور ان کے جلالت و جبروت سے لرزاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلام اور افسردہ بنے رہتے ہیں۔

کوئی اخبار اس بار گراں کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ تاریخ کے تمام واقعات تو کیا کسی ایک واقعہ کا صحیح مرقع پیش کرسکے پھر تاریخ اسلام کے صفحات اور مسلمانوں کے اوالعزمانہ کارناموں کا مجمل سا ذکر بھی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس وقت اسی قدر کہ دینا بس کرتا ہے کہ وہ دور سعید جس میں خانہ بدوش صحرانشینوں کی بانگ درا اور ان کے نعرۂ تکبیر سے شہنشاہان زمن کانپ جاتے تھے، مدتیں گزریں ختم ہوچکا ہے۔ وہ زمانہ ہوچکا جب بحروبر پر پرچم ہلال لہرایا کرتا تھا اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے نشان اس کے آگے گرد ہوچکے تھے۔ یورپ اور ایشیا کی وسیع زمین نے ان شہ سواروں کے گھوڑوں کے قدم

چوے ہیں جو جذبہ عشق و وارفتگی اور احساس عمل سے سیماب وار مضطرب اعلائے **کلمتہ الحق** اور خدمت بنی نوع انسان کے لئے **جبل الطارق** سے چین کی آخری حد تک اس طرح پھیل گئے تھے کہ تمام ملاحدہ و فراعنہ کو اپنے دنیوی جاہ و حشم کے باوجود ان کا کلمہ پڑھنا پڑا تھا۔ یہ کہن سال آسمان گواہ ہے۔ اس کے سورج اور چاند، اس کے بے شمار ستاروں نے اس عروج و اقبال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جو علم برداران اسلام کو بے سروسامانی کی حالت میں زندگی بسر کرنے کے زمانے میں نصیب تھا۔

وہ استغنا، وہ احساس عمل، وہ جذبہ عشق و وارفتگی جو مسلمانوں کے لئے مایہ صد ہزار ناز تھا، مفقود ہوتا گیا۔ سادگی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ شاہی عظمت اور باطل نمود و ظاہری نمائش اور دنیوی تکلفات نے تباہی کے راستے پر ڈال دیا۔ بے سروسامانی سے محبت کا دور ختم ہوگیا۔ عالیشان عمارتوں اور دنیادی مکانوں اور دفینوں کی الفت نے اس طرح موہ لیا کہ مسلمان اللہ کے نہیں، بلکہ دنیا کے غلام ہوگئے۔۔ آخرکار وہ بدنصیب دن آگیا کہ ہر طرف مسلمان کہلانے والے اسلام کو بدنام کرنے والے بے عمل، بے حس افراد ذلیل و خوار نظر آنے لگے۔

آج کی صحبت میں ہم چاہتے ہیں کہ زمانہ ماضی کی پرشکوہ لیکن غم انگیز تاریخ کو تھوڑی دیر کے لیے گلدستہ طاق خیال بنادیں اور زمانہ حال کے عالم اسلام پر نظرڈالیں اور دیکھیں کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دنیائے مسکون کے ہر حصہ میں کلمہ توحید پڑھنے والے موجود ہیں اور اس مٹ جانے پر بھی افریقہ، یورپ اور ایشیا میں مسلمان حکمران نظر آتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ ابواب میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر ایک اچٹتی نظرڈالیں اور یہ دیکھیں کہ عالم اسلام کے کوائف حاضرہ کیا پتہ دے رہے ہیں اور مسلمانان ہندوستان اس وقت کس خواب خرگوش میں پڑے ہیں۔

❑ شمالی افریقہ کا مغربی حصہ

{ ۱۹ر رجب ۱۳۴۳ ہجری المقدس }

دنیائے اسلام کی موجودہ حالت پر ایک اجمالی نظرڈالنے سے ہماری آنکھیں اس

سرزمین پر پڑتی ہیں جس کے سامنے سمندر کے اس پار اندلس میں کسی زمانہ میں عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم تھی۔ اس کے مغربی حصہ کے مقابلہ میں وہ مشہور و معروف مقام ہے جو طارق کے نام پر آج **جبل الطارق** کہلاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے، جہاں گنے چنے مسلمانوں کی جماعت دشمنان اسلام کی لاتعداد افواج کے مقابلے میں اتری تھی اور جس کے افسر نے محض اس خیال سے کہ کہیں شکست کھاکر واپس بھاگ جانے کا خیال دل میں نہ آجائے، اپنے سفینہ کو اندلس کے اس کنارے نذر آتش کردیا تھا پھر اسی مختصر جماعت نے عشق اسلام کی بدولت کفار کے لشکروں کے پرے کے پرے اکھیڑ پھینکے تھے اور دشمنوں پر عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔

چارلس پنجم شاہ ہسپانیہ کے تخت نشین ہونے سے پہلے اندلس میں اسلامی آبادی موجود تھی۔ اگرچہ حکومت مسلمان امراء کی باہمی معاندت کی نذر ہو چکی تھی۔ عیش پسندی اور اسلام سے دوری نے آخر اس آبادی کو اس درجہ ذلیل کیا کہ فلپ ثانی شاہ ہسپانیہ نے ان نام نہاد مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دے کر آخرکار اپنی مملکت سے نکال دیا۔

ان نام نہاد مسلمانوں کے زوال کے کئی سو سال بعد صرف ہسپانیہ میں نہیں، بلکہ مراکش میں اور مراکش کے اس علاقے میں جہاں ہسپانیہ کی حکومت ہے تاریخ نے اپنا اعادہ کرنا شروع کیا۔ اللہ والوں کی ایک مختصر سی بے سروسامان جماعت توکلاً علی اللہ امیر غازی محمد بن عبدالکریم ایداللہ بنصرہ کی قیادت میں خدمت بنی نوع انسان کے لئے کمربستہ ہو گئی اور اس نے محض اسلام کے اصول جہاد کے مطابق بر کاربند رہ کر ہسپانیہ کو جو یورپ میں دوسرے درجے کی سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی شکست پر شکست دی اور دنیا کو عزیمت راسخہ کے حیرت انگیز کارناموں سے ششدر کردیا۔

ریف ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ جس کی آبادی مشکل سے ایک لاکھ ہوگی۔ دنیا کی مزعومہ تہذیب سے ایسا معرکہ آرا ہوا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ پہلے شمالی افریقہ کے وحشی قبائل سے عموماً ریف ہی مراد لئے جاتے تھے۔ یہ علاقہ سازوسامان کے اعتبار سے اتنا بے بضاعت تھا کہ ہوائی جہاز اور مشین تو درکنار، معمولی رائفلوں اور پرانی وضع کی دقیانوسی توپوں تک بھی رسائی نہ رکھتا تھا۔ مال و دولت اور زر و جواہرات سے اس قدر تہی تھا کہ اس کے طول و

عرض میں کسی ایک بھی ایسے مالدار زمیندار یا شیخ کا نام نہیں لیاجاسکتا جو صحیح معنوں میں دولتمند کہاجاسکتاہو۔ خدا کی شان ہے کہ آج سے چار سو سال پہلے اس میں ایک شخص اپنے ابنائے ملت کی رسوائی و ذلت دیکھ کر دفعتاً حمیت قومی کے جذبہ سے مشتعل ہوا۔ وہ دس آدمیوں کی ایک جماعت لے کر علم جہاد بلند کردیتا ہے اور پورے چار سال نہیں گزرنے پاتے کہ وہ عظیم الشان سلطنت جس کے حدود مملکت میں پونے دو کروڑ انسان آباد ہیں جو ماہرین کے تخمینہ کے مطابق ریف کی پوری آبادی کے برابر بیک وقت اپنی فوج میدان جنگ میں لا سکتی ہے اور جو عہد حاضر کے تمام محیرالعقول آلات جنگ سے آراستہ ہے اس کے سامنے سرنگوں ہوجاتی ہے۔ ہر معرکہ میں شکست کھاتی ہے۔ ہر میدان میں ہزیمت اٹھاتی ہے اور آخر اندروں ملک رزمگاہوں سے بھاگ کر آہن پوش جہازوں کی پناہ میں پہنچ کردم لیتی ہے۔

دنیا حیران ہے کہ اس چیز کو مافوق الفطرت قوت کرشمہ سے تعبیر کرے یا کچھ اور کہے۔ مادہ پرست عقلیں اس معمہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس اس گتھی کو سلجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں مگر ایک مسلمان اس راز سے اچھی طرح واقف ہے اور اس کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ اس کے نزدیک ریف کا جہاد آیہ کریمہ "**ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین**" کی عملی تفسیر ہے۔ نیز یہ کہ ریف کے پہاڑی میدانوں میں بدر وحنین جیسی سکینت اتاری گئی تھی اور وہ معرکہ میں "**انتم الاعلون ان کنتم مومنین**" کی عملی تشریح دیکھ رہا ہے۔

جب تک ریف کے لوگ اس باطل عقیدہ میں مبتلا تھے کہ ہسپانیہ فرعون کی سی قوت رکھتا ہے۔ تعداد افواج میں' دولت میں اور سروسامان میں اس کی ہیبت و جبروت سے انکا کوئی مقابلہ نہیں ہے اور ایسے فولادی بازو سے پنجہ کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا کرنا ہے۔ اس وقت تک ان کے نفوس پر تعبد و غلامی کی ذلت مسلط رہی اور جو کچھ غلاموں پر ہمیشہ گزرا کرتی ہے' ان پر بھی گزرتی رہی مگر جب خدا کے ایک بندے نے ان میں ایمان کی حرارت پیدا کردی اور قوت کے اس اصل سرچشمہ تک انہیں پہنچا دیا۔ جہاں سے دنیا کی تمام قوتیں سیراب ہوتی ہیں تو ان کے دلوں سے ہسپانی رعب و اقتدار کا طلسم باطل ٹوٹ گیا۔ ایک ایک ریفی کے دست و بازو میں وہ زور پیدا ہوگیا جو ہسپانیہ کی پوری

رجمنٹوں میں بھی نہ تھا۔ وہ اپنی پستی و درماندگی کو بھول گئے اور انہی ٹوٹی ہوئی تلواروں سے جن کو وہ ناکارہ سمجھتے تھے' اسپین کی طاغوتی قوتوں کا خاتمہ کردیا۔

اس وقت ایک اسپین ہی نہیں' دنیا کی تین "عظیم ترین قوتیں امیر محمد بن عبدالکریم کے اقدامات سے لرزہ براندام ہیں۔ ایک طرف فرانس کو اندیشہ ہے کہ ریف کی آزادی اس کی استعماری تمناؤں کے خسران کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور مراکش' الجزائر اور تیونس کے مسلمانوں میں نئے سرے سے استقلال کی وہ روح پیدا ہوجائے گی جو آج سے ایک صدی قبل امیر عبدالقادر الجزائری کی قوت کو توڑ کر اس نے فنا کردی تھی۔ دوسری طرف اٹلی پریشان ہے کہ خدا خدا کرکے اسے افریقہ میں ایک بڑی نوآبادی میسر آئی تھی اور ابھی وہ پوری طرح مسخر بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے جذبات حریت و شجاعت میں ریفیوں کی کامیابی نے ایک تازہ جوش پیدا کردیا۔ تیسری طرف برطانیہ عظمی پر وحشت چھائی ہوئی ہے' کیونکہ جبل الطارق کے عین مقابل میں ایک اتنی پرجوش قوت کا پیدا ہوجانا اس کے مواصلات استعماری کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ غرض ایک چھوٹے سے امیر کی قوت نے حریصان استعمار کی جماعت میں ہلچل مچادی ہے اور ہر قوت جو افریقہ یا دنیائے اسلام میں کچھ استعماری مصالح رکھتی ہے' اپنی اپنی جگہ خوف زدہ ہو رہی ہے۔

ریف کے باشندے بے زر ہیں۔ بے سروسامان ہیں' ان کی آبادی بھی کچھ اتنی زیادہ نہیں ہے۔ ان کا اتحاد' ان کا اشتراک عمل' ان کا جذبہ خدمت اسلام آج ہر طرف سے خراج تحسین وصول کررہا ہے۔ دشمن مقابلے پر موجود ہے۔ زہریلی گیسوں کے بم فداکار غازیوں کے جوش کو مشتعل کررہے ہیں۔ ان غازیوں کے بوڑھے بزرگوں' بے کس خواتین اور بے بس بچوں کے لئے سخت مضر ثابت ہورہے ہیں۔ ہسپانیہ کے ہوائی جہاز محض انتقام کے لئے بے گناہ آبادیوں پر بلا امتیاز بم گرا رہے ہیں۔ ہر طرف موت اور وحشت کے اندوہ گین اور المناک نظارے ہیں لیکن تمام دردانگیز نظاروں اور عیال و اطفال پر مصائب و نوائب کے ہجوم سے غازیان ریف کے دلوں پر ذرہ برابر دہشت طاری نہیں ہوئی۔ الحمد للہ وہ آج تک مردانہ وار میدان میں موجود ہسپانیہ کے درندوں اور ان کی انسانیت سوز سفیہانہ حرکات کا مقابلہ کررہے ہیں۔

کیا اس میں ہمارے لئے کوئی درس بصیرت نہیں ہے؟ کیا ریف کے مٹھی بھر مسلمان

ہم کروڑوں کلمہ گویان توحید کو کوئی درس عبرت نہیں دیتے؟ کیا اس قوم سے ہم کوئی سبق نہ لیں گے جس نے چودہ برس بھی غلامی کی ذلت نہ برداشت کی اور چار سال کی قلیل مدت میں محکومی کا جوا اتار پھینکا؟ ریف کا ذرہ ذرہ آج ہم سے پکار پکار کہہ رہا ہے کہ جب تک تم دنیاوی سروسامان کے طلسم میں مبتلا رہوگے اور اپنے اندر وہ عزم راسخ پیدا نہ کروگے جس کا ایمان کے ساتھ پیدا ہونا ضروری ہے، تمہاری مشکلات کا حل، تمہاری بیماریوں کا علاج اور تمہاری محکومی و ذلت کا تدارک کبھی نہ ہوگا۔ تم کچھ نہ کرو، صرف اسلام کی راہ ہدایت اختیار کرلو۔ پھر دیکھو ارباب توکل کے لئے خدا خود کس طرح میر ساماں بنتا ہے اور کس طرح دنیا کی تمام قوتیں تمہارے آگے سر بسجود ہوجاتی ہیں۔ فھل من مدکر۔

☐ مراکش، الجزائر، تیونس، طرابلس

{ ۲۳ر رجب المرجب ۱۳۴۳ھ }

آج کی صحبت میں اسلامی افریقہ کے ان علاقوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو فرانس اور اٹلی کے تسلط میں ہیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جو اسلام کی پہلی صدی ہی میں اس کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے اور آج تک اسی کی غلامی پر فخر کرتے ہیں۔ طرابلس تو حضرت فاروق اعظم ؓ ہی کے عہد میں فتح ہو چکا تھا۔ تیونس کی جانب حضرت عثمان غنی ؓ کے عہد میں قدم بڑھایا گیا اور جناب امیر معاویہ ؓ کے عہد میں عقبہ بن نافع نے ۵۰ھ میں اسے کامل طور پر مسخر کر کے شہر قیروان تعمیر کرایا۔ ۸۲ھ میں موسیٰ بن نصیر نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر بربرہ سے جنگ کی اور الجزائر کو فتح کرتا ہوا اقصائے مغرب میں بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ ۸۵ھ میں طنجہ کو فتح کر کے مراکش کی تسخیر مکمل کردی۔ اس وقت سے یہ ممالک اسلامی تاریخ کے نہایت اہم اجزاء ہیں۔ افریقہ میں ان کو اسلامی تہذیب اور علوم و فنون کا گہوارہ کہنا چاہیے۔ ان کی سرزمین سے بڑے بڑے علماء اور محققین پیدا ہوئے۔ جن میں ابن خلدون اور ابن بطوطہ کے نام آج تاریخ کے ہر ابجد خوان کی زبان پر جاری ہیں۔ یہی ممالک تھے۔ جنھوں نے اندلس کی یادگار زمانہ اسلامی تہذیب کا قصر تعمیر کرنے کے لیے سامان فراہم کیا تھا۔ انہی کی اعانتیں آڑے وقتوں میں مسلمانان اندلس کے کام

آتی رہیں۔ انہی نے مدتوں اندلس کو وہ تازہ خون پہنچایا تھا۔ جس سے وہ مسیحی یورپ کے عین گھر میں آٹھ صدیوں تک بڑے طمطراق کے ساتھ متمکن رہا اور یہی تھے جنہوں نے ازابیلا اور فرڈیننڈ کے ظلم و ستم سے بھاگنے والے مسلمانوں کو اپنی آغوش میں امان دی تھی اور پھر سالہاسال تک اسپین و پرتگال کی تاخت و تاراج کا مقابلہ کیا تھا۔

قرون مظلمہ میں جہاں دنیائے اسلام کے دوسرے قطعات پر گوناگوں بلائیں نازل ہوئیں وہاں یہ بھی انہی کے سیلاب میں بہ گئے۔ جہالت، گمراہی، فساد و اخلاق، تشتت و تفرق اور دوسری اجتماعی بیماریاں جو اسلامی تعلیمات کو فراموش کردینے اور غیر اسلامی زندگی اختیار کرلینے سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں ان میں بھی پیدا ہو گئیں۔ مراکش نے نہایت غرور اور تمکنت کے ساتھ اسلامی افریقہ کے دوسرے علاقوں سے بے تعلقی پیدا کرلی ہے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا بیٹھا اور مدتوں دشمن کے خدائع و حیل کی زنجیر کو زیور سمجھ کر پہنے رہا۔ آخر ایک وقت آیا کہ اسے پوری طرح جکڑے جانے کے بعد اپنی اسیری کا حال معلوم ہوا۔ الجزائر اور تونس نے کچھ مدت تفریق کی زندگی بسر کرنے کے بعد اسلام کی مرکزی قوت کی حمایت قبول کرلی مگر جب خود مرکز میں اضمحلال پیدا ہو گیا تو وہ اپنی جگہ آپ نہ سنبھلے اور آخر پھوٹ کے شکار ہوئے۔ پہلے الجزائر کو غلامی کا طوق پہننا پڑا اور تونس اطمینان سے اس تماشے کو دیکھتا رہا۔ بعد میں تیونس کا نمبر آیا اور امم اسلامیہ کے ایک پر سکون مجمع کے سامنے نہایت خاموشی کے ساتھ اس کی حلقہ بگوشی کی رسم عمل میں لائی گئی۔ طرابلس کی باری سب سے آخر میں آئی۔ اس کی قسمت میں ایک نوخیز مسیحی قوت کی غلامی لکھی ہوئی تھی جسے بحیثیت ایک سلطنت کے قائم ہوئے ابھی نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری ہے۔ اس کو اپنے ہمسایوں سے ذرا زیادہ عرصہ تک اسلامی حمایت کی ہوا کھانی نصیب ہوئی اور اس کے سامنے طوق و زنجیر کا تحفہ اس وقت پیش کیا گیا جب بیداری کی ہوا چل چکی تھی۔

شمالی افریقہ میں استعمار و استبداد کا سب سے بڑا علمبردار فرانس ہے۔ ۱۷۹۰ء میں جب جمہوریت، مساوات، انصاف اور عدالت کا جوش نیا نیا تھا تو اس نے اعلان کیا تھا کہ آئندہ کسی قوم کی آزادی چھیننے کے لیے فرانسیسی تلوار نہیں اٹھے گی۔ ۱۷۹۱ء میں جمہوریت کا قانون اساسی مرتب کیا پھر اسے عوام و خواص کے کانوں تک پہنچایا گیا مگر

جوش کے دن گزرتے ہی یہ ساری بلند آہنگیاں نسیاً منسیاً ہو گئیں۔ جدید فرانس نپولین جیسے حریص اقتدار قائد کی تربیت میں ایک حریص ملوکیت فرانس بن کر نکلا اور دنیا کی قوموں کو اپنے حریف انگلستان ---- کی طرح ان کے فطری حقوق سے محروم کرنے پر مستعد ہو گیا۔ پہلے اس نے ہندوستان کی طرف نظر دوڑائی اور مصر پر قبضہ کر لیا مگر جب اس میدان میں انگلستان نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تو وہ ایک عظیم الشان افریقی سلطنت کا خواب دیکھنے لگا اور اپنے سامنے ہی بحر ابیض متوسط کے دوسرے کنارے پر استعمار کے جال بچھانے لگا۔

اس کا سب سے پہلا شکار الجزائر تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ رہائن کے مشرق میں اپنی حدود کو آسٹریا اور پروشیا کی دشمنی مول لیے بغیر نہیں بڑھا سکتا اور دوسری طرف انگلستان کو جو جبل الطارق اور مالٹا پر قابض ہو چکا ہے، بحر ابیض کا مالک کل بننے کا موقع دے رہا ہے تو بحری قزاقی کے انسداد کا بہانہ کر کے اس نے بائے حسین والیٔ جزائر کے سامنے نہایت نامعقول مطالبات پیش کرنے شروع کر دیئے اور جب فرنچ قونصل کی بیہودہ گفتگو سے غضب ناک ہو کر بائے نے اس کے منہ پر پنکھا مارا تو اسے ملک پر حملہ کر دینے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ۴ر جولائی ۱۸۳۰ء کو ۱۸ ہزار کے لشکر جرار نے شہر الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ اندرون ملک میں اپنے حلقہ نفوذ کو وسیع کرنے کے لیے قتل و خون کے بازار گرم کرنے شروع کر دئے اور دولت جمہوریہ فرانس نے اعلان کر دیا کہ مملکت الجزائر اب ایک فرانسیسی مقبوضہ ہے۔ اس ظالمانہ غصب و امتلاک سے تمام الجزائر میں ایک آگ سی لگ گئی۔ خدا نے اپنے ایک بندے عبدالقادر کو اپنے مظلوم بندوں کی حمایت و قیادت کے لیے پیدا کر دیا وہ اٹھا اور ٹھیک اسی تدبر، جرأت اور استقلال کے ساتھ جو حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خصائص میں سے تھا۔ فرانس کی بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ شروع کر دیا۔ ایک منظم بدوی فوج، ایک غیر متمدن نیم وحشی ملک اور بے سروسامان قبائلی لشکر میں اس نے اپنی عزیمت راسخہ سے ایسی روح پھونک دی کہ ۱۷ برس کی طویل مدت تک اس نے فرانس جیسی زبردست قوت کا مقابلہ کیا اور بعض مواقع پر اس دبدبہ کے ساتھ اس کی فوجوں کے منہ پھیر دیئے کہ اسے تسخیر سے مایوس ہونا پڑا مگر برا ہوا آپس کی پھوٹ کا اس نے مقاومت کے بند میں رخنہ ڈال دیا۔ مراکش نے اپنے بھائی کو قتل

کرنے میں فرانس کو مدد دی اور آخر غاصبوں کا سیلاب اس شد و مد کے ساتھ امنڈ آیا کہ امیر عبدالقادر کو مجبوراً اس کے آگے ہتھیار رکھ دینے پڑے اور نومبر ۱۸۴۷ء میں مدتوں کے لیے الجزائر کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

اس کے بعد مراکش پر اس کی نظر پڑی۔ یہ ایک قدیم اسلامی سلطنت تھی۔ جسے اٹھارہویں صدی میں مولائی اسماعیل اپنے زبردست ہاتھوں سے مضبوط کر گیا تھا اور اس کے بعد اس کے جانشینوں میں سعدی محمد، مولائی سلیمان اور مولائی عبدالرحمٰن نے نظم و آئین کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ فرانس کو الجزائر کی سی آسانی سے ایک باقاعدہ حکومت پر قبضہ کر لینے کی جرات نہ ہوئی اس لیے اس نے دسیسہ کاری سے کام لے کر رفتہ رفتہ اپنا اثر پھیلانا شروع کر دیا۔ پہلے الجزائر کے معاملات میں اس سے چھیڑ چھاڑ کی گئی، پھر ہسپانیہ سے لڑوا کر اس کی کمر توڑی گئی، اس کے تجارتی حقوق کے بہانے سے مکر و فریب کے جال بچھائے گئے اور جونہی مولائی الحسن کی آنکھیں بند ہوئیں انہوں نے نوجوان بادشاہ مولائی عبدالعزیز کی ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر اپنی اغراض کو بار آور کرنا شروع کر دیا اور تھوڑی ہی مدت میں دنیا کو سنا دیا گیا کہ اب مراکش فرانس کے حلقہ اثر میں ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا کہ دونوں اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں بے کھٹکے کام کریں۔ ایک وادی نیل کو اپنی ہوسناکیوں کی تخم ریزی سے سرفراز کرے اور دوسرا مراکش کی سرزمین پر اپنے مصالح خصوصی کی فصل تیار کرے۔ ممکن تھا کہ کچھ مدت تک مراکش میں مصر کی سی حالت باقی رہتی اور خدیو کی طرح مولائی مراکش بھی فرنچ قیادت میں برائے نام سلطان رہنے دیا جاتا مگر مولائی حفیظ اپنی وطن فروشی کے جوش کو زیادہ عرصہ تک ضبط نہ کر سکا اور اندلس کے آخری بادشاہ ابو عبداللہ کی طرح ملک کا آخری سودا کر کے نکل کھڑا ہوا۔ فرانس کے لیے اس سے زیادہ بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی۔ اس نے عنان اقتدار بلا واسطہ اپنے ہاتھوں میں لی اور اگرچہ کچھ مدت تک الجبا کے جانبازانہ اقدامات کا اسے حریف بننا پڑا، مگر آگ اور خون کے کھیل میں مراکشی قبائل [illegible]سری فوج کو شکست دے کر اب وہ بے کھٹکے مغرب اقصیٰ کا مالک الملک بنا ہوا ہے۔

مراکش کے بعد فرانس کا دانت تونس پر مدتوں سے تھا اور وہ احتلال کے بہانے تلاش کر رہا

تھا مگر ترکی کے ایک صوبہ پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد ہی دوسرے پر چھاپہ مارنے کی اسے ہمت نہ پڑتی تھی اور آخر وہ وقت آیا جب کہ پرشیا کی قوت نے میدان جنگ میں جرمن ایمپائر کی بنیاد رکھی۔ یورپ کی عنان سیاست بسمارک جیسے پچیت کے ہاتھ آئی' جنگ روس و ترکی کے بعد اس کی ریاست میں برلن کانگرس منعقد ہوئی اور اس میں اس داعیۂ سیاست نے ائتلاف ثلاثہ کی اسکیم مکمل کرنے کے لیے اٹلی اور فرانس کے درمیان تونس کی عداوت کو ذریعہ بنا لیا۔ اس نے دیکھا کہ اٹلی کو فرانس سے جدا کر کے جرمنی و آسٹریا کے اتحاد میں شامل کرنے کے لیے ایک یہی صورت ہے کہ فرانس کے سامنے تونس کا لقمہ تر پیش کرو۔ جس پر اٹلی کی نیت بری طرح آئی ہوئی ہے۔ چنانچہ ترکی کے خرچ پر وہ اپنا یہ مدعا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا' اس کے اکسانے پر فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونس پر حملہ کیا' ۱۸۸۲ء میں بائے تونس سے معاہدہ کر کے اسے باقاعدہ اپنی حمایت میں لے لیا۔ اٹلی کو یہ حرکت پسند نہ آئی' اس نے علانیہ فرانس کو ملامت کی اور اس سے دوستی کا رشتہ توڑ کر جرمنی سے عقد الفت باندھ لیا۔

تونس پر فرانسیسی' احتلال قائم ہوتے ہی اٹلی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے طرابلس پر ضرور قابض ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے کہ کرسپی (اطالوی وزیراعظم) نے انہی دنوں میں لارڈ سالسبری کو اپنے اس ارادہ کی اطلاع دی تھی اور اس پر دنیا کی سب سے بڑی استعماری سلطنت کے وزیراعظم نے اسے پسند کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابھی مناسب وقت نہیں آیا ہے۔ آخر ۱۹۱۱ء کی آخری سہ ماہی میں وہ مناسب وقت بھی آ گیا اور تمام یورپین دنیا کی مسرتوں کے ہجوم میں اٹلی نے طرابلس کے عثمانی صوبہ پر جو افریقہ میں اسلامی حکومت کی آخری یادگار تھا' حملہ کر کے باقاعدہ تسلط قائم کر لیا۔

اب حال یہ ہے کہ اقصائے مغرب سے لے کر برقہ کے آخری حدود تک جور و ستم کا ایک اسٹیم رولر پوری بیدردی کے ساتھ کلمہ گویان توحید کو کچل رہا ہے اور انسانیت' تہذیب اور مذہب کے علمبردار اپنے ہاتھوں کو مسلم کشی کے خون سے رنگین کر رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ مراکش میں مذہبی جنون اور دینی تعصب کی حکمرانی ہے۔ اہل مغرب کو کتوں اور بلیوں سے زیادہ ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ ایک فرانسیسی کی جان ہزاروں مراکشیوں کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ مسلمانوں کا مذہب' جان مال اور عزت و ناموس

کوئی چیز فرانسیسیوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے اور معمولی معمولی قصوروں پر اہل قبائل کو وہ ہولناک سزائیں دی جاتی ہیں۔ جنکی مثال صرف ہندوستانی سرحد کی برطانوی کارروائیوں ہی میں مل سکتی ہے۔ الجزائر میں اسلامی اوقاف پر حکومت کا قبضہ ہے۔ مداخل اوقات سے نشرو تبلیغ مسیحیت کا کام لیا جا رہا ہے۔ مسجد نے کلیسا کی صورت اختیار کرلی ہے۔ فاتحین اسلام کے مزارات پر سرکاری عمارتیں بن رہی ہیں۔ انصاف و عدالت کا کہیں نام و نشان نہیں ہے' مسلمانوں کی حالت ان یہودیوں سے بھی بدتر ہے جنہیں **وباء و بغضب من اللہ اور ضربت علیہم الذلہ والمسکنہ** کے دائمی خذلان میں مبتلا کر دیا گیا تھا اور حد یہ ہے کہ ایک مسلمان جب تک مسلمان ہے الجزائر کی سرزمین پر اس کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔ وہ جامہ انسانیت سے باہر سمجھا جاتا ہے اور تا وقتیکہ مسیحیت قبول نہ کرے۔ حکومت کی کسی رعایت سے مستفید ہونے کا مجاز نہیں۔ تونس کی جو کچھ حالت ہے وہ آپ کو آج ہی کی اشاعت میں مشہور کاتب امیر شکیب ارسلان کے مضمون سے معلوم ہو سکتی ہے۔ وہاں بھی اسلام خود اپنے گھر میں غریب ہو گیا ہے۔ فرانسیسیوں کے مظالم حدود انتہا تک پہنچے ہوئے ہیں اور ان کی بے انصافیوں کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ فرانسیسی اور یہودی ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں اور ۱۶ لاکھ ایکڑ زمین جوتنے والے مسلمانوں کو ان دس لاکھ ایکڑ کا بھی لگان ادا کرنا پڑتا ہے جو فرانسیسیوں اور فرانسیسی یہودیوں کے زیر کاشت ہیں۔ غرض شمالی افریقہ میں فرانسیسی استعماریت کا بنیادی اصول وہ مسودہ ہے جو (۱۹۱۲ء) میں پیرس کے نیم سرکاری سلطان نے اپنی حکومت کو دیا تھا:

> "فرانسیسی استیلاء وتسلط کی خیر اسی میں ہے کہ ہمارے عمال حکومت وہاں مسلمانوں کو باہم دست و گریباں رکھیں اور انہیں آزادی کا خواب دیکھنے کی فرصت ہی نہ دیں"۔

یہودیوں نے جو ظلم ڈھائے ہیں۔ ان کی یاد ابھی تک ہمارے حافظہ سے محو نہیں ہوئی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اٹلی کی جرار فوجیں مدہش آلات حرب سے آراستہ ہو کر ایک بے بس آبادی پر ٹوٹ پڑی تھیں اور اس پر وہ ظلم و ستم توڑے تھے کہ ساری اسلامی دنیا بلبلا اٹھی تھی۔ ہماری آنکھوں میں ابھی تک نخلستان کے قتل عام اور غیر مصافی

آبادیوں پر گولہ باری کے ہولناک مناظر پھر رہے ہیں اور ہم سنتے ہیں کہ جو حرکات جنگ کے زمانہ میں کی گئی تھیں ان کا سلسلہ اب "امن" اور صلح کے زمانے میں بھی برابر جاری ہے۔ یہ قوتیں حریت و استقلال کی آگ کو خون کے چھینٹوں سے بجھانا چاہتی ہیں، مگر انہیں نہیں معلوم کہ خون اس آگ کے لیے تیل کا حکم رکھتا ہے۔ یہ اپنے مقبوضات میں قتل و غارت اور ظلم و زیادتی سے اسلام کی بیخ و بنیاد اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہیں۔ حالانکہ یہی وہ چیز ہے جو اسے اور زیادہ مستحکم اور مضبوط کرتی ہے۔ طرابلس میں اٹلی اور مراکش الجزائر اور تونس میں فرانس کی ظالمانہ حرکات نے ان ممالک میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی ہے۔ ہر طرف حریت و استقلال کا چرچا ہے، برابرہ و اعراب کے دلوں میں سے مستعمرین کا تسلط اٹھ چکا ہے اور اب صرف گردنوں کی رسیاں باقی ہیں۔ سو ان کے ٹوٹنے کا وقت بھی انشاء اللہ قریب آیا چاہتا ہے۔ ریف میں محمد ابن عبدالکریم کے فاتحانہ اقدامات نے تمام شمالی افریقہ کو پیام امید سنا دیا ہے۔ تونس میں علامہ عبدالعزیز ثعالبی نے طلب استقلال کا علم اٹھایا ہے، طرابلس میں سنوسی مجاہدین شمشیر بکف ہیں اور اٹلی اپنے جنگی جہازوں کی پناہ میں ایک مختصر سی ساحلی پٹی تک اپنے نفوذ و اقتدار کا دائرہ محدود کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ الجزائر و مراکش میں بھی اندر ہی اندر ایک آتش گیر مادہ پک رہا ہے جو یقین ہے کہ بہت جلدی پھوٹ نکلے گا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمالی افریقہ میں اسلام کا حال تو تاریک ہے مگر مستقبل درخشاں ہے۔

مصر

【۲۷؍ رجب المرجب ۱۳۴۳ ہجری】

فراعنہ کی سرزمین اپنی جغرافیائی جائے وقوع، اپنے سیاسی موقف، اپنی تاریخی اہمیت اور اپنی اسلامی شان کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا اسے عجائبات کی سرزمین کہتی ہے۔ تاریخ اسے انسانی تہذیب و تمدن کے اولین گہواروں میں شمار کرتی ہے اور مسلمان اسے قبۃ الاسلام کے معزز نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں خدا تعالی نے حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کو عالم آشکار کیا تھا۔ جہاں اپنے ایک نہتے اور بے یار و مددگار بندے موسیٰ

علیہ السلام کے ہاتھوں فرعون کے تکبر اور علوفی الارض کا تختہ الٹ دیا تھا۔ جہاں جزیرہ نمائے عرب کے بعد دنیا میں سب سے پہلے اسلام کو عروج و اقبال بخشا تھا اور جسے افریقہ کے براعظم میں اسلام کی ضیا پاشیوں کا اولین ذریعہ بننے کا شرف عطا فرمایا تھا۔ بحر قلزم اور بحر روم کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اسے حرمین شریفین کی حفاظت سے ایک خاص جنگی تعلق حاصل ہے اور افریقہ و یورپ کے وسط میں واقع ہونے کے باعث وہ اتحاد اسلامی کا مرکز بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔

مصر کو ہندوستان کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ دونوں ایک ہی ملوکیت کے گرفتار بلا ہیں۔ دونوں کی قسمت ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ دونوں کی اغراض مشترک ہیں۔ دونوں کا مطمح نظر ایک ہے۔ مذہب کی پابندی اور حسن اخلاق میں مصری مسلمان کا درجہ ہندی مسلمانوں سے ذرا گرا ہوا ہے۔ حال کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ ان میں اسلامیت کا جذبہ بھی مسلمانان ہند کے برابر قوی نہیں ہے، مگر علوم دینی کی اشاعت، معارف اسلامی کی ترقی، عام روشن خیالی و بیداری، علوم جدیدہ کی تحصیل اور زمانہ کی ترقیات کا ساتھ دینے میں وہ ہم سے منزلوں آگے بڑھ گئے ہیں۔ صحافت کا معیار ان کے ہاں نہایت بلند ہے، نشر و طباعت میں وہ یورپ کے متمدن ممالک سے کسی طرح کم نہیں۔ عربی زبان میں انہوں نے علوم جدیدہ کے اکثر شعبوں کو بڑی حد تک منتقل کر لیا ہے۔ اسلامی علوم کے گمشدہ ذخیروں کو دنیا سے دوبارہ روشناس کرانے میں لندن اور برلن کے بعد قاہرہ نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج مصر تمام دنیائے اسلام کا معلم ہے۔ اب تک وہاں اس چیز کی کمی تھی کہ مشرقیات و مغربیات کے جامع علماء پیدا نہیں ہوتے تھے سو اب امید ہے کہ ازہر میں تحریک اصلاح شروع ہو جانے سے یہ بھی کمی پوری ہو جائے گی۔

بیداری مصر کی تاریخ اس قدر طویل ہے کہ اگر اسے مختصر سے مختصر کر کے بھی پیش کیا جائے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے اس لئے ہم اس حصے کو چھوڑ کر صرف مسئلہ مصر سے بحث کر سکتے ہیں۔

مسئلہ مصر کا آغاز صحیح معنوں میں نہر سویز کی تعمیر سے ہوتا ہے۔ اس نہر کی تعمیر ان اہم ترین سیاسی غلطیوں میں سے تھی جنھوں نے قوموں کی قسمتوں پر اثر ڈالا ہے۔ تجارتی

حیثیت سے تو کوئی شک نہیں کہ اس کی تعمیر نے مشرق و مغرب کے تجارتی تعلقات میں ایک زبردست انقلاب برپا کردیا اور بجاطور پر اس کی تعمیر کو دنیا کے مفید ترین رفاہی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے مگر اسلامی مصالح اور خود مصر کے قومی مفاد کے اعتبار سے یہ ایک شدید غلطی تھی اور ایسی شدید غلطی تھی جس کے نتائج اب تک بہت برے ثابت ہوئے ہیں اور کچھ خبر نہیں کہ آئندہ کتنے برے ثابت ہوں گے۔ دوربین نگاہوں نے اول دن سے تاڑ لیا تھا کہ بحرروم اور بحر قلزم کو خاکنائے سویز کا قلب چیر کر باہم متصل کر دینا مصر کی تجارتی و جنگی اہمیت کو اس قدر بڑھا دے گا کہ دنیا کی سب سے زیادہ حریص اور سب سے زیادہ قومی سلطنت کے غاصبانہ ارادوں سے اس کا بچنا مشکل ہو جائیگا اور یہ صرف خیال ہی نہیں تھا بلکہ اس متوقع نتیجہ پر یقین کرنے کے کافی وجوہ بھی موجود تھے۔ لارڈ پامرسٹن نے نہر کی تعمیر شروع ہونے سے پہلے ہی برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کردیا تھا کہ!"جب بحرروم بحراحمر سے مل جائے گا تو انگلستان کو مجبوراً مصر پر قبضہ کرلینا پڑے گا" اور اس کے بعد جب تعمیر شروع ہونے لگی تو ۱۸۵۵ء میں لارڈ الن برو نے صاف تصریح کردی تھی کہ!"انگلستان نہر سویز کی تجارتی آزادی اس وقت تک تسلیم نہیں کرسکتا جب تک اسے مصر پر کامل تسلط نہ حاصل ہو جائے"۔

چنانچہ یہی ہوا کہ انگلستان نے نہر کا افتتاح عمل میں آتے ہی مصر پر قبضہ کرنے کے بہانے تلاش کرنے شروع کردے۔ سب سے پہلے خدیو اسماعیل کو قرضوں کی چاٹ لگائی پھر احمق بنا کر ۴۰ لاکھ پونڈ کی حقیر رقم کے عوض نہر سویز کی کمپنی میں مصر کے حصے خرید لیے۔ اس کے بعد فرانس کی شرکت سے انگریز و فرنچ سرمایہ داروں کے حقوق کی حفاظت کا بہانہ کر کے مصری مالیات پر مشترکہ نگرانی قائم کردی اور آخر عرابی پاشا کی اصلاحی تحریک کو خدیومی خاندان کے لئے خطرناک بتلا کر اسکی حفاظت کے بہانہ سے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قابض ہو گیا۔ حضرت سید جمال الدین افغانی نے ان خطرات کو پہلے ہی سے محسوس کرلیا تھا اور علماء و اعیان مصر کو اس سے متنبہ کردیا تھا مگر انگریز ان کی زعیمانہ قابلیتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان کی طرح انہیں مصر سے بھی نکال دیا اور اتنا موقع ہی نہ دیا کہ اہل مصر کو طوفان آنے سے پہلے اس کی مدافعت کے لئے آمادہ کرتے۔

تل الکبیر میں عرابی پاشا کی قوت کو کچل کر اور قسطنطنیہ ۱۸۸۸ء کی آخری بین الاقوامی کانفرنس کو سوکھا سا جواب دے کر انگلستان مطمئن ہو چکا تھا کہ اب اس کے احتلال کے خلاف آواز بلند کرنے والی کوئی قوت نہیں ہے لیکن اس کی توقع کے عین برخلاف ۱۸۹۵ء میں ایک ایسی قوت کا ظہور ہوا جس نے ایک ہی وقت میں مصر کے اندر اور باہر استقلال مصر کا علم ایسی شدت کے ساتھ بلند کیا کہ آج تک دولت برطانیہ کی مدہش جنگی طاقتیں بھی اس کو نیچا نہیں دکھا سکیں۔ بلکہ انہیں کبھی نہ کبھی اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔ اس قوت سے ہماری مراد مصطفے کامل کی تاریخی شخصیت ہے۔ اس شخص نے ۲۳ سال کی عمر میں آزادی مصر کا بیڑا اٹھایا۔ فرانس، جرمنی، آسٹریا، اٹلی، انگلستان اور ترکی کا دورہ کر کے مدبرین یورپ کے حلقوں میں مصری حقوق کا صور پھونکا اور خود اہل مصر کو جھنجوڑ کر انہیں حریت طلبی کی ایسی تیز و تند شراب پلا دی کہ مارشل لاء کی ترشیاں اور توپوں کے دھماکے بھی اس کے نشے کو اتارنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مصطفے کامل کے کارنامے بیان کرنے کے لیے ایک مستقل دفتر چاہیے۔ مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ شخص مصر کی تحریک وطنی کا بابا آدم ہے اور آج مصر میں زندگی کی یہ جتنی سرگرمی ہے سب کی سب اسی کے دم کی رونق ہے۔ اس کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس نے قبطیوں اور مسلمانوں کے اختلافات کو مٹا کر ایک متحدہ قوم بنا دیا اور اس متحدہ قومیت پر حزب الوطنی کی بنیاد رکھی۔

مصطفے کامل کی پھونکی ہوئی جنگی روح اس کے بعد بھی کام کرتی رہی اور اہل مصر کی نواہائے حریت تیز تر ہوتی رہیں یہاں تک کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں انگلستان کے لئے مصر کا قبضہ ایک خاص اہمیت رکھتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی دن کے لئے اس نے ایک کھلی بے ایمانی کر کے اسکندریہ پر فوجیں اتاری تھیں پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے نازک موقعہ پر مصریوں کو استقلال کے نعرے لگانے کی اجازت دیتا۔ اس نے دسمبر ۱۴ء میں عارضی احتلال کا نمائشی لباس اتار کر مصر کو ”حمایت“ کے نام سے دائمی تسلط کا طوق پہنا دیا اور جب ازہر کے طلباء اور عام اہل مصر نے اس کارروائی کے خلاف سختی کے ساتھ آواز بلند کی تو مارشل لاء کی قوت سے اس طرح گلا گھونٹا کہ ۴ سال کے لئے ان پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

مگر قوت سے حق کی آواز کو کبھی نہیں دبایا جاسکتا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی مصر نے پھر جھرجھری لی۔ اس مرتبہ اس کی قیادت زاغلول پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے نومبر ۱۹۱۸ء میں استقلال مصر کا مطالبہ برطانوی ہائی کمشنر کے سامنے پیش کیا۔ جسے رد کردیا گیا پھر وفد مصر کو مرتب کرکے ایک میموریل پر تمام مصری قوم سے دستخط لئے۔ جس میں امت مصریہ کے متفقہ مطالبات تحریر کئے گئے تھے اور اسے پیرس کی مجلس صلح کے سامنے پیش کرنے کی اجازت مانگی مگر اس کے جواب میں ۹ر مارچ ۱۹۱۹ء کو وہ مع چند رفقاکار رہنماؤں کے قید کردیئے گئے۔ اس پر مصر میں ایک آگ لگ گئی۔ طلبا نے مدرسے چھوڑ دیئے۔ عورتیں گھروں سے نکل آئیں، سارے کاروبار بند ہوگئے۔ اندرون ملک کا پر سکون زندگی بسر کرنے والا فلاح تک اپنے زراعتی کام کو ترک کرکے میدان مبارزہ میں آگیا اور پورا ایک مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ رائے عامہ کی اس ناقابل تسخیر قوت نے زاغلول پاشا کو آزاد کرالیا۔

اب انگلستان نے توپ اور بندوق کے کھیل میں ہار جانے کے بعد فریب کے ہتھیار سنبھالے اور مصریوں میں تفرق پیدا کرنے اور ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۱۹ء میں لارڈ ملر کی زیر صدارت ایک کمیشن بھیجا مگر اہل مصر نے بالاتفاق اس کا مقاطعہ کردیا اور اپنی متفقہ خواہش کا اس جوش کے ساتھ اظہار کیا کہ خود لارڈ ملر کو بھی برطانوی حمایت کی تنسیخ اور مصری استقلال کو تسلیم کرنے لئے سفارش کرنا پڑی۔ اس نے لندن جاکر لائڈ جارج کی وزارت کو مشورہ دیا کہ مصر سے ایسی شرائط پر صلح کرلینا عین مصلحت ہے جن سے اس کو خود مختاری بھی مل جائے اور برطانوی مفاد بھی محفوظ رہے لیکن لائڈ جارج نے ان سفارشوں کو رد کردیا اور اعتدال پسند پارٹی کو مراعات کا خواب دکھا کر اس کے لیڈر زاغلول پاشا کو وزارت مصر پر مامور کیا۔ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک اعتدال پسندوں سے رازونیاز کی سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ مذاکرات صلح کو کامیاب بنانے کے بہانے سے ۱۹۲۱ء کے وسط میں زاغلول پاشا کو جلاوطن کردیا اور طویل کانفرنسوں کے بعد فروری ۱۹۲۲ء میں ایک صلح نامہ کا اعلان کیا گیا۔ جس کی رو سے مصر کی خود مختاری برائے نام تسلیم کرلی گئی۔ سلطان فواد کو امیر فیصل کی طرح شاہ مصر بنا دیا گیا۔ ایک آزاد مصری پارلیمنٹ قائم کردی گئی مگر اصل قوتیں برطانیہ ہی کے ہاتھ میں رہیں۔ نہر سویز پر برطانیہ

کا قبضہ، مصر میں غیر ملکی مفاد کی حفاظت اور خود مصر کی صیانت کے لئے برطانوی فوج کا قیام، سوڈان کی حکومت میں انگلستان کی شرکت اور مصر کی خارجی حکمت عملی پر انگریزی احتساب یہ ایسی چیزیں ہیں جو اس خود مختاری کو بالکل بے معنی کر دیتی ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ مصری و برطانوی تعلقات کی عملی صورتیں اس صلح نامے پر طے نہیں کی گئیں اور انہیں بعد کے دوستانہ مذاکرات پر چھوڑ دیا گیا۔ جس سے اس کی اپنی رہی سہی وقعت بھی ختم ہو گئی۔

اعلان دستور کے بعد زاغلول پاشا کو رہا کر دیا گیا۔ ان کے لئے اس خود مختاری اور بے معنی دستور میں کوئی جاذبیت نہ تھی، مگر انہوں نے اعتدال پسند پارٹی کو مزید سیادت کا موقع دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس نئی پارلیمنٹ کے انتخابات میں شریک ہو گئے اور فروری ۱۹۲۴ء میں آزاد مصر کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے قلم دان سنبھالتے ہی ان معاملات کا تصفیہ کرنے کے لئے برطانوی وزارت پر زور ڈالنا شروع کیا۔ جنہیں اعلان صلح میں آئندہ کے دوستانہ مخابرات پر چھوڑ دیا گیا تھا لیکن برطانوی حکومت جس نے محض مصری قوم کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لئے خود مختاری کا کھلونا اس کے ہاتھ میں دیا تھا کسی طرح ان کا تصفیہ کرنے پر تیار نہ تھی اور اس انتظار میں تھی کہ پہلا موقع ملتے ہی ان حقیر رعایات کو بھی واپس لے لے جو اسے فروری ۱۹۲۲ء کے اعلان صلح میں دی تھیں۔ چنانچہ یہ موقع بھی ۹ ہی مہینے بعد ہاتھ آ گیا۔ شاید ضرورتاً پیدا کر لیا گیا اور نومبر ۱۹۲۴ء میں سروار لی اسٹیک کے قتل سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ عظمیٰ نے اپنا بحیرہ روم کا پورا بیڑہ اسکندریہ اور پورٹ سعید کے سامنے بھیج کر مصری جنگی خانے پر قبضہ کر لیا۔ مصر و سوڈان میں اپنی فوجی قوت کی نمائش شروع کر دی اور مصری قوم سے اس قسم کے مطالبات کئے جنہیں کسی حیثیت سے بھی دیت کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ صرف یہی سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ ایک بھیڑیے کو جب بزغالہ کے پھاڑ کھانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے پانی گدلا کرنے کے خود ساختہ قصور کی پاداش میں اس پر حملہ کر دیا۔

اب یہ کیفیت ہے کہ غریب مصر ۳۰ سال کی مسلسل جدوجہد اور شدید مصائب برداشت کرنے کے بعد ٹھیک اسی نقطہ پر آ گیا ہے جس پر وہ ابتداءً میں تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے آزادی کی تڑپ دلوں میں نہیں تھی اب وہ پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے قلوب بھی

استقلال کی نعمت سے اسی طرح محروم تھے جس طرح اجسام تھے۔ اب یہ بات نہیں رہی۔ پہلے غلامی اعماق قلب میں جاگزیں تھی۔ اب صرف دست و پا تک محدود ہے مگر جہاں تک اصل مقصود کا تعلق ہے مصری قوم اس کے عین دروازے پر پہنچ کر دفعتاً برطانوی خداعی وحیلہ بازی کے ایک ہی افسوں سے منزلوں دور ہٹ گئی ہے۔ یہ ایک اہم سیاسی راز ہے جسے مشرقی اقوام کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے‘ کیونکہ برطانوی قوم کی ان فریب کاریوں سے ہر ایک کو کبھی نہ کبھی واسطہ پڑتا ہے۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ قوم پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ اپنے مطالبہ استقلال پر انتہائی شدت کے ساتھ قائم ہے اور دہان توپ سے اس کو اس کے عزم راسخ سے باز نہیں رکھا جاسکتا تو اس نے فوراً نرمی کا پہلو اختیار کر کے مصری مقاومت کے اس کمزور حصہ پر حملہ کیا۔ جسے آسانی سے توڑ کر رخنہ پیدا کیا جاسکتا تھا۔ اس نے اعتدال پسند پارٹی کو "پارلیمنٹ" میں بادشاہت اور استقلال کے نام سے چند نمائشی مراعات دے کر راضی کرلیا اور خود مصریوں ہی میں ایک ایسی قوت پیدا کردی جو حریت کاملہ کے خلاف برطانوی مفاد کی حفاظت کرسکتی تھی۔ اس حرکت سے زاغلول پاشا کی پوزیشن نہایت نازک ہوگئی۔ ان کے لئے ایک صورت تو یہ تھی کہ اس برائے نام استقلال کو ٹھکرا دیتے اور اپنے قطعی مطالبات کے لئے جدوجہد جاری رکھتے مگر اس میں یہ نقصان تھا کہ نظم و آئین کی قوتیں ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں آجاتی تھیں جو وطنی تحریک کو کچلنے کے لئے خود وطن ہی کے ذرائع کو استعمال کرتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اسے قبول کر کے حکومت کی عظیم قوت سے مصری قوم کو مطالبہ آزادی کے لیے تیار کرتے‘ مگر اس میں یہ خرابی تھی کہ نظم و آئین کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے وہ کسی ایسی پرجوش تحریک کو نہیں چلا سکتے تھے۔ جس سے انگریزی "حمایت" کو خطرہ محسوس ہوتا اور وہ اسے مداخلت کے لئے بہانہ بنا لیتی۔ انہوں نے کامل غور و خوض کے بعد اس آخری صورت کو اختیار کیا۔ ۹ مہینہ تک اس قابلیت کے ساتھ وزارت اور وطنی قیادت کے فرائض انجام دیئے کہ ساری دنیا انگشت بدندان رہ گئی لیکن جس بات کا اندیشہ تھا وہ آخر پوری ہوئی اور برطانوی ملوکیت نے پہلی فرصت ملتے ہی اپنے اس خطرناک دشمن کا استیصال کردیا۔

اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مستقبل میں مصری قوم کی قسمت کیا رنگ اختیار

کرتی ہے لیکن بہر صورت یہ امر یقینی ہے کہ آخر کار حق کو فتح ہوگی اور باطل کو چند مزید مہلتوں کے سوا کوئی دائمی کامیابی نصیب نہ ہوسکے گی۔ آخر میں **التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا۔**

ترکی

{ ۲ شعبان المعظم ۱۳۴۳ہجری المقدس }

اسلام کی فاتحانہ قوتوں کے سب سے زیادہ محیر العقول معجزات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مغولستان کے جن تاتاریوں نے اس کو فنا کرنے کے لئے تلوار اٹھائی تھی انہیں اس نے مسخر کرلیا اور جو قتل کرنے آئے تھے وہ اس کے پابوس ہو کر رہ گئے۔ انہی تاتاریوں کا ایک قبیلہ ترک تھا جس میں چنگیز خان کے ظہور سے پہلے ہی اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی تھی۔ اسلام کی تاریخ میں عربی عنصر کی قوت کمزور ہوجانے کے بعد اس ترکی عنصر ہی نے اقتدار کی باگیں ہاتھ میں سنبھالیں اور صدیوں تک دین مبین کی شان کو برقرار رکھا۔ تاریخ اسلام میں ہم کو سلجوقی، دیلمی، خوارزمی، غزنوی، غوری، تغلق، خلجی، تیموری، قاچاری وغیرہ جتنے شاہی خاندانوں کے نام ملتے ہیں۔ سب یہی ترک ہیں اور موجودہ عہد میں بھی اکثر اسلامی حکومتیں ترکی خاندانوں ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ مصر کے خدیوی ایران کے قاچاری، افغانستان کے بارک زئی۔ حتی کہ حیدر آباد کے آصف جاہی تک ترکی الاصل ہیں۔

مگر ان سب قوموں میں سے جس نے سب سے زیادہ اسلام کی خدمت کی اور حقیقت میں جس کے کارنامے اسلام کی تاریخ میں سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں وہ عثمانی ترکوں کی قوم ہے۔ یہ وہ قوم ہے جس نے آج سے سات سو برس پہلے اسلام کی حمایت میں تلوار اٹھائی اور اس زمانہ میں جبکہ اس کے سب حامی تھک کر چور ہو گئے تھے۔ اپنے خون سے اس کی کھیتی کو لالہ زار بنایا۔ اس نے ۳۶ سال تک دنیا کے ہرگوشہ میں جہاد کا فرض ادا کیا اور عین یورپ کے قلب میں گھس کر صدہا برس تک اسلام کی عظمت و شان کا پرچم بلند رکھا، جس وقت اندلس سے اسلامی قوت مٹ رہی تھی۔ شمالی افریقہ میں کلمہ گویان توحید کو زیر و زبر کیا جا رہا تھا۔ مصر ممالیک کی عیش

پسندیوں سے پامال ہو رہا تھا۔ عرب ملوک الطوائف کی باہمی خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ روس سے اسلامی اقتدار کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ ہندوستان اپنے شاہانہ جاہ و جلال کے باوجود پرتگال کی ترکتازیوں کے مقابلہ میں عاجز و درماندہ تھا اور ہر طرف یورپ کی نوخیز قومیں اسلام سے اسکے فاتحانہ اقدامات کے گن گن کر بدلے لینے کے لیے اٹھ رہی تھیں تو اس معمورہ ارضی پر صرف یہی ایک قوم تھی جس نے بڑھ کر اپنا سینہ سپر کیا۔ اپنے دست و بازو پر تمام وار روکے اور آج تک کہ ساڑھے چھ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اپنی خوں آشام تلوار کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

کسی زمانہ میں جب عثمانی ترکوں کا عروج تھا تو ان کی سلطنت اپنے وقت میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ افریقہ میں مصر، طرابلس، تونس، الجزائر، اس کے زیر نگین تھے۔ ایشیا میں اناطولیہ، عراق، شام، حجاز، نجد، یمن اور ماورا، قفقاز پر ان کا ہلالی علم لہراتا تھا اور یورپ میں تھریس، مقدونیہ، یونان، البانیہ، سرویا، بوسنیا، ہنگری، رومانیا، فلسطین، لیبیا، تاتارستان کوچک سے کریمیا تک ان کا سکہ چلتا تھا۔ مدتوں تک یہ حال رہا کہ بحراسود کو ایک ترکی خلیج بحرمتوسط کو ایک ترکی سمندر اور بحرقلزم کو ترکی سلطنت کی ایک نہر سمجھا جاتا تھا مگر سلیمان اعظم کی آنکھ بند ہونی تھی کہ نقشہ بدل گیا۔ ترکوں میں سے اقدام کی روح نکل گئی اور ہر قدم جو پہلے آگے کی جانب اٹھتا تھا پیچھے پڑنے لگا۔ وائنا کی جانب دوسری پیش قدمی میں انہوں نے شکست کھائی۔ سمندر میں لیبانٹو پر جنوبی یورپ کی متحدہ قوتوں نے ان کی بحری قوتوں کا خاتمہ کردیا اور اس کے بعد ایک ایک کرکے ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوگئے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں روس اور انگلستان کی قوتیں ابھرنی شروع ہوئیں اور آسٹریا کی ملوکیت کے ساتھ مل کر انہوں نے مسئلہ مشرقیہ کے نام سے "مرد بیمار" کی وراثت کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ باندھا۔ ان کی قوت کو گھن ہی لگتا چلا گیا۔ حتی کہ آج ڈیڑھ سو برس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہی سلطنت جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی تھی سمٹ کر مشرقی تھریس کے ایک چھوٹے سے یورپین قصبہ اور مغربی ایشیا کے ایک محدود رقبہ میں سما گئی ہے۔

اس عظیم الشان عروج کے بعد ایسا حیرت انگیز زوال بے سبب نہیں۔ اگر عثمانی قوم کے اسباب تنزل کا استقصاء کیا جائے تو وہ دوسری امم اسلامیہ کے اسباب تنزل سے کچھ

بھی مختلف نہ پائے جائیں گے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ احکام مذہبی سے غفلت، دین مبین کی راہ ہدایت سے اعراض، قوت ایمانی کی کمزوری سے دلوں میں ضعف اور ہواو ہوس کی بندگی سے جوش تقدم میں سرد مہری پیدا ہوگئی۔ سلاطین نے گھوڑوں کی پیٹھ چھوڑ کر عیش و نشاط کے بستر اختیار کر لیے۔ امراء نے قبضۂ شمشیر کی بجائے جام و صراحی کو پسند کیا۔ علماء نے امربالمعروف و نہی عن المنکر سے اعراض کیا اور تملق و رضاجوئی امراء کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ ارباب علم کی گرم بازاریاں بند ہوئیں اور جہالت و گمراہی کا بول بالا ہونے لگا اور پہلے جو ہمتیں راہ تقدم میں صرف ہوتی تھیں۔ اب ان کو حضیض ادبار کی جانب مائل کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف یورپ اپنی مسیحیت کی قید و بند سے آزاد ہو کر تحقیق و اکتشاف کی راہ میں سربکف کھڑا ہوگیا۔ اس نے سمندروں کو چھان مارا۔ زمین کی تہیں کھود ڈالیں۔ فضائے آسمانی کی غیر محدود وسعتوں میں پھیل گیا۔ نئے نئے فنون ایجاد کیے، نئے نئے علوم کی تدوین کی۔ قوانین اقتصاد کا استنباط کرکے اپنی دولت مندی کو بڑھایا، نوامیس فطرت کی تحقیق کرکے مقدرات اشیاء کا علم حاصل کیا جس کی بدولت آج ہم سائنس کی چہل پہل دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ نفسیات انسانی کے مطالعہ سے سیاست مدن کے نئے نئے اصول وضع کیے۔ فنون حرب کو ترقی دیکر نظام عسکری کی ایک نئی دنیا پیدا کر دی اور ان سب ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اسلام سے بدلہ لینے کے لئے نکلا جس نے آٹھ سو برس تک اس کے قلب میں بیٹھ کر عقیدہ تثلیث کا بطلان کیا تھا مگر دوسری طرف ترک جو خانہ اسلام کے دربند آہنی پر پہرہ دار کی حیثیت سے مامور تھے خواب غفلت میں سو گئے۔ ان کو کچھ نہ سوجھا کہ دشمن کیا تیاریاں کر رہا ہے۔ وہ زمانہ کی ترقیات کا ساتھ نہ دے سکے۔ اپنے قدیم طرز کے نظام حکومت کو آسمانی نظام، پرانے طریق جنگ کو الہامی طریق اور دقیانوسی اسلحہ کو خدا کے ہاں سے اترے ہوئے ہتھیار سمجھتے رہے اور آخر جو کچھ کمایا تھا سب کھو دیا حتیٰ کہ خود اپنی جان کے بھی لالے پڑ گئے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب عثمانیوں کی ذلت انتہا کو پہنچ گئی۔ تو سب سے پہلے سلیم ثالث کی آنکھیں کھلیں مگر جہالت و تنگ نظری کا برا ہو کہ اس نے غریب سلطان کو کچھ نہ کرنے دیا۔ بلکہ اس کی جان تک لے ڈالی۔ پھر محمود مصلح نے اصلاح کا علم بلند کیا اور نظام حکومت اور تنظیم افواج میں بہت کچھ تغیرات کئے مگر اندرونی بغاوتوں

اور بیرونی حملوں نے اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی فرصت نہ دی۔ اس کے بعد عبدالمجید خان کا عہد آیا اور اس میں مصطفٰے رشید پاشا، والی پاشا، فواد پاشا، عمر پاشا اور امین پاشا جیسے اولوالعزم مدبروں نے ترکی کے بے جان قالب میں ایک نئی روح پیدا کردی اور شناسی آفندی، معاوی، آفندی، ابوالضیاء بے اور نامق کمال بے جیسے سحرنگار ادیبوں نے وطنی غیرت اور قومی حمیت کے سوئے ہوئے جذبات کو برانگیختہ کرکے ترکی جدید کا ہیولیٰ تیار کیا مگر ان کی تخم ریزیاں ابھی بارور بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ عبدالعزیز خان کے عہد میں پھر اوس پڑگئی اور ایک طویل مدت کے لئے ترکی کی قوم کو خواب غفلت میں سلا دیا گیا۔ مدحت پاشا نے جگانے کی کوشش کی مگر وہ غریب طائف کے قید خانے میں سڑا سڑا کر مار ڈالا گیا۔ روس کی ٹھوکروں، سین اسٹیفانو کے صدمات اور برلن کانگرس کے تازیانوں نے تڑپ پیدا کرنی چاہی۔ مگر سلطان عبدالحمید خان نے اپنی استبدادیت سے اس کو ایسا جکڑ دیا کہ حرکت نہ کرسکی۔ اس میں شک نہیں کہ سلطان مرحوم نے علوم وفنون کے احیاء اور نظام عربی کی اصلاح میں بہت کچھ سعی کی مگر ان کو ترکی کی ترقی سے اپنی ملوکیت زیادہ پیاری تھی اس لئے عثمانی قوم میں انہوں نے وہ حرارت پیدا نہ ہونے دی جو تقدم کی جان اور ترقی کی روح ہوتی ہے۔

آخر جب پانی سر سے گزر گیا اور موت کی گھڑیاں سامنے آگئیں تو ترکی قوم چونک کر خود بخود اٹھ بیٹھی، انجمن اتحاد و ترقی نے ۱۹۰۸ء میں حمیدی استبداد کا خاتمہ کردیا اور نہایت مستعدی کے ساتھ بقائے حیات کے لئے سرگرم عمل ہوگئی دشمن نے اپنے شکار کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر ایک آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے اٹلی نے پاپائیت کا مسکن ہونے کی حیثیت سے پیش قدمی کی اور طرابلس پر قابض ہوگیا پھر ریاست ہائے بلقان نے اپنی پچھلی ذلتوں کا داغ مٹانے کے لئے متحدہ حملہ کیا اور یورپ سے عملاً ترکی اقتدار کا خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد جو کچھ جان باقی تھی اس کو سلب کرنے کے لیے دول عظمیٰ کی ایک پوری جماعت مستعد ہوگئی اور جرمنی کے دامن میں پناہ لینے کے باوجود ترکوں کو کوئی چیز موت کا جرعہ پینے سے نہ بچاسکی۔ بلقانی ریاستوں کی مسلسل جنگ کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب عارضی صلح کا نامۂ سیاہ مرتب ہوا تو ترک اپنے عراق، شام، فلسطین اور حجاز و یمن کے وسیع علاقے کھو چکے تھے اور صرف ایشیائے کوچک اور مشرقی

تھریس کے علاقے باقی رہ گئے تھے مگر ابھی ایوان صلح کی تباہ کاریاں باقی تھیں جو یورپ کی سرزمین پر میدان جنگ کی ہلاکت آفرینیوں سے زیادہ سخت ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ سیورے میں انہوں نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ غریب ترکوں کو تھریس اور سمرنا کے زرخیز صوبوں سے نکال دیا گیا۔ قسطنطنیہ سے محروم کردیا گیا' موصل سے اس کو دست بردار ہونا پڑا اور ایک آزاد سپاہی کی حیثیت سے اس پر موت کا فتویٰ صادر کردیا گیا۔

اب دنیا قطعاً مایوس ہوچکی تھی اور ہر شخص کو یقین تھا کہ ترکی کا مرد بیمار جس نے ۱۹۱۲ء میں آخری سنبھالا لیا تھا۔ ہمیشہ کے لئے مرچکا' مگر خدا کو اس قوم کے سرفروشانہ مجاہدات کا اجر ضائع کرنا منظور نہ تھا۔ اس نے دنیا کو بعث بعد الموت کا حیرت انگیز منظر دکھایا اور مصطفیٰ کمال کی ذات میں ایک ایسی بے نظیر قوت پیدا کر دی جس کے کارناموں کو تاریخ کبھی نہ بھولے گی۔ اناطولیہ کی مشرقی پہاڑیوں میں ٹھیک اس وقت جب مغربی یورپ کا بھیجا ہوا جلاد اپنے فرائض انجام دینے کے لئے سمرنا پر لنگرانداز ہوا تھا' ابر رحمت کی بارش ہوئی اور خدا نے اپنے مظلوم شکست خوردہ اور زخموں سے چور چور بندوں میں کچھ ایسا جوش عمل، رسوخ عزم اور ارادہء مستقیم پیدا کردیا کہ انہوں نے اپنی بے سرو سامانی اور متحدہ یورپ کی قوت دونوں سے قطع نظر کرکے تلوار ہاتھ میں لے لی۔ ایک طرف اپنے اندرونی نظام کو مستحکم کیا' دوسری طرف آرمینیا کو زیروزبر کرکے مشرقی خطرات سے یک سوئی حاصل کی' تیسری طرف ایران' افغانستان آذربائیجان اور داغستان دغیرہ حکومتوں سے عقد مواخات کو استوار کیا اور پھر اپنی قسمت کا آخری فیصلہ کرنے کے لئے یونان کے مقابلہ میں اتر آئے۔ سب سے پہلے ایونو کے میدان میں اسے نیچا دکھایا' پھر نہر سقاریہ کے کنارے اس کو ہزیمت فاش دی پھر فرانس کو کیلیکہ خالی کرنے پر مجبور کیا پھر ۱۹۲۴ء کی پہلی سہ ماہی شروع ہونے سے قبل یونانیوں کو اناطولیہ کی سرزمین سے نکال باہر کیا پھر قسطنطنیہ پر جہاں تین سال سے صلیبی علم لہرا رہا تھا' اسلام کا ہلالی جھنڈا اڑایا اور آخر لوزین صلح کانفرنس میں تین سو برس کے بعد پہلی مرتبہ فاتح کی حیثیت سے اپنے وہ حقوق تسلیم کرالیے جو جنگ عظیم سے پہلے بھی انہیں حاصل نہ تھے۔

یہ ایک کامل فتح تھی جو کامل شکست کے بعد ترکوں کو نصیب ہوئی مگر جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ انقلاب کی تکمیل کے بعد ترکی جدید کی تنظیم میں انتہاپسندی کے عناصر نے

غلبہ حاصل کرلیا اور نئے مدبرین سلطنت سے ترقی و تجدید کے جوش میں بعض ایسی حرکات سرزد ہوگئیں جن پر دنیائے اسلام میں ایک عام رنج و افسوس کی لہردوڑ گئی۔ جہاں تک قدیم خاندان عثمانی کے اخراج اور جمہوریت کے قیام کا تعلق ہے ہم اس پر ترکوں کو قابل الزام نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اپنے لئے وہ جیسا طرز حکومت پسند کرتے ہوں، انہیں اسے اختیار کرنے کا پورا حق حاصل ہے مگر جب وہ نئی یورپین تہذیب کی تقلید میں حجاب شرعی کی مخالفت کرتے ہیں۔ تعدد زوجات کی رخصت شرعی کو ناجائز کرنا چاہتے ہیں۔ خواتین کو رقاصی و جلوہ فروشی کی اجازت دے کر اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہیں اور ان سب سے زیادہ یہ کہ مغربیت کی مادہ پرستیوں سے متاثر ہوکر عبائے خلافت کو ایک پیراہن بوسیدہ سمجھ کر تار تار کرکے پھینک دیتے ہیں۔ تو ہمیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ یورپ پر مادی فتح حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اخلاق اور روحانیت کے میدان میں اس سے شکست کھائی ہے جو پہلی شکست سے زیادہ قابل افسوس ہے۔ تاہم گزشتہ چند ماہ سے ترکی میں جو ایک نیا انقلاب پیدا ہو رہا ہے وہ ہمارے لئے بہت زیادہ امید افزا ہے اور ہم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ترکوں کا زیادہ سنجیدہ اور مدبر طبقہ اس بڑھتی ہوئی مادہ پرستی سے جلد رجوع کرے گا موجودہ دور ایک چند روزہ جوش کا دور ہے جس کو دوام حاصل نہیں ہوسکتا۔ جس خدا نے اسلام کی عزت برقرار رکھنے کے لئے ترکوں کو موت کے منہ سے بچایا ہے، یقین ہے کہ وہ انہیں ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہونے سے بچائے گا اور بہت جلدی وہ محسوس کریں گے کہ تمدن و تہذیب کی حقیقی ترقی ان کو صرف شریعت اسلامی کے اتباع ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

و ھوالذی ینزل الغیث من بعد قنطوا و ینشر رحمتہ و ھو الولی الحمید ۔

عرب

{ ٦ر شعبان المعظم ۱۳۴۳ہجری المقدس }

نبی عربی (روحی فداہ) نے امت مرحومہ کے لئے تین چیزیں چھوڑی ہیں جو اس کی وحدت اور موالفت و مواخات کی بناو اساس ہیں۔ ایک قرآن دوسری خلافت اور تیسرا عرب۔ جس طرح ہر دائرہ کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ اسی طرح ملت حنیفی کے دائرہ روحانی کا

مرکز قرآن ہے۔ دائرہ شخصی کا مرکز خلیفہ وقت ہے اور دائرہ ارضی کا مرکز عرب۔ عرب کی مرکزیت کچھ اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ جغرافی حیثیت سے عالم اسلام کے وسط میں واقع ہے اور نہ اس لیے ہے کہ اس کے ایک مرکزی مقام کو ناف زمین کہا جاتا ہے بلکہ دراصل اس بے آب و گیاہ ریگ زار کو دنیا بھر کی زمینوں پر اس لیے بھی شرف حاصل ہے کہ خداوند قدوس نے اس میں حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا کہ اپنی قوم کو ماسوی اللہ کی غلامی سے نجات دلائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا کہ ارض بابل سے بت پرستی کا کھوج مٹا دیں۔ حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا کہ قوم عاد کی سرکشی کا استیصال کریں۔ حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا کہ ثمود کے تمرد وعصیان کی بیخ کنی کردیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا کہ امن کی بھوکی اور صلح سے محروم دنیا کو سکھ اور چین کا پیغام دیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ سید المرسلین و خاتم النبین حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا کہ اس کے بندوں کو اس کا آخری پیغام سنا دیں۔ اور اس کی نعمتوں کو حد اتمام و تکمیل تک پہنچا دیں۔ پھر یہی وہ سرزمین ہے جہاں اس معمورۂ ارضی میں خدائے واحد کی پرستش کے لئے سب سے پہلا معبد تعمیر ہوا۔ جس کے ایک مخصوص خطہ کو حضرت حق نے بارکنا حولہ کہہ کر مقدس فرما دیا۔ اور جس کو من دخلہ کان آمنا کہہ کر دنیا کا واحد مامن قرار دیا۔

انہی گوناگوں فضیلتوں کے باعث شارع نے اپنی حکمت بالغہ سے مسلمانوں پر ہر طرح کی پابندیاں عائد کردیں کہ خود دنیا کے کسی خطہ میں ہوں مگر اس کے ساتھ ضرور وابستہ رہیں۔ ان کا قبلہ یہیں مقرر کیا گیا کہ جب کبھی اپنے معبود حقیقی کی طرف متوجہ ہوں تو رخ اسی کی طرف ہو۔

حیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ

"ان پر فرض کیا کہ استطاعت ہو تو عمر میں کم از کم ایک دفعہ ضرور بیت اللہ کا طواف کرنے آئیں"

وانذ فی النلس بللحج یاتوك رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق

ان کو تاکید کی کہ دنیا میں خواہ کیسی کفر و ظلمت کی گھٹائیں چھاجائیں مگر یہ پاک اور مقدس سرزمین شرک و ضلالت کے استیلاء میں ملوث نہ ہونے پائے کہ انما المشرکون نجس فلا

یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا اور ان سب باتوں سے مقصود یہ تھا کہ دنیا میں کم از کم ایک گوشہ تو ایسا ضرور رہے جہاں ہدایت کا نور روشن ہو اور حقیقت کی پیاسی دنیا کے لیے اس چشمہ کا فیضان کبھی بند نہ ہو سکے۔

جس طرح ہر چیز اپنے مولد و منشا میں پھلتی پھولتی ہے اسی طرح یہ بھی ایک طبعی امر تھا کہ عرب کے اس گہوارہ میں اسلام نے خوب نشو و نما حاصل کیا۔ قرون اولیٰ میں عرب اسلامی تعلیمات کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ اسلام طبائع انسانی میں جس قدر تغیرات پیدا کر دیتا ہے وہ سب عربوں کی طبیعت میں پیدا ہو گئے تھے۔ عرب کا ایک ایک بادیہ نشین اپنے اندر وہ روحانی قوت رکھتا تھا جس میں ایک عالم کو مسخر کر لینے کی طاقت تھی۔ اس کی زبان اور تلوار سے بڑھ کر محض اس کی زندگی اور عمل میں کچھ ایسی کشش تھی کہ جہاں جاتا تھا دنیا اسکی گرویدہ ہو جاتی تھی۔ اور اس دین فطرت پر ایمان لے آتی تھی جس کی وہ مجسم دعوت تھا۔ اس کے بدوی اور حضارت نا آشنا دماغ میں کچھ ایسی حیرت انگیز روشنی پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے صدیوں وحشت کدہ عالم میں علم و حکمت اور مدنیت و تہذیب کا چراغ روشن رکھا مگر زمانہ کا انقلاب رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اس کو ایک آن یہ جہانگیریاں اور ضو فشانیاں نہ بھائیں اور آخر دولت عباسیہ میں عجمی عروج کے ساتھ عربی زوال شروع ہوا۔ پھر عباسیوں کے دور انحطاط میں ترکی عنصر کے بر سر اقتدار ہونے سے عربوں میں رجعت و پسپائی کا آغاز ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ شارع کا مدعائے حقیقی تو اسی وقت فوت ہو چکا، جب عربوں نے **قوامین بالقسط شهداء علی النلس** کی ذمہ داریاں چھوڑ کر وہی پچھلی سی بدویانہ زندگی اختیار کر لی تھی اور عرب نے تمام دنیا کے تمدن و تہذیب اور علم و حکمت کا مرکز ہونے کی حیثیت سے اپنا رتبہ کھو کر محکومیت یا طوائف الملوکی کی زندگی کو اپنے لیے پسند کر لیا تھا۔ تاہم جب تک ایوبی، ممالیکی اور پھر عثمانی اقتدار باقی رہا، عرب کی حرمت پر آنچ نہ آنے پائی اور معناً نہیں تو لفظاً اسلام کا گہوارہ بنا رہا۔

مگر دور اخیر عرب کے لیے اس سے زیادہ بد قسمتیوں کا پیام لے کر آیا۔ قرون متوسطہ میں جب اسلامی قوت کا زوال اور یورپ کی مسیحی قوتوں کا عروج شروع ہوا تو مسیحیوں کی تمام کوششوں کا مدعا صرف یہ تھا کہ نہ صرف ارض مقدس کو مسلمانوں سے

چھین لیں، بلکہ عین قلب اسلام پر حملہ کر کے صدیوں تک مسیحی قبلہ پر قابض رہنے کا بدلہ بھی لے لیں۔ سب سے پہلے پرتگال نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور افریقہ کا چکر کاٹ کر عرب میں اپنی بحری ترک تازیوں کے جوہر دکھانے لگا۔ اس نے نہ صرف سواحل عرب پر قبضہ کر کے عربی تجارت کو بالکل فنا کر دیا، بلکہ خاص جدہ پر کئی مرتبہ حملہ کر کے حرم پاک تک اپنے تسلط کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر مسیحیت کی علم برداری کا فخر انگلستان، فرانس اور روس کو حاصل ہوا۔ روس نے اپنا مشن پورا کرنے کے لیے اسلام کی مرکزی سلطنت پر پے در پے ضربیں لگا کر اسکی بنیادیں ہلا دیں اور اس طرح ارض مقدس تک پہنچنے کی راہ نکالنی چاہی۔ جس کے نکلنے سے پہلے وہ خود فنا ہو گیا، مگر انگلستان اور فرانس نے اپنے مقصود و مدعا کو حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب کوششیں کیں۔ ان میں سے ایک کا راستہ جنوب و مشرق کی جانب تھا اور دوسرے کا شمال و مغرب کی طرف۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں انگلستان نے تمام مخالف قوتوں کو شکست دے کر بحر عرب کی تنہا حکمرانی حاصل کی اور پھر عدن، سواحل حضرموت، عمان، بحرین وغیرہ پر مسلط ہو کر عراق میں اپنے مصالح کی تخم ریزی شروع کی اور دولت عثمانیہ کو بابل عباسیہ کے عہد کی زرخیزیاں یاد دلا کر دوآبہ دجلہ و فرات کی آبپاشی کا ٹھیکہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف فرانس نے شام اور فلسطین میں فرنچ تہذیب کی اشاعت شروع کی، جگہ جگہ اپنے سرمایہ کا جال بچھا دیا اور شہر شہر میں اپنے کفر و الحاد کی تعلیم دینے والے مدارس کھول دئے۔

لیکن ان استعمار کے بھوکوں نے ان تمام حرکات کو ناکافی سمجھ کر ایک دوسرا فتنہ کھڑا کیا جو تمام فتنوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ انہوں نے عربوں کے جبلی خصائص کے گہرے مطالعہ کے بعد ان کی جنسی عصبیت کے دبے ہوئے جذبہ کو نئے سرے سے ابھارا اور خلافت عربی کا خواب دکھا کر اسلام کے گھر میں نفاق ڈال دیا۔ تھوڑی ہی مدت گزرنے پائی تھی کہ عرب اور ترک جو چار سو برس سے آپس میں شیر و شکر تھے ایسے بچھڑے کہ ایک دوسرے کی صورت سے نفرت ہو گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جو منحوس انجام شاید ایک صدی میں رونما ہوتا وہ پچیس تیس برس کی کوششوں ہی میں نمودار ہو گیا۔ یورپ کی جنگ عظیم کا چھڑنا تھا کہ آپس کا نفاق رنگ لایا۔ سادہ لوح عرب سمجھا کہ اس کی آزادی کا وقت آگیا

ہے، حالانکہ وہاں حقیقی غلامی کا پھندا اس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس نے اعدائے اسلام سے مل کر بے تکلف اپنے ترکی آقا کا گلا کاٹ دیا اور جب آزادی کی امنگیں لیکر میدان جنگ سے نکلا تو دفعتہ" یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ اس کی گردن سے اسلام کا طوق نکل کر سارا بدن کفر کی رسیوں سے جکڑا ہوا ہے۔

اب تمام عرب اور سارا عالم اسلامی یہ دیکھ کر خون کے آنسو رو رہا ہے کہ جس سرزمین کو حقیقی معنوں میں اسلام کا گہوارہ ہونا چاہیے تھا، وہ آج ایک کامل غیر اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کر رہی ہے۔ عدن، حضر موت، عمان، بحرین، عراق، شام اور فلسطین وغیرہ تمام ساحلی اور زرخیز علاقے غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں۔ سارا ملک چھوٹے چھوٹے امرا میں بٹا ہوا ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو پھاڑے کھاتے ہیں۔ اجنبی وسائس و مکائد کا جال جزیرہ عرب کے گوشہ گوشہ میں پھیلا ہوا ہے۔ امت عربیہ غیروں کے اشاروں پر حرکت کر رہی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ عرب جن کو اسلامی تعلیمات کا سچا نمونہ ہونا چاہئے تھا، بدترین بدعات میں مبتلا ہیں۔ یورپ کی تہذیب ترکوں اور مصریوں کی طرح ان میں اثر کر گئی ہے اور ان پر بھی یورپ کی ذہنی غلامی کا وہ عفریت مسلط ہو رہا ہے جو جسمانی غلامی سے بدرجہا زیادہ مہلک ہے۔

پس اس وقت مسلمانوں کی حیات اسلامی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اپنی تمام کوششیں اپنے مرکز کی اصلاح اور درستی پر صرف کردیں کہ اس کے بگڑ جانے سے ان کی دینی زندگی کا سارا نظام بگڑ جائے گا۔ مسئلہ عرب ذہنی ازادی کا طالب ہے ورنہ اخوت اور حریت کی متاع گرانمایہ کھوئی جائے گی جس کی تلافی ساری دنیا کے مسلمان ہو جانے سے بھی نہیں ہو سکتی۔

ہمارے سامنے بودھ مذہب کا انجام موجود ہے کہ آج تبت، چین، جاپان اور جزائر شرق الہند میں کروڑوں انسان اس کے پیرو موجود ہیں، مگر اپنے اصلی مولد، ہندوستان سے اس کے مٹ جانے کی بدولت معمورہ ارضی کا ایک چپہ بھی ایسا نہیں ہے جو بودھ کی تعلیمات کا عملی نمونہ پیش کرتا ہو۔ مسیحی مذہب کا جو کچھ حشر ہوا ہے، اس سے ہم سبق لے سکتے ہیں کہ اس کے پیرو آج ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں، مگر ارض کنعان سے اس کا کھوج مٹ جانے کی بدولت دنیا میں کوئی ایک خطہ بھی ایسا نہیں رہا جس کے آثار سے

متبعین ملت مسیحی کے دینی جذبات تازہ ہوتے ہوں اور سب سے زیادہ ہمارے لیے یہودیوں کے دردناک انجام میں ایک عبرت انگیز سبق ہے کہ ارض موعود سے نکل کر آج وہ ساری دنیا میں بکھر گئے ہیں اور کہیں ان کو موقع نہیں ملتا کہ اپنی حیات ملی کا شیرازہ مجتمع کر سکیں۔

پس اگر مسلمان اپنے عزیز مذہب کا ایسا ہی حشر نہیں دیکھنا چاہتے' اگر انہیں یہ منظور نہیں ہے کہ **جعلنا البیت مثابہ للنلس وامنا** کی نعمت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں کم از کم ایک جگہ تو ایسی رہے جہاں اسلام کا نور ہدایت اپنی پوری چمک کے ساتھ روشن ہو تو اب ان کے لیے حقیقت میں بیدار ہو جانے کا وقت آگیا ہے۔ اس وقت عرب کو متعدد خطرات دھمکی دے رہے ہیں اور ان سب کا مقابلہ نہایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے اس پاک سرزمین کو اغیار کے تسلط سے نجات دلانا ہے' پھر اس کی آپس کی خانہ جنگیوں کا استیصال کر کے تمام امراء وملوک عرب کو حرمت عرب کی حفاظت کے لیے متحد کرنا ہے۔ پھر اس کو مغربیت کے ناپاک اثرات سے پاک کر کے عربی زندگی کو خالص اسلامی زندگی بنانا ہے اور اس کے ساتھ ہی اہل عرب کی تمدنی و تعلیمی حالت کو درست کر کے اس عربی تمدن کو زندہ کرنا ہے جس پر آج تک امت مسلمہ کو بجا طور پر فخر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالات کی عدم مساعدت ان مقاصد کی تکمیل میں سدراہ ہے' مگر مسلم قوم نے ہمیشہ ایسے ہی نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے دنیا کی قوتوں کو زیر و زبر کیا ہے۔

وسط ایشیا

{ ۱۰شعبان المعظم ۱۳۴۳ہجری }

براعظم ایشیا کا وہ علاقہ جو بحر اسود کے مغربی سواحل سے مغولستان کے آخری حدود تک پھیلا ہوا ہے اپنی مردم خیزی کے اعتبار سے گہوارہ اقوام سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہیں سے وہ دو زبردست قومیں نکلیں جن کو آرین اور تورانی کے نام سے ماہرین علم الانساب نے امہات اقوام کا لقب دیا ہے۔ ہندوستان' ایران' ترکی' روس اور ممالک یورپ کا بڑا حصہ اسی انسانی منبع سے سیراب ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے انسانی

تاریخ کو بنانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ عام طور پر مسلمان اس خطہ ارضی کے حالات سے بہت بے خبر ہیں اور خصوصاً اس کی اسلامی تاریخ پر ان کو بہت ہی کم اطلاع حاصل ہے مگر عنقریب یہ سرزمین اسلامی زندگی میں ایک ایسا نمایاں حصہ لینے والی ہے کہ دنیا اسے دیکھ کر ششدر رہ جائے گی۔ اس لیے آج کی صحبت کو ہم اسی کے ذکر خیر کے لیے وقف کرتے ہیں۔

وسط ایشیا میں اسلام کی اشاعت کا کوئی زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسلام نے اس وسیع سرزمین میں مختلف زمانوں میں نفوذ کیا ہے۔ اس لیے اس کا زمانہ بھی مختلف ہے۔ تاہم یہ امرواقعہ ہے کہ فتح ایران مکمل ہونے کے بعد ہی سے یہاں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور چھٹی ساتویں صدی ہجری ختم ہونے تک تمام ماوراء النہر‘ مغولستان‘ سائبیریا‘ قفقاز اور تارستان وغیرہ دین حنیفی کی روشنیوں سے منور ہو چکے تھے۔ تارستان میں پہلی اسلامی حکومت بلغاریہ کی تھی۔ جس نے چوتھی صدی ہجری میں اسلام قبول کیا اور نویں صدی تک روسی طوفان کے مقابلہ میں زندہ رہی۔ اسکے ساتھ ہی قازان‘ استراخان‘ یوکرین‘ کریمیا میں مختلف اسلامی حکومتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے کسی زمانہ میں مشرقی یورپ پر اپنی مدنیت و تہذیب کا مدتوں ڈنکا بجایا ہے۔ قفقاز و ماورائے قفقاز میں آذربائیجان‘ داغستان گرجستان اور ارمنستان وغیرہ میں ہمیشہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں پیدا ہوتی رہیں جنہوں نے ہر عالمگیر اسلامی قوت کے ساتھ الحاق کو بخوبی منظور کیا اور تیسری طرف ماوراالنہر اور ترکستان میں سمرقند بخارا‘ کاشغر‘ خوارزم اور فرغانہ وغیرہ اسلامی تہذیب کے مرکز تھے جن کی شاندار روایات تاریخ کے حافظہ سے کبھی محو نہ ہوں گی۔

جب تک مسلمانوں میں روح حیات باقی رہی۔ ان ممالک میں اسلامی زندگی کو کوئی چیز گزند نہ پہنچا سکی۔ ایک سلطنت کا زوال ہوتے ہی دوسری نے اس کی جگہ سنبھال لی اور جب ایک قوم نے اپنے آپ کو وراثت اسلامی کا نااہل ثابت کردیا تو مسلمانوں ہی میں سے کوئی دوسری قوم اپنا جائز حق لینے کے لیے کھڑی ہو گئی مگر جب قرون اخیرہ میں اسلام کے برے دن آئے تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح تاتاری و ترکستانی مسلمانوں کی بھی قومی روح سلب ہو گئی اور بدقسمتی سے انکے حصہ میں وہ شدید مصیبت آئی جو تمام دوسری

اسلامی اقوام کی مصیبتوں سے زیادہ دردناک تھی۔

پندرہویں صدی عیسوی میں ایک طرف تو روس کی قوت نئی ابھر رہی تھی اور دوسری طرف ان مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اپنے الگ الگ خانوں کے ماتحت بٹے ہوئے تھے۔ ایک خان کو دوسرے خان سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ بلکہ آپس میں کچھ ایسی رقیبانہ عدواتیں تھیں کہ ہر وقت لڑائی کے لیے تیار رہتے اور ہر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ اس آپس کی پھوٹ کا جو قدرتی نتیجہ رونما ہونا تھا آخر وہی رونما ہوا۔ وہی روس کہ جو کسی زمانہ میں کریمیا کے خان سے خوف زدہ رہتا تھا ان کی باہمی خانہ جنگیوں کی بدولت اسے یہ دن نصیب ہوا کہ تمام تاتارستان و ترکستان کا مالک الملک بن بیٹھا تھا۔

پھر قازان کی باری آئی اور خود قازانیوں ہی نے اپنی گلے میں پھانسی کا پھندہ پہن لیا۔ اس کے بعد یوکرین پر ہلاکت کی گھٹائیں چھاگئیں اور جن قزاقوں کو تلوار کی قوت سے زیر نہ کیا جاسکتا تھا انہیں اطماع و تحریص کی طاقت نے غلامی پر آمادہ کردیا۔ آخر میں کریمیا‘ بصربیان اور قوبان کا نمبر آیا۔ یہ ممالک عثمانی ترکوں کے زیر اثر تھے۔ اس لیے طویل جنگ و جدل کے بعد روس کو انہیں غلام بنانے میں کامیابی ہوئی اور ان کی تسخیر کے ساتھ تاتارستان سے اسلامی عظمت و شوکت کا چراغ بھی گل ہوگیا۔

یہ افسوس ناک منظر اٹھارہویں صدی کے ساتھ ختم ہونے کے بعد انیسویں صدی میں اس سے زیادہ دردناک نظارہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس صدی میں ایک طرف عثمانی ترکوں کی قوت اپنے انتہائی انحطاط کو پہنچ چکی تھی اور دوسری طرف ایران میں نادرشاہ کی زبردست شخصیت کے اٹھ جانے کے بعد کوئی قوت ایسی نہ رہی جو روس کی پیش قدمیوں کو روک سکتی۔ اس نے قفقاز میں جارجیا‘ منگولیا‘ آذربائیجان‘ سرکیشیا‘ داغستان اور اریوان کو ایک ایک کرکے فتح کرلیا اور دوسری طرف ترکستان میں تاشقند‘ سمرقند‘ ترمذ‘ اندیجان‘ خوارزم اور بخارا نے یکے بعد دیگرے اس کی اطاعت قبول کرلی۔ حتی کہ ۱۸۸۴ء میں مرو تک اس کی فرمانفرمائی کا دائرہ وسیع ہوگیا۔

جیسا کہ آج ایک دنیا کو معلوم ہے‘ روس کی زاریت دنیا کی ان بدترین استبدادی حکومتوں میں سے تھی جو موجودہ دور تہذیب میں عہد وحشت کی ایک یادگار باقی رہ گئی تھی

مگر مسلمانوں کے ساتھ اس کی ستم گاریاں کچھ اس سے بھی زیادہ تھیں جن کا تختہ مشق روس کا ہر طبقہ بنا ہوا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان نہ صرف اس کی رعایا تھے بلکہ اس مذہب کے پیرو تھے جس سے مسیحیت کا بدلہ لینے کی اس نے قسم کھائی تھی۔ اس کے ماتحت گزشتہ چند صدیوں میں روسی مسلمانوں پر جس ظلم و تشدد کا ہولناک دور گزرا ہے اس کے تصور سے انسانی جگر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اشاعت پر بندشیں تھیں۔ مساجد کی تعمیر ممنوع تھی۔ مسیحی اپنے دین کی اشاعت میں نہ صرف آزاد تھے بلکہ جابر و قہار حکومت اپنی تمام قوتوں سے ان کی مدد پر مستعد تھی۔ مسلمان بچوں کے لیے اسلامی تعلیم حاصل کرنا محال تھا اور ہر طرح مسلمانوں کو روسی مذہب اور روسی قومیت قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ ایسے شدید مظالم تھے کہ ان سے تمام اسلامی روس چیخ اٹھا تھا اور ایک شاعر نے درد بھرے لہجے میں اپنی قوم کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا تھا۔

ونحن بخطه فيها صغار   يشيب بكر به الطفل الصغير
تجاذبنا الاعادی با صطناع   فينخدع المخول والفقير
ويمضعتا النصاری ای قلب   علی هذا يقر ولا يطير
مضی الاسلام فلبک دم هليه   وهل يطفی الجوی نلد مع الخزير

اگر کوئی اور مذہب ہوتا تو کبھی کا مٹ چکا ہوتا مگر اسلام ظلم و تشدد سے مٹنے کی بجائے زندگی کی لطافت حاصل کرنے کا عادی ہے۔ جتنا جتنا روسیوں کا ظلم بڑھتا گیا۔ کلمہ گویان توحید کا جذبہ اسلامی تیز تر ہوتا گیا۔ انہوں نے سائبیریا کی زہرہ گداز سختیاں جھیلیں قید خانوں میں سڑ سڑ کر مر گئے سنگینوں اور گولیوں کی مشق ستم کے لیے اپنے سینے پیش کر دئے اور ہر طرح کے مادی و روحانی نقصانات برداشت کئے مگر قرآن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ دین و ملت کے بقاء و تحفظ کے لیے ان کے شاندار کارنامے قرون اخیرہ کی اسلامی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح روس کی جفاکاریاں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی طرح مسلمانان روس کی فداکاریاں دیکھ کر دلوں میں حرارت اور ایمان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

الجمعیتہ کی گذشتہ چند اشاعتوں میں اسلامی روس کی بیداری‘ علمائے روس کی مجاہدانہ مساعی اور مسلمانان روس کی موجودہ ترقیات کے متعلق مسٹر عبدالقیوم ملک کا ایک طویل مضمون شائع ہو چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے قارئین کرام کو اپنے روسی بھائیوں کی تحریک آزادی اور اسکے کامیاب نتائج کا ایک اجمالی علم حاصل ہو گیا ہوگا۔ اس لیے ہم اس مرقع کا ایک حصہ نظرانداز کر کے صرف اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت دنیائے اسلام میں اگر سب سے زیادہ درخشاں مستقبل کسی قوم کا ہے تو وہ وسط ایشیا کی تورانی قوم ہے اقصائے مغولستان سے ایشیا کوچک کے آخری سواحل تک کئی کروڑ کی انسانی آبادی ایک نسل‘ ایک زبان‘ ایک مذہب اور ایک ہی قسم کے مفاد و مصالح رکھتی ہے اور اس پر مزید یہ کہ گذشتہ دور مصائب سے سب قومیں اس بات کا زندہ احساس لیکر نکلی ہیں کہ انہیں اپنے آپ کو کامل ہلاکت سے بچانے اور دنیا میں ایک فاتح قوم کی حیثیت سے اپنا درجہ حاصل کرنے کے لیے متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں‘ بلکہ انہوں نے اپنے متحدہ نصب العین کی طرف بڑی حد تک عملی اقدام بھی کیا ہے۔ تعلیمی حیثیت سے آج تمام مسلمانان عالم میں ان کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ دینی و ملی جوش انہوں نے ورثہ میں پایا ہے۔ اور ان کی تنظیمی قوت اس حد تک بڑھ گئی ہے۔

ان کی مساعی کا پہلا ثمر آج ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تمام اسلامی روس خود مختار و نیم خودمختار جمہوریتوں سے پٹا پڑا ہے اور وہ سب ایک کیمیائی کشش سے باہم ایک دوسرے کے ساتھ روابط اخوۃ کو مضبوط کر رہی ہیں۔ یہ اصل تعمیری کام کے ابتدائی ایام ہیں۔ اب تھوڑی ہی مدت بعد ہم دیکھنے والے ہیں کہ پوری تورانی نسل ایک زبردست نظام میں منسلک ہو جائے گی اور وسط ایشیا اسلامی قوت کا سب سے بڑا مرکز بن جائے گا۔

اگرچہ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ یورپ کی مفسدانہ تعلیمات نے تورانی تحریک میں انتہا پسندی کے عناصر بہت زیادہ بڑھا دئے ہیں۔ چنانچہ آذربائیجان اور بخارا میں بولشویکوں کے غیر اسلامی عقائد پھیل گئے ہیں اور ترکی میں ایک طاقتور جماعت اسلامیت کی بجائے مغربیت پر زیادہ گہرا عقیدہ رکھتی ہے سب بہت جلد ہی اپنے مذہب کی طرف رجوع کریں گے اور انہیں خود زمانہ کے تجربات بتا دیں گے کہ انہیں اسلام کے سوا کسی اور اجتماعی نظام میں اخلاقی و مادی ترقیات ایک ساتھ نصیب نہیں ہو سکتیں۔

☐ افغانستان

{ ۲۲؍ شعبان المعظم ۱۳۴۳ ہجری المقدس }

اسلامی ہند پر افغانستان کے اتنے احسانات ہیں کہ ان کا احصاء کسی صورت سے ممکن نہیں۔ اول تو ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور اس ملک پر برکات تہذیب اسلامی کے نزول کا ذریعہ ہی افغانستان تھا ورنہ اگر سندھ اور مالابار کی کوششوں پر ہی خاتمہ ہوجاتا تو آج یہاں مسلمانوں کی تعداد شاید پارسیوں اور جینیوں سے زیادہ نہ ہوتی۔ لیکن افغانستان نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ ہندوستان میں اسلام کو پھیلایا بلکہ اس سے زیادہ بڑھ کر وہ سات سو برس تک یہاں نوائے حق بلند رکھنے کے لیے مسلسل کوششیں بھی کرتا رہا۔ جن کے نہ معلوم کتنے شاندار نقوش تاریخ کے حافظہ سے محو ہو چکے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ محمود غزنوی علیہ الرحمتہ کے عہد سے احمد شاہ ابدالی کے زمانہ تک تازہ دم اسلامی فوجوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہندوکش کے پہاڑی راستوں سے ہندوستان کی طرف کوچ کرتا رہا ہے۔ جس نے ہندوستان کے کونہ کونہ میں اسلام کی برتری و تفوق کا ڈنکا بجادیا اور سچ یوں ہے کہ اگر افغانستان ہر صدی میں اسلامی ہند کو اپنا تازہ اور گرم خون بہم نہ پہنچاتا رہتا تو اب تک اس کے جسم میں موت کی ٹھنڈک کبھی کی سرائیت کر چکی ہوتی۔ اور آج ہندوستان کی حیثیت اسلام کی تاریخ میں اسپین سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی۔

پس افغانستان سے ہمارا صرف یہی تعلق نہیں ہے کہ وہ ہمارا برادر دینی ہے بلکہ وہ ہمارا محسن ہمسایہ بھی ہے۔ ہماری آبادی کے ایک بڑے حصہ کا قومی و نسلی بھائی بھی ہے اور وہ ہمارے ساتھ ایسے گہرے روابط سے مربوط ہے جن کا ٹوٹ جانا قیامت تک ناممکن ہے۔ کیونکہ ان روابط نے ہمارے جسموں ہی کو نہیں بلکہ خون اور ہماری روح کو بھی آپس میں ہم رشتہ کر دیا ہے۔

افغانستان ان خوش قسمت ملکوں میں سے ہے جنہوں نے کبھی کسی کی غلامی قبول نہیں کی۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ وہ کبھی تہذیب و مدنیت کے اس پیراہن سے آراستہ نہیں ہوا جو انجام کار قوموں کے قوائے حیات کو مضمحل کر دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایک سپاہی ملک رہا ہے اور آئندہ بھی اگر تہذیب و مدنیت قبول کرے گا تو شاید وہ سپاہیوں ہی

کی سی تہذیب و مدنیت ہوگی۔ دنیائے اسلام کے دور انحطاط میں کچھ مدت اس پر بھی ایسی گزری ہے جس میں اس کا مستقبل خطرناک ہو گیا تھا۔ چنانچہ امیر دوست محمد اور شیر علی کی باہمی خانہ جنگیوں نے انیسویں صدی کے وسط میں روس اور انگلستان کو اس ملک میں مداخلت کا موقع دے دیا تھا مگر خدا تعالیٰ کو اس بہادر قوم کی عزت منظور تھی اس لیے اس نے اس موقع پر اسے بچالیا اور آخر اس کو ایک ایسا روحانی دماغ اور اولوالعزم فرزند عطا کیا جس نے اسے تمام خطرات سے نکال کر اب ترقی کی شاہرہ پر لگا دیا ہے۔

افغانستان کی نجات تین چیزوں میں مضمر ہے۔ ایک اس کی بہادری' دوسرے اس کا قدرتی استحکام اور تیسرے روس اور انگلستان کی باہمی رقابت۔ اس ملک کی گذشتہ یک صد سالہ تاریخ انہی تینوں عوامل کے باہمی اشتراک عمل کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ انگلستان نے اس پر تین مرتبہ حملہ کیا اور تینوں مرتبہ اس کے قلب تک اس کی فوجیں پہنچ گئیں مگر پہلی مرتبہ افغانی قوم نے جس طرح اس کی پوری بارہ تیرہ ہزار فوج کو کاٹ کر رکھ دیا تھا اس سے انگلستان کو ایسا سبق حاصل ہوا کہ پھراس نےاس ملک کی کامل تسخیر کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔

انگلستان نے سوچا تھا کہ حیدر آباد کی طرح اس کو بھی ایک ماتحت ریاست بنائے مگر ایک طرف روس کی رقیبانہ کوششوں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا اور دوسری طرف افغانستان کی جائے وقوع اس کے ان ارادوں کے لیے ایک زبردست روک ثابت ہوئی۔ آخر میں وہ صرف اسی پر قانع رہنے کے لیے تیار ہو گیا کہ افغانستان ایک خود مختار ریاست رہے مگر اپنی خارجی سیاست پر اس کے مصالح کی سیادت تسلیم کرلے۔ افغانستان اگر مضبوط اور منظم ہوتا تو شاید انگلستان کی اس خواہش کو بھی پورا نہ ہونے دیتا۔ لیکن اس زمانہ میں وہاں انتہائی بدنظمی و طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا اور امیر عبدالرحمٰن خاں اس کو دیکھتے ہوئے اس بات پر مجبور تھے کہ اپنی سلطنت کے استحکام کا سامان ہونے تک انگلستان اور روس دونوں میں سے کسی ایک کی سیاسی برتری کو تسلیم کرلیں۔ اس لیے انہوں نے ایک بڑی لعنت کے مقابلہ میں چھوٹی لعنت کو طوعاً و کرہاً قبول کرلیا اور سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے نجات حاصل کرکے نہایت خاموشی کے ساتھ افغانستان کی تنظیم میں مشغول ہو گئے۔

امیر عبدالرحمٰن خاں جس کام کے لیے پیدا کئے گئے تھے اسے انہوں نے اپنی زندگی میں پورا کر دیا اور اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت چھوڑ گئے جس کو سرحد ہند کے غیر جانبدار علاقوں کے سوا افغانستان کے چپہ چپہ پر کامل اقتدار حاصل تھا۔ ان کے بعد دوسری پشت کا یہ کام تھا کہ اس حکومت کی اصلاح و تنظیم کرکے اسے ایک مہذب حکومت بناتی مگر افسوس کہ امیر حبیب اللہ خاں نے تھوڑی مدت تک مستعدی سے کام کرنے کے بعد رجعت قہقری شروع کردی اور اپنی زندگی کے وہ ایام جنہیں ایک کسان کی سی مشقتوں کے ساتھ بسر کرنا چاہیے تھا' شاہانہ عیش و عشرت میں اڑا دیئے۔ یہ دور حقیقتاً افغانستان کے لیے اس عہد سے بھی زیادہ خطرناک تھا جب وہ اجنبی مداخلتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کیونکہ اس میں اغیار کو صرف دسیسہ کاریوں ہی کا موقع نہیں مل رہا تھا' بلکہ افغانی قوم کی وہ سپاہیانہ سادگی بھی آج کل کی تہذیب سے تبدیل ہو رہی تھی جو اس کی آزادی کی اصلی ضامن ہے' مگر قدرت الٰہی نے عین وقت پر افغانستان کی مدد کی اور جس وقت امیر حبیب اللہ خان کی عیش پسندیاں عروج کو پہنچ گئیں تو اس نے ایک غیبی ہاتھ سے ان کا کام تمام کرکے ان کی جگہ امیر امان اللہ خان کو مامور کر دیا۔ جو عہد جدید کے بہترین مدبروں میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔

امیرمان اللہ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا یہ ہے کہ انہوں نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے ملک کی سیاست خارجیہ کو انگلستان کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے تلوار اٹھائی اور نہایت کامیابی کے ساتھ اس مقصد عظیم کو حاصل کرلیا۔ لیکن ان کی اس بہادری سے زیادہ ان کی یہ بیدار مغزی قابل صد ہزار تحسین و آفرین ہے کہ انہوں نے اس کامیابی سے وہ بہترین فائدہ اٹھایا جس کے زبردست نتائج ابھی تو نہیں مگر عنقریب دنیا پر ظاہر ہو جائیں گے۔ ایک طرف انہوں نے ترکی' ایران اور وسط ایشیا کی دوسری اسلامی حکومتوں سے تعلقات قائم کرکے اسلام کی زنجیر کو استوار کر دیا ہے۔ دوسری طرف یورپ کی اکثر مہذب سلطنتوں کے ساتھ دوستانہ معاہدے کرکے اپنی سلطنت کی تنظیم جدید کے لیے ان کی اعانت حاصل کرلی ہے اور تیسری طرف خود افغانستان میں ایک ایسی روح پیدا کر دی ہے جو ترقی کے لیے بے چین ہے۔

جن لوگوں نے موجودہ زمانہ میں افغانستان کی سیاحت کی ہے وہ ہندوستان اور ترکی و مصر کے مقابلہ میں اس کی حالت مایوس کن بتاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ امیر حبیب اللہ خاں کے عہد میں اس ملک کو دیکھ چکے ہیں، ان کے نزدیک آج کا افغانستان اس وقت کے افغانستان سے کوسوں آگے نکل چکا ہے اور نہایت تیزی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تاہم ابھی تک جو کچھ خرابیاں باقی ہیں ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان کو کام کے آدمی میسر نہیں۔ تمام افغانستان میں صرف ایک ہی ذات ہے جو تجدید اسلحہ اور تنظیم و ترقی کے جدید خیالات سے روشن ہے۔ اور صرف وہی ان خداداد قابلیتوں سے بہرہ ور ہے۔ جو ایک پسماندہ قوم کو ابھار کر تہذیب و مدنیت کی بلند سطح پر لا سکتی ہے۔ ورنہ تمام ملک میں ابھی تک وہی پرانے خیالات اور وہی دقیانوسی باتیں ہیں اور حکومت کی مشین چند گنتی کے قابل آدمیوں کے سوا انہی کل پرزوں سے چلائی جا رہی ہے۔ جو اب کسی طرح بھی کام دینے کے قابل نہیں رہے ہیں۔

آج کل امیر صاحب اپنی بیدار مغزی سے اپنی تمام تر توجہ اس قحط الرجال کو دور کرنے میں صرف فرما رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے لیے کافی تعداد میں ملک کے نوجوانوں کو جرمنی، فرانس اور اٹلی بھیجا ہے اور انہیں زیادہ کار آمد بنانے کے لیے ملک کے اندر ہی ان کے لیے مواقع پیدا کیے جا رہے ہیں۔ خود ملک میں علوم و معارف کی ترقی کے لیے نہایت تیزی کے ساتھ کوششیں جاری ہیں اور حکومت کے ہر شعبہ کے لیے قابل کارکن پیدا کئے جا رہے ہیں۔ ان کوششوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ افغانستان میں ابھی تک جس قدر پسماندگی کے آثار باقی ہیں یہ محض چند روزہ ہیں۔ جس وقت یورپ سے نوجوان طلبہ فارغ التحصیل ہو کر واپس آئیں گے اور جدید افغانی مدارس سے پہلی جماعت اپنے نصاب ختم کر کے نکلے گی تو اس ملک میں ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ جس کی ترقیات کا آج ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

❑ ہندوستان

{۲۶ر شعبان المعظم ۱۳۹۳ ہجری المقدس}

ہندوستان ہمارا وطن، دنیا میں اسلام کا سب سے بڑا گہوارہ، موجودہ دور کی اسلامی تہذیب کا اولین علم بردار، خزینہ اسلام کا درخشان ترین گوہر اور عہد جدید کے سچے اسلامی لشکر کا مقدمتہ الجیش، ہم پر حق رکھتا ہے کہ دنیائے اسلام کے اس تبصرہ میں اس کو سب سے زیادہ حصہ دیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اس پر اتنا کچھ لکھا جاسکتا ہے کہ ایک اخبار کے کالموں میں اس کا عشر عشیر نہیں لکھا جاسکتا۔ تاہم ہم کوشش کریں گے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن پر اپنے خیالات مختصراً قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں۔

ہندوستان کے تمدن و تہذیب کو اسلام نے جن بیش بہا افادات سے مالامال کیا ہے ان کے غیرفانی نقوش اس سرزمین کے ذرہ ذرہ پر مرتسم ہیں۔ اگر آج تاریخ کے دفتر سب کے سب دریا برد کردیئے جائیں مسلمانوں کا وجود اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے اور ایک زبان بھی افسانہائے پارینہ کو دہرانے والی باقی نہ رہے۔ تب بھی جب تک یہاں کوئی متمدن انسانی آبادی موجود ہے اس وقت تک یہاں کا مذہب، عادات، رسوم، شعائر، زبان، معاشرت الغرض ایک ایک چیز اس حقیقت کا پتہ دیتی رہے گی کہ کبھی یہاں مسلم نام کی کوئی ایسی قوم رہتی تھی جس کی تہذیب ایک حکمران تہذیب اور جس کی مدنیت ایک حاکمانہ مدنیت تھی۔ تم پشاور سے لے کر راس کماری تک ہندوستان کے قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں پھر جاؤ۔ ہر جگہ تم کو اسلام کے زندہ اور منہ سے بولتے ہوئے آثار نمایاں نظر آئیں گے۔ تم دیکھوگے کہ برہمن کو اسلام کے نام سے نفرت ہے مگر اسلامی تعلیمات نے اس کے معتقدات کی دنیا بدل دی ہے۔ تم دیکھوگے کہ پنڈت کو مسلمانوں کی عربی و فارسی کا نام تک سننا گوارا نہ تھا مگر وہ ان کے اثر سے خود اپنی زبان کو نہ بچاسکا اور ان کی نئی پراکرت یعنی اردو کو بے تکلف بولنے لگا۔ تم دیکھوگے کہ مرہٹہ تلوار لیکر مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے اٹھتا ہے مگر تہذیب کے میدان میں خود ہی ان سے شکست کھا چکا ہے اور اپنے دربار سے لیکر نظام حکومت کے ادنیٰ معاملات تک ہر چیز میں مسلمانوں کے طرز حکومت کی نقل اتار رہا ہے۔ غرض انسانی زندگی کے جس شعبہ پر نظر ڈالوگے تم کو یہی دکھائی دے گا کہ مسلمانوں نے صرف تلوار ہی سے ہندوستان کو فتح نہیں

کیا تھا بلکہ اپنی تہذیب سے بھی اسے مسخر کرلیا تھا۔ اور آج یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تلوار کے کارنامے تو چند صدیوں تک اپنی گرما گرمی دکھا کر ختم ہوگئے مگر تہذیب کے کارنامے ابھی تک زندہ ہیں اور انشاء اللہ تاقیامت زندہ رہیں گے۔

اسلامی ہند کا دور اول تو خیر قدرتاً شاندار ہونا ہی چاہیے تھا۔ کیونکہ ہر قوت اپنے ابتدائی عہد میں جوش اور زورمندی کا اظہار کیا کرتی ہے مگر خصوصیت کے ساتھ اس کا عہد متوسط اس شان کا گزرا ہے کہ ہم اس کے دبدبہ و شوکت اور وسعت اقتدار سے قطع نظر کرکے اس کے عمیق نفوذ و اثر اور انقلاب پیدا کرنے والے نظم و آئین کے اعتبار سے اس کو دنیا کی کسی زبردست تاریخی سلطنت سے کم درجہ نہیں دے سکتے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس عہد کی شان و شوکت اپنے انتہائی عروج کو اس وقت پہنچی جب اس کے زوال اور قطعی زوال کا وقت قریب آن لگا تھا۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر اور ان کی حکومت دنیا کی سب سے زیادہ پر شوکت وباجبروت حکومت تھی اور در حقیقت اس دور آخر میں انہوں نے دنیا کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد کا نقشہ دکھا دیا تھا مگر عالمگیر غازیؒ کی آنکھ بند ہوتے ہی سارا سماں دفعتاً بدل گیا۔ اسلامی اقتدار کا آفتاب یکایک غروب ہوگیا۔ ہندوستان کی شان و شوکت ایک آن کی آن میں سب کافور ہوگئی۔ اور چند ہی برس میں اس بدقسمت ملک کو وہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ جو خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ فرنگیوں کی قوم جو معمولی صوبہ داروں کے آگے عاجزانہ دست سوال پھیلا کر ہندوستان کے سواحل پر قدم رکھنے کی اجازت مانگا کرتی تھی۔ جس کا سرحد ہند کے معمولی قزاقوں سے دم فنا ہوتا تھا جو "مغل اعظم" کے دربار میں تجارتی رعایات کی بھیک مانگنے آتی تھی جسے غایت خان نے بری طرح ذلیل کرکے قاسم بازار اور ہگلی سے نکال دیا تھا۔ اس قوم کو ہندوستان کی بدنصیبی سے ایسے دن آگئے کہ ملکی حکمرانی کا تاج پہن بیٹھی اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اپنی فرمانروائی کا ڈنکہ بجا دیا۔

اگرچہ عالمگیر غازیؒ کے بعد بھی کچھ مدت تک ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار باقی رہا۔ دکن، بنگال، میسور اور اودھ میں بڑی بڑی طاقتور اسلامی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ نظام الملک، حیدر علی، ٹیپو سلطان اور امیر خان جیسے زبردست اسلامی جنرل اور مدبر پیدا ہوئے

اور اپنی اپنی جگہ ہر ایک نے اپنا سکہ جمانے کی کوششیں کیں، مگر جمعیت اسلامی کا شیرازہ منتشر ہوچکا تھا۔ اجتماعی روح فنا ہوچکی تھی اور وہ نظام وحدت جو ہر قوم کی کامیابی کا اصلی راز اور مسلمانوں کے فاتحانہ اقدامات کا اولین ضامن تھا۔ بالکل درہم برہم ہوچکا تھا۔ اس لئے انفرادی کوششوں سے کچھ فائدہ مترتب نہ ہوسکا۔ بنگال پر مصیبت آئی تو سب تماشا دیکھتے رہے۔ حیدر علی و ٹیپو سلطان اسلامی علم لے کر اٹھے تو خود مسلمانوں ہی نے دشمن کے ساتھ مل کر ان کا سر کچل دیا اودھ کی موت کا وقت آیا تو کوئی ایسا نہ تھا جو اس کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا اور آخر جب ۱۸۵۷ء میں قضاء و قدر نے ایک غافل قوم کی قسمت کا آخری فیصلہ سنایا تو اس وسیع براعظم کے طول و عرض میں ایک آنکھ نہ تھی جو اس کے جنازے پر آنسو بہاتی اور ایک دل نہ تھا جو اس کے حال پر رحم کھاتا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اسلامی ہند پر کامل موت طاری ہوچکی تھی۔ علم و فضل، دولت، حکومت، اقتدار غرض قومی زندگی کا جو کچھ سرمایہ تھا سب لٹ چکا تھا اور بہت ممکن تھا کہ یہ سرزمین بھی اندلس کی طرح اسلامی تہذیب کا ایک حسرت ناک مقبرہ بن کر رہ جاتی مگر خدا کو اپنے پرستاروں کی عزت بچانی منظور تھی۔ اس نے موت کے بعد ایک دوسری زندگی کے آثار پیدا کردیئے اور مسلمانان ہند کو بحیثیت ایک حکمران قوم کے نہیں تو کم از کم ایک زندہ قوم کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لئے کچھ ایسے سامان بہم پہنچا دیئے۔ جن کی بدولت آج ہم کو ہندوستان میں اسلام کے ۷ کروڑ پیروان اسلام کی عظیم الشان تعداد نظر آرہی ہے اور ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ایک زبردست مسیحی حکومت اور ایک طاقتور غیر مسلم اکثریت کے ماتحت زندگی بسر کرنے اور ایک شکست خوردہ قوم ہونے کے باوجود ہم نے جس طرح اپنے قومی وقار کو قائم رکھا ہے اس کی مثال بمشکل دنیا میں کہیں اور مل سکتی ہے۔ اگرچہ ہمارے لئے یہ صورت حال کسی طرح قابل اطمینان نہیں ہے۔

اسلامی ہند میں اصلاح کی دو تحریکیں بیک وقت پیدا ہوئیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اول اول دونوں کا راستہ بالکل الگ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف عمل کرتی تھیں مگر دونوں سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا اور آخرکار دونوں نے ایک دوسرے کی ضرورت تسلیم کرکے اتحاد قبول کرلیا۔ جس کا اب آغاز ہوگیا ہے۔ ان دونوں تحریکوں سے ہماری

مراد دیوبند اور علی گڑھ کی تحریکیں ہیں۔ پہلی خالص اصلاح دینی سے متعلق تھی اور دوسری کو ہم اصلاح افرنجی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ایک طرف علماء امت کی ایک مخلص جماعت تھی جس نے ہندوستان سے اسلام کا آفتاب غروب ہوتا دیکھ کر علوم الہیہ کی روشنی پھیلانی شروع کی اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں معارف قرآنی کا نور پہنچا دیا اور دوسری طرف اللہ کا ایک مخلص و دردمند بندہ مسلمانوں کو ذلت و نکبت کے گڑھے میں گرتے دیکھ کر اٹھا اور یہ سمجھ کر کہ ان کی بیماری کا اصلی علاج جدید علوم اور جدید تہذیب کی اشاعت میں ہے اس نے علی گڑھ میں علوم جدیدہ کے حصول کے لئے کالج قائم کیا اس کے پرنسپل تہذیب جدیدہ کے علمبردار ہیں۔ اس شخص کے مذہبی معتقدات اور دینی اجتہادات سے ہم کو خواہ کتنا ہی اختلاف ہو اور اس تحریک کے الحاد پرور اثرات کو ہم کتنی ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھیں مگر انصاف ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس نے بڑے نازک وقت میں مسلمانان ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچایا اور ان کی دنیاوی فلاح کے لئے ایسی بہترین کوششیں کیں کہ ان کے شاندار نتائج کو بمشکل نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ دونوں تحریکیں ابتدا ہی میں اتحاد کے ساتھ شروع ہوتیں اور دیوبند میں تجدید کے عناصر بڑھائے جاتے اور علی گڑھ تحریک میں افرنجیت کے اجزا شامل نہ ہوتے تو آج یقیناً اسلامی ہند کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ مسلمان ایک ہی وقت میں دین اور دنیا دونوں کے علم بردار ہوتے اور ایک دفعہ پھر ہمارے اندر قرون اولیٰ کی سی ذوالریاستین ہستیاں پیدا ہوتیں مگر وہ وقت اور وہ حالات ایسے تھے جن میں کوئی ایسی معتدل تحریک پیدا ہونی ناممکن تھی۔ ایک مغربی قوم کے ہندوستان پر فاتحانہ تغلب کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ایک جماعت اس کے خیالات اور اس کی تہذیب سے بالکل مفتوح ہوجاتی اور دوسری جماعت اس کی ہر چیز کے خلاف علم جہاد بلند کردیتی۔ ایسی حالت میں ان دونوں کے اندر بعد قلبی کا پیدا ہونا اور دونوں کا ایک دوسرے کو گم کردہ راہ سمجھنا ایک طبعی بات تھی۔

آخر چند سال گزرنے کے بعد جب طبیعتیں اعتدال کی جانب مائل ہوئیں تو ایک متوسط تحریک کی ضرورت عام طور پر محسوس کی گئی۔ تاکہ ایک طرف احیائے علوم اسلامیہ کا مقصد اعلیٰ حاصل کیا جائے اور دوسری طرف ترویج علوم جدیدہ کی اہم وقتی ضرورت پوری کی جائے۔ اس ضرورت کو سب سے پہلے علمائے امت کے ایک اصلاح پسند طبقہ

نے پورا کرنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ ندوۃ العلماء کے قیام کی صورت میں نمودار ہوا۔ جو اپنے اصول اور مقاصد کے اعتبار سے اس وقت نہ صرف اسلامی ہند بلکہ دنیائے اسلام کا بہترین اصلاحی نظام کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کی اسکیم فلسفہ احیا و اصلاح امت کے نہایت عمیق مطالعہ کے بعد مرتب کی گئی تھی اور اس میں امت مسلمہ کے مرض کی صحیح تشخیص کرکے صحیح تر علاج تجویز کیا گیا تھا مگر افسوس کہ یہ اسکیم جتنی بلند پایہ تھی اس پر عمل درآمد کرنے میں اتنی ہی غلطیاں کی گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس تحریک کو تمام ہندوستان میں پھیل جانا چاہیے تھا وہ آج ایک معمولی درسگاہ تک محدود ہے اور خود اس درس گاہ کو بھی کسی معنی میں ان اصولوں کی عملی صورت نہیں کہا جاسکتا جو ندوہ کی اصلی اسکیم میں پیش کئے گئے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس اسکیم کو کوئی سید احمد خان جیسا پرجوش، بیدار مغز اور خالص عملی آدمی میسر آجاتا تو یہ اسلامی ہند میں ایک زبردست انقلاب برپا کردیتی۔

اسی طرز کی ایک دوسری تحریک حال ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے شروع ہوئی تھی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کے اعتبار سے ایک بہترین تحریک تھی مگر افسوس کہ اسے اتنی بھی کامیابی نہ ہوسکی جتنی ندوہ کو ہوئی ہے۔ اس کی وجہ بعض لوگ۔ مسلمانوں کی بے حسی کو قرار دیتے ہیں مگر درحقیقت اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایسے وقت میں برپا ہوئی جب کہ تعمیر کے بجائے تخریب مقصود تھی اور اس لئے اس کے عناصر ترکیبی میں اصلاح کی بجائے انقلاب کے اجزاء زیادہ شامل تھے پس جب تک جوش باقی رہا جامعہ بھی چلتی رہی اور جب جوش ٹھنڈا پڑ گیا تو جامعہ کو بھی ٹھنڈا ہوجانا پڑا۔

اصلاح دینی کی تیسری اعتدالی تحریک جسے بلا مبالغہ اسلامی ہند کے لئے آیہ رحمت کہنا چاہیے۔ جمعیت العلماء کی تحریک ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت محض ایک سیاسی نظام کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے معرض وجود میں آنے کا وقت ایسا نازک ہے کہ جبکہ مریض کی تقویت کے بجائے اس کی عین حیات کا مسئلہ درپیش ہے۔ لیکن اس تحریک کا اصلی مدعا علمائے امت کو ان کے حقیقی واجبات و فرائض کی بجاآوری کے لئے بیدار کرنا اور ایک خالص دینی تنظیم کے ذریعہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنانا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی

وہ اصل چیز ہے جس پر مسلمانوں کی دینی و دنیاوی فلاح کا انحصار ہے۔ جمعیت العلماء کی ضرورت اس کی اہمیت اور اس کے اصلی کام کے متعلق ایک مفصل بحث کرنے کا تو یہاں موقع نہیں۔ کیونکہ وہ ایک مستقل مبحث ہے۔ جس پر انشاء اللہ ہم آئندہ کسی صحبت میں اپنے خیالات پیش کریں گے۔

اس زمانے میں بھی اگر کوئی اسلام کی شاندار روایات کو پھر تازہ کر سکتا ہے تو وہ صرف علمائکس جماعت ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے حبل متین کو مضبوط پکڑے اور ان حقیقی اسلامی تعلیمات پر کاربند ہو جو قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے جہانگیرانہ اقدامات کے اندر کارفرما تھیں۔ اور آج بھی ان کو غلامی و ذلت کے گڑھوں سے نکال کر ان کے اصلی منصب رفیع تک پہنچا سکتی ہیں۔ اس اہم قومی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے علمائے امت کی بیداری ہمیشہ سے ضروری تھی اور آج بھی اس کی ضرورت ہے۔

❑ چین

{۳۰ر شعبان المعظم ۱۳۴۳ ہجری المقدس}

اسلام کے دین فطرت ہونے کی اگر دنیا میں کوئی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ روشن عملی دلیل ہے تو وہ بلا شبہ مشرق اقصیٰ میں اس کی اشاعت ہے۔ اب تک دنیا کے جتنے ممالک کو اسلام نے حلقہ بگوش کیا ہے وہ کبھی نہ کبھی مسلمانوں کی تلوار سے ضرور مغلوب ہوئے ہیں اور اگرچہ تاریخ کے گہرے مطالعہ سے تلوار اور اسلامی روحانیت کے اثرات ہم کو بالکل جدا جدا نظر آسکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک شخص دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام اپنی حقانیت کے بجائے اپنی اشاعت کے لئے تلوار کا منت پذیر ہے مگر چین اور جزائر شرق الہند میں جہاں آج تک کوئی اسلامی حملہ نہیں ہوا۔ گیارہ بارہ کروڑ مسلمانوں کا وجود اس حقیقت پر روشن ترین شہادت پیش کرتا ہے کہ اسلام خود اپنی فطرت ہی میں فاتحانہ قوتیں رکھتا ہے جن سے ہر طبع سلیم بلا جبر و اکراہ مفتوح و مغلوب ہو جاتی ہے۔

چین میں اشاعت اسلام کی ابتداء کے متعلق کوئی خاص تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی۔ مگر پہلی دوسری صدی ہجری کی چینی تاریخوں میں اس قسم کا ذکر موجود ہے کہ مسلمان تاجر چین پہنچے۔ ان کی متقیانہ عادات اور خدا پرستی کو دیکھ کر چینی لوگ ان کے

گرویدہ ہوگئے۔ بادشاہ نے کانٹن میں ان کو رہنے کی اجازت دی۔ اور انہوں نے اپنی شاندار عمارات وہاں تعمیر کرلیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ثالث کے عہد میں دربار خلافت اور شہنشاہ چین کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوئے تھے اور ولید بن عبدالملک اموی کی زمانہ میں دولت اموی کے حدود مملکت چین کی سرحدوں سے مل گئی تھیں جن کے باعث چین میں مسلمانوں کی آمدورفت زیادہ کثرت سے ہونے لگی تھی۔ یہ تعلقات خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی کے عہد میں اور بھی زیادہ ترقی کرگئے جب خلیفہ نے ایک چینی عہدیدار سلطنت کی مدد کے لئے ایک فوج روانہ کی اور وہ اپنی مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد چین ہی میں رہ پڑی۔ آج چین میں مسلمانوں کی جو عظیم الشان تعداد نظر آتی ہے وہ صرف انہی ابتدائی مستعمرین کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ ہے۔

اس کے چار پانچ سو برس بعد جب فتنہ تاتار کے عہد میں ہم دوبارہ چین کے نقشہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو اس کے اکثر صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے اور ہم مسلمانوں کے اقتدار کو اس قدر ترقی پر دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان سید اجال بنیان کا صوبہ دار ہے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اس کی اولاد چینی بادشاہوں پر گہرا اثر ڈالتی ہے اور جب ابن بطوطہ چین کے ساحلی شہروں کی سیاحت کرتا ہے تو ہر جگہ اسے مسلمان نہایت معزز و ممتاز نظر آتے ہیں۔ سولھویں صدی کے اوائل میں ایک مسلمان تاجر سید علی اکبر پیکنگ (چین کے پایہ تخت) پہنچتا ہے' تو وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان نہایت عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی بستیاں غیر مسلموں سے الگ' ان کی آبادیاں سب سے زیادہ شاندار اور پاکیزہ اور مساجد و معابد سے معمور ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہم کو نظر آتا ہے کہ شہنشاہ کین لنگ اپنے صرف سے مسلمانوں کے لیے ایک شاندار مسجد بنواتا ہے اور ۱۷۷۰ء میں زنگاریا کا پورا صوبہ دین حنیفی کو قبول کرلیتا ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں سے حکومت چین کے مفاہمانہ تعلقات تھے۔ اگرچہ بیچ میں بھی چند مرتبہ ان کو شمشیر بکف ہونے کی ضرورت واقع ہوئی۔ چنانچہ ۱۶۴۸ء میں صوبہ کانسو (یا قانصو) کے مسلمانوں نے حکومت چین کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا مگر بحیثیت مجموعی انیسویں صدی کے اوائل تک وہ پر امن باشندے رہے۔

حتیٰ کہ ۱۷۳۱ء میں ینگ چن شہنشاہ چین نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ مسلمان چینی خاندان کے ویسے ہی سچے رکن ہیں جیسے خود چینی ہیں اور وہ ہمیشہ اپنے مذہبی، ملکی اور سیاسی واجبات و فرائض کو مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ لیکن انیسویں صدی شروع ہونے کے ساتھ ہی یہ نقشہ بدل جاتا ہے اور جس طرح اس صدی میں دوسرے اسلامی ممالک پر بلائیں نازل ہوتی ہیں، اسی طرح چین میں بھی مسلمانوں کے ساتھ حکومت کا برتاؤ سخت ہو جاتا ہے اور غریب مسلمانوں کو مجبوراً اس کی اطاعت کا جوا اپنے کندھوں پر سے اتار دینا پڑتا ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے مسلمانوں کی سب سے پہلی سیاسی بغاوت ۱۸۲۰ء میں ہوئی تھی جبکہ جہانگیر خواجہ ایک زبردست جماعت لیکر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور حکومت چین ۸ برس کی مسلسل کوششوں کے بعد بمشکل اس کو شکست دے سکی تھی۔ اس کے ۳۰ برس بعد ایک دوسری بغاوت صوبہ پنان میں رونما ہوئی اور ۱۸۵۶ء میں اسقدر شدید خونریزی کے بعد فرو ہو سکی کہ ایک مسلمان بھی تلوار چلانے کے قابل باقی نہ رہا۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ چینی ترکستان میں ایک زبردست جماعت امیر یعقوب بیگ جیسے بہادر جنرل کی قیادت میں خود مختاری کا علم لیکر کھڑی ہوئی اور اس نے ۱۷ برس تک ایسی کامیابی کے ساتھ چینی حکومت کا مقابلہ کیا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے چینیوں کو یارقند، کاشغر اور ختن کے علاقوں سے نکال باہر کیا اور چینی فوج کے پے در پے حملوں کے مقابلے میں اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔ ان کی اس کامیابی کو دیکھ کر حکومت روس نے ان کا استقلال تسلیم کر لیا اور خود حکومت ہند کو بھی ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں اس نے مسٹر فورسایتھ کو ایک سفارتی مشن دے کر یارقند بھیجا تھا۔ خود امیر یعقوب نے بھی بیرونی دنیا اور خصوصاً اسلامی حکومتوں سے تعلقات قائم کرنے شروع کر دئے تھے۔ غالباً ۱۸۷۲ء میں انہوں نے اپنا ایک سفیر سلطان عبدالعزیز خاں کے پاس بھیجا تھا جس کا قسطنطنیہ میں بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا گیا اور اس نئی اسلامی حکومت کی خود مختاری تسلیم کر لی گئی مگر افسوس کہ زمانہ بہت جلدی مسلمانوں سے آنکھ پھیر گیا۔ ۱۸۷۸ء میں امیر یعقوب بیگ شہید ہو گئے اور اس کے بعد یارقند کو سنبھالنے والی کوئی قوت باقی نہ رہی یہاں تک کہ تھوڑی مدت میں اس پر

چین کا قبضہ پھر بحال ہو گیا۔

مسلمانان چین کی زندگی کے تمام رواۃ متفق اللفظ ہیں کہ وہ اپنے ارتقاء' اپنے اخلاق' اپنی پاکیزگی اور مذہب کی پابندی کے اعتبار سے چین کی عام آبادی کے مقابلہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ عام طور پر چین میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان افسر غیر مسلم افسر کے مقابلہ میں زیادہ دیانت دار اور منصف مزاج ہوتا ہے۔ تجارتی میدان میں بھی مسلمان اپنے غیر مسلم ہمسایوں سے بڑھے ہوئے ہیں اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ صنعت اور تجارت کے لیے خاص طور پر وضع ہوئے ہیں۔ ان کی پرہیزگاری کا یہ عالم ہے کہ افیون کا استعمال جو عام چینیوں کی زندگی کا لازمی جزو ہے' صدیوں کی ہمسائیگی کے باوجود ان کے ہاں رائج نہ ہو سکا اور اس سے ان کی عام صحت اور نسلوں کی ترقی پر اتنا اچھا اثر ہوا کہ چین کا ہر سیاح اسے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیتا ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی ان کے اخلاق اور کردار کی برتری نمایاں نظر آتی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ان کی تحریری و تقریری تبلیغ سے بدرجہا زیادہ بہتر تبلیغ خود ان کی زندگی ہے۔ جسے دیکھ کر ہر سلیم الفطرت چینی ان کے مذہب کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ بہت سے یورپین مشنریوں نے چین میں اشاعت اسلام پر جو مضامین لکھے ہیں' ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کی سرزمین میں اسلام کی حیرت انگیز ترقی کا راز خود مسلمانوں کی زندگی ہی میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ اسے دیکھ کر چینی لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہین اور گروہ در گروہ ان کا مذہب قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ بہت سے مبصرین نے تو اسی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ عنقریب سارا چین مسلمان ہو جائے گا اور اس سے مشرق اقصیٰ کی سیاست ایک نیا روپ اختیار کر لے گی۔ چنانچہ ڈاکٹر مارٹن صاف الفاظ میں لکھتا ہے کہ "مسلمانوں کو ایک نہ ایک دن چین کا حکمران بننا ہے"

موسیو تھریسنٹ کا خیال ہے کہ: "بدھ مت" اور کنفیوشس کو اس کے لیے میدان خالی کرنا پڑے گا" آج سے ۳۰ سال پہلے ینان کے ایک مسلمان سید سلیمان نے ثمرۃ الفنون میں لکھا تھا کہ "ہماری تعداد ہر سال اس قدر تیزی سے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ خود ہم کو بھی اس کا پورا اندازہ نہیں ہے"۔

ایک روسی مبصر واسیلیف نے ۱۸۹۷ء میں پیش گوئی کر دی تھی کہ: "اسلام چین کا قومی مذہب بن کر رہے گا اور اس طرح مشرقی دنیا میں ایک زبردست انقلاب برپا ہو جائے گا"۔ خود چینیوں میں یہ عام اعتقاد پھیلا ہوا ہے کہ شاہی حکومت کے ختم ہوتے ہی ان کے ملک پر اسلام کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

ان تمام باتوں کے ساتھ جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ چین میں شخصی حکومت کا دور ختم ہو کر جمہوری حکومت قائم ہو چکی ہے اور اس جمہوریت میں مسلمانوں پر سے وہ قیود اور سختیاں بھی اٹھ گئی ہیں جو شہنشاہیت کے دور میں تھیں تو ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ جو پیشین گوئیاں اب سے بہت پہلے کی گئی تھیں ان کے پورے ہونے کے امکانات اب پہلے سے بھی زیادہ قوی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ہماری موجودہ نسلیں ہی اس ساعت منتظرہ کو دیکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ جب مشرق اقصیٰ سے اسلام کا آفتاب ایک نئی شان کے ساتھ نمودار ہو گا اور تمام عالم مشرق کا نقشہ بدل جائے گا۔

جزائر شرق الہند

{ ۳ر رمضان المبارک ۱۳۴۳ہجری المقدس }

جزائر شرق الہند میں اسلام کی تاریخ بڑی حد تک چین سے ملتی جلتی ہے۔ جہاں تک اسلام کی اشاعت کا تعلق ہے۔ یہاں بھی چین کی طرح مسلمان تاجروں اور خاموش مبلغوں نے نور ہدایت پہنچایا اور باوجود دشمنوں کی شدید مزاحمت کے اتنی کامیابی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کی کہ جاوا، سماٹرا، مالیزیا، ملکا، بورنیو، فلپائن اور سولو وغیرہ تمام مجمع الجزائر ملایا میں مسلمانوں کی کثیر تعداد پیدا ہو گئی اور بعض جزائر میں تو ان کو یہاں تک قوت حاصل ہو گئی کہ انہوں نے اپنی حکومت تک قائم کر لی، مگر سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان جزائر میں اسلام کی اشاعت کا اصلی زمانہ وہ ہے جب کہ قرون متوسط کی مسیحیت کے علمبردار پرتگال اور اسپین بیدار ہو چکے تھے اور انہوں نے بحر اٹلانٹک سے لے کر بحر الکاہل تک جگہ جگہ مسلمانوں کا سراغ لگا کر ان سے حروب صلیبیہ کی ناکامیوں کے بدلے لینے شروع کر دیے تھے۔ انہوں نے جس طرح عرب ہندوستان اور ملایا کے سواحل پر عربی و ہندی تاجروں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا اس کے حالات تاریخ کے

حافظہ میں محفوظ ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عربی و ہندی مبلغین نے کیسے سخت نامساعد حالات میں اپنے اس مقدس فریضہ دینی کو انجام دیا۔

اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ اس مجمع الجزائر کے ایک ایک جزیرہ کے متعلق الگ الگ بحث کریں۔ تاکہ قارئین کرام کو وضاحت کے ساتھ بحرالکاہل اور جزائر شرق الہند میں اسلام کی پوزیشن معلوم ہو جائے۔

سماٹرا میں اسلام کی ابتداء بارہویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے۔ تیرہویں صدی میں یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی اور اس کا پہلا مسلمان فرمانروا جہان شاہ تھا جسے وہاں کی زبان میں سری پدوکہ سلطان کہا جاتا تھا۔ اس کے عہد میں اسلام برابر ترقی کرتا چلا گیا اور جوں جوں جزیرہ کے اطراف و جوار میں دین مبین کی روشنی پھیلتی گئی اسلامی حکومت کے حدود بھی وسیع ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ۱۳۴۵ء میں جب ابن بطوطہ اس جزیرہ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ الملک الطاہر کی حکومت تمام سواحل سماٹرا پر پھیل گئی ہے۔ ہندوستان اور ایران سے اس کے ہاں سفراء آتے جاتے ہیں اور تبلیغ اسلام کا کام زور شور سے جاری ہے۔ اسی زمانہ میں اسلام نے سواحل کو مطیع کرنے کے بعد اندرون جزیرہ میں بھی اپنا نفوذ و اثر وسیع کرنا شروع کردیا اور سو برس کے اندر اندر اس کے کونہ کونہ میں قرآنی تعلیمات کی روشنی پھیل گئی۔ سولہویں صدی میں پرتگال کی نوخیز مسیحی قوت اسلام کے مقابلہ پر آئی اور سو برس تک تلوار کی دھار سے اسکا مقابلہ کرتی رہی مگر ڈچ اور انگریزوں کے آتے ہی اسے خود پسپا ہو جانا پڑا۔ سترھویں صدی میں ہالینڈ استعمار کی حرص سے متحرک ہو کر اٹھا اور کچھ مدت انگلستان سے دست و گریباں رہنے کے بعد اس نے سیلون وغیرہ کو انگلستان کے حق میں چھوڑ کر سماٹرا میں آزادی عمل حاصل کر لی۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر وہ تمام جزیرہ پر چھا گیا۔ تاہم آخر وقت تک اسلامی حکومت برائے نام قائم رہی۔ اور آخر انیسوی صدی کے آخری ایام میں سماٹرا پر اس کا پورا پورا تسلط ہو گیا۔ اس دوران میں یہاں عیسائی مشنریوں نے حکومت کے زیر سایہ اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے بڑی زبردست کوششیں شروع کر دیں، مگر ۱۸۰۳ء میں سماٹرا کے مسلمانوں میں ایک زبردست بیداری کی لہر پیدا ہوئی اور عیسائی مشنریوں کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور اس وقت بحمد اللہ جزیرہ کی اکثر آبادی مسلمان ہے۔

ملایا میں اشاعت اسلام کا ذریعہ ساٹرا ہے۔ جہاں سے مسلمان تجار نے بارہویں صدی عیسوی میں سنگاپور کو اپنا مرکز بنایا تھا اور ایک صدی بعد ملکا کو آباد کر کے تمام جزیرہ نما میں اپنا تبلیغی مشن پھیلا دیا تھا۔ چودہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ جس کا پہلا بادشاہ سلطان محمد شاہ تھا۔ سولھویں صدی میں تمام ملایا کی مہذب آبادی نے اسلام قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ شمالی ملایا کی ریاست قدح پوری کی پوری مسلمان ہو گئی اور سترہویں صدی میں یہیں سے سیام اور ہند چینی میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ یہاں کے مسلمان تمام جزائر شرق الہند سے زیادہ راسخ العقیدہ پابند صوم و صلوٰۃ اور تنظیم اسلامی کے عاشق ہیں۔ حج کرنے کا شوق خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ ہے اور ہمیشہ ان کی نہایت کثیر تعداد مکہ معظمہ جاتی ہے۔ آج کل یہاں انگریزی حکومت قائم ہے۔ اور یہیں کا ایک شہر سنگارپور اس بحری مستقر کے لیے منتخب کیا گیا ہے جس پر دنیا ایک دوسری فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہو رہی ہے۔

جاوا میں قدیم ہندو تہذیب بہت مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ اس لیے اسے مٹا کر اسلامی تہذیب پھیلانے میں اسلامی مبلغوں کو بہت کافی مدت تک کوششیں کرنی پڑیں۔ اس جزیرہ میں اشاعت اسلام کی ابتدا بارہویں صدی عیسوی کے اواخر سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے کامل تین سو برس کی کوششوں کے بعد یہاں کی سب سے بڑی ریاست ماجاپاہت کو حلقہ بگوش اسلام بنایا اور ۱۴۸۱ء میں وسط جاوا سے ہندو مذہب اس طرح رخصت ہو گیا کہ اب جزیرہ بالی کے سوا کہیں شیو (ہندوؤں کا دیوتا) کی پرستش نہیں ہوتی۔ مشرقی اور مغربی جاوا میں اشاعت اسلام کا زمانہ اس سے بھی زیادہ بعد کا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے پندرہویں صدی میں شیخ نورالدین ابراہیم کی کوششوں سے مشرقی علاقہ میں دین مبین کی اشاعت ہوئی اور سولہویں صدی میں پاجا جارن کی ریاست نے مغرب میں اسلام قبول کیا مگر باوجودیکہ سولہویں صدی تک جاوا نے اسلام قبول کر لیا تھا' ایک عرصہ تک قدیم ہندو عقائد لوگوں کی طبیعت پر غالب رہے۔ حتیٰ کہ ۱۷۶۸ء تک بعض علاقوں میں منو (ہندوؤں کا مسلمہ مقنن) کے قوانین پر عمل کیا جاتا رہا۔ لیکن اب جاوا کی آبادی تھوڑے استثناء کے ساتھ کلیتہ" شریعت حقہ کی پابند ہے۔ اور خصوصاً مغربی جاوا اسلامی علوم اور تہذیب کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جہلاء میں ہندوستانی عوام کی طرح اوہام پرستی کا

غلبہ ہے۔ ٹوٹکے ٹونے کو بہت مانتے ہیں مگر اسلام ان کی طبیعتوں میں اس طرح راسخ ہو گیا ہے کہ ڈچ پادری اپنی حکومت کی مدد سے مسیحیت کی تبلیغ میں دو اڑھائی سو برس سے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، لیکن ابھی تک ان کو کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ جاوا کے لوگ بھی حج کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ ۱۸۵۲ء تک ڈچ گورنمنٹ ان کے راستے میں سخت رکاوٹیں پیدا کرتی رہی مگر بعد میں اسے مجبوراً مسلمانوں کی خواہشات قبول کرنی پڑیں۔ اور اس وقت سے دس بارہ ہزار حاجی ہر سال مکہ معظمہ حاضر ہوتے ہیں۔

جزائر ملکا میں اشاعت اسلام کا فخر ایک جاوی مسلمان شیخ منصور کو حاصل ہے۔ جس نے پندرہویں صدی عیسوی میں یہاں کے راجہ کو مسلمان کیا اور اس کا نام جمال الدین رکھا۔ اس زمانہ میں ہسپانیہ کی بحری ترکتازیاں شروع ہو چکی تھیں اور ۱۵۲۱ء میں ہسپانی اور پرتگالی تاجروں نے ان جزائر پر قبضہ کر کے مسیحیت کی جبری اشاعت کرنی چاہی تھی مگر مسلمانوں نے موقع پاتے ہی ان کو نکال باہر کیا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام جزائر ملکا کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا۔ سترہویں صدی میں ہالینڈ ان تمام جزائر پر پھیل گیا اور قلیل مدت میں اس نے چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستوں کا ایک ایک کر کے خاتمہ کر دیا مگر باوجود اس کے اسلام کی اشاعت پر آج تک کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور ملکا میں جس طرح ہسپانی و پرتگالی پادریوں کو ناکامی نصیب ہوئی تھی اسی طرح ڈچ گورنمنٹ کے ماتحت بھی مسیحیت کو کوئی فروغ حاصل نہ ہو سکا۔

مسلمانوں نے سولہویں صدی کی ابتدا میں چند ساحلی ریاستوں کو مسلمان کر لیا۔ جس وقت ۱۵۲۱ء میں پہلی مرتبہ پرتگالی تاجروں نے یہاں قدم رکھا تھا تو اسلام نیا نیا پھیل رہا تھا۔ سترہویں صدی کے آغاز میں سکدانہ کی ریاست مسلمان ہوئی۔ اور اس کے بادشاہ سلطان محمد صفی الدین کی کوششوں سے تمام سواحل بورنیو پر اسلام کی حکومت قائم ہو گئی۔ سترہویں صدی کے اواخر میں یہاں یورپین قوموں نے اپنے اثرات پھیلانے شروع کر دیئے۔ اٹھارہویں صدی میں اسلامی ریاستوں کا خاتمہ شروع ہو گیا اور اب وہاں برطانیہ اور ہالینڈ کا قبضہ ہے مگر غیروں کا قبضہ بھی اشاعت اسلام کے لیے باعث برکت ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ اندرون جزیرہ کے وہ وحشی قبائل جو جہالت کے باعث اب تک اسلام کی برکتوں سے محروم تھے۔ اب تعلیم و تہذیب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس دین

مبین کو بھی قبول کرتے جا رہے ہیں۔

جزیرہ سیلبس نے سترہویں صدی کے اواخر میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر سے مسیحیت قبول کرلی تھی اور ۱۶۸۹ء میں خود وہاں کا راجہ عیسائی ہو گیا تھا۔ مگر آج سے تقریباً ۸۰ برس پہلے ۱۸۴۴ء میں راجہ (جیکولیس مانیول مانوپو) نے خود بخود اسلام قبول کر لیا اور اس وقت سے اتنی تیزی کے ساتھ دین مبین کی اشاعت شروع ہوئی کہ اب تک آدھے سے زیادہ باشندے مسلمان ہو چکے ہیں اور روز بروز مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

جزائر فلپائن میں تقریباً تین سو برس تک وثنیت اور عیسائیت کی کشمکش برپا رہی۔ جس وقت ۱۵۲۱ء میں پہلی مرتبہ ہسپانیوں نے وہاں قدم رکھا تو وہاں کے چند قبائل اسلام قبول کر چکے تھے اور عرب تاجر دین حق کی اشاعت و ترویج کے لیے زبردست کوششیں کر رہے تھے۔ ہسپانیوں نے ان کے مقابلہ میں تلوار کے زور سے مسیحیت کی تبلیغ شروع کی۔ اور تمام جزیرہ میں ان کے مشنری اپنی فوجوں کے ساتھ پھیل گئے مگر ان کے ظلم و ستم نے اہل جزیرہ پر بہت برا اثر کیا اور اس پر منڈاناؤ "جنوبی فلپائن" کی اسلامی ریاست میں ہر طرف مظلوم قبائل جمع ہو ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔ اس پر منڈاناؤ اور اسپین کے درمیان جنگ شروع ہو گئی اور ۱۸۹۰ء تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اسپین نے جزیرہ کو امریکہ کے حوالے کر دیا۔ اب تقریباً تیس پنتیس سال سے یہ جزیرہ امریکہ کے ماتحت ہے اور اس کی چوتھائی سے زیادہ آبادی اسلام قبول کر چکی ہے۔ امریکن حکومت نے مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا پورا پورا حق دیا ہے اور آج کل امریکہ کے دولتمند مسیحی مبلغ حیران ہیں کہ وہ کروڑوں روپیہ پر پانی پھیر کر بھی اپنے مذہب کی تبلیغ میں اتنی کامیابی حاصل نہیں کر سکے جتنی یہ مسلمان ایک پیسہ خرچ کئے بغیر حاصل کر رہے ہیں۔ جنگ عظیم سے قبل یہاں کے مسلمانوں نے امریکن گورنمنٹ کی اجازت سے اپنی دینی تنظیم کی بھی کوشش کی تھی۔ اور سلطان محمد رشاد مرحوم سے درخواست کی تھی کہ ان کے لیے ایک شیخ الاسلام مقرر فرمائیں۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں علامہ وجیہ الدین آفندی فلپائن کے شیخ الاسلام مقرر ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ اور تھوڑی مدت میں انہوں نے یہاں کی اسلامی زندگی کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا مگر افسوس کہ ایک طرف وہ فلپائن میں زیادہ نہ ٹھہر سکے اور دوسری طرف جنگ نے مسلمانوں کا نظم و نسق درہم برہم کر دیا۔

اس مختصر خاکہ سے قارئین کرام کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ گذشتہ چھ سو برس کے اندر اندر بغیر کسی سیاسی و جنگی قوت کے محض مسلمان تاجروں اور پر امن مبلغوں کی کوششوں سے تمام جزائر شرق الہند نے اسلام قبول کر لیا۔ آج ان مسلمانوں کی تعداد کم سے کم ۵ کروڑ ہے۔ جسے اگر تناسب آبادی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہاں اسلام کو ہندوستان سے بدرجہا زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ حالانکہ ہندوستان آٹھ سو برس تک اسلامی حکومت میں رہا۔ لیکن دوسری طرف یہ افسوس ناک منظر ہماری روح کو صدمہ بھی پہنچاتا ہے کہ جزائر ملایا میں اس سرے سے اس سرے تک آزاد اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے اسلام کی خدمات بھی انجام دیں اور سو ڈیڑھ سو برس تک زندہ بھی رہیں مگر آخر میں ان کے خلاف مغربی استعمار کا سیلاب ایسے زور کے ساتھ آیا کہ وہ ان سب کو بہا لے گیا اور اب پوری پانچ کروڑ اسلامی آبادی ہالینڈ، انگلستان، فرانس، امریکہ اور پرتگال کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان جزائر میں کوئی متحدہ اسلامی سلطنت قائم نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر جزیرہ کی الگ حکومت تھی جب مغربی سیلاب آیا تو کوئی متحدہ محاذ قائم نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایک ایک کر کے بہا لے گیا۔ اگر یہ خرابی نہ ہوتی اور شرق الہند میں کوئی متحدہ سلطنت قائم ہو جاتی تو بہت ممکن تھا کہ یورپ کو اس کے مٹانے میں اتنی آسانی سے کامیابی نصیب نہ ہوتی اور کم از کم اس کا ایک حصہ غلامی سے آزاد رہ جاتا۔

جزائر ملایا کے مسلمانوں میں ایک اور بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ابھی تک کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں کر سکے۔ آج بحرالکاہل کی سیاست، دنیا کے سیاسی مسائل میں مرکزیت حاصل کر رہی ہے اور اس کا مستقبل دنیا کے مستقبل کا سوال بن رہا ہے مگر اس سمندر کے قلب میں پانچ کروڑ کی عظیم الشان اسلامی آبادی ہونے کے باوجود اسے سیاست مشرق اقصیٰ میں کوئی وزن حاصل نہیں، نہ ان کی آواز کو اس میں کوئی دخل ہے نہ اس کی تشکیل میں ان کا کوئی اثر ہے نہ ان کے مستقبل کے مسئلہ پر کوئی توجہ کی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ مسلمانان شرق الہند کوئی متحدہ قومیت اور کوئی متحدہ آواز نہیں رکھتے۔ ان کی جمعیت کا شیرازہ منتشر ہے اور وہ ہزارہا برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اب ان میں اس کمزوری کا احساس پیدا ہو چلا ہے اور جاوا

وغیرہ جزائر میں کچھ بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں مگر ہم کو امید نہیں کہ آئندہ فیصلہ کن گھڑی آنے تک جس کا آنا اب یقینی ہو چکا ہے وہ کوئی خاص قوت بہم پہنچالیں گے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کے آجانے کے بعد ان میں حقیقی زندگی کے آثار پیدا ہوں اور جس طرح گذشتہ جنگ عظیم نے وسطی و مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کو جگا دیا ہے' اسی طرح آئندہ جنگ عظیم مسلمانان جزائر شرق الہند کو بھی بیدار کردے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

درد اور اس کا علاج

{ ۷ر رمضان المبارک ۱۳۴۳ ہجری المقدس }

یہ طویل تبصرہ جو ہم نے گذشتہ گیارہ بارہ ابواب میں دنیائے اسلام کی گذشتہ و موجودہ حالت پر کیا ہے۔ محض ایک تاریخی و سیاسی داستان نہیں ہے۔ جس کو بیان کرنے اور سن لینے کے بعد ہمارے دماغ کو اپنا کام ختم کر دینا چاہیے۔ بلکہ دراصل وہ اپنے اندر ایک عمیق درس عبرت رکھتا ہے۔ جس پر ہمیں سوچنے اور بار بار سوچنے کی ضرورت ہے۔ آج دنیائے اسلام کی جو حالت ہے اور کل جو کچھ تھی اس کا ایک اجمالی علم ہم کو حاصل ہو چکا ہے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ مسلم نام ایک قوم حجاز کے ایک بے آب و گیاہ ریگستان سے نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے گوشہ گوشہ پر چھا گئی۔ معمورہ ارضی کے کونہ کونہ کو چھان مارا اور بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکا دیئے۔ یورپ' ایشیا اور افریقہ کے ہر حصہ میں آسمانی صداقت کا نور پھیلا دیا اور عقائد باطلہ و اوہام کاذبہ کی بنیادیں متزلزل کر دیں مگر ایک وقت آیا کہ دفعتہ" اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ دل میں سردی اور دماغ میں جمود اور ہاتھوں میں سستی آگئی۔ زندگی کے ہر میدان میں اس کو پسپا ہونا پڑا۔ ترقی کی ہر دوڑ میں وہ پیچھے رہ گئی۔ دنیا کی دوسری قوموں نے علم و دلت' حکومت' صنعت و تجارت غرض ہر میدان میں اسے شکست دیدی اور آج اس کا یہ حال نظر آتا ہے کہ یہ قوم مراکش سے لے کر اقصائے مشرق تک ہر جگہ مظلوم و محکوم اور ذلیل و خوار ہے۔

جس وقت اپنے اس شاندار ماضی کے مقابلہ میں ہم اپنا جدید الم انگیز حال دیکھتے ہیں تو ہمارا دل خون ہو جاتا ہے اور بے اختیار منہ سے ایک آہ نکل جاتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ بے وجہ تو نہیں ہے۔ ہم کو سوچنا چاہیے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ہم کو دنیا کا حکمران بنا دیا تھا؟ گزشتہ ایک صدی میں عالم اسلامی کے بڑے بڑے ارباب فکر و رائے اور داعیان اصلاح و ترقی نے اسی سوال کے حل کرنے میں اپنی تمام قوتیں صرف کی ہیں۔

دور آخر میں احیائے امت کی جتنی تحریکیں مختلف بلاد اسلامیہ میں جاری ہوئی۔

ہیں۔ ان کا مبداء و منبع بھی یہی ایک سوال ہے جس کو ہر صاحب عقل و تدبیر نے اپنی روشنی فکر کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج کی صحبت میں ہم چاہتے ہیں کہ اپنی مختلف تحریکات اصلاح پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں اور اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دیں کہ اس باب میں ہمارا مسلک کیا ہے۔

جہاں تک فروعی و جزئی تفصیلات کا تعلق ہے عالم اسلامی کی ہر تحریک دوسری سے کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتی ہے۔ جو خالص مقامی مصالح، خارجی و بیرونی اثرات، عقل و فہم کے تفاوت اور فکر و رائے کے تباین کے لحاظ سے ایک ناگزیر چیز ہے۔ لیکن اگر ان فروعی ملحوظات سے قطع نظر کر لیا جائے تو مبادی و اصول کے لحاظ سے تمام اصلاحی تحریکات کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں۔ ایک وہ جو یورپ کے اقدامات، اس کی علمی و حکمی ترقیات اور اس کے تمدن و تہذیب کی چمک و دمک سے مرعوب ہو کر پیدا ہوئی ہیں اور دوسری وہ جو کتاب و سنت کی روشنی اور سلف صالحین کی پاک زندگیوں کے مطالعہ سے ماخوذ ہیں۔ پہلی قسم کی تحریکات میں اصلاح کی بنیاد مغربی اصولوں پر رکھی گئی ہے اور ان کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان خواہ صحیح اسلامی نقطہ نظر سے مسلمان رہیں لیکن ساتھ ساتھ انہیں ترقی یافتہ و تعلیم یافتہ قوم بن جانا چاہیے۔ ان تجربات کو ہم "اصلاح افرنجی" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ منہاج فرنگیت پر چلائی گئی ہیں۔ دوسری قسم کی تحریکات خالصتہ” قرآن و حدیث کی تعلیمات اور صلحائے امت کے اسوہ حسنہ پر مبنی ہیں اور ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنی ترقی کے لیے غیر اسلامی طریقے اختیار کریں گے تو وہ ترقی تو بے شک کر جائیں گے، مگر اسلام کے کام کے نہ رہیں گے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو مسلمان رکھ کر بام ترقی پر لے جانا چاہتی ہیں اور صحیح معنوں میں اسی کو وہ اصلی ترقی سمجھتی ہیں۔ اس طریق اصلاح کو بجا طور پر "اصلاح دینی" کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ مصباح شریعت سے کسب ضیاء کرتی ہیں۔

اصلاحِ افرنجی کے رونما ہونے کا زمانہ مختلف اسلامی ممالک میں مختلف ہے۔ مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریق اصلاح ہر جگہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جب یورپ نے بالواسطہ یا بلا واسطہ ان پر کامل تسلط حاصل کر لیا اور ان کے دلوں میں مغربی اسلحہ کی ہیبت اور مغربی علوم و صنائع کی عظمت بیٹھ گئی ہے۔ مثال کے طور پر آپ

دیکھیں گے کہ ترکی میں اس تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جب آسٹریا اور روس نے مل کر اس کے جوڑ بند سب ڈھیلے کر دیئے تھے۔ نپولین کی فاتحانہ پیش قدمیوں نے تمام دنیا کو اور خصوصاً ان ترکوں کو جو اپنے سے زیادہ بہادر کسی کو نہیں سمجھتے تھے، مبہوت کر دیا تھا۔ مصر میں یہ تحریک اس وقت پیدا ہوئی جب نپولین نے اچانک اس پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کی مٹھی بھر فوج کے سامنے ممالیک کی پوری قوت بے دست وپا ہو کر رہ گئی تھی۔ ترکستان میں اس تحریک نے اس وقت جنم لیا جبکہ روس ایک ایک کر کے تمام تاتارستان و ترکستان پر چھا گیا تھا اور اس کی مہیب قوت نے ہمارے وسط ایشیا کو مرعوب کر لیا تھا۔ ہندوستان میں یہ تحریک اس وقت شروع ہوئی جب ۱۹۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی نے اسلامی ہند کا آخری چراغ بھی گل کر دیا تھا اور ہندوستان پر انگریزی نفوذ و اقتدار کی بنیادیں خوب مستحکم ہو چکی تھیں۔ پس لازمی طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ طریق اصلاح ہماری مفتوحیت کی یادگار، ہماری محکومی کی نمایاں تر نشانی، ہماری غلامی کی روشن تر علامت اور مغرب کی ہم پر سب سے بڑی فتح ہے۔

اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم کو محض تلوار سے فتح کر لے اور اپنی تہذیب سے مسخر نہ کر سکے تو اس کی فتح کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کا قبضہ محض عالم مادی پر ہوتا ہے اور اس کے نقوش بڑی آسانی سے محو ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس کی تہذیب کو بھی شکست دے کر اپنی تہذیب رائج کر دے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کا قبضہ اجسام سے گزر کر دلوں پر بھی قائم ہو گیا ہے اور اسے مکمل فتح حاصل ہوئی ہے۔ کہ اگر اس کی حکومت مٹ بھی جائے تو جب تک اس کی تہذیب کا اثر باقی رہیگا۔ اس کی حاکمانہ فتح کا داغ محکوم قوم کی پیشانی پر برابر چمکتا رہے گا پس اصلاح افرنجی درحقیقت ہماری تہذیب کی شکست اور مغربی تہذیب کی فتح ہے اور ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ ہماری غلامی کی بدترین پیداوار ہے۔

اصلاح افرنجی کی مختلف قسمیں ہیں جن میں سے بعض تھوڑے نقائص کے ساتھ مفید و کار آمد بھی ہیں۔ مثلاً تعلیمی اصلاح کہ اگر اس کا مقصد محض علوم و فنون جدیدہ کی ترویج اور مسلمانوں میں علمی و حکمی تحقیقات کا ذوق پیدا کرنا ہو تو اس کے مفید ہونے سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح سیاسی اصلاح اگر وہ مغرب کی جھوٹی وطنیت یا

نیشنلزم سے آلودہ نہ ہو اور اس کا مدعا محض چند اصولوں پر امور مملکت کی تنظیم ہو تو بلاشبہ وہ ایک قابل تعریف اور ضروری چیز ہے۔ یہی حال اقتصادی اصلاح کا ہے کہ اگر وہ صریح اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہو اور اسے جواز ربا" "سود" جیسی چیزوں تک وسیع نہ کردیا جائے تو اس کو بھی قبول کرنے میں کوئی عقلمند آدمی تامل نہیں کرسکتا مگر ان سب تحریکوں میں سب سے زیادہ افسوسناک اور قابل ملامت اصلاح مذہبی کی تحریک ہے جو مسلمانوں کی متاع دنیا ہی کو نہیں بلکہ متاع آخرت کو بھی برباد کررہی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مصیبت مسلمانوں کے لئے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس تحریک کے دعاۃ و محرکین اپنے آپ کو روشن خیال، وسیع النظر، کشادہ دل اور صاحب الاجتہاد کے شاندار ناموں سے موسوم کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ مذہب اسلام کو کھوٹ اور آمیزش سے پاک کرکے ترقی و عروج سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں یہ دعوی بظاہر عقل کو اپیل کرنے لگتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ نادانی و کج فہمی کے جنون میں ہماری تہذیب معاشرت کے ساتھ ہمارے مذہب کو بھی مغرب کے آگے سرجھکانے پر مجبور کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام بھی عرب کا نہیں بلکہ یورپ کا اسلام ہوجائے۔ وہ اپنے زعم باطل میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اسلامی احکام و عقائد کو عقل و فلسفہ کے قالب میں ڈھال کر اسلام کی بنیادیں مضبوط کرتے ہیں مگر درحقیقت ان کا یہ تیشہ تفلسف ارکان شریعت کو منہدم کر رہا ہے۔ ان نادانوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ خدا کے اٹل قوانین کو انسان کی روز بروز بدلنے والی عقل کا تابع کرکے وہ کوئی بڑا کام انجام نہیں دے رہے ہیں۔

اب ایک نظر اصلاح دین کی تحریکات پر بھی ڈالئے۔ اصلاح دین کا مسئلہ کوئی حدیث العہد مسئلہ نہیں ہے بلکہ جب سے دین برحق میں بدعات و خرافات اور اسرائیلیات و یونانیات کی آمیزش شروع ہوئی ہے۔ اس وقت سے ہی یہ مسئلہ حکمائے امت کے پیش نظر رہا ہے اور ہر زمانہ میں انہوں نے اصلاحی تحریکات جاری کی ہیں مگر آج وہ جتنا اہم ہے اتنا کبھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اس وقت تین تین مصیبتوں میں گرفتار ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مستقل بلا ہے۔ ایک طرف وہ عقائد باطلہ اور بدعات سیئہ ہیں جو اموی و عباسی عہد اور تفلسف کی یادگار چلے آتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مذہبی و تمدنی خرابیاں ہیں جو جہالت، افلاس محکومی اور تنزل کے

لوازم میں سے ہیں اور تیسری طرف زندقہ و الحاد کے وہ زہریلے جراثیم ہیں جو مغربی تعلیمات اور فرنگی تقلیدات سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

ان تین تین بلاؤں کے بدترین نتائج گزشتہ صدی میں اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ ایک طرف افرنجی اصلاح کی تحریکات نے دنیائے اسلام کے ہر حصہ میں مذہبیت کی بنیادیں کھوکھلی کردی تھیں اور دوسری طرف مذہبی تنگ نظری اور جاہلانہ ذہنیت نے مسلمانوں کے لئے ترقی کا راستہ اور صحیح اصلاحات کا دروازہ قطعاً بند کردیا تھا۔ اس مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں اصلاح دینی کی تحریکات کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوستان ، مصر، ترکستان، عرب، افریقہ وغیرہ ممالک اسلامیہ میں متعدد ارباب اصلاح کا علم لے کر کھڑے ہوئے۔ ہرایک نے اپنی اپنی عقل کی روشنی میں مسلمانوں کی بیماری کی تشخیص کی اور اس کے علاج کی تدبیریں اختیار کیں، کسی نے مذہب سے ناواقفیت کو تنزل کا سبب ٹھہرایا اور علوم دینی کی ترویج کے لئے کوششیں کیں۔ کسی نے مدارس اسلامیہ کے نقائص کو تمام خرابیوں کا منبع قرار دیا اور اصلاح تعلیم کی سعی کی، کسی نے اسلامی برادری کے موجودہ تفرق کو ان کے سیاسی انحطاط کی وجہ بتلایا اور امت اسلامیہ کے درمیان رابطہ اخوت دینی کو استوار کرنے کے لئے اپنی قوتیں صرف کردیں۔ کوئی عقائد و اعمال کی بدعتوں کی جانب متوجہ ہوا اور ایک عام دینی اصلاح کے لئے سرگرم عمل ہوگیا۔ مگرافسوس کہ ان میں سے کسی تحریک کو بھی مستقل اورپائیدار کامیابی نہیں ہوئی اور نہ کسی سے امت مرحومہ کے اصلی روگ کا علاج ہوسکا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ نظرغور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بعض تحریکیں عمل سے خالی اور محض زبان و قلم تک موقوف تھیں۔ اس لئے طبعاً ان کو آنکھوں اور کانوں سے گزر کر قلوب و ارواح تک پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ بعض تحریکوں میں تطرف اور افراط پسندی کا غلبہ تھا۔ اس لئے وہ درد کا اصلی علاج ثابت نہ ہوسکیں اور بعض میں زمانہ اور وقت کی ضروریات کو نظرانداز کرکے صدیوں پرانے حالات کے مطابق کام کیاگیا۔ اس لئے وہ ہماری پسماندگی و تنزل کیلئے کارگر دوا نہ ثابت ہوئیں۔

پس اب سوال یہ ہے کہ امت مسلم کے موجودہ روگ کا اصلی علاج کیا ہے؟ اس کا جواب بالکل صاف ہے۔ کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے

وہ اصلاح دینی ہے اور یہی مسلمانوں کے درد کا اصلی علاج ہے۔ مگر ہمارے خیال میں کسی ایک جزئی و فرعی خرابی کے دور کردینے کا نام دینی اصلاح نہیں ہو سکتا' بلکہ اسے ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونا چاہیے۔ ہمیں جس طرح تعلیم کی ضرورت ہے اسی طرح اصلاح تمدن کی بھی ضرورت ہے۔ جس طرح علوم دینیہ کی ترویج لازمی ہے۔ اسی طرح علوم عصریہ کی تحصیل بھی لابدی ہے۔ جس طرح فرنگی عقائد اور مغربی مفاسد کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے اسی طرح بدعات و مزخرفات اور خلاف شرح مذہبیت کا مقابلہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں میں سے نہ تو ہم کسی ایک چیز کو چھوڑ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ محض کسی ایک پر انحصار کرکے حصول مدعا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ پس اب مسلمانوں کی بیماری کا واحد علاج یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن حکیم کی تعلیمات کے نام پر جت جائیں اور ہر اس چیز کو رد کر دیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے خلاف ہو مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ خود عوام ہی اس کو انجام دے سکیں اور نہ یہ اشخاص و افراد کے بس کی بات ہے۔ یہ صرف علماء امت اور اہل علم کا ہے اور اب ضرورت ہے کہ تمام علمائے امت اپنے اس فرض کو محسوس کریں اور ارشاد و ہدایت دینی کے اس منصب کو دوبارہ سنبھالنے کے لئے مستعد ہو جائیں جسے انہوں نے خود ہی عرصہ سے چھوڑ رکھا ہے۔

* مولانا عبدالباری صاحب کا انتقال

ابھی ابھی ہمیں ایک تار سے یہ معلوم کر کے سخت رنج ہوا کہ مولانا عبدالباری صاحب پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور ۲۰ر جنوری ۱۹۲۵ء کی رات کو آپ کا انتقال ہوگیا۔ ہندوستان کے علماء میں جناب مولانا کو جو درجہ حاصل تھا اور وہ علمائے ہند کے جس مقدس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس کے اعتبار سے ہر مسلمان یہ افسوسناک خبر سن کر یقیناً سخت غم زدہ ہو گا۔ خصوصیت کے ساتھ جمعیت العلماء کے لئے تو مولانا کی یہ دائمی جدائی اتنی ہی شدید مصیبت ہے جتنی خود فرنگی محل کے لئے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آپ ایک ممتاز عالم ہونے کے علاوہ ان مقدس ہستیوں میں سے تھے جنکی کوششوں سے جمعیت العلماء عالم

وجود میں آئی تھی اور جنھوں نے ہمیشہ اس کے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ ہم اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کے خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

تپش مرحوم

{ ۲۲ر جنوری ۱۹۲۵ء }

تمام ہندوستان میں اس خبر کو نہایت افسوس کے ساتھ سنا جائے گا کہ ۲۰ر مارچ کو مولوی عبداللہ خان تپش خورجوی نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر سفر آخرت اختیار کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ مرحوم کے خلوص و اتقاء سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں جنھیں کبھی ان کے ساتھ رہنے یا ان کی اسلامی خدمات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا شمار حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے خاص مریدوں میں تھا اور مولانا اکثر ان کے مکان پر خورجہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ موصوف کی تمام عمر مشاغل علمیہ اور قومی و ملی خدمات کو انجام دینے میں گزری۔ قومی شعراء کی فہرست میں تپش کا نام ہمیشہ نمایاں حروف سے لکھا جائے گا۔ افسوس کہ ملک و قوم زیادہ عرصہ تک ان کی علمیت اور قومی سرگرمیوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ابھی ان کی عمر ۴۵‘ ۵۰ کے درمیان ہی ہوگی کہ ہم سے جدا ہو گئے۔ خدا کے برگزیدہ بندے جو اس گمراہی کے زمانہ میں اسلام کی تعلیم کا صحیح نمونہ پیش کریں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں اور جو پیدا ہوتے بھی ہیں ان کو کچھ زیادہ دن جینا نصیب نہیں ہوتا۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

سیام کے مسلمانوں پر مظالم

{ ۲ر فروری ۱۹۲۵ء }

ہمعصر سلطان کلکتہ میں یہ جگر خراش اور زہرہ گداز خبر شائع ہوئی ہے کہ سیام کے آسمان کے نیچے جہاں بدھ مذہب کے معتقدین کا سکہ چلتا ہے۔ خدائے واحد کے پرستاروں اور رسول عربی ﷺ کا نام لینے والوں پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ کی جا رہی

ہے۔ ہمارا ہمعصر رقمطراز ہے کہ سیام کے مسلمان طرح طرح کے مظالم کا شکار بنائے جا رہے ہیں۔ حکومت کے انسانیت سوز ظلم و ستم سے نہ تو سیام کے مسلمان بوڑھے محفوظ ہیں نہ جوان اور بچے مامون و مصئون۔ مرد' عورتیں' جوان' بوڑھے اور بچے سب کے سب حکومت سیام کی سفاکانہ حرکات کا نشانہ بن رہے ہیں۔ انہیں خلاف اسلام احکام کی متابعت اور شریعت غرائے مصطفوی سے انحراف کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔ انہیں دائرہ اسلام سے باہر نکل جانے اور مخالف اسلام مذہب قبول کرنے سے انکار کرنے پر طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ صعوبتوں اور مصیبتوں کا ہدف بنایا جا رہا ہے غرضیکہ سیام کے مسلمانوں پر غم والم کے مصائب و محن کا کوہ گراں پھٹ پڑا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعات کہاں تک درست ہیں کیونکہ ہمعصر "سلطان" کے پیش کردہ اعداد و شمار کے سوا ابھی تک مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ!

تانہ باشد چیز کے مردم نہ گویند چیزہا

ممکن ہے کہ یہ واقعہ من و عن درست نہ ہو لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں اصلیت کو ذرہ برابر دخل نہیں۔ فرض کیجئے کہ بیان کردہ مظالم کا عشر عشیر بھی درست ہے اور پانچ چار لاکھ نہیں۔ دس بارہ سو مسلمانوں پر' کلمہ توحید پڑھنے والوں پر' خدائے قدوس کے پرستاروں پر ظلم ڈھایا گیا ہے۔ تو کونسا قلب ہو گا جو ساکت و ساکن رہ سکے گا۔ کون سا مسلمان دل ہو گا جو اضطراب و ہیجان سے سیماب وش مضطرب اور بے چین نہ ہو جائے گا اور کون سی آنکھ خون کے آنسو نہ روئے گی۔

ہم اپنے فریضہ سے غافل ہو کر دنیاوی امور میں منہمک ہو چکے تھے۔ ہم سمجھنے لگے تھے کہ ہم نے مغرب کی تقلید سے اپنے لئے کامیابی و کامرانی کے دروازے کھول لئے ہیں۔ ہم حقیقی آزادی سے بے زار اور مغربی آزادی و حریت کے دلدادہ ہو کر اسی کلید کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جس نے مغرب میں فواحش و معاصی کو انسان کے دل میں مقفل کر دیا ہے۔ ہم خدائے لایزال کے قانون سے روگرداں اور سرکش ہو کر فانی قوانین اور متغیر احکام کی غلامی پر ناز کرنے لگے تھے لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ ہماری سہل انگاریوں اور غفلت شعاریوں کے تلخ ترین ثمرات سے نسل انسانی کو تلخ کام بنائے۔ اس

نے ہمیں عین اس وقت جب کہ ہم اپنی کامیابی کے نشہ میں سرشار و مست پھر رہے تھے۔ ہمیں جھنجھوڑا۔ ہمیں بیدار کیا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ترکی اور دیگر بلاد اسلامیہ میں شامل کردیا جو مذہب اسلام سے بعد اور فریضہ تبلیغ سے غفلت کا بدیہی اور لابدی نتیجہ ہے۔

حکومت سیام کی انسانیت سوز حرکات اور سفیہانہ مظالم نے مسلمانوں کے دل ہلا دیئے ہیں لیکن ہم انہیں کہیں گے کہ صبر و تحمل سے کام لیجئے۔ ہیجان و اضطراب میں جن تحریکات کا آغاز ہوتا ہے وہ چنداں دیرپا اور مستقل ثابت نہیں ہوا کرتی ہیں۔ ہم تجربہ کرچکے ہیں اور بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ اب ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

ہمیں احساس ہے کہ علمائے کرام کی غفلت سے یہ تمام خرابیاں رونما ہو رہی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ان تمام مفاسد کا ازالہ بھی ان ہی بزرگوں کے ہاتھوں عمل میں آئے گا۔

ہم مختلف اسلامی جماعتوں سے استدعا کرتے ہیں کہ ان کے نمائندے جمع ہو کر فیصلہ کریں کہ حکومت سیام کے بیان کردہ مظالم کی تحقیقات کے لئے کیا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ مختلف جماعتوں کے نمائندوں کا ایک وفد سیام بھیجا جائے جو وہاں کے مسلمانوں کے حالات مرتب کرے اور حقیقی واقعات سے مسلمانان ہندوستان کو آگاہ کرے۔ جمعیۃ علمائے ہند مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ انشاء اللہ مختلف اسلامی جماعتوں کے نمائندوں کی خدمت میں بہت جلد وہ معلومات جو اس حادثہ جان گداز کے متعلق موصول ہوں گی پیش کردے گی۔

خدا کرے کہ یہ طامۃ کبریٰ مسلمانوں کو باہم ملا دے اور وہ ایک مستحکم اور صحیح نظام کے ماتحت فریضہ تبلیغ کی ادائیگی کے لئے مستعد اور کمربستہ ہوجائیں۔

✱ وسط ایشیا کا بھوت اور رہنمایان ہنود

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ بعض رہنمایان ہنود ابھی تک وسط ایشیا کے بھوت اور افغانستان کے ہوے سے ڈرتے رہتے ہیں۔ مسلمان رہنماؤں نے متعدد بار یقین دلایا کہ

اسلامی ممالک کے فرمانرواؤں نے اعلانات شائع کئے۔ اسلامی جرائد نے مضامین لکھے۔ لالہ لاجپت رائے بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے لئے بھی تشریف لے گئے لیکن ابھی تک بعض رہنمایان ہنود کے دماغوں پر حملے کا خوف و خطر مسلط ہے۔

واقعات و حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد ہندوؤں کے بعض رہنماؤں کا افغانستان اور وسط ایشیا کے ہوے سے ڈرنا بہت تاسف انگیز امر ہے اور اگر وہ محض ہندوؤں کو بیدار کرنے اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں شکوہ اور شان پیدا کرنے کے لئے اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو یقیناً بہت ہی زیادہ قابل افسوس ہے۔

ہم ان رہنماؤں کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے جائز حقوق تسلیم کر لئے جائیں اور ارکان اسلام کی ادائیگی میں کسی وقت کسی قسم کی مداخلت عمل میں نہ آئے تو انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ کسی اسلامی سلطنت کے دماغ میں ہندوستان پر حملہ کرنے کا وہم تک نہ سما سکے گا۔ کاش یہ حضرات توہمات اور فضول خیالات کو اپنے دماغ سے نکال کر ملک اور اہل ملک کی حقیقی خدمت کے لئے کمربستہ ہوجائیں اور مختلف ملل کے جائز حقوق تسلیم کر کے کسی کو شکایت کرنے کا موقعہ نہ دیں۔

خود زندہ رہو اور زندہ رہنے کا حق دو

اس مشہور کلیہ کو افغانی ریاست کا بنیادی اصول قرار دیکر ان کے تمام خطرات و توہمات کا ازالہ کردیا گیا ہے۔ ہم شکوک اور اوہام کے مریضوں کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ موصوف کے اس مضمون کو غور سے پڑھیں اور اس کی کی روشنی میں اپنے مزعومات باطلہ پر نظرثانی کریں۔

★ ایک شدید غلط بیانی

اشاعت حاضرہ میں ہم نے کسی دوسری جگہ ایک مراسلہ کا ترجمہ درج کیا ہے۔ جو مصر کے اخبار "الشوری" کو بمبئی کے کسی صاحب نے بھیجا ہے۔ اس میں جہاں تک نامہ نگار صاحب نے اپنی ذاتی رائے لکھی ہے ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ کیونکہ ہر شخص اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق رکھتا ہے مگر جہاں انہوں نے وفد حجاز کے متعلق ایک شدید

غلط بیانی کی ہے' اس کی تردید ہمارے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ انہوں نے وفد حجاز پر بیک وقت تین الزام لگائے ہیں۔ ایک یہ کہ وفد باخبر اور معتمد علیہ شخصیتوں پر مشتمل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے مجلس مرکزیہ خلافت نے منتخب نہیں کیا اور تیسرے یہ کہ وہ حکومت ہند کا بھیجا ہوا ہے' حالانکہ سب سے پہلی بات جس سے دانستہ اغماض کیا گیا ہے' یہ ہے کہ اس وفد میں صرف وہی لوگ منتخب نہیں کیے گئے تھے جن سے وہ بحالت موجودہ مرکب ہے۔ بلکہ اس میں چند ممتاز شخصیتیں ہی تھیں۔ جن میں حضرت مولانا کفائت اللہ صاحب صدر جمعیت علمائے ہند بھی شامل تھے لیکن وفد کی روانگی کا انتظام کچھ ایسی جلدی میں کیا گیا کہ حضرت مولانا شریک نہ ہو سکے اور صرف تین ارکان ہی بھیج دیئے گئے تاہم موجودہ وفد جن ارکان سے مرکب ہے وہ مجلس خلافت کی جماعت منتظمہ کے رکن ہیں۔ مسلمانان ہند کے سیاسی و علمی حلقوں میں اچھی طرح مشہور ہیں اور مسلمانان ہند ان پر کافی اعتبار و اعتماد رکھتے ہیں۔

رہا باخبری اور سیاست دانی کا سوال' تو یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ارکان وفد مسلمانان ہند کے نہایت صائب الرائے لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور اسی لیے انہیں مجالس قومی میں ذمہ دار پوزیشن حاصل ہے۔ رئیس وفد ہندوستان کے مشہور اہل قلم اور علامہ شبلی نعمانی کے جانشین ہیں۔ مولوی عبدالماجد صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب اپنے اپنے صوبہ کی مجالس خلافت کے صدر مرکزی جمعیتہ خلافت اور جمعیت العلماء ہند کی مجالس منتظمہ و عاملہ کے ارکان کی حیثیت سے بہترین قومی' ملکی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

دوسرا الزام بھی قطعاً بے بنیاد ہے۔ کیونکہ مجلس مرکزیہ خلافت کی جانب سے یہ وفد بھیجا گیا ہے۔

تیسرے الزام میں نامہ نگار نے تلبیس حق بالباطل کی صریح کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ مرکزی خلافت بمبئی نے جب اول اول ممالک اسلامیہ میں وفود بھیجنے کا ارداہ کیا اور انگورہ کے لیے ایک وفد مرتب کر کے حکومت سے پاسپورٹ کی درخواست کی تو اس کی جانب سے چند قیود عائد کر دی گئیں۔ جن کی بنا پر مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ ہمارے ملک سے باہر جانے سے معذور ہو گئے۔ اس لیے جب

دوسرا وفد حجاز کے لیے منتخب کیا جانے لگا تو اس میں ان قیود کو مدنظر رکھ کر صرف ایسے ہی لوگوں کو منتخب کیا گیا جن پر حکومت اپنی پیش کردہ شرائط کے مطابق اعتراض نہیں کرسکتی تھی۔ اسی سادہ سی بات کو اس طرح الجھا کر پیش کرنا کہ حکومت کو ایک فہرست بھیجی گئی تھی جس میں اس نے اپنی پسند کے موافق لوگ منتخب کرلیے۔ نامہ نگار مذکور کی کھلی بددیانتی ہے۔

ہماری رائے میں مرکزی مجلس خلافت کو اس طرف جلد توجہ کرنی چاہیے اور تمام عربی اخبارات کے نام تار دے دینے چاہییں کہ نامہ نگار ”الشوریٰ“ کا بیان بالکل غلط ہے۔ ورنہ عربی ممالک میں عام غلط فہمی پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ معزز ہم عصر الشوریٰ سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کی تردید کردے۔ جمعیت علماء کی جانب سے جریدہ مذکورہ کو براہ راست اس بیان کی تردید بھیج دی گئی ہے۔

دیباچہ ملوکیت

{ ۶ر فروری ۱۹۲۵ء }

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ سلطان ابن سعود کے اس ابلاغ عام کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۲۲ر جمادی الثانی کو اپنے اعلان ملوکیت سے صرف ایک دن پہلے شائع کیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ سلطان نے حضرت صدر جمعیت العلماء ہند کے جواب میں اپنے اعلان ملوکیت کے جو دو اسباب ظاہر کئے تھے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا سبب بھی تھا اور اگر ہم نے اس ابلاغ عام کا مطلب سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے تو اس تیسری وجہ کو بجا طور پر سبب الاسباب قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سلطان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں کہ:۔

> ”اہل حجاز نے وفود کی شکل میں اور انفرادی طور پر مجھ سے اس امر کا مطالبہ کیا کہ میں ان کو اپنے مستقبل کی تعیین میں وہ آزادی عطا کردوں جس کا میں ان سے وعدہ کرچکا ہوں۔ چنانچہ ان کے پیہم مطالبات کے بعد میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کو موعودہ آزادی عطا کردوں“۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ سلطان کے اعلان ملوکیت کی وجہ اہل حجاز

کا متفقہ مطالبہ تھا لیکن اس "متفقہ مطالبہ" کو منظور کر لینے کی وجہ یہ تھی کہ عالم اسلامی نے حجاز جیسے اہم مسئلہ میں بے رخی برتی اور سلطان کے ۱۰ر ربیع الثانی والے دعوت نامہ پر لبیک کہنے میں سستی کی۔ پس زیادہ صحیح یہ ہے کہ سلطان کے اعلان بادشاہی کی اصلی وجہ عالم اسلامی کی یہ "بے رخی" ہی ہے۔

اگر اس اعلان کی یہ تعبیر تسلیم کر لی جائے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ بنیادی وجہ اتنی قوی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر سلطان اپنے پچھلے وعدوں سے بری الذمہ ہو سکتے ہوں۔ اب تک انہوں نے عالم اسلامی کو جتنے دعوت نامے بھیجے تھے وہ ایسے وقت میں تھے جب حجاز میں حالت جنگ قائم تھی اور خواہ سلطان کی حیثیت اس میں فریق غالب ہی کی کیوں نہ ہو مگر اصولاً دنیا کے سامنے حجاز کے مستقبل کا سوال اس وقت تک پیش نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک جنگ خاص نتیجہ پر پہنچ کر ختم نہ ہو جاتی۔ اس لحاظ سے سلطان کا فرض یہ تھا کہ وہ جدہ میں داخل ہونے کے بعد اسلامی حکومتوں کو دعوت دیتے، یا کم از کم وفد خلافت کو جو وہاں محض انعقاد موتمر کی کوشش کرنے کے لیے مقیم تھا، یہ موقع عطا کرتے کہ وہ دول اسلامیہ سے ان کے پچھلے دعوت نامہ کا جواب حاصل کرتا۔ جنگ کے دوران جمعیت خلافت یا جمعیت العلماء کے لیے تو سلطان سے اس باب میں گفت شنید کرنا ممکن نہ تھا مگر دول اسلامیہ سے یہ توقع قائم کرنا کہ وہ فریقین جنگ میں سے کسی ایک کی ایسی دعوت کو قبول کر لے گی بین الدولی اخلاق و آئین سے افسوس ناک تغافل کا ہم معنی ہے۔

اس ابلاغ عام میں ان حضرات کے لیے بھی ایک صاف اور صریح جواب موجود ہے جو کہتے ہیں کہ سلطان نے کبھی عالم اسلامی کو حجاز کی آئندہ حکومت کے فیصلہ کا اختیار دینے کا وعدہ ہی نہیں کیا تھا۔ اگر وہ اس اعلان کو ملاحظہ کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ سلطان آخر وقت تک اپنے اس غیر متزلزل عزم پر قائم تھے کہ مستقبل حجاز کے متعلق عالم اسلامی کے حکم کو تسلیم کریں گے۔

* موپلوں کی جلاوطنی

جزیرہ انڈمان کی تحقیقات کے لیے حکومت مدراس نے جو وفد روانہ کیا تھا۔ اس

کے ایک رکن مسٹر عباس علی خاں ممبر مجلس واضع قوانین صوبہ مدراس بھی تھے۔ وفد مذکور نے انڈمان جاکر جو کچھ تحقیقات کی ہیں۔ وہ موصوف کے اس بیان کے مطابق ہیں۔ اس سے قبل ایک دوسرے ممبر مسٹر شفیع محمد صاحب نے جو بیان شائع کرایا تھا اس کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسے محب وطن کا بیان ہے جو حکومت کی موافقت کر ہی نہیں سکتے مگر مسٹر عباس علی خاں کے بیان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ حکومت کے خاص آدمیوں میں سے ہیں۔ ان کے بیان سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ انڈمان میں حبس دوام کے قیدیوں کو رکھ کر پینتیس لاکھ روپے سالانہ ہندوستانی ٹیکس دہندوں کا بالکل بے کار صرف کیا جا رہا ہے حالانکہ اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ یہ قیدی یہاں نہ رکھے جائیں۔ انہوں نے حکومت کے اس دعویٰ کو کہ خود موپلے اپنی رضامندی سے انڈمان میں آباد ہوئے ہیں‘ باطل ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ صاف کہتے ہیں کہ!

> ”موپلے یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتے اور وہ اپنے وطن کی پہاڑیوں اور وادیوں کے لیے بے قرار ہیں“۔

جزیرہ میں مچھروں کی اس قدر کثرت ہے کہ خاں صاحب کو یہ خوف تھا کہ ”کہیں مجھے مچھر اٹھا کر نہ لے جائیں“ اور وہ خود بھی اس قلیل عرصہ میں ملیریا کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ خاں صاحب نے جزیرہ کی اخلاقی حالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> ”قیدی اور آزاد دونوں کی اخلاقی حالت یہاں بے حد خراب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عورتیں کم ہیں اور ہر دس مرد کے درمیان ایک عورت ہے“۔

موپلا عورتوں کی خوش حالی کے متعلق جب موصوف سے سوال کیا گیا تو آپ نے طویل خاموشی کے بعد نہایت سوچ کر یہ فرما ہی دیا کہ

> ”انہیں صرف خوراک مل جاتی ہے روپیہ نہیں ملتا جس سے وہ بے حد غریب ہیں۔ انہیں صرف سرسوں کا تیل‘ لہسن‘ دال‘ چاول اور تھوڑا سا نمک دیا جاتا ہے۔ نہ گوشت نہ مچھلی۔ انہیں نہ جلانے کو تیل ملتا ہے نہ سر میں لگانے کو“۔

مزید اصرار پر آپ نے کہا کہ: ”میں نہیں کہہ سکتا کہ موپلے اپنی اس حالت سے خوش اور مطمئن ہیں“۔

موپلوں کے متعلق مندرجہ بالا بیانات کے علاوہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ!

> "گورنر انڈمان ہر کام میں بالکل مطلق العنان ہے۔ اس کے الفاظ قانون ہیں اور اس کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا جا سکتا۔ محض عمارتوں پر ساٹھ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کیا جا رہا ہے"۔

حکومت اب تک غیر سرکاری اور آزاد لوگوں کے بیانات کو جھٹلاتی رہی ہے مگر اب ہم اس سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ خود اپنے وفد کی رپورٹ کو اسی طرح ٹھکرا دے گی۔ موپلوں کے آلام د مصائب کی انتہا ہو چکی ہے اور دنیا کی کوئی آفت ایسی باقی نہیں رہی جو ان پر نہ توڑی گئی ہو لیکن افسوس ہے کہ انہیں ستانے سے حکومت کا دل ابھی تک سیر نہیں ہوا۔ ان کے ساتھ حکومت کا یہ طرز عمل موجودہ تہذیب و تمدن کے دامن پر سیاہ دھبہ ہے اور وہ جس قدر جلد اس کو دھونے کی کوشش کرے بہتر ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس وفد کو بھیجنے سے حکومت کا مدعا کیا تھا؟ اگر اس کا منشا یہ تھا کہ ایک جائز ایجی ٹیشن کو محض تھپکیاں دے کر دبا دیا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی، لیکن اگر وہ ایمانداری کے ساتھ یہ چاہتی تھی کہ واقعی حالات کی تحقیقات کے بعد موپلوں کے ساتھ انصاف کرے تو اب ہم یہ سمجھتے ہیں اور یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا ہے کہ اس بد نصیب قوم کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے اور اب حکومت کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس جلاوطنی کی تحریک سے باز آجائے اور نہ صرف آئندہ کے لیے اس سلسلہ کو منقطع کر دے بلکہ جو موپلے یہاں پہنچ گئے ہیں انہیں بھی واپس لا کر دوبارہ ان کے وطن میں آباد کر دے۔

غازیان ریف کے دم خم

{ ۱۰ر فروری ۱۹۲۵ء }

ارباب عزیمت پر فوز و فلاح کے ابواب کس طرح مفتوح ہوا کرتے ہیں۔ غازیان انگورہ اور مجاہدین ریف کے کارنامے بتا رہے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں سے عشق رکھنے والے توپوں و تفنگوں ہوائی جہازوں اور دنیا جہان کے آلات حرب پر کس طرح غالب آتے ہیں۔ ان بہادروں کی فتوحات سے ظاہر ہے۔

غازی عبدالکریم کی مختصر سی سرفروش جماعت قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ یورپ کے خود غرض' ہوس ناک' حریص اور مغرور سرکشوں کو بتا رہی ہے کہ

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قوی نشان ہمارا
قرآن کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

ہسپانیہ والوں کے پٹھو رسولی نے اسلام سے غداری کی۔ مخالف اسلام قوم کی حمایت کا علم بلند کیا۔ ہزیمت خوردہ افواج ہسپانیہ کے بل بوتے پر اترانے لگا۔ شاہ ہسپانیہ کی خدمت میں اظہار اطاعت و انقیاد کرنے کے بعد اپنے بھائیوں سے نبرد آزما ہوا۔ حق اور باطل کی اس آویزش میں باطل کو شکست ہوئی کیونکہ باطل ہمیشہ مٹا دیا جایا کرتا ہے

غازیان انگورہ نبرد آزما اور تجربہ کار تھے۔ غیور ترک وہ ذلت آمیز شرائط قبول نہیں کر سکتے تھے جو دول متحدہ نے انہیں ہزیمت خوردہ سمجھ کر پیش کی تھیں۔ پھر عالم اسلام ان کے ساتھ تھا۔ ہر طرف ان کی حمایت میں آواز بلند ہو رہی تھی اور یہ بھی زبردست اخلاقی مدد تھی لیکن اہل ریف نہ اتنے جرار تھے نہ تجربہ کار' پھر عالم اسلام کی کون سی آواز متحدہ ان کی حمایت میں اٹھی تھی۔ مجاہدین کی اولاد اور غازیوں کے اہل و عیال کے لیے کون سی رقوم بھیجی گئیں؟ اس بے کسی کے عالم میں محض توکل علی اللہ حق کی صداقت کے لیے نبرد آزما ہونا اور بے سروسامانی کی حالت میں یورپ کی ایک عظیم الشان سلطنت سے جنگ کرنا اور اس کی فوجوں کو شکست پر شکست دینا اللہ تعالیٰ کا معجزہ نہیں تو کیا ہے۔

غازی عبدالکریم کی فتوحات کا افریقہ شمالی کے حصوں پر علی الخصوص اور تمام دنیائے اسلام پر علی العموم نہایت اچھا اثر پڑے گا۔ اگر مسلمانان ہندوستان نے ان کی مالی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تو انشاء اللہ دیگر اسلامی ممالک بھی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مستعد ہو جائیں گے اور مسلمانوں کو پھر عروج نصیب ہو گا۔

* وفد حجاز کی مراجعت

وفد حجاز کی روانگی جس غیر ضروری عجلت سے معرض عمل میں آئی تھی وہ بتا رہی تھی کہ انجام کچھ اچھا نہیں ہو گا۔ چنانچہ افسوس ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ وفد حجاز جدہ سے

قاہرہ آپہنچا ہے اور دس بارہ دن کے بعد ہندوستان پہنچ جائے گا۔ پہلے حکومت کی طرف سے مشکلات حائل ہوئیں پھر غدار ابن غدار نے انہیں مکہ جانے سے روکا اور مسلمانان ہندوستان کے نمائندوں سے اپنی بادشاہت کی تصدیق کرانی چاہی۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ سلطان ابن سعود مصالحت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سلطان ابن سعود اور ارکان وفد کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہیں' لیکن ان کا اس غدار سے مصالحت کرنے سے انکار کر دینا چنداں استعجاب انگیز نہیں ہے۔ کیونکہ خادم اسلام سلطان ابن سعود کسی ایسے خود غرض اور بدباطن سے جو شخصی اغراض اور نفسانی خواہشات سے اپنی شاہی کی قربان گاہ پر اسلام کے مصالح اور ملت مرحوم کے مفاد کو بھینٹ چڑھا رہا ہے کس طرح صلح کر سکتے ہیں؟ سلطان ابن سعود حرم محترم اور حجاز کی پاک زمین کو شاہی کی لعنت سے پاک کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرتے ہیں کہ دنیائے اسلام کے مرکز پر کسی ایک قوم یا فرد واحد کی حکومت ہو پھر یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ امیر علی سے مصالحت کرلیں جو اپنے قدح کی خیر مناتا ہے۔ اور حجاز میں بادشاہ بنا رہنا چاہتا ہے۔

بہرحال وفد حجاز بہت جلد ہندوستان پہنچ جائے گا اور مسلمانان ہندوستان دیار حبیب کے تازہ حالات غدار ابن غدار کی سفیہانہ حرکات اور امیر ابن سعود کے کارناموں کی تفصیلات سے بہرہ اندوز ہو سکیں گے۔

* علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کا عطیہ شاہانہ

علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال نے پچھلے دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ایک لاکھ روپے کا شاہانہ عطیہ عطا فرمایا ہے اور زنانہ مدرسہ علی گڑھ کو بیس ہزار کی رقم خطیر بخشی ہے۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ مسلمانوں کی تعلیم میں جو خاص دلچسپی لیتی ہیں وہ محتاج تعارف نہیں لیکن ہم بیدار مغز والیہ بھوپال کی خدمت اقدس میں بصد ادب یہ عرض کریں گے کہ حضور نے اس امر پر بھی غور فرمایا ہے کہ مسلمانان ہندوستان نہ صرف برادران وطن بلکہ عالم اسلام کے دیگر مسلمانوں کے مقابلے میں اس درجہ پست حالت میں کیوں ہیں؟ اگر مغربی تعلیم حاصل کرنے اور تہذیب مغرب کی تقلید سے مسلمانان ہندوستان کو پھر وہی

عظمت و شان نصیب ہو سکتی ہے جو قرون اولیٰ کے غیر مہذب مسلمانوں کو حاصل تھی تو ہم یہ عرض کریں گے اور ضرور عرض کریں گے کہ حضور ہر قسم کی مغربی تعلیم کے دروازے کھول دیجئے اور مسلمانوں کو ان تعلیمات سے بہرہ اندوز ہونے دیجئے لیکن ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں اور تجربہ بتا رہا ہے کہ انگورہ اور ریف کے "غیر مہذب مسلمان" جن میں صرف عشق اسلام موجود ہے وہ چیز حاصل کر رہے ہیں جس سے "غیر مہذب" "ڈاکو" اور لٹیرے دنیا کے نجیح انسانوں اور قابل ترین مدبرین میں شمار کئے جانے لگے ہیں۔

اس سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ مغربی تعلیم مسلمانوں کے لئے زہر قاتل ہے بلکہ ہم تو یہ معروضہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اس تمام تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں جذبہ خدمت اسلام اور عشق خدا اور رسول ﷺ پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے اور وہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم اس قسم کا ماحول پیدا کر سکیں جس میں یہ جذبات عشق پرورش پایا کرتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی یا علی گڑھ کالج کے طلبا میں بفضل خدا تھوڑا بہت اسلام ضرور ہوتا ہے لیکن عشق اسلام اور وہ جذبہ جس کی ضرورت اور اشد ضرورت ہے کالج کی عالیشان عمارتوں اور ان کتابوں میں کہاں ملتا ہے جو نصاب میں داخل ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کی سینکڑوں آرزوئیں علیا حضرت بیگم صاحبہ کی ذات گرامی سے وابستہ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ علیا حضرت بہ نفس نفیس تمام مسلمان، والیان ریاست، روسا اور امراء کا ایک جلسہ منعقد فرمائیں اور اس اہم مسئلہ پر غور فرما کر ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد رکھیں جس میں مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم نہیں بلکہ اسلامی تعلیم کے ساتھ مغربی تعلیم دی جائے۔ فارغ التحصیل طلباء کے لئے حصول معاش کے ذرائع بہم پہنچائے جائیں۔ ان طلباء کو اسی درسگاہ سے وظائف ملتے رہیں اور وہ ایک خاص مدت تک خدمت اسلام انجام دیا کریں۔ بہت سے ایسے نوجوان مسلمان اب بھی موجود ہیں جو خدمت اسلام کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہتے ہیں اور حقیقی جذبہ اسلام سے سرشار ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان والیان ریاست، روساء اور امراء اس کار خیر میں مدد فرمائیں اور ان نوجوانوں کی سرپرستی فرما کر بہرہ اندوز سعادت دارین ہوں۔

* مولانا عین القضاۃ کا انتقال

معزز ہمعصر ہمدم سے یہ معلوم کرکے ہم کو بے حد رنج ہوا کہ ہفتہ گزشتہ میں لکھنؤ کے مشہور عالم باعمل حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ مولانا مرحوم ہمارے درمیان بزرگان سلف کی ایک زندہ مثال تھے۔ جن کا زہد و تقوی اور عدم رہبانیت کے باوجود ترک و تجرد مسلمانوں کے لئے ایک قابل تقلید اسوہ حسنہ تھا۔ ساری عمر انہوں نے خلق خدا کی روحانی و مادی خدمت میں گزار دی۔ اور خاص اپنی ذات کے لئے زاد آخرت کے سوا کوئی پونجی مہیا نہ کی۔ احکام شریعت کی تعلیم ‘اوامرالٰہی کی تبلیغ نہی ‘عن المنکر کی تابہ مقدور سعی تشنگان علم کی کفالت اور غرباء و محتاجین کی اعانت ان کی زندگی بھر کے اعمال کا خلاصہ تھا۔ ایسے لوگ اول تو ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں مگر اس عہد ظلمت میں تو ان کا وجود مغتنمات روزگار میں سے تھا۔ جس کے فقدان پر ہر مسلمان کو اندوگیں ہونا چاہیے۔

معاصر ہمدم نے حضرت مغفورلہ‘ کے وصال کی جو کیفیت بیان کی ہے اسے پڑھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ حقیقت میں ”خاتمہ بالخیر“ اسی کو کہتے ہیں۔ لکھا ہے کہ پیر کے دن نماز عصر ادا کرنے کے بعد آپ حسب معمول حجرہ میں تشریف لے گئے۔ یہ وقت لوگوں کی ملاقات کے لئے مخصوص تھا۔ چنانچہ اس دن بھی بعض ملاقاتی آچکے تھے کہ اتنے میں دو شخص حجرہ میں بلا اطلاع داخل ہوئے جو بظاہر عرب معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے سلام کے بعد عربی میں خوش الحانی کے ساتھ چند عربی اشعار یا قرآن پاک کی چند آیات کی تلاوت کی۔ جس سے مولانا پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہوئی اور آپ سربسجود ہوگئے اور اسی حالت میں آپ کی روح مبارک جسد عنصری سے پرواز کرگئی دونوں عرب اس کے بعد چپ چاپ چلے گئے اور کسی نے ان کے حال و احوال کا تفحص نہیں کیا۔

* حکومت کی چال ہے یا انقلاب پسند جماعت کی حرکت

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند کے ارباب بست و کشاد غضب کے دوررس اور بلا کے معاملہ فہم واقع ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں حکومت کی مشکلات اور احکام کے راستے میں ناقابل برداشت صعوبتوں اور مصیبتوں کا مرقع نہ پیش کریں تو ان کی حرکات و سکنات کو عظیم کارناموں اور اہم ترین خدمات سے کون تعبیر کرے۔ جب کبھی ہندوستان میں فوجی مصارف میں تخفیف اور صوبہ سرحد سے افواج کے معمولی سے حصے کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ صوبہ سرحد میں ڈاکے اور برطانی چوکیوں پر حملے معرض ظہور میں آتے رہے ہیں۔ ملک میں بدامنی بغاوت اور اسی قسم کی ہزاروں مشکلات کی موجودگی کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔

جولائی یا اگست ۱۹۲۴ء سے پہلے حکومت بنگال کے ارباب حل و عقد اور وابستگان دامن حکومت کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس صوبہ میں بغاوت کا مادہ موجود ہے اور بہت جلد پھوٹنے والا ہے لیکن جب بنگال کونسل کے حریت پسند ارکان نے کونسل میں حکومت کو شکست پر شکست دی وزراء کا ناطقہ بند کردیا پولیس کے مصارف کے لئے رقوم منظور کرنے سے انکار کردیا تو فوراً ہندوستان اور غیر ممالک کے اخباروں میں یہ اطلاعات شائع ہونے لگیں کہ بنگال میں بغاوت کا مادہ موجود ہے۔ سرخ بنگال کے اشتہارات اور اعلانات چسپاں کئے جانے لگے پھر لارڈ لٹن کی رسوائے عام تقریر پر لے دے شروع ہوئی آخر کئی بے گناہ فرزندان بنگال گرفتار کرلئے گئے اور حریت کش اور حکومت کے دامن پر سخت بدنما دھبے کی یاد تازہ رکھنے کے لئے حکومت ہند کی کتاب آئین پر بنگال کے سیاہ قانون کے نمایاں الفاظ نظر آنے لگے۔ جہاں گورنر اور ان کے یاران سرپل اور جناب وائسرائے نے اس سیاہ قانون کی تائید میں تقریریں کیں۔ آخر بڑی مشکل سے ہندوستان کی بہی خواہ جمہوریت دوست حکومت نے انگلستان کے سابق لارڈ چیف جسٹس کے عہد ”معدلت عہد“ میں اس پر **اشتداد** قانون پر بحث کرنے کے لئے اسمبلی کے ارکان کو اجازت دی لیکن ابھی بحث و تمحیص جاری تھی کہ ہندوستان بھر میں انقلاب پسندوں کی طرف سے اعلانات شائع کئے جانے لگے اور حکومت کی باخبر خفیہ پولیس اور ”مستعد اور

چست" پولیس کی موجودگی میں نہ صرف شہروں کے گوشوں اور کونوں میں بلکہ تمام بڑی بڑی عمارتوں 'درسگاہوں' اخبارات کے دفتروں اور دیگر نمایاں مقامات پر چسپاں کردیئے گئے۔

ہم حیران ہیں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اگر فی الحقیقت کوئی انقلاب پسند جماعت موجود ہے تو اس کے ارکان اپنی سرگرمیوں کے لئے ایسے مواقع کیوں پسند کرتے ہیں جب حکومت کے ارباب حل و عقد اس بات کے ثبوت فراہم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں کہ ہندوستان میں زبردست سازش انقلاب ہو رہی ہے۔ واقعات کے پیش نظر بعض اہل الرائے یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی ساحران حکومت کا ایک چلتا جادو اور خداوندان حکومت کی ایک چال ہے۔ اپنے پانسہ کو زبردست بنانے کے لئے یہ داؤں چلا جاتا ہے ورنہ کسی انقلاب پسند جماعت میں ایسے بیوقوف اور حماقت مآب ارکان نہیں ہوا کرتے کہ ادھر حکومت سازش اور انقلاب کے ثبوت فراہم کر رہی ہے اور ادھر وہ انقلاب انگیز اعلانات شائع کرنے شروع کردیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ حکومت کو یقین تھا کہ اسمبلی میں آرڈیننس کے خلاف پیش شدہ قرارداد ضرور منظور ہوجائے گی اس لئے یہ اعلانات شائع کرائے گئے تاکہ ۱۹۲۴ء کے قانون کو کتاب آئین پر قائم رکھنے کے لئے کچھ تو حیلہ بہانہ مل جائے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ حقیقت کیا ہے۔ کیا رہنمایان قوم ان واقعات پر غور فرما کر یہ معاملہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ انقلاب پسند جماعت کے اعلانات کی اشاعت کی ذمہ دار کونسی جماعت ہے؟ یہ استعجاب انگیز حرکت حکومت کے اپنے پٹھوؤں کی چال ہے یا فی الحقیقت کسی فاتر العقل انقلاب پسند جماعت کے ارکان اس قسم کی حرکت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

* اجمیر شریف کے عرس پر حرکات مذبوحی

ہمیں یہ سن کر بہت رنج ہوا کہ اجمیر شریف میں عرس کے موقعہ پر بعض ناعاقبت اندیش کج فہم افراد کی جانب سے مصالح اسلام اور اتحاد بین المسلمین کے خلاف ایسی

حرکات عمل میں آئی ہیں جو مسلمانان عالم کے لئے علی العموم اور مسلمانان ہندوستان کے لئے علی الخصوص بہت مضرت رساں ثابت ہونگی۔ بعض زائرین نے جو اجمیر شریف سے واپس آئے ہیں یہ تاسف انگیز اطلاع دی ہے کہ اس عرس کے موقعہ پر جب کہ محض اجمیر شریف کے اطراف و جوانب سے ہی نہیں بلکہ طول و عرض ہندوستان سے ہزاروں نہیں لاکھوں انسان اجمیر شریف میں آتے ہیں۔ سلطان ابن سعود کے خلاف اعلانات شائع کئے گئے اور نمایاں مقامات پر چسپاں کردیئے گئے۔ ان اعلانات میں نجدیوں کے مظالم اور اس قسم کی اور باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ تمام افراد جو اس قسم کی حرکات کا ارتکاب پہلے کچھ مدت گزری کر چکے ہیں وفد حجاز کی مراجعت تک خاموش رہتے اور مولانا عبدالساجد قادری بدایونی' مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالقادر قصوری کی تحقیقات حالات سے بہرہ اندوز ہوتے لیکن جلب منفعت اور حصول جاہ کا خیال باطل بعض کور باطن افراد کو بے طرح ابھار رہا ہے۔ وہ آگ جو آج ہم اپنے دامنوں سے مشتعل کر رہے ہیں خدانخواستہ ہمارے اپنے گھروں کو جلانے میں کام آئیگی اور اس خاکستر پر غیر مسلم اپنی عالیشان عمارتیں بنائیں گے اور ان فلک رفعت محلوں کی بنیاد ڈالیں گے جن کا خواب مدتوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کاش! وہ افراد جو اس قسم کی حرکات کا ارتکاب کررہے ہیں ذرا تدبر و فراست سے کام لیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ وہ اس طرح خدمت اسلام انجام دے رہے ہیں یا اسلام کش اور مسلم آزار اقوام کی مدد فرما رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں' اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلا رہے ہیں۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے اس ناپاک پروپیگنڈے کے لئے خاص طور پر اجمیر شریف کو منتخب کیا ہے جو یقیناً ہندوستان میں اس کے لئے سب سے زیادہ ناموزوں مقام تھا۔ کوئی سچا مسلمان اس حرکت کو پسند نہیں کرسکتا کہ ایسے مقدس بزرگ کے آستانہ کو جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام کی شمع ہدایت روشن کی اور جس کی ساری زندگی اسلام کی صحیح تعلیمات کے عملی نمونے پیش کرنے میں بسر ہوئی۔ ان سفیہانہ حرکات کے لئے استعمال کیا جائے جو اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کرنے والی ہیں۔ ہمارے خیال میں اجمیر کی مرکزیت سے اس قسم کا فائدہ حاصل کرنا ان لوگوں کی انتہائی بدطینتی کا ثبوت ہے۔

❑ ہفتہ معراج اور مجاہدین ریف

{ ۱۸ر فروری ۱۹۲۵ء }

اشاعت امروز کے صفحہ اول پر ہم جہاد ریف کے ابتدائی چند حالات ہدیہ ناظرین کر چکے ہیں۔ یہ وہ واقعات و حقائق ہیں جو صفحات تاریخ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں اور جن پر اہل ریف کی آنے والی نسلیں ناز کیا کریں گی۔ یہ بصیرت افروز حقائق ان اقوام کے لئے ایک سبق ہیں جن کے افراد غلامی کی لعنت پر نازاں اور محکومی کو نعمت غیر متوقبہ خیال کرتے ہیں‘ جو اپنے قدح کی خیر مناتے ہیں دنیوی جاہ و چشم کے دام میں پھنس کر قوم‘ ملک اور بنی نوع انسان کی فلاح کو فراموش کر چکے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ غلام آباد ہند کے باشندے ان واقعات کو پڑھیں۔ بار بار پڑھیں۔ غور سے پڑھیں اور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ شاید ان کے مردہ قلوب میں حرکت پیدا ہو اور غیرت جوش میں آوے‘ وہ پرامن طریقوں سے آزادی حاصل کرنے کے عشق میں اس درجہ وارفتہ ہو جائیں کہ وہ تمام قضیئے اور جھگڑے فراموش کردیں جو قوم کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔

لیکن اس وقت مجاہدین ریف کی اولوالعزمانہ سرگرمیوں اور فداکارانہ شوق جہاد کا ذکر کرنے سے ہمارا مقصود حریت دوست اصحاب کو صرف یہ یاد دلانا ہے کہ شہدائے ریف آپ سے اپنا حق طلب کر رہے ہیں اور آپ خاموش ہیں۔

اسلام حریت و آزادی کا مخزن و منبع ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر اس قوم کی امداد کرے جو حریت و آزادی کے لئے مستبد حکومت کا مقابلہ کر رہی ہو۔ اہل ریف حکومت ہسپانیہ کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہے ہیں۔ تازہ ترین واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہسپانیہ کے ظالم خونخوار‘ روباہ صفت باشندوں نے شکست پر شکست کھاکر ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے اہل ریف پر بم گرانے شروع کئے‘ زہریلی گیسوں سے حملہ کیا تاکہ مجاہدین کی تعداد کم ہو جائے۔ ان پر ہیبت طاری ہو‘ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو جائیں اور طوق غلامی کو اپنے ہاتھوں پھر اپنے گلے میں ڈال لیں۔ افواج ہسپانیہ کی انسانیت سوز حرکت اور قابل صد ہزار ملامت فعل یہ ہے کہ ان بدبختان ازلی نے بے گناہ باشندوں‘

بے کس خواتین، بے بس بچوں اور ناتواں بوڑھوں پر گیس سے حملہ کیا اور ان پر بم گرا کر اپنی شجاعت اور بہادری کے ثبوت فراہم کئے۔

مہذب یورپ اور اس کی بے حس اقوام سے ہمیں یہ امید نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے کہ وہ باشندگان ہسپانیہ کی ان سفیہانہ حرکات پر غور کرے گی۔ اس لئے ہم مسلمانان عالم سے اور تمام انصاف دوست اور حریت پرور انسانوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس تہذیب کو کب تک سراہتے رہیں گے اور یورپ کے ان درندوں کو کب تک غریبوں اور بے گناہوں کے پھاڑ کھانے کا موقع دیتے رہیں گے۔

مسلمانو! تمہارے امتحان کا وقت ہے۔ اس سے پہلے ایک آدھ دفعہ نہیں بار بار تمہارا امتحان لیا گیا۔ تمہارے ایثار و خودداری کو آزمایا گیا۔ بحمد اللہ! کہ تم ان امتحانات میں ہمیشہ پورے اترے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقتصادی مشکلات درپیش ہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تمہاری ملکی ضروریات بہت زیادہ ہیں لیکن یہ حقیقت ہے اور ہمیشہ نظر میں رہنی چاہیے کہ ممالک اسلام کی آزادی سے آپ کو زبردست تقویت پہنچ سکتی ہے۔ اگر اس وقت ہسپانیہ کو فتح نصیب ہوئی تو نہ صرف ریف اور مراکش بلکہ تمام دنیائے اسلام پر دشمنان حریت چھا جائیں گے۔ طاقت اور عجب، حکومت میں تمہاری ان کوششوں کو جو حصول حریت و آزادی کے لئے آج تک جاری ہیں حرف غلط کی طرح مٹا ڈالیں گے۔ آنکھیں کھولئے اور اپنی خداداد بصیرت سے کام لیجئے اور غازیان ریف کے لئے چندہ فراہم کیجئے۔ مدیر "مسلم آؤٹ لک لاہور" اس کار خیر کے لئے سرمایہ فراہم کر رہے ہیں۔ آپ جس قدر جلد رقم جمع ہو جائے ان کی خدمت میں ارسال کرتے جائیں۔

ہم اسلامی مجالس کے ارکان اور دیگر خدام اسلام سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ شب معراج سے چار دن پہلے اعانت ریف شروع کریں اور اس تقریب سعید پر چندہ فراہم کر کے ریف میں اسلام اور اسلام والوں کو عروج اقبال تک پہنچنے میں مدد دیں۔

* بعض ہندو اخبارات کا قابل اعتراض رویہ

ہمیں افسوس ہے کہ رہنمایان قوم کی وہ تمام آوازیں جو اخبار نویسی کی اصلاح کے

لئے بلند ہوتی ہیں بعض اوقات انسانوں کے کانوں سے نہیں بلکہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہیں۔ بڑی مشکل سے ان خرافات آلود مضامین کا سلسلہ بند ہوا تھا جو بعض اخباروں میں شائع ہوا کرتے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بسنت سے پہلے پھر کوئی ایسی ہوا چلی ہے کہ اردو اخبارات علی الخصوص ہندو اخبارات کا رویہ قابل اعتراض ہوگیا ہے۔ اگر رہنمایان قوم اس طرف متوجہ نہ ہوئے تو ہمیں ڈر ہے کہ پھر ایک اور مشکل کام کرنا پڑے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ حضرات جنہوں نے اخبار نویسی کے نہایت اہم پیشہ کو اختیار کیا ہے اس فن کو محض جلب منفعت یا تفریح طبع کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ ان ذمہ داریوں کو بھی محسوس کریں جو رائے عامہ کی تربیت و اصلاح کے لئے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ اخبار نویسی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ ہر شخص جو کچھ شدبود کا علم رکھتا ہو۔ ہاتھ میں قلم لے کر بیٹھ جائے اور عام طبائع کو جن باتوں سے خوش ہوتے دیکھے' خواہ وہ کیسی ہی مبتذل اور مخرب اخلاق ہوں انہیں لکھنا شروع کردے۔ یہ کام تو ایسے لوگوں کو کرنا چاہیے جو اپنے ذاتی منافع کو نظرانداز کر کے قوم کے سیاسی مذاق کی صحیح تربیت اور فاسد مادوں کی اصلاح کرنے کا فداکارانہ جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اس قسم کے مضامین نہ لکھے جائیں گے تو کیا ہوگا؟ کیا ہندو ایسے اخبارات کی خریداری بند کردیں گے جو اس قسم کے دل آزار مضامین نہیں لکھیں گے؟ کیا اردو زبان اور قومی صحافت میں ترقی نہ ہوسکے گی؟ آخر کونسا مفاد پیش نظر ہے کہ ہمارے بعض نادان بھائی دانستہ یا نادانستہ طور پر غیر ملکی آقاؤں کے آلہ کار بنتے ہیں اور باہمی افتراق و انشقاق کی خلیج کو وسیع تر بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر محض کاروبار کے لئے یہ خدمت انجام دی جا رہی ہے تو ہم بصد ادب عرض کریں گے کہ خدا کے لئے یہ پیشہ اختیار نہ کیجئے۔ دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں عذاب الیم ہوگا۔ بہتر ہے کہ ایسی حرکات سے اجتناب کیجئے اور روزی کمانے کا کوئی اور ذریعہ تلاش کیجئے۔ ملک خدا تنگ نیست بشرطیکہ آپ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ جائیں۔

دارالعلوم ندوۃ لکھنؤ

{ ۲۲ر فروری ۱۹۲۵ء }

مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ خوبی ودیعت فرمائی ہے کہ وہ اسلامی ضروریات کے لیے اپنی ضروریات قربان کر دیتے ہیں۔ دولت و زر کی تو حقیقت کیا ہے بوقت ضرورت جان جیسی متاع عزیز نذر اسلام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے اقوام عالم پر مسلمانوں کی ہیبت و دہشت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ اسی خدا داد فضیلت سے انہیں دنیا میں تفوق حاصل ہے۔ علوم دینیہ کی ترویج اور اسلامی مدارس کی تنظیم و امداد میں مسلمان خاص طو پر حصہ لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان درسگاہوں میں رشد و ہدایت کے دروازے کھلتے ہیں اور ان ہی درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلباء تبلیغ اسلام اور تلقین مذہب کے فرائض انجام دیا کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ ان درسگاہوں کے طریقہ تعلیم میں تغیر کی اشد ضرورت ہے اور ایک مدت سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے لیکن ابھی تک برادران ملت کو یہ موقعہ نصیب نہیں ہوا کہ وہ اس اشد ضروری کام کی طرف متوجہ ہوں۔ دارالعلوم ندوہ بزرگان ملت کی انتہائی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس دارالعلوم میں مسلمانوں کو مشرقی اور مغربی علوم سے بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ چنانچہ اس درالعلوم کے بعض فارغ التحصیل حضرات ملک بھر میں مشہور ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ دارلعلوم کی مالی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔

دارالعلوم نے تحریک ترک موالات کے آغاز ہی میں سرکاری امداد لینے سے انکار کر دیا تھا اور مجلس خلافت کی طرف سے اسے گراں قدر امداد ملتی تھی۔ مجلس خلافت کی مالی حالت کمزور ہو گئی۔ اس کا اثر دارالعلوم ندوۃ پر بھی پڑا اور دارالعلوم کو مجبوراً امداد کے لیے فرزندان اسلام سے استدعا کرنا پڑی۔

ندوۃ العلماء کا انیسواں سالانہ جلسہ ۱۳۔۱۴۔۱۵ شعبان المکرم ۱۳۴۳ھ بمطابق ۹۔۱۰۔۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء بمقام لکھنؤ منعقد ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ اطراف و اکناف کے مسلمان اس جلسہ میں شرکت فرمائیں گے اور اس کار خیر میں ضرور حصہ لیں گے۔

* دمودر ساورکر اور ڈاکٹر مونجے کا رویہ

بعض ہندو اخبارات میں "ہندو جاتی" کے نئے "سیوکوں" کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے ہیں۔ ان میں سے دمودر ساورکر بیرسٹر ایٹ لاء کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہم ڈاکٹر مونجے کی شکایت نہیں کرتے کیونکہ وہ تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اشتراک عمل ناممکن الوقوع خیال کرتے ہیں اور اپنے خیال کی تائید میں نہایت بھونڈے اور بودے دلائل پیش کرنے کے عادی ہیں لیکن "جاتی" کے نئے سیوک مسٹر دمودر ساورکر کو جو پہلے اچھے خاصے "دیش بھگت" تھے عام سیوکوں سے جن کی سیوا سے جاتی کو پچھلے دو برس میں بہت فائدہ پہنچا ہے کئی قدم آگے نکل گئے ہیں۔ آپ ہندو بھاشا کی ترویج کے لیے سماج کو مشورہ دیتے ہیں کہ "اردو لکھنے والا قلم توڑ دے"۔ آپ اسی قسم کی اور بہت سی نصیحتیں فرماتے ہیں اور قوم کو رقابت و مسابقت کے جذبہ سے متاثر کرنا چاہتے ہیں۔

تجربہ بتا رہا ہے کہ ایسے افراد کی حرکات اضطراری قوم کے لیے بالآخر بہت مضر ثابت ہوا کرتی ہیں۔ مالویہ جی کے کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ اگر وہ ملتان کے فسادات کی سنی سنائی باتوں اور مبالغہ آمیز کہانیوں سے متاثر نہ ہوتے اور آپس میں اتحاد و اتفاق کی تیاریاں شروع کرتے تو غالباً ملک کو بھی فائدہ پہنچتا اور ہندوؤں کو بھی لیکن حالت اضطرار میں مالویہ جی نے ایک تحریک شروع کر دی جس سے جوش رقابت بھڑک اٹھا اور اکثر مقامات پر سنگھٹن کے کارنامے ظہور میں آئے۔

پنجاب اور صوبہ جات متحدہ میں اس قسم کے خیالات رکھنے والے سروں کا امتحان ہو چکا ہے۔ اب صوبہ بمبئی میں ان خیالات کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان حرکات کا صرف ایک ہی نتیجہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ ہماری غلامی کی زنجیریں اور مضبوط ہو جائیں گی۔ آنے والی نسلیں ان افراد پر جو اس وقت بزعم خویش "جاتی" کی خدمت کر رہے ہیں، افسوس اور رنج کا اظہار کیا کریں گی۔

اس وقت ہم گاندھی جی اور دیگر رہنمایان ہنود کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ الفاظ سے گھاؤ نہیں بھرا کرتے ہیں۔ آپ اپنے ان مشہور و معروف بھائیوں کو

مشورہ دیں کہ وہ ایسے الفاظ زبان پر نہ لائیں۔ جن سے افتراق و انشقاق کی آگ بھڑکتی جائےاور قوم کا خرمن امید جل کر خاکستر ہو جائے‘ اگر ان معمولی سی حرکات کی طرف بہت جلد توجہ نہ دی گئی تو کچھ ہی عرصہ کے بعد حالات میں بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔

* فلاکت زدہ موپلوں کی قابل رحم حالت

غیور باحمیت بد قسمت و مظلوم موپلوں پر حکومت کی طرف سے جو مظالم ہوئے ہیں وہ دنیا سن چکی ہے۔ ان پر اپنے بھائیوں کی طرف سے جو زیادتی ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔ اب اس درد انگیز داستان کے کسی حصہ کا اعادہ جلے دل کو زیادہ جلانا ہے لیکن کیا کریں بد بختی و افلاس‘ ناداری و نکبت اب تک ان بد نصیب موپلوں کی تلاش میں ہے اور ان ستم زدہ بہادروں کو آج تک راحت و آرام کا نام تک نصیب نہیں ہوا۔ ہمعصر سوراجیۂ مدراس کا ایک نامہ نگار رقمطراز ہے کہ پچھلے دنوں کثیر تعداد میں موپلے جیل خانوں سے رہا کئے گئے ہیں ۔ ان کی حالت زار بے انتہا افسوس ناک ہے۔ ان کے پاس کھانے کو ٹکڑا نہیں‘ تن ڈھاپنے کو چیتھڑا نہیں‘ رہنے کو جھونپڑا نہیں۔ اکثر مدراس کے بازاروں میں آوارہ پھرتے اور گداگری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

افسوس صد افسوس! اس بد نصیب قوم کے سپوت اس طرح پریشان حال و در بدر پھر رہے ہیں۔ قوت و طاقت جو تھی وہ حوادث و تفکرات نے چھین لی۔ جو کچھ سرمایہ تھا برباد ہو گیا۔ گھر بار تباہ ہو گئے۔ اب آسمان سائبان اور فرش خاک بستر ہے۔ غربت و افلاس کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ حکومت کے جذبہ انتقام کی تاریکی اب تک سب پر محیط ہے۔ تر و خشک سب اس آتش کی نذر ہیں۔ حکومت سے امداد و اعانت کا خیال تحصیل حاصل ہے تو کیا یہ بہادر موپلے اسی طرح سرگرداں و آوارہ ہزیمت خوردہ اور بے بسی کی موت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں گے اور ہمدردان بنی نوع انسان ان کی حالت زار پر ہمدردی کے آنسو تک نہیں بہائیں گے۔ کیا مسلمانان ہندوستان اور مخیر اکابر اسلام ان غیور اور باحمیت انسانوں کو تباہ حال اور خستہ و خوار ہوتے دیکھیں گے۔

اعلیٰ حضرت حضور تاجدار دکن خلد اللہ ملکہ‘ وسلطنتہ نے اس بد نصیب قوم کی امداد

کے لیے جمعیتہ دعوۃ و تبلیغ پونا کو پچاس ہزار روپے کی گرانقدر رقم عطا فرمائی تھی۔ جس سے سینکڑوں کیا ہزاروں فدا کار جانباز فاقہ کی لعنت شاقہ اور مصائب سے نجات پا کر تاجداروں کی فیاضی اور کریم نفسی کے راگ گا رہے ہیں۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام اپنے ان فلاکت زدہ بھائیوں کی امداد کے لیے پھر شاہانہ فیاضی سے کام لیں گے اور دیگر روساء اور اصحاب ثروت بھی اس کار خیر میں اعلیٰ حضرت کے نقش قدم پر چلیں گے اور بہت جلد اس قدر سرمایہ فراہم کریں گے کہ یہ مظلوم قوم اس وقت کے مصائب کے طوفان سے اور دو چار ماہ بعد آنے والی برسات کے شدائد سے محفوظ رہ سکے۔ بزرگان ملت اور تمام اسلامی انجمنوں کو اس طرف بہت جلد متوجہ ہونا چاہیے۔

☐ کیا اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے؟

{ ۲۶ر فروری ۱۹۲۵ء }

چونکہ آج کل اخبارات میں قتل مرتد کے مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے اور نہایت غیر ذمہ دارانہ طریق پر اظہار خیالات کیا جارہا ہے اندیشہ تھا کہ مسلمان کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم نے اس مسئلہ کو صاف کرنے اور اسلامی تعلیم کی روشنی میں لانے کے لیے ایک سلسلہ مضامین “شریعت اسلام اور قتل مرتد” کے عنوان سے شروع کیا ہے۔ جس کی پہلی قسط آج کے پرچہ میں کسی دوسری جگہ درج کی گئی ہے۔ امید ہے کہ طالبان حق کے لیے یہ مضمون مشعل راہ ہدایت ہوگا۔

* شب برات اور آتشبازی

مسلمانان ہندوستان نے نہ صرف اسلامی تہواروں بلکہ اپنی روزانہ زندگی میں جن بدعات کو داخل کر لیا ہے وہ ان کے شریعت غرائے مصطفوی سے بعد بعید اور غیر ملکی رسم و رواج کی ناپاکیوں میں آلودگی پر دال ہے۔ شب برات سے پہلے اور اس رات کو بلکہ اس کے بعد بھی آتش بازی چلائی جاتی ہے اور غریب قوم کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں روپے نذر آتش کر دیئے جاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں کو ان حرکات سے باز رکھنے کے لیے اب تک کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی۔ رہنمایان ملت اور علمائے اسلام محسوس تو کرتے ہیں اور وہ کونسا قلب مسلم ہے جس میں اس بیہودگی اور فضول خرچی کے لیے جذبہ نفرت موجود نہ ہو، لیکن اس کا کیا کیجئے کہ برس بھر میں ایک دن بھی تو دل کی اس کڑھن کے علاج کے لیے وقف نہیں کیا جاتا اور ہر سال شب برات کی تقریب سعید پر دل جلانے کے لیے آتشبازی کی نمائش نظر آتی ہے۔

ہم مسلمانوں سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آتش بازی کی نمائش نہ ہو تو کونسا فریضہ مذہب ہے جس کی تکمیل نہ ہو سکے گی؟ اسلام تو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح اسلام کو بدنام کیا جائے اور وہ پیسہ جو محنت شاقہ کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو، اس طرح فضول طور پر خرچ کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو عزیز نہیں رکھتا جو اسراف کرتے ہیں اور ضروریات ملت سے بے خبران بدعات پر اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی صرف کرتے ہیں۔

کیا مسلمانوں کے پاس دولت و زر موجود ہے؟ کیا وہ ان تمام ضروریات ملی کا اہتمام و انصرام کر چکے ہیں۔ جس کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے؟ کیا قوم میں غرباء، یتامیٰ مساکین، بیوہ اور نادار عورتوں، ضعیف اور مسکین مردوں اور اپاہجوں کی تعداد کثیر موجود نہیں؟ کیا مسلمانوں کی آبادی کا بیشتر حصہ نان شبینہ تک کو محتاج نہیں؟ پھر کیا ممالک اسلامیہ کے مسلمان آرام و چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں ان حرکات کا ارتکاب جاری ہے۔ مسلمان تو کسی حالت میں بھی اس قسم کے اسراف کو جائز نہیں سمجھ سکتا اور ہم اس اسراف کی روک تھام کے لیے کوشش تک نہیں کرتے اور مسلمان کہلاتے ہیں۔ کیا ہماری موجودگی اسلام کے لیے باعث ننگ و عار نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے اور ہم اس وقت تک باعث ننگ و عار رہیں گے جب تک ہمارے اندر سے یہ چیز ختم نہیں ہو جاتی۔ ہم مسلمانوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں اور پھر اپنے اپنے محلوں اور بستیوں میں شب برات سے پہلے، اس رات کو اور اس کے بعد آتشبازی کی نمائش کی بدعت کا قلع قمع کر دیں اور کوشش کریں کہ پھر یہ بدعت اپنا رنگ نہ جما سکے۔

❑ مسودہ قانون حج

{۲؍مارچ ۱۹۲۵ء}

مسودہ قانون حج پر الجمعیۃ کے کالموں میں حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب نے جس قدر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی تھی' اور اس پر قانونی حیثیت سے مولانا محمد علی صاحب نے کامریڈ میں جس قدر مفصل و مدلل بحث کی تھی' اس کی بنا پر امید تھی کہ جب یہ مسودہ اسمبلی میں پیش ہوگا تو کم از کم مسلمان ارکان کرایہ واپسی کی لازمی شرط کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کریں گے مگر ۲۵؍فروری کو جب یہ مسودہ اسمبلی میں پیش ہوا تو ہم نے بڑے تعجب کے ساتھ دیکھا کہ سوائے مولوی محمد شفیع صاحب کے اور کسی نے رائے عامہ کی نمائندگی نہیں کی اور اکثر مسلمان ممبروں نے انہی دلائل کی بنا پر حکومت کی حمایت کی جو خود حکومت کی جانب سے اس کی تائید میں پیش کئے گئے تھے اور جن کا تار و پود حضرت صدر جمعیت العلماء ہند پوری طرح بکھیر چکے تھے۔ جناب محمد یعقوب صاحب نے مسودہ کی تائید کرتے ہوئے صرف اتنی عنایت کی کہ ان لوگوں کے لیے کرایہ واپسی کی شرط سے استثناء حاصل کرلیا جو مقامی حکومتوں کے مقرر کردہ افسروں کے سامنے حلفیہ اقرار کریں کہ تین سال تک ہندوستان واپس نہ آئیں گے مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی شرطوں سے اس ناروا قید کے عدم جواز پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو بلا وجہ عازمین حج پر عائد کی جارہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مسلمان ممبروں کی جانب سے اس امر کو ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ کرایہ واپسی کی شرط سے حجاج کی ان اصل مشکلات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی جو ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کے باعث حقیقی ہیں۔ جنہیں دور کرنا صرف حکومت ہی کے اختیار میں ہے۔ اس قسم کے اہم اسلامی معاملات میں ہمارے ممبران اسمبلی کی یہ غفلت ناقابل عفو ہے۔

* جدہ قناصل کا رویہ

دول یورپ کے ارادوں پر ان کے قناصل کے رویہ سے ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان کے وفد حجاز نے جدہ سے واپس پہنچ کر جو تصریحات شائع کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعود نے جدہ پر گولہ باری شروع کرنے سے پہلے قناصل دول سے

درخواست کی تھی کہ وہ اپنے دفاتر اور متعلقین کو لے کر سمندر میں اپنے جہازوں پر چلے جائیں تاکہ گولہ باری سے ان کو نقصان نہ پہنچے مگر اس درخواست کو رد کر دیا گیا پھر انہوں نے لکھا کہ اگر یہ صورت پسند نہیں تو نواح جدہ میں کسی ایسے مقام پر چلے جائیں جو موقع جنگ سے الگ ہو، مگر اسے بھی قبول نہ کیا گیا پھر انہوں نے لکھا کہ کم از کم اپنی عمارات پر ایسے امتیازی نشانات لگا دیجئے جو دور سے نظر آسکیں اور گولہ باری کے وقت ان کا خیال رکھا جائے مگر ایسی معقول خواہش کو بھی مسترد کر دیا گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس طرح امیر علی کو غیر جانبدار سلطنتوں کے دامن میں پناہ دی جا رہی ہے، یا مقصود یہ ہے کہ اگر ہجوم عام کے دوران میں قونصل خانوں کو کوئی نقصان پہنچے۔ جس کا پہنچنا ایک طبعی امر ہے، تو احترام دول کے بہانے سے مداخلت کی جا سکے اور جدہ پر بھی وہی کاروائی کرنے کا موقع مل جائے جو بغاوت یونان کے زمانہ میں نوارنیو پر کی گئی تھی۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قناصل دول کا یہ طرز عمل تمام بین الاقوامی قوانین کے بالکل خلاف ہے۔ ان کو قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی غیر جانبداری کی پوزیشن سے اس طرح ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور اگر اس کوشش میں انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے تب کسی بین الاقوامی قانون کی رو سے وہ حملہ آور کے خلاف اعتداء علی الحقوق کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ ہمیشہ جب کبھی کسی شہر پر کوئی مخالف سلطنت حملہ کرتی ہے تو غیر جانبدار سلطنتوں کے سفراء اور قناصل موقع جنگ سے دور ہٹ جایا کرتے ہیں تاکہ افواج کے ہجوم میں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ جدہ کے قناصل کے لیے بھی یہی صورت کھلی ہوئی تھی اور ان کا فرض تھا کہ ابن سعود کا نوٹس ملتے ہی شہر سے فاصلہ پر چلے جاتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور سلطان کی آخری تجویز تک کو جس سے زیادہ معقول اور کوئی تجویز ہو ہی نہیں سکتی تھی، نہایت غیر معقولیت سے ٹھکرا دیا گیا چنانچہ سلطان کی احتیاطی تدابیر کا امیر علی کی حرکتوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ تو ہم پر صاف روشن ہو جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اپنے خلفاء کے ساتھ مل کر اب کوئی خاص چال چلنا چاہتی ہے جس کے لیے میدان صاف کیا جا رہا ہے۔

* دیانند شتابدی کی برکات

ہفتہ گزشتہ میں قارئین کرام نے متعدد ایسے برقی پیغامات اور مراسلات کا مطالعہ کیا ہوگا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ سماج کے لوگوں نے اپنے مقتداء کے صد سالہ یوم پیدائش کا جشن ہندوستان کے اکثر شہروں میں نہایت اشتعال انگیز طریقوں سے منایا، کہیں اپنی ہمسایہ اقوام کے نازک حسیات دینی کو صدمہ پہنچایا، کہیں ان کے مقابر و معابد کی توہین کی کہیں، ان کے مذہبی پیشواؤں کی عزت پر حملے کئے کہیں ان کے عاجز و درماندہ افراد کو جبراً اپنے حلقہ میں شامل کرنے کی کوشش کی اور کہیں انہیں چھیڑ کر خواہ مخواہ میدان رزم و پیکار گرم کیا۔ اگرچہ ایک مذہب کے پیشوا کا یوم پیدائش اس سے بد تر کسی اور طریقہ سے نہیں منایا جاسکتا۔ ہم ان سے عرض کریں گے کہ وہ اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے خود اپنے مذہب کی بھی کوئی بڑی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ بلکہ دراصل اس کے متعلق ہندوستان کی عام رائے کو اور زیادہ خراب کر رہے ہیں۔ ساری دنیا کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی تہواروں کو نہایت امن و سکون اور خالص مذہبی شغف کے ساتھ مناتی ہے لیکن آپ اس کے برعکس انہیں ہمسایوں کو ستاکر اور دوسرے مذاہب کی توہین کر کے مناتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے دل میں آپ کے پیشوا اور اس کی تعلیمات کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے اور ہر شخص اس کو اصلاح کا مذہب نہیں بلکہ فساد کا مذہب سمجھے گا۔ یقیناً کسی مذہب کی تبلیغ کا اس سے بدتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔

* حجاز میں مداخلت کی کوشش

انگلستان کے بعض اخباری حلقوں میں یہ خیال گشت لگا رہا ہے کہ موسم حج کے قریب آجانے کی وجہ سے حکومت برطانیہ اپنی مسلمان رعایا کی خاطر امیر علی اور ابن سعود سے غیر سرکاری طور پر قیام امن کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس خیال کو حکومت کی جانب منسوب کر کے انگریزی اخبارات دراصل اپنی جانب سے

ایک تجویز پیش کر رہے ہیں یا فی الحقیقت حکومت نے اس قسم کی مداخلت کا ارادہ کر لیا ہے اور اخبارات نے اسے محض افواہ کا رنگ دے کر شائع کیا ہے مگر خواہ کوئی صورت ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت اس قسم کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی ہمیشہ عادی رہی ہے اور وہ جب کبھی اسلامی ممالک میں مداخلت کرنا چاہتی ہے تو خود مسلمانوں ہی کے مصالح کو بہانہ بنا کر مخلصانہ خیر خواہی کے لباس میں اپنا مطلب حاصل کرتی ہے۔ پس اگر یہ امر واقعہ نہ بھی ہو اور ابھی صرف خیال ہی خیال ہو تب بھی ہم مسلمانوں کی طرف سے صاف صاف اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ خواہ فریضہ حج کی ادائیگی میں ایک سال نہیں دس سال کا التوا ہو جائے اور حجاز کی جنگ کتنی ہی طویل مدت تک جاری رہے مگر ہم ایک لمحہ کے لئے بھی دولت برطانیہ کی سرکاری یا غیر سرکاری مداخلت کو پسند نہیں کر سکتے۔

اگر دولت برطانیہ کو بعض گنے چنے خوشامدی مسلمانوں نے یہ یقین دلایا ہو کہ وہ جنگ حجاز میں ثالثی کر کے مسلمانوں کی کوئی خاص خدمت انجام دے گی تو وہ ان لوگوں کی رائے کو ہرگز **عامتہ المسلمین** کی رائے نہ سمجھے۔

☐ قانون حج کا آخری فیصلہ

{ ۶ر مارچ ۱۹۲۵ء }

غالباً ہماری یہ تحریر اس وقت لیجس لیٹو اسمبلی کے ارکان کے ہاتھوں میں ہوگی جب آخری فیصلہ کے لئے قانون حج کا مسودہ ان کے سامنے پیش ہوگا۔ پچھلے مباحثہ میں ان کی اکثریت نے اس مسئلہ کے اہم پہلوؤں سے جس طرح صریح ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم کو قطعاً کوئی امید نہیں کہ وہ ایک افسوسناک مذہبی مداخلت کو روکنے کی کوشش کریں گے لیکن اس ناامیدی کے باوجود ہم تمام غیر سرکاری نمائندوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان ممبروں کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ کم از کم ایک ایسے اہم معاملہ میں جو مسلمانوں کے سب سے بڑے فریضۂ دینی کی ادائیگی پر اثر انداز ہوتا ہے' اس قدر ناواجب حریت رائے سے کام نہ لیں اور محض اپنے چند مزعومات کے دائرہ سے باہر نکل کر ان نہایت وزنی دلائل پر ایک نظر ڈالیں جو حضرت مولانا کفایت اللہ صدر جمعیت

العلماء ہند اور مولانا محمد علی نے اس مسودہ قانون کے خلاف پیش کیے ہیں۔

ہم کو خوب معلوم ہے کہ جن حضرات نے مسلمانوں کی نمائندگی کا بار نہایت ہلکا سمجھ کر اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے انہوں نے اسلامی مفاد کی خاطر اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں فرمائی کہ اس مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر غور کرنے اور کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اس لٹریچر کا مطالعہ کرلیتے جو انہی کی توجہ کے لئے مہیا کیا گیا تھا پھر اس سے زیادہ افسوسناک منظر ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عام طور پر اسلامی اخبارات اور اسلامی پبلک کی جانب سے احتجاجی مظاہرات ہونے کے باوجود اسمبلی کے بعض مسلمان ممبروں نے نہایت بے تکلفی کے ساتھ اعلان کردیا کہ مسلمانوں کی رائے عامہ اس قانون کی مؤید ہے اور حکومت کی جانب سے اس قسم کا قانون پیش کیا جانا باعث ملامت نہیں بلکہ قابل شکریہ ہے۔ اگرچہ اب بالکل موقع نہیں کہ ان حضرات کی خدمت میں دوبارہ اس مسئلہ کے تمام پہلو بوضاحت پیش کیے جاسکیں لیکن آخری طور پر ہم ان کو بتلا دینا چاہتے ہیں کہ اس مسودے کے حق میں رائے دے کر وہ ایک ایسی حکومت کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں جو اتحاد اسلامی کو اپنے استعماری منصوبوں کے لئے ایک زبردست خطرہ سمجھتی ہے اور مدتوں سے حج کو روکنے کی تدابیر میں منہمک ہے۔

گاؤ پرستی کی حقیقت

{ ۱۸ مارچ ۱۹۲۵ء }

برادران ہنود کے دل میں گائے کی جس قدر محبت و عظمت ہے اور اس کی حفاظت کے مسئلہ کو ان کی قومی سیاست میں جیسی اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے مگر یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے وطنی بھائی گائے کو صرف قصائی کے چھرے ہی سے بچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ اس کی حفاظت کے دوسرے ذرائع اختیار کرنے سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اپنے اقتصادی فوائد کی خاطر ان کی مخالفت کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مثال کے طور پر ہم ریاست کشمیر کا ایک تازہ ترین واقعہ پیش کرتے ہیں جسے ہم عصر مسلم آؤٹ لک نے اپنی ایک قریبی اشاعت میں درج کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:

”ریاست میں سوپور ایک گاؤں ہے جس کی آبادی تقریباً دس ہزار ہے اور اس

> میں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ہندو رہتے ہیں۔ اس کے نواح میں چراگاہوں کا ایک وسیع رقبہ ہے جہاں کثرت سے مویشی چرتے ہیں۔ ریاست کے محکمہ جنگلات نے تجویز کیا ہے کہ اس قطعہ زمین میں چرنے کی ممانعت کر کے وہاں پودوں کی تربیت و حفاظت کے لئے ایک "نبات خانہ" بنا دیا جائے۔ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اور اس تجویز کی مخالفت میں ان کی جانب سے یہ دلیل بھی پیش کی گئی کہ اس سے تقریباً دس ہزار گائیں بھوکی مر جائیں گی مگر اس پر نہ صرف یہ کہ توجہ نہیں کی گئی بلکہ ان زمینداروں کو جنہوں نے عرضی بھیجی تھی سزائیں دی گئیں۔ محکمہ جنگلات کے ایک افسر نے موقع پر پہنچ کر عرضی گزاروں کو اپنے آدمیوں سے پٹوایا اور پھر پولیس نے ان کو گرفتار کر کے اس حد تک تکلیفیں دیں کہ انہوں نے مجبوراً تجویز کو منظور کر لیا"۔

ہمعصر موصوف آگے چل کر لکھتا ہے کہ ابھی تک گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے۔ محکمہ جنگلات کے آدمی جس شخص کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں پولیس اسی کو گرفتار کر لیتی ہے اور چند روز تک بند رکھ کر توبہ کرا کے چھوڑ دیتی ہے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے گاؤ پرستی کی حقیقت خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی ریاست جس کے حدود اختیار میں گائے کو ذبح کرنا سخت جرم ہے۔ ایک دو گایوں کو نہیں بلکہ دس ہزار گایوں کو صرف ایک معمولی زراعتی فائدہ کی خاطر بھوکا مار دینے کی کوشش کرتی ہے اور مسلمان اس کوشش کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ تو اس کے ہندو عمال ان پر عقوبت و عذاب کی بارش کر دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر ہر شخص کو مجبوراً یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ خواہ برادران ہنود مذہبی طور پر گائے کو کتنا ہی محترم سمجھتے ہوں۔ لیکن بحالت موجودہ ان کی طرف سے اس کی حفاظت کے لئے جتنا زور دیا جا رہا ہے وہ سب خالص سیاسی ہے اگر اس ظلم وجور کا مفہوم اس کے سوا کچھ اور ہو تو مہربانی کر کے گائے کانفرنس کے ارباب حل و عقد اور خصوصاً مسٹر شام لال نہرو جو عنقریب تحفظ مویشیان کا مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کرنے والے ہیں۔ اس کی تشریح فرمائیں۔

* لارڈ ریڈنگ کا مقصد سفر

سرکاری طور پر اعلان ہو چکا ہے کہ لارڈ ریڈنگ وزیر ہند سے مشورہ کرنے کے لئے انگلستان جا رہے ہیں۔ اسمبلی میں مسٹر جناح نے یہ کھوج لگانے کی بہتیری کوشش کی کہ ان کا مقصد سفر کیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی پوچھ لیا گیا کہ وہ مڈی مین "اصلاحات کی تحقیقی کمیٹی" رپورٹ پر بحث کرنے کے لئے تو نہیں بلائے گئے ہیں مگر ہوم ممبر جو رازداری کی قسم کھائے ہوئے تھے "سرولبراں" کو حدیث دیگراں میں رسوا کرنے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔

لیکن دنیا کا قاعدہ ہے کہ جو بات جتنی راز میں رکھی جاتی ہے وہ اس کی اتنی ہی تلاش کرتی ہے۔ چنانچہ اعلان کے بعد سے برابر قیاسی توجیہیں کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ بعض لوگ تو اپنی دانست میں حقیقت تک پہنچ بھی گئے ہیں جس کے بعد انہوں نے نتائج ملاقات کے متعلق حکم بھی لگانے شروع کر دیئے ہیں مگر ہمارے خیال میں یہ سربستہ راز اس وقت تک کبھی بے نقاب نہ ہوگا جب تک حکومت کسی خاص فیصلہ پر نہ پہنچ جائے گی۔

تاہم اگر ڈیلی نیوز لندن کا یہ بیان قرین قیاس تسلیم کر لیا جائے کہ لارڈ ریڈنگ خود اپنی خواہش سے لندن جا رہے ہیں اور وہ دراصل مڈی مین کمیٹی کی اقلیت کے حامی ہیں جس نے موجودہ قانون اصلاحات میں ترمیم کی سفارش کی ہے۔ تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ دولت برطانیہ کو اس کی خوش قسمتی سے ہندوستان میں اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کا ایک آخری موقع مل رہا ہے اور غالباً وہ اپنی انتہائی بدقسمتی سے اسے ضرور کھو دے گی۔ برطانوی حکومت کو اگر آئندہ خطرات سے کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ہندوستان کی طمانیت ہے جو سوراج کے بغیر کبھی حاصل نہ ہو سکے گی۔ یہ ضرورت سمجھانے کے لئے برطانوی ملوکیت کو لارڈ ریڈنگ سے بہتر کون آدمی مل سکتا ہے؟

* برطانوی ارتجاعیت کا افسوسناک مظاہرہ

حکومت کی جانب سے اب تک ہندوستانیوں کا دل بہلانے کے لئے جتنے کھلونے پیش کئے جا چکے ہیں ان میں شاید سب سے زیادہ بدنما اور بھونڈا کھلونا وہ ہے جو اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی یا مڈی مین کمیٹی کی رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے کھلونے کم از کم اتنے حسین اور جاذب نظر ضرور ہوتے تھے کہ تمام ہندوستان من حیث المجموع نہیں تو ایک خاص جماعت ان کو خوشی خوشی قبول کرلیا کرتی تھی لیکن یہ کھلونا تو اسقدر ردی ہے کہ پہلی نظر ہی میں اسے سب نے بالاتفاق رد کردیا ہے اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت نے اسے نظر استحسان سے نہیں دیکھا ہے۔

اس کمیٹی کی تاریخ کو بتفصیل پیش کرنے کے لئے تو کافی وسعت درکار ہے لیکن اس کی نوعیت سمجھنے کے لئے محض اتنا جان لینا کافی ہے کہ جب حکومت توسیع اصلاحات کے لئے ہندوستانیوں کی متفقہ خواہشات کا مقابلہ کرتے کرتے عاجز آگئی تو اس نے ان کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کمیٹی کو مقرر کیا تھا تاکہ چند مہینے تک اس کی رپورٹ کے انتظار کا مشورہ دے کر ان کے منہ بند کئے جاسکیں۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک اسمبلی میں برابر اس قسم کے ریزولیوشن پاس کئے جاتے رہے ہیں کہ ۲۹ء سے پہلے اصلاحات میں توسیع کی جائے اور دو عملی کا خاتمہ کرکے صوبہ جات میں کامل ذمہ دار حکومت قائم کردی جائے۔

اس سلسلے کی آخری کڑی پنڈت نہرو کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ایک تجویز تھی جو بڑی کثرت رائے سے پچھلے سال منظور ہوئی۔ اس پر سر میلکم ہیلی نے جو اس وقت ہوم منسٹر تھے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان کیا اور اس کے دائرۂ عمل کا جس طرح تعین کیا گیا اس نے اس امر کی تصدیق کردی کہ " قانون اصلاحات میں ہندوستانیوں کے تجربہ میں جتنے نقائص پائے گئے ان سے اس قانون کے بنیادی اصول کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ تاہم کمیٹی ان اصلاحات میں مناسب ترمیم کے لیے تجاویز مرتب کرے گی"

ظاہر ہے کہ اس طرح پہلے ہی سے اس کمیٹی کے دائرہ عمل کو اسقدر محدود کردیا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی خواہشات کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی معقول سفارش نہیں کرسکتی تھی مگر رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دائرہ اصولاً جسقدر تنگ تھا۔ عملاً اسے اور بھی زیادہ تنگ کردیا گیا۔ اور قانون اصلاحات کے آئینی نقائص کو دور کرنے کی بجائے

دراصل اس کے ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش کی گئی جن پر سوراج پارٹی کی کونسلوں میں داخل ہونے کے بعد حکومت کو آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی سفارشات پر ایک نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ عورتوں کو رائے دہندگی کا حق دینے، ماہی گیری و جنگلات کے محکمے وزراء کے سپرد کردینے، نیچی ذاتوں کو نمائندگی کے حقوق عطا کرنے اور سیاسی قیدیوں کے لئے مجالس قانونی میں انتخاب کی غیر مشروط اجازت دیئے جانے کے سوا تقریباً تمام سفارشات ایسی ہیں جو اصلاحات میں ہندوستانیوں کے اختیارات کو وسیع کرنے کی بجائے ان کو اور زیادہ محدود کرنے والی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم چند موٹی موٹی باتوں کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اب تک کونسلوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اگر وہ وزراء کو پسند نہ کریں تو ان کی تنخواہیں نامنظور کردیں لیکن صوبہ متوسط اور بنگال کے تجربات نے حکومت پر روشن کردیا کہ اس حق کو دباؤ ڈالنے اور انتظامی آئین کو روکنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اب اس کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ وزراء کی تنخواہیں عموماً ایگزیکیٹو کونسل کے ممبروں کے برابر ہونی چاہئیں۔ لیکن اگر کوئی کونسل انہیں کم کرنا چاہے تو اسے ۳؍۵ سے کسی طرح کم کرنے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح وزراء کی پوزیشن ہمیشہ کے لیے محفوظ کردی گئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انگلستان میں ہندوستانی ملازموں کے لیے جاذبیت پیدا ہو۔ بالفاظ دیگر برطانوی ملوکیت کے فولادی شکنجہ کو مضبوط کرنے کے لئے ہندوستان کی ملازمتوں میں اس قدر زیادہ جاذبیت پیدا کی جائے کہ انگریزی پسند نوجوان خوشی خوشی ان کی طرف متوجہ ہونے لگیں۔ اگر اس کا مطلب اس کے سوا کچھ اور ہے کہ کونسلوں میں حکومت ہر شعبہ کے ہندوستانی عنصر کو بڑھانے کے لئے جو زور دے رہی ہے اس کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکے تو کم از کم ہم اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ایک دوسری سفارش کا مدعا یہ ہے کہ اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں کسی مجوزہ تحریک پر صدر کا جو کچھ فیصلہ ہو۔ اس میں عدالتوں کو مداخلت کا حق نہ دیا جائے۔ یہ دراصل اس بات کا جواب ہے کہ گزشتہ سال مسٹر سین گپتا نے بنگال ہائیکورٹ میں صدر کونسل پر ایک دعویٰ کیا تھا جس کی بنا پر عدالت نے وزراء کی تنخواہوں کا مطالبہ دوبارہ

کونسل میں پیش کرنے سے صدر کو منع کردیا تھا۔

یہ باتیں صاف ظاہر کررہی ہیں کہ اس کمیٹی کے مقاصد میں آئینی ترقی کے ذرائع سوچنا تو داخل ہی نہیں تھا' بلکہ وہ دراصل صرف اس غرض کے لئے قائم کی گئی تھی کہ ان مشکلات کے مقابلہ کی تدبیریں دریافت کرے جو کونسلوں میں ایک زبردست مزاحمت کرنے والی جماعت کے داخل ہوجانے سے پیدا ہوگئی ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد جب ہم اس کمیٹی کے فیصلوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی یہی **ارتجاعیت** کارفرما نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس میں اکثریت نے صاف طور پر اپنی تحقیقات کا یہ نتیجہ بیان کیا ہے کہ دو عملی حکومت قطعاً ناکام نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وہ بحالت موجودہ ہندوستان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور اس کی موجودگی میں آئین حکومت کو تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ اس کمیٹی کے سامنے جتنی شہادتیں پیش ہوئی تھیں وہ سب اس فیصلہ کے بالکل خلاف تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ ان وزراء اور **لیجسلیٹو** کونسل کے ہندوستانی ممبروں نے جو خود دو عملی کا تجربہ کرچکے ہیں اور جن پر عدم دیانت کا کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا اس دو عملی کی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور واضح طور پر اس بات کا اعلان کرچکے ہیں کہ اب دو عملی کو ایک لمحہ کے لئے بھی جاری نہیں رکھنا چاہیے مگر ان زبردست تصریحات کے باوجود مڈی مین اور مونکریف اسمتھ وغیرہ حضرات محض اپنی ذاتی رائے کو نتائج تحقیقات کے نام سے پیش کرکے دو عملی کے جاری رکھنے کی سفارش کرتے ہیں جسے ان کی اور حکومت ہند کی ارتجاعیت کے سوا کسی اور چیز پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس رپورٹ کو دیکھ کر ان لوگوں کے عقیدہ میں کچھ نہ کچھ تزلزل ضرور آجانا چاہیے جو اب تک دولت برطانیہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور امیدیں لگائے بیٹھے ہیں کہ آسمان پارلیمنٹ سے ان کے لئے عنقریب مائدہ سوراج نازل ہوگا لیکن اگر اب بھی وہ اپنے اس ایمان پر قائم رہیں تو ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ وہ دراصل ان لوگوں میں سے ہیں جو سراب کی حقیقت خود اسی کی زبان سے سن لینے کے بعد بھی اس سے اپنی تشنہ لبی کے علاج کی توقع رکھتے ہیں۔

* قومی امتیاز

حال ہی میں سر عبدالرحیم کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی ہے اس نے ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں میں ایک ہیجان برپا کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نازک موقعہ پر حکومت نے تمام دستوری قواعد اور پچھلی نظائر کے خلاف عمل کر کے یہ بات بالکل روشن کر دی ہے کہ وہ جس طرح پہلے ہندوستانیوں پر کوئی اعتماد نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح اب بھی ان پر اعتماد کر کے انہیں ذمہ داری کے مناسب پر مامور کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اب تک نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری برطانوی کامن ویلتھ میں اس دستور پر عمل کیا جاتا رہا ہے کہ جب کسی گورنر کی جگہ عارضی طور پر خالی ہوتی ہے تو اس کی کونسل کے سینئر ممبر کو اس کا قائم مقام بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی دستور کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنگال میں علی الخصوص اور تمام ہندوستان میں علی العموم یہ امید ظاہر کی جا رہی تھی کہ جب لارڈ لٹن عارضی طور پر وائسرائے کی خدمات انجام دیں گے۔ اس وقت سر عبدالرحیم ایگزیکٹو کونسل کے سینئر ممبر کی حیثیت سے ان کی جگہ کام کریں گے لیکن حکومت نے آئینی طرز حکومت کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ یہ بدعت کی ہے کہ ایک کالے ہندوستانی کے سینئر ممبر ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے صوبہ کے گورنر کو عارضی طور پر لارڈ لٹن کی جگہ گورنر مقرر کیا ہے۔ جب اس سے یہ سوال کیا گیا اس سے پہلے بھی اس قسم کی کوئی مثال موجود ہے کہ ایک صوبے کے گورنر کی عارضی جگہ کام کرنے کے لیے دوسرے صوبہ کا گورنر بلایا جائے۔ اس کے جواب میں لدل ونٹرٹن نے تمام پارلیمنٹ اور تمام دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونک کر کہہ دیا کہ اس سے پہلے ہندوستان میں گورنر کی جگہ عارضی طور پر کبھی خالی ہوئی ہی نہیں۔ مگر ہم انہیں اس بیسویں صدی کا یہ واقعہ یاد دلاتے ہیں کہ جب لارڈ کرزن کی جگہ کام کرنے کے لیے لارڈ ایمپتھل کو عارضی طور پر مقرر کیا گیا تھا تو گورنر مدراس کے لیے صوبہ متوسط یا کورگ کا چیف کمشنر نہیں بلایا گیا بلکہ کونسل کے سینئر ممبر سر جیمز تھامسن کو مقرر کیا گیا تھا۔ البتہ یہ بات ضرور تھی کہ سر تھامسن انگریز تھے۔

ممکن ہے کہ یہ بات ہمارے اعتدال پسندوں کے نزدیک غیر متوقع ہو، مگر وہ لوگ جو برطانوی قوم کی ذہنیت کا کافی مطالعہ کر چکے ہیں انہیں نہ صرف اسی کی توقع تھی بلکہ وہ اس سے زیادہ کی بھی توقع رکھتے ہیں۔

* * *

دہلی کا فساد

{ ۲۲ر مارچ ۱۹۲۵ء }

اشاعت گذشتہ میں ہم ۱۶ر مارچ کے فساد کی محض ایک ابتدائی رپورٹ درج کر سکے تھے۔ کیونکہ اس کی اطلاع ہم کو عین اس وقت وصول ہوئی جبکہ آخری کاپی پریس میں جا رہی تھی۔ اور ہمارے لیے چند مختصر الفاظ کہہ دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ تھا۔ مگر اب نہ صرف ۱۶ر مارچ کے تمام تفصیلی واقعات ہمارے سامنے ہیں بلکہ ۱۷ر مارچ کو حافظ محمد احمد شہید کے جنازہ پر جو دوسرا فساد ہوا ہے اس کی بھی نہایت مفصل کیفیات پر ہم کو اطلاع حاصل ہو چکی ہے۔ اور اب ہم اپنے آپ کو اس قابل پاتے ہیں کہ فساد کے اسباب اس کی ذمہ داری اور اس کے تدارک کے وسائل پر شرح و بسط کے ساتھ نظر ڈال سکیں اور اس کے ساتھ ہی بعض حلقوں سے نام نہاد سیاست دانی و مصلحت اندیشی کے لباس میں جو افسوسناک غلط بیانیاں کی جاری ہیں ان پر بے لاگ تنقید کر کے حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر سکیں۔

اس سلسلہ میں ہم یہ بات نہایت صفائی کے ساتھ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ تمام جماعتی مسائل میں ہمارا مسلک کلیتہ ”حق پرستی پر مبنی ہے اور مصلحت پرستیوں کے لیے اس میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ جس چیز کو ہم حق سمجھتے ہیں اس کے اظہار سے باز رہنا خواہ کیسے ہی زریں مصالح کا حامل ہو مگر ہمارے نزدیک وہ حد درجہ قابل نفرت ہے اور جو چیز درحقیقت باطل ہو اس کے اخفا کی کوشش کرنے یا اس سے مصلحتاً چشم پوشی کرنے میں خواہ کیسے ہی مادی و اخلاقی فوائد ہوں مگر ہم اس کو ایک بزدلانہ منافقت سمجھتے ہیں۔ مزید برآں ہم یہ بات بھی ابتداء ہی میں صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ آئندہ سطور میں جو کچھ بحث کی جائیگی وہ نہایت واضح اور ناقابل انکار حقائق پر مبنی ہوگی اور ہم ہر وقت تیار ہوں گے کہ اگر کسی صاحب کو اس کے کسی لفظ پر شبہ ہو تو اپنے بین دلائل سے ان کو مطمئن کر دیں۔

* فساد کی ابتداء اور اس کے اسباب

اس فساد کی ابتدا اور اس کے اسباب کی تحقیق میں اگر محض ظاہر بینی کے بجائے ذرا عمق سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا کہ عام خیال کے مطابق یہ کوئی حدیث العہد پیداوار نہیں، بلکہ دراصل ان گہرے جذبات نفرت و عداوت کا نتیجہ ہے جو بعض خود غرض فساد پسندوں نے ڈیڑھ دو سال سے دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا کر رکھے ہیں۔ اگرچہ سال گذشتہ کے فسادات نے بڑی حد تک دلوں کا بخار نکال دیا تھا، مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ اتنے کشت و خون اور مالی نقصانات کے بعد بھی دلوں کی یہ آگ پوری طرح بہ بجھ نہ سکی اور گذشتہ نو مہینہ کی طویل عدالتی کارروائیوں کا نتیجہ جب مسلمان ملزموں کی کامل بریت کی صورت میں نمودار ہوا تو وہ نئے سرے سے بھڑک اٹھی۔ علاوہ ازیں اس کے بجھنے اور دوبارہ بھڑک اٹھنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ فساد کے اصل بانیوں اور پس پردہ کام کرنے والے اشرار کی تلاش و تحقیق اور ان کے استیصال کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ مقامی حکام ہمیشہ ان بے گناہ لوگوں کی پکڑ دھکڑ میں مشغول رہے جو بیچارے محض ان اصل مفسدوں کی شرانگیزیوں کے شکار ہوئے تھے اور جن پر اس آگ کے بھڑکانے کی ذرہ برابر بھی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔

تاہم اگر ان بنیادی اسباب سے قطع نظر کر لیا جائے تو ہم کو یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کہ فساد اس مخلوط انتخاب کے بلا واسطہ نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کو مدتوں سے باشندگان دہلی پر ان کی مرضی کے خلاف مسلط کرنے کی بعض سیاسی جماعتیں کوشش کر رہی تھیں۔ اگرچہ شہر کی بدقسمتی سے اس جماعت نے اپنی کج فہمی کے باعث چیف کمشنر صاحب کو مخلوط انتخاب کی تجویز مسترد کرنے کا موقع دے دیا تھا اور ان کے حکم سے تازہ انتخابات کے موقع پر حلقہ ہائے انتخاب پہلے کی طرح جداگانہ ہی رکھے گئے تھے لیکن صدر بازار اور علاقہ نمبرے میں کوئی مقابلہ کا امیدوار نہ ہونے کی وجہ سے مخلوط انتخاب کو بھی امتحان کا موقع حاصل ہو گیا اور اب ہم اپنے ان دوستوں سے جو آخر وقت تک جداگانہ انتخاب کی مخالفت کرتے رہے ہیں یہ عرض کر سکتے ہیں کہ جو طریق انتخاب آپ کے نزدیک اتحاد پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا وہ نہ صرف یہ کہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا، بلکہ اس نے اس کے عین برخلاف بغض و عناد کے جذبات کو اور بھی

زیادہ مشتعل کردیا اس اشتعال کی فضا میں مخلوط انتخاب کا سسٹم استعمال کرنے کا یہ کوئی عقل مندانہ طریقہ نہیں ہے کہ انہیں مصنوعی طریقہ سے مخلوط کر کے تصادم کا موقع دیا جائے۔ بلکہ ایک سمجھدار آدمی سب سے پہلے ان کے اس تضاد و تخالف کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو ان کے باہمی امتزاج میں مانع ہوتے ہیں اور جب تک وہ دور نہ ہوں انہیں الگ ہی رکھنا زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔

* پہلا فساد اور اس کی ذمہ داری

اب اصولی بحث کو چھوڑ کر حقائق پر نظر ڈالئے۔ آپ کے سامنے ۱۶ مارچ کے فساد کی مفصل کیفیت موجود ہے۔ آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ صدر بازار کے حلقہ میں مسٹر عبدالعزیز وکیل کے مقابلے پر کوئی دوسرا امیدوار موجود نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان رائے دہندوں نے بھی ہندو نشست کے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندو نشست کے دو امیدواروں میں سے ایک کو اس کے جماعتی تعصب کی بنا پر ہندوؤں کی اکثریت سپورٹ کر رہی تھی اور دوسرا اپنی بے تعصبی کے باعث سنگھٹنی حلقوں میں مبغوض اور مسلمانوں میں ہر دلعزیز تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے کہ انتخابی جدوجہد میں چوہدری لوٹن سنگھ نے جو دہلی میں سنگھٹن کے روح رواں ہیں نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور اپنے مخالف فریق پر لاٹھیوں کا دباؤ ڈال کر انہیں ووٹنگ میں حصہ لینے یا بالفاظ دیگر اپنے حق رائے دہندگی کے استعمال سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس امر واقعہ میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ لوٹن سنگھ کی مخالف پارٹی زیادہ تر مسلمانوں سے مرکب ہے۔ لڑائی کا آغاز لوٹن سنگھ کی لٹھ بازی اور مزاحمانہ کارروائیوں سے ہوا۔ اصل جائے انتخاب پر کوئی زیادہ لڑائی نہیں ہوئی بلکہ جنگ کا اصل میدان نئے بانس اور صدر بازار کے درمیان کا راستہ تھا۔ جہاں راہ گیر مسلمانوں کو جن کا انتخابی جد وجہد سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا' بلا وجہ مارا گیا اور اس مار پیٹ میں بہت زیادہ مسلمان زخمی ہوئے۔

اگر ان واقعات کو جن کی واقعیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا مندرجہ بالا ترتیب کے ساتھ دیکھا جائے تو کوئی غیر جانب دار حق پسند انسان یہ ماننے سے انکار

نہیں کر سکتا کہ ۱۶ مارچ کی جدوجہد میں سنگھٹنی جماعت نے مفسدانہ طرز عمل اختیار کیا۔ اسی نے فساد کی ابتدا کی اور پھر اسی نے اس معاملے کو جو انتخابی جدوجہد سے تعلق رکھتا تھا ہندو مسلم مسئلہ بنا کر مسلمانوں پر لٹھ برسائے۔

* دوسرے دن کا فساد اور اس کی ذمہ داری

اب دوسرے دن کے واقعات پر نظر ڈالیئے۔ ۱۶ مارچ کے فساد میں جو مسلمان زخمی ہوئے تھے ان میں سے ایک تو اسپتال میں انتقال کر گیا۔ شہر میں انجمن اسلامیہ یا کسی دوسری اسلامی جماعت کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ کل کے شہید کی نماز جنازہ جامع مسجد میں پڑھائی جائے گی۔ اس پر جامع مسجد میں تین چار سو مسلمان جمع ہو گئے۔ نماز سے قبل امام صاحب اور مسٹر فقیر محمد نے تقریریں کیں جن میں ہم خود بھی موجود تھے اور ہم ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ سوائے صبر کی تلقین اور تعمیری کام کی ضرورت کے علاوہ انہوں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جسے اشتعال انگیز کہا جا سکتا ہو پھر جنازہ اٹھا' مسجد سے باہر نکلنے کے بعد کثیر تعداد میں مسلمان جنازہ کے ساتھ ہو گئے۔ حوض قاضی پر پہنچ کر بعض عاقبت اندیش مسلمانوں نے تحریک کی کہ جنازہ شہر کے باہر باہر قبرستان تک لے جایا جائے لیکن چند دوسرے لوگوں نے اسے پسند نہ کیا اور وہ اس کو اندرون شہر ہی کی شاہراہوں سے لے گئے۔ نئے بانس پر پہنچ کر دفعتہ" ہندوؤں کے مکانات سے جنازہ پر پتھر آنے شروع ہو گئے۔ اس پر مسلمانوں میں اشتعال کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ وہ بھڑک اٹھے اور فساد کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

یہ واقعات جو تھوڑے تغیر کے ساتھ خود ہندو اخبارات میں بھی مندرج ہیں۔ حادثہ کی اصل بنیاد ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد ہم ہر اس شخص سے جو مصلحتوں کے مقابلہ میں حق و انصاف کو زیادہ عزیز رکھتا ہو' یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ بعد کے تمام افسوس ناک واقعات کا ذمہ دار کس کو قرار دے گا کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے ایک ایسے شخص کی نماز جنازہ کا خلاف معمول اعلان کیا جس کا فساد میں شہید ہونا بذات خود مسلمانوں کے لیے باعث اشتعال تھا اور اس طرح مجمع اکٹھا کر کے انہوں نے دوسری غلطی یہ کی کہ بیرون شہر کا راستہ چھوڑ کر اندرون شہر کا راستہ اختیار کیا اور عین اسی بازار میں سے جنازہ

کو لے گئے جہاں وہ شخص شہید ہوا تھا لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ ان دونوں افعال میں سے کس فعل کو آپ ناجائز یا خلاف قانون یا تجاوز عن الحدود پر مبنی قرار دے سکتے ہیں؟ کیا نماز جنازہ کے لیے مسلمانوں کو اکٹھا کرنا کوئی ناجائز فعل تھا؟ کیا مسلمانوں نے نماز جنازہ کا اعلان کرکے کسی دوسری جماعت کے حقوق میں دست اندازی کی تھی؟ اندرون شہر سے جنازہ کو لے جانا کسی معنی میں بھی زیادتی کہا جا سکتا ہے؟ کیا وہ راستہ قانوناً ممنوع قرار دیا گیا تھا؟ کیا ان راستوں سے رات دن جنازے نہیں گزرتے؟ کیا اس طرح جنازہ کو لے جانا کسی حیثیت سے خلاف قانون یا برادران ہنود کے لیے باعث دل آزاری کہا جا سکتا ہے؟ ان سولات کے جواب میں اگر حد سے حد کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ کہ مسلمانوں نے نماز کے اعلان اور راستہ کے اختیار کرنے میں کوئی ناجائز یا خلاف قانون حرکت تو نہیں کی، مگر ایسے موقع پر جبکہ دونوں اطراف جذبات مشتعل ہو رہے تھے، ان باتوں سے اشتعال کا بڑھ جانا ایک قدرتی امر تھا اور اسے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ان افعال کو خلاف مصلحت ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن ہم یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ مسلمانوں کے یہ دونوں فعل موقع و محل کے لحاظ سے نامناسب تھے۔ انہیں الزام دینے والوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک مسلمانوں کا ایک نیم ہندو بازار سے جنازہ کو لے کر گزرنا ہندوؤں کے لیے اس بات کو جائز کر دیتا ہے کہ وہ جنازہ پر پتھروں اور اینٹوں کی بارش کریں؟ کیا جنازہ لے کر گزرنے کو کسی حیثیت سے بھی ہندوؤں کے لیے باعث اشتعال اور سنگباری کا محرک قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا مصلحت پرست بزرگ جرأت فرماکر یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ جنازہ پر پتھر برسانا مسلمان عوام کے لیے کوئی باعث اشتعال بات نہیں تھی؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً ہونا چاہئے تو تمام جانبداریوں سے قطع نظر ہمیں خالص حق اور انصاف کے نقطہ نظر سے بتلائیے کہ آپ کے نزدیک فساد کی ابتداء کس نے کی اور آتش گیرمادوں کو دیا سلائی دکھانے کے بعد جو بربادی و تباہی نازل ہوئی اس کا ذمہ دار کس کو قرار دیا جائے گا؟۔

* حق اور انصاف کی بات

ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی کے بعض سیاسی حلقوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو فساد کا

یکساں ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے اور حقائق کو نظرانداز کر کے محض اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ کسی جماعت کو اس کے متعلق جانبداری کی شکایت پیدا نہ ہونے پائے مگر ہم نہایت صفائی سے یہ بات عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اصل غیر جانبداری وہ نہیں ہے جسے ہمارے ان مقتدر دوستوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ حقیقی غیر جانبداری حق اور انصاف کا نام ہے۔ آپ محض حقائق پر نظر ڈالئے اور واقعات کو ان کی اصل روشنی میں دیکھئے اور اس کے بعد جس کا جتنا قصور ہو اسے بے کم وکاست ظاہر کر دیجئے۔ خواہ اس میں مسلمانوں کو شکایت کا موقع ملے یا ہندوؤں کو' آپ کے سامنے اول سے لے کر آخر تک جنازے کے نہایت کھلے ہوئے واقعات موجود ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ فساد کی ابتدا ہندوؤں کی جانب سے ہوئی اور انہوں نے خود ہی اس آگ کو مشتعل کیا۔ اور آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ظالم وہی ہے جو ابتدا کرے پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ کسی غیر متعلق مصلحت کی بنا پر حق بات کہنے سے احتراز کریں۔ آپ کو صاف کہنا چاہئے کہ پہلے فساد کے ذمہ دار کلیتہ" ہندو ہیں اور دوسرے فساد کی ذمہ داری مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی، بے احتیاطی اور ہندوؤں کی فساد پسندی و شرانگیزی پر عائد ہوتی ہے' یعنی بحیثیت مجموعی ان فسادات کی ذمہ داری میں مسلمانوں کا حصہ حد سے حد دس فی صد ہے نہ کہ برابر برابر۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے نزاعات کے موقع پر ہر شخص کا اپنی ہی جماعت کو دبانا زیادہ مفید ہوتا ہے اور ایک فریق کے آدمی کا دوسرے فریق کو ملامت کرنا خواہ کتنا ہی جائز و معقول وجوہ پر مبنی کیوں نہ ہو' کبھی رفع شر میں مفید نہیں ہو سکتا مگر اپنی جماعت کو دبانا اور بات ہے اور حق کے خلاف اسے جا وبے جا الزام دینا اور بات ہے۔ آپ ایک ہی وقت میں اعلان حق بھی کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی رفع شر کے لیے زجر و توبیخ کی زبان بھی کھول سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان اس فساد کے ذمہ دار نہیں ہیں اور وہ زبردستی اس میں کھینچے گئے مگر پھر بھی دوران فساد میں ان سے جو کچھ مجنونانہ حرکات ہوئیں وہ سخت قابل ملامت ہیں اور ان کو کسی حال میں جائز نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح اگر آپ مسلمانوں کو یہ تلقین کریں کہ خواہ انہیں کتنا ہی اشتعال دلایا جائے' لیکن کبھی ان کو اس طرح مشتعل ہو کر ایسی حرکات نہیں کرنی چاہئیں جو ان کے دین و مذہب کے بھی خلاف ہیں تو کوئی شخص آپ سے شکایت نہیں کر سکتا۔

حجاز ریلوے

{۲۶ر مارچ ۱۹۲۵ء}

برطانوی دارالامراء میں لارڈ ریگلن نے اپنی حکومت کو اس جانب توجہ دلائی ہے کہ حجاز ریلوے کا مسئلہ زائرین حرم کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے اگر وہ تھوڑا سا روپیہ خرچ کرکے اس لائن کی تعمیر مکمل کرا دے اور اس کا انتظام درست کرے تو اس طرح اسے تمام دیندار مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں لارڈ انسلو نے حجاز ریلوے کے ان قطعات کا حال بیان کرنے کے بعد جو براہ راست برطانوی انتظام میں ہیں اس امر کا اعلان کیا کہ حکومت اس معاملہ پر غور کر رہی ہے کہ عمان (شرق اردن) کے جنوب میں اس ریلوے لائن کے جو قطعات ہیں ان کو بھی اپنے انتظام میں لے لے۔ اگرچہ لارڈ انسلو نے اپنے مطلب کو زیادہ واضح طور پر بیان نہیں کیا اور لارڈ ریگلن نے بھی اپنا مدعا مسلمان حجاج کی بہی خواہی کے پردہ میں لپیٹ کر ظاہر کیا ہے، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ قلب عرب میں انگریزی اقتدار کی توسیع کے لیے حجاز ریلوے پر قبضہ کرنے کی تجویز مدتوں سے جاری ہے اور اب غالباً اس پر عملدر آمد کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔

ہم اس قسم کی کاروائیوں سے پہلے حکومت برطانیہ کو صاف الفاظ میں تنبیہ کیے دیتے ہیں کہ حجاز ریلوے پر اس کے قبضہ کو دنیائے اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اگر وہ یہ حرکت کر بیٹھی تو اس سے “دیندار مسلمانوں” کا اعتماد حاصل کرنا تو درکنار اسے ان کی سخت ناراضی و مخالفت مول لینی پڑے گی۔ اس میں شک نہیں کہ ریلوے کی حالت بہت خراب ہے اور حجاج کی آسانی کے لیے نہ صرف اس کا حسن انتظام ضروری ہے بلکہ اسے مدینہ سے جدہ تک وسیع کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے لیکن باوجود ان تکالیف کے جو ان نقائص کی بدولت زائرین حرم کو برداشت کرنی پڑتی ہیں ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ انگریزی سرمایہ اور انگریزی محنت سے ان کو دور کرنے کا کوئی انتظام کیا جائے اور یہ صرف اسی لیے نہیں کہ ہم ارض مقدس میں غیر مسلم کے قدم رکھنے کو پسند نہیں کرتے بلکہ اس لیے بھی کہ ہمیں آج تک

انگریزی قوم کی تاریخ میں اس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ اس نے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا کوئی کام اپنی ذاتی اغراض کے بغیر انجام دیا ہو۔

اس باب میں ٹائمز آف انڈیا نے اپنی قومی حکومت کو جو مشورہ دیا ہے وہ ہماری رائے سے بہت زیادہ مناسب ہے۔ اس کا قول ہے کہ خواہ حجاج کی حالت کیسی ہی ابتر ہو' انگریزوں کا ان کی فلاح کے لیے کوئی کاروائی کرنا غلط فہمیاں پیدا کئے بغیر نہ رہے گا کیونکہ ان پر عرصہ سے یہ بدگمانی کی جارہی ہے کہ وہ جزیرۃ العرب میں مداخلت کے بہانے ڈھونڈا کرتے ہیں اور اس لیے اس کی رائے ہے کہ جب تک خود مسلمان برطانوی حکومت سے حجاز ریلوے کا انتظام کرنے کے لیے کوئی درخواست نہ کریں اسے اس قسم کی کوئی کاروائی نہ کرنی چاہیے۔

* لارڈ کرزن

رپوٹر کے ایک تار نے ہمیں لارڈ کرزن کے مرنے کی خبر سنائی ہے۔ یہ شخص برطانوی حکومت کے اعاظم رجال میں سے تھا اور ہم سمجھتے ہیں کہ انگریزی قوم اس کے فقدان پر جتنا افسوس کرے کم ہے مگر انگریزی قوم کے ساتھ اس نے ہندوستان اور اسلام کی بھی بہت سی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ جن کی بنا پر وہ ہم پر بھی کچھ حق رکھتا ہے' اگرچہ اس کی نوعیت اظہار کی مرہون منت نہیں ہے۔

لارڈ کرزن کی زندگی میں جو چیز ہم کو سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ ان کی اقتدار پسندی و استبداد ہے۔ وہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے ایک سخت حریص اقتدار شخص تھے اور یہی چیز ساری عمر ان کے ساتھ رہی تھی کہ انہیں عروج پر بھی اسی نے پہنچایا۔ اس کے ساتھ دوسری چیز جسے ان کی حیات سیاسی کا جوہر کہنا چاہئے' ان کا یہ عقیدہ تھا کہ انگریز انسان اعلیٰ (Superman) ہونے کی حیثیت سے دنیا بھر کو اپنا غلام بنانے کا حق رکھتے ہیں۔ ان دونوں باتوں نے ملکر ان کو ایک ایسا زبردست برطانوی مدبر بنا دیا تھا کہ دور جدید کی انگریزی تاریخ میں مشکل سے ان کا جواب ملتا ہے۔

کرزن صاحب کی زندگی ابتداء ہی سے شاندار رہی ہے۔ کالج سے نکلتے ہی وہ ۲۶ برس کی عمر میں برطانیہ کے مشہور کنسرویٹو وزیر اعظم لارڈ سالسبری کے پرائیویٹ سیکریٹری

مقرر ہوئے۔ ۳۲ سال کی عمر میں نائب وزیر ہند اور ۳۶ برس کی عمر میں نائب وزیر خارجہ بنائے گئے اسی دوران میں انہوں نے ایران' وسط ایشیا' افغانستان' جزائر شرق الہند اور کوریا کی سیاحت کی اور "روس وسط ایشیا میں"۔ "ایران اور مسئلہ ایران" اور "مسائل مشرق اقصیٰ" کے عنوان سے وہ معرکتہ الآرا کتابیں لکھیں جو سیاست مشرقیہ کے انگریز لٹریچر میں مستند تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان قابلیتوں نے انگلستان کے سیاسی حلقوں میں ان کی دھاک بٹھا دی اور تسلیم کر لیا گیا کہ لوٹن و ڈفرن اور ڈلہوزی جیسے فراعنہ استبداد کی جانشینی کے لیے ان سے بہتر فرعون کا ملنا مشکل ہے۔ چنانچہ ۴۰ سال کی چھوٹی سی عمر میں ان کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ یہاں آکر انہوں نے جو جو کاروائیاں کیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ متعدد حیثیات سے ان کا درجہ اپنے پیشرو فراعنہ سے بڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے بنگال کی بڑھتی ہوئی قوم پرستی کو تقسیم بنگال کے ذریعہ زک پہنچانے کی کوشش کی۔ سرحدی قبائل پر وحشیانہ مظالم کا دروازہ کھولنے کے لیے سرحد کے پانچ اضلاع کو ایک مستقل صوبہ بنا دیا۔ حضور نظام پر بے جا دباؤ ڈال کر ان سے برار کا دوامی پٹہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۹-۱۹۰۰ کے مشہور قحط سے تین سال بعد ہندوستان کا لکھوکھا روپیہ ایک ایسے شاہانہ دربار میں اڑا دیا جس کی مثال برطانوی ہند کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ ہندوستان میں ان کے کارہائے نمایاں کی چند مثالیں ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جابر حکمران کی حیثیت سے ویلزلی ہیسٹنگز' ڈلہوزی اور ڈفرن وغیرہ پر ان کو بمدارج فوقیت حاصل تھی۔

ہندوستان میں لارڈ کرزن کی پالیسی دو بنیادوں پر قائم تھی۔ ایک ان کی فطری مطلق العنانی اور دوسری ان کی جباری و قہاری۔ پہلی چیز کی بدولت انہیں ایک حکمران کی حیثیت سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کیونکہ انہوں نے تمام اختیارات کو اپنی ذات میں مرکوز کر لینے کی کوشش کی اور دوسری چیز نے ان سے ہندوستان کی خواہش آزادی کو فنا کرنے کے لیے وہ حرکتیں کرائیں جن کے باعث وہ ہندوستان کے "انارکزم" کے آدم خیال کیے جاتے ہیں اور عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ قومی بیداری اور حریت پرور تحریکات انہی کے تازیانہ ظلم و ستم کی رہین منت ہیں۔

۱۹۰۵ء میں ہندوستان کی **وائسرائلٹی** کے ساتھ لارڈ کرزن کی شاندار زندگی کا پہلا

باب ختم ہو گیا اور اس کے بعد دوسرا باب ۱۹۱۹ء میں اس وقت شروع ہوا جب وہ پہلے سے بھی زیادہ اعزاز و اختیار کے ساتھ برطانوی وزیر خارجہ کی حیثیت سے سیاسیات عالم کے اسٹیج پر ایک پولیٹیکل جلاد کا پارٹ ادا کرنے کے لیے بر آمد ہوئے۔ اس مرتبہ انہوں نے اسلام کی ایسی زبردست خدمات انجام دیں کہ جب تک دنیائے اسلام کی موجودہ بیداری کے حالات صفحات تاریخ پر باقی رہیں گے ان کی خدمات کو کوئی قوت محو نہ کر سکے گی۔ انہوں نے اسلام کی سب سے بڑی قوت کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے، تھریس، سمرنا، آرمینیا اور قسطنطنیہ پر صلیبی علم بلند کرانے، جزیرۃ العرب کی مقدس سرزمین سے اسلامی اقتدار کو مٹا دینے اور افغانستان و ایران وغیرہ ممالک اسلامیہ پر برطانوی ملوکیت کا جال بچھانے کے لیے وہ کوششیں کیں، جنکی یاد ابھی تک ہمارے حافظہ میں محفوظ ہے اور شاید ابھی برسوں محفوظ رہے گی۔

یہ اس زبردست برطانوی مدبر کی زندگی کا خلاصہ ہے جس کو ہم ایک سیاست دان، ایک مدبر اور ایک منتظم کی حیثیت سے کسی طرح کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ مگر ایک گمراہ ملوکیت پرست، ایک غلط اندیش سیاست دان اور ایک کوتاہ قامت لیڈر کی حیثیت دے سکتے ہیں اور برطانیہ کی ان عظیم الشان شخصیتوں میں شمار کرتے ہیں جن کا درجہ بیکنز اور سالسبری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

* لالہ ہردیال کی زہر افشانی

مقامی اخبار "تیج" نے ہندوستان کے مشہور انقلاب پسند لالہ ہردیال کا ایک مضمون "بدیشی نام کی کانگرس میں جانے کی ضرورت نہیں" کے عنوان سے اپنی ایک قریبی اشاعت میں درج کیا ہے۔ جسے دیکھ کر ہمیں سخت افسوس ہوا کہ آج کل برادران ہنود میں اس قدر مسموم اور زہریلے خیالات کی اشاعت کی جا رہی ہے جن کے نتائج ہندوستان کے مستقبل کو شاندار بنانے کی بجائے اور زیادہ تاریک کر دیں گے۔ لالہ ہردیال کے متعلق اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کسی زمانہ میں ایک بہت بڑے محب وطن تھے۔ اسی حب الوطنی کی خاطر انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف خفیہ تحریکات میں حصہ لیا تھا۔ اسی کی پاداش میں انہیں جلاوطن ہونا پڑا اور آج کل اسی کی بدولت وہ سویڈن اور جرمنی

میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ لیکن ان دنوں ہندوستان کی فضا اس درجہ خراب ہو رہی ہے کہ ایسے لوگ بھی اس کے برے اثرات سے بچ نہیں سکے اور وہ اپنی قوم کو اتنی زہریلی تعلیم دے رہے ہیں جس کے آگے لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مالوی تک کی تعلیمات ہیچ نظر آتی ہیں۔

لالہ جی کے مضمون کا مدعا ہندو قوم میں اس خیال کی اشاعت کرنا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد بجائے مفید ہونے کے ایک مضرت رساں چیز ہے۔ اس لیے ہندوؤں کو مسلمانوں سے اتحاد کرنے کی تمام خواہشات کو ترک کر کے ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ یہ تلقین کرتے ہیں کہ جب تک ہندوستان میں اسلام اور عیسائیت کا وجود باقی ہے، ہندوستان کو امن و چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شدھی کے بغیر سوراج کا وجود ناممکن ہے۔ ان کا یہ مضمون کانگرس کی مخالفت سے شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلی تلقین وہ یہ کرتے ہیں کہ:

> ”کانگرس جیسی بدیشی نام کی عجیب مجلس میں جانے کی ہم کو اب ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے ہندو سبھا ہی سب کچھ ہے اور ہم اسی کے ذریعہ سے سارا قومی کام کریں گے“۔ اس کے بعد وہ خود یہ سوال کرتے ہیں کہ جب کانگریس مٹادی جائے گی تو پھر مسلمان کس مجلس میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں گے اور پھر خود ہی اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ مسلمانوں سے اتحاد کی ضرورت ہی نہیں ہے“

وہ ایک الگ قوم ہیں، نہ ہمارے تہواروں میں شامل ہوتے ہیں، نہ ہماری زبان کو پسند کرتے ہیں۔ نہ ہندوستانی نام رکھتے ہیں اور نہ ان کو پنجاب یا ہندوستان سے محبت ہے ایک مسلمان کے لئے ناممکن ہے کہ یکایک ہندوستانی یا پنجابی محب وطن بن جائے وہ صرف محب اسلام بن سکتا ہے۔ ایسے مسلمانوں سے دلی اتحاد کی امید رکھنا حماقت ہے۔ ان کے نزدیک ہندو مسلمانوں کا مل کر کام کرنا اگر کسی صورت سے ممکن ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ حکومت ہندو ہو اور مسلمان اس میں رعایا کی حیثیت سے کام کریں وہ دونوں کی مشترکہ حکومت کو بالکل ناممکن خیال کرتے ہیں اور اس لئے صاف کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا مقصد پنجاب (ہندوستان) میں ایک ہندو ریاست قائم کرنا ہے۔ اگر وہ یہیں تک رہتے تب بھی

غنیمت تھا مگر آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ محض ہندو راج سے بھی ان کا اطمینان نہیں ہوتا وہ ہندوؤں کے محکوم کی حیثیت سے بھی ہندوستان میں ان کے وجود کو برداشت نہیں کرسکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> "جب تک پنجاب اور ہندوستان بدیشی مذہبوں سے پاک نہ ہوگا تب تک ہمیں کبھی چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش کو نہیں مانتا ہے وہ کپوت ہے۔ بے جان ہے۔ مردہ دل ہے' بے سمجھ ہے۔ ہر سچے ہندو کی خواہش ہونی چاہیے کہ اپنے دیش کو اسلام اور عیسائیت سے پاک کردے۔ پنجاب اور ہندوستان میں دونوں مل کر نہیں رہ سکیں گے یا سب ہندو اسلام قبول کرلو یا سب مسلمانوں کو شدھی کے ذریعہ سے ہندو بنالو۔ یہی اس سوال کا حل ہے"۔

ان الفاظ میں مسلمانوں کے لئے جیسا کھلا چیلنج موجود ہے۔ اس کی تشریح غیر ضروری ہے مگر ہمارا یہ مجنون دوست صرف اتنا ہی زہر اگلنے پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ آگے چل کر اسلام پر ایک اور وار کرتا ہے جس سے اس کی دماغی حالت کا مزید حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> "مذہب اسلام ایک ایسی انوکھی چیز ہے کہ مسلمان کسی ملک میں دوسری قوموں کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتے۔ اتفاق اور امن کے لئے ضروری ہے کہ یا صرف اسلام ہو یا اسلام بالکل نہ ہو۔ بیس فیصدی اسلام سے صرف بلوے فساد ہونگے۔ بیس فیصدی اسلام کے روڑے کو کوئی ہضم نہیں کرسکتا۔ جس ملک نے اس پتھر کو نگل لیا ہے اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہے گا ہندوستان میں بیس فیصدی اسلام اور پنجاب میں پچاس فیصدی اسلام صرف نفاق اوربدامنی کا سرچشمہ ہے۔ اسلام کبھی دوسری قوموں اور مذہبوں سے نہیں مل سکتا۔ یہ ایک تاریخی اور سیاسی صداقت ہے"۔

ہم نے اس قدر طویل اقتباسات محض اس لئے دیئے ہیں کہ قارئین کرام کو اس زہریلے مضمون کی سمیت کا پورا پورا اندازہ ہو جائے۔ اب اس کے بعد ہم ہر شخص سے پوچھتے ہیں کہ جب کسی قوم کو اس قسم کی زہر سے بجھی ہوئی تعلیم دی جانے لگے تو کیا یہ

امید کی جاسکتی ہے کہ وہ کبھی اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ مل کر رہ سکے گی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ابھی تک تو گائے، زبان، باجے، گانے اور سیاسی حقوق کے محض فروعی معاملات، مابہ النزاع ہیں، جن میں آج نہیں تو کل ان کا اختلاف دور ہوسکتا ہے لیکن اب اس اختلاف کو فروعی حیثیت سے آگے بڑھاکر ایک مستقل قومی عداوت کا رنگ دیا جارہا ہے اور ہندوؤں کے دل میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ہی سرے سے مٹا دینے کے قابل ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان بھی اتحاد و اتفاق کے تمام خیالات کو اپنے دماغ سے نکال کر ایک قطعی اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار ہوجائیں اور پھر دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسی ہولناک کشمکش کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ جس کا ختم ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک یا تو ۷ کروڑ مسلمان اس براعظم سے مٹ جائیں یا ۲۲ کروڑ ہندو پھر کیا ہمارے جنگجو دوست ہندوستان کو کسی ایسی ہولناک خانہ جنگی میں مبتلا کردینا چاہتے ہیں۔ کیا ان باتوں سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اس بدنصیب ملک کو کبھی امن و چین نصیب نہ ہو؟ کیا وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ ہندوستان کو قتل و غارت اور لوٹ مار کا ایک دائمی آتش کدہ بنادیں؟ اگر فی الحقیقت وہ یہی چاہتے ہیں تو آؤ، ہم سب ملکر ایک دفعہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی قسمت کو رولیں۔

ہم اپنے معزز ہم عصر “تیج” سے پوچھتے ہیں کہ اس نے آخر کیا سمجھ کر لالہ ہردیال کے ان آتشیں خیالات کو پبلک میں پیش کیا ہے؟ وہ لالہ صاحب کو “محب وطن” کے لفظ سے یاد کرتا ہے مگر کیا کوئی ایسا شخص بھی محب وطن کہلایا جاسکتا ہے جو اپنے وطن کو ایک غیر محدود مدت کے لئے خانہ جنگی و فساد کی دوزخ بنا دینا چاہتا ہو؟ کیا کوئی شخص جو اپنے وطن سے ذرہ برابر محبت رکھتا ہو ایسا مضمون لکھنا تو درکنار، اسے شائع کرنا بھی گوارا کرسکتا ہے؟ ممکن ہے کہ “تیج” اور اس کے ہم مشرب لوگوں کے خیال میں اسی چیز کو حب وطن کہتے ہوں مگر ہوش مندوں کی بولی میں تو اس کو وطن کشی، جنگجوئی، فساد پروری اور شرانگیزی کہتے ہیں۔

☐ فرنگیانہ مذہبیت

{ ۲۹ر مارچ ۱۹۲۵ء }

آج کل مذہبی آزادی کچھ ایسی وبا کی طرح پھیل رہی ہے کہ ہر وہ شخص جو قلم پکڑنا جانتا ہے بے تکلف اسلام اور مذہب کے نام سے اپنے ان خیالات کو پیش کرنے لگتا ہے جو یکسر افرنجیات باطلہ "بالکل ملحدانہ" سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ حال میں "مراد آباد" کی آل انڈیا سنی کانفرنس نے اپنے ایک جلسہ میں یہ ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ ارتداد کی سزا میں حکومت افغانستان کا چند احمدیوں مرزائیوں کو سنگسار کردینا ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے جس میں کسی مداخلت کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اس پر ہم عصر بمبئ کرانیکل سخت برہم ہے اور کہتا ہے کہ سنی کانفرنس کو اس قسم کا ریزولیوشن پاس کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ سنی مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہے اور خود سنی مسلمانوں ہی کی ایک روشن خیال جماعت سزائے سنگساری کے خلاف آواز بلند کررہی ہے۔ جہاں تک وہ سنی کانفرنس کے حق سے بحث کرتا ہے ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں۔ کیونکہ یہ اس کا تجزیہ ہے لیکن جب وہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ یہی مسلمان ہر جگہ اس خلاف انسانیت سزا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں جو افغانستان میں جاری ہے اور جس کی قرآن میں کوئی اجازت نہیں تو ہمیں اس کے جہل مرکب پر بے اختیار ہنسی آتی ہےوہ اپنے زعم میں سزائے رجم کو خلاف انسانیت قرار دیکر اپنی تہذیب اور روشن خیالی کی کوئی بہت بڑی مثال پیش کرتا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ پیغمبر اسلام ہی کے متعلق وہ مدعی ہے کہ ان سے اس قسم کی کوئی سزا ثابت نہیں۔آپ زانی محض کو یہی سزا دیتے تھے اور ایسی ہی دوسری سزائیں مثلاً ہاتھ کاٹنا اور ورے لگانا جن کو ہمارا ہمعصر فرنگی علم اخلاق کی روشنی میں یقیناً وحشیانہ اور خلاف انسانیت قرار دے گا قرآن میں چوری و زنا کے لئے مقرر فرمائی گئی ہیں۔ کرانیکل کے محترم مدیر نے جہاں تک ہمیں معلوم ہے قرآن و حدیث اور علوم اسلامیہ کی تحصیل میں اپنی زندگی کاایک ہزار واں حصہ بھی صرف نہیں فرمایا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ ادنیٰ سی شرمندگی محسوس کئے بغیر حکم لگاتے ہیں کہ سنی کانفرنس کا یہ فیصلہ اس کی مذہب سے کامل ناواقفیت کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ فتویٰ بھی صادر فرماتے ہیں کہ اگر زمانہ گزشتہ میں یہ وحشیانہ سزا کسی مسلمان فرمانروا نے

جاری کی ہے تو اس نے شارع اسلام کی تعلیمات کے بالکل خلاف عمل کیا ہے کیونکہ وہ تو مذہبی ٹھیکیداروں کی پھیلائی ہوئی ادہام پرستی کے باطل اثرات کو مٹانے کے لئے آئے تھے اور انہوں نے صرف انسانی عقل کی مرشدانہ ہدایت پر اعتماد کی تعلیم دی تھی۔ اس طرح ہمارے اس محترم ہمعصر نے ایک طرف اپنی دینی واقفیت کا بلند بانگ دعوی کیا ہے اور دوسری طرف ایک ایسی بات کہی ہے کہ جو شریعت سے اس کی انتہائی ناواقفیت پر دلالت کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس نے سنگ ساری جیسی وحشیانہ سزا دی ہے اس نے شارع کی تعلیمات کے خلاف عمل کیا ہے۔ حالانکہ اگر اس کے نزدیک سنگساری کوئی وحشیانہ سزا ہے تو کسی اور سے پہلے خود شارع ہی نے متعدد مرتبہ اس قسم کی اور اس سے بھی زیادہ سخت سزائیں دی ہیں اور بعد میں جس کسی مسلمان فرمانروا نے حدود شرعیہ جاری کی ہیں اس نے شارع علیہ التحیتہ والسلام ہی کا اتباع کیا ہے پھر شارع اسلام پر تہمت لگاتا ہے کہ ”انہوں نے انسانی عقل کی مرشدانہ ہدایت پر اعتماد کی تعلیم دی تھی“ حالانکہ اس غریب کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ شارع کی بعثت کا مقصد وحید انسانی عقل کی کرشمہ سازیوں کا استیصال کرکے آسمانی ہدایات کا دستور العمل نافذ کرنا تھا۔ تاکہ انسان خود اپنے کھودے ہوئے گڑھوں میں گرنے کی بجائے خدا کے بتلائی ہوئی صراط مستقیم پر سیدھا چل سکے۔ ہم حیران ہیں کہ جو لوگ اسلام کے معمولی مبادیات سے بھی اس درجہ نابلد ہیں وہ آخر کیونکر اسلام کے نام سے اس قسم کے بلند بانگ دعوے کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

* نمک کا محصول

لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک مرتبہ نمک کا محصول کم کرکے دوبارہ اس کو بڑھا دیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس نے فیصلہ کردیا تھا کہ محصول صرف ایک روپیہ فی من رکھا جائے مگر بعد میں جب کونسل آف اسٹیٹ سے سوا چار روپے فی من کی تحریک پاس ہوکر دوبارہ اسمبلی میں غور کرنے کے لئے یہ مسئلہ پیش ہوا تو عین وقت پر چند حضرات نے اپنی رائے بدل دی اور ایک روپیہ چار آنے فی من کی تحریک کو حکومت کا ساتھ دے کر منظور کرادیا۔ ان لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ نمک انسانی ضروریات میں ایک اہم ضرورت ہے۔ جس پر ٹیکس لگانے سے غریب شخص پر بار پڑتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے

ہیں کہ غرباء کی حالت آج کل کسی ٹیکس کا بار اٹھانے کے قابل نہیں مگر باوجود اس کے وہ انسانی غذا کے ایسے اہم جزو پر چار آنے (پچیس پیسے) فی من محصول کے اضافہ کی حمایت کرتے ہیں اور پھر بھی مدعی ہیں کہ ہم کونسلوں میں ہندوستانی باشندوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے گئے ہیں۔ اگر حفاظت حقوق اسی چیز کا نام ہے کہ آپ غریب ہندوستانیوں کے منہ سے نوالہ چھین کر انگریزی افسروں کے لئے الاؤنس اور پنشنیں مہیا کریں تو ہم حیران ہیں کہ پھر غصب حقوق اور اعتداء علی الناس (لوگوں پر زیادتی) کس چیز کو کہا جائے گا؟

بعض سطحی النظر حضرات کہتے ہیں کہ ٹیکس کم کرنے سے عامتہ الناس کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے تمام فوائد کو وہ بیچ کے لوگ کھاجاتے ہیں جن کے ہاتھوں میں نمک کی تجارت ہے لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ بیچ والے اس کے منافع کو کھا جاتے ہیں اور عام پبلک کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تب بھی ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسے حکومت کے خزانہ میں پہنچانا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ پبلک کو بددیانت تاجروں کے شر سے بچانے کی اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں اور ہمارے خیال میں وہ اس سے بدرجہا زیادہ عقلمندانہ ہیں۔ مثال کے طور پر آپ حکومت سے درخواست کرسکتے ہیں کہ وہ ان تاجروں کو قیمتوں کی بھی پابندی پر مجبور کرے۔ آپ حکومت سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ صرف انہی لوگوں کے ہاتھ نمک فروخت کرے جو مقررہ نرخ نامہ کی پابندی کا وعدہ کریں۔ اس طرح آپ کے لئے اور دوسرے ذرائع بھی ایسے ہیں جن سے بددیانت تاجروں کے استیصال کے ساتھ پبلک کو فائدہ بھی پہنچایا جاسکتا ہے مگر آپ ان سب کو چھوڑ کر صرف ایک آسان سی تدبیر اختیار کرلیتے ہیں کہ جب پبلک کو فائدہ نہیں پہنچتا تو دوکانداروں کو بھی فائدہ نہ ہو اور چار آنے فی من کے حساب سے ایک عظیم الشان رقم اس خزانہ میں چلی جائے جس کا سب سے بڑا کام ہندوستانیوں کو چٹنی روٹی سے محروم کرکے انگریزی افسروں کو شادی اور جدائی تک کے الاؤنس دینا ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے ایسی تدبیریں لال بھکڑ کے سوا کسی اور کو نہیں سوجھ سکتیں۔

✱ عدل اور سیاست

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ کٹڑہ خیل اور باڑہ ہندو راؤ کے مقدمات کے فیصلے درج کئے گئے ہیں۔ یہ دونوں مقدمات گزشتہ فسادات دہلی کے سلسلے میں نو مہینے سے چل رہے تھے پہلا مقدمہ ان ہندو کمہاروں کے خلاف تھا۔ جنہوں نے ایک مسلمان لڑکے کو مار کر فساد کی ابتداء کی تھی اور دوسرا مقدمہ ان مسلمانوں کے خلاف تھا۔ جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عین وقت پر ایک سڑک کو ممنوعہ قرار دینے کے باوجود اس سے گائے لے گئے تھے۔ پہلے مقدمے میں چار کمہاروں کو تین تین گھنٹہ اور پندرہ پندرہ اور سات سات دن کی سزائیں دی گئی ہیں اور دوسرے میں مسلمانوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی سزائیں دی گئیں اور دو پر پانچ پانچ سو روپیہ جرمانہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس تفاوت کے لئے کچھ قانونی وجوہ بھی ہوں مگر ہم یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ ان فیصلوں میں عدل کی بجائے سیاست کے اجزاء زیادہ شامل ہیں۔ ایک طرف فساد برپا کرنے کا جرم ہے جس پر اس قدر معمولی سزائیں دی جاتی ہیں کہ بمشکل ان کو گوشمالی سے تعبیر جاسکتا ہے اور دوسری طرف سرکاری حکم کی خلاف ورزی ہے جس پر ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی سخت سزائیں دے دی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہماری حکومت فساد کو اتنا بڑا جرم نہیں سمجھتی جتنا سرکاری احکام کی خلاف ورزی کو سمجھتی ہے۔

✱ خزاں کا پیش خیمہ

مانچسٹر گارجین بڑے وثوق کے ساتھ خبر سناتا ہے کہ لارڈ برکن ہیڈ آئندہ موسم خزاں میں ہندوستان کی **وائسرائلٹی** کا چارج لیں گے اور سر رابرٹ ہارن ان کی جگہ وزیر ہند ہوں گے۔ اگرچہ ہمارے لئے لٹن، ریڈنگ اور برکن ہیڈ سب ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے ہم اس نئے تغیر پر ذرہ برابر غور کئے بغیر بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ:

"مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت"

مگر پھر بھی ہم حیران ہیں کہ برکن ہیڈ صاحب میں وہ کونسی قابلیت ہے جس کی "پاداش" میں ان کو گورنر جنرل کے ذمہ دار عہدہ پر مامور کئے جانے کی تجویز ہے۔ اگر کسی شخص کا محض لارڈ ہو جانا اس کی قابلیت کے لئے کافی ضمانت نہیں ہے۔ تو ہمارے خیال

میں برکن ہیڈ صاحب اس کے سوا کوئی اور خاص قابلیت نہیں رکھتے۔ جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی یا پڑھی ہیں اور جو لوگ اخبارات میں ان کے مضامین پڑھتے رہے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا دماغ برطانوی مدبرین میں تھرڈ کلاس کا دماغ ہے اور وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ نارتھ بروک‘ ڈفرن‘ کرزن اور ریڈنگ جیسے بلند مرتبہ مدبروں کی کرسی کے لئے انہیں منتخب کیا جائے لیکن اگر فی الحقیقت برکن ہیڈ صاحب ہی وزیر ہند کے عُہدے سے وائسرائے کے منصب پر فائز ہونے کی پہلی مثال پیش کرنے والے ہیں تو ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ یہ انتخاب محض ان کی رجعت پسندی‘ استبدادیت اور جفاپیشگی کی بنا پر عمل میں آئے گا۔ جس سے موجودہ وزارت کی ذہنیت اور ہندوستان کے متعلق اس کے آئندہ ارادوں پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

❑ مسٹر یعقوب کا عذر گناہ

{ ۲ر اپریل ۱۹۲۵ء }

اشاعت گذشتہ میں ہم نے مسٹر محمد یعقوب کا ایک طویل مراسلہ شائع کیا ہے۔ جس میں انہوں نے قانون حج پر اپنے رویہ کے متعلق صفائی پیش کی ہے۔ اس مضمون کو ہم نے باربار پڑھا مگر کہیں ہم کو ان دلائل و براہین کا ایک بھی جواب نظر نہیں آیا جو اس قانون کے خلاف حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب اور جناب مولانا محمد علی صاحب نے اپنے مبسوط مضامین میں پیش کئے ہیں۔ البتہ اس میں ہم کو جگہ جگہ ایسی باتیں نظر آتی ہیں جن سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جناب محمد یعقوب صاحب پبلک کو غلط فہمی میں مبتلا کرکے اپنا مدعا حاصل کرنا اور جمعیتہ علماء کی مجلس عاملہ کے اس ریزولیشن کو حقیر ثابت کرنا چاہتے ہیں جو اس قانون کے خلاف شائع کیا گیا تھا۔ ہم اس جگہ مسٹر یعقوب کے مضمون کے ان حصوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن میں انہوں نے محض غیر متعلق مباحث چھیڑ کر ان سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ان باتوں کا جواب خاموشی ہی سے دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو انہوں نے اپنے مخالفین کو بدنیت اور خود غرض ثابت کرنا چاہا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد محض ان غلط بیانیوں کی تردید کرنا ہے جو انہوں نے جان بوجھ کر عامتہ المسلمین کو دھوکہ دینے کے لیے کی ہیں۔

انہوں نے اپنے مضمون میں اور اسمبلی کی دو تقریروں میں جمعیت العلماء پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ سال بھر تک سوتی رہی۔ باربار توجہ دلانے کے باوجود اس نے اس معاملہ کو کھٹے میں ڈالے رکھا مگر یہ بالکل غلط ہے۔ جمعیت کے پاس جس وقت مسودہ قانون حج اظہار رائے کے لیے آیا تھا تو جناب صدر نے اس پر ذاتی رائے ظاہر کرنے کو درست خیال نہیں فرمایا اور ایسے اہم مذہبی مسئلہ کو مجلس منتظمہ کے فیصلہ پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ مسودہ کا اردو ترجمہ کرا کے اسے چھپوا لیا گیا اور اس کی کاپیاں مجلس منتظمہ کے جملہ ارکان کے پاس بھیج دیں تاکہ بحث سے پہلے ارکان مجلس خوب تیار ہو کر آجائیں۔ مراد آباد میں جب جمعیتہ علماء کا اجلاس خصوصی منعقد ہوا تو یہ مسئلہ اجلاس عام میں پیش کر دیا گیا اور کامل دو گھنٹہ تک اس پر بحث ہوتی رہی۔ مگر وہاں کوئی بات طے نہیں ہو سکی اور اس قسم کی ایک تجویز پاس کردی گئی کہ یہ جلسہ مسودہ قانون حج کو جمعیتہ کی مجلس عاملہ کے سپرد کرتا ہے اور اسی کو اختیار دیتا ہے کہ اپنے آخری فیصلہ سے گورنمنٹ کو مطلع کردے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جمعیتہ پر غفلت کا الزام بالکل غلط ہے البتہ اگر اس پر کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اس پر خوب غور خوض کرنے کے بعد عین فیصلہ کے وقت اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ تاکہ وہ اسمبلی اور حکومت کی رائے پر اثر انداز ہو سکے۔

مسٹر یعقوب نے اسمبلی کی تقریر اور اپنے مضمون میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ جمعیت علماء کی چھوٹی سی مجلس عاملہ نے جس میں دس گیارہ آدمی شریک تھے، مسودہ قانون کے خلاف ایک ریزولیشن پاس کیا تھا جس کو کسی طرح فتویٰ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی مگر ہم ان کو بتانا چاہتے ہیں کہ مجلس عاملہ کو پوری جمعیت کی نمائندگی حاصل ہے اور مزید برآں جمعیت کے اجلاس عام نے خاص اس باب میں بھی اسے مجاز قرار دیا تھا کہ اپنے فیصلہ سے حکومت کو مطلع کردے۔ ایسی حالت میں مجلس کا فیصلہ عین جمعیت کا فیصلہ ہے اور اس کی وقعت کو یہ کہہ کر کم کرنا صریح افتراء ہے کہ یہ جمعیتہ کا نہیں بلکہ چھوٹی سی جماعت عاملہ کا فیصلہ ہے۔ رہا یہ خیال کہ مجلس نے جو ریزولیوشن شائع کیا تھا اسے فتویٰ کی حیثیت حاصل نہیں۔ سو اس کے متعلق ہم سوائے مسٹر یعقوب کی عقل یا حسن نیت پر ماتم کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ایک مذہبی جماعت جب

کسی مذہبی مسئلہ میں اپنا فیصلہ شائع کرتی ہے تو خواہ اسے ریزولیوشن کہا جائے یا فیصلہ یا کچھ اور بہر صورت اس کی وقعت وہی ہوتی ہے جو ایک مذہبی فتویٰ کی ہوتی ہے۔

حکیم اجمل خاں صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد اس قانون کے حامی ہیں اور انہوں نے مجلس عاملہ میں اس کی حمایت کی تھی مگر کسی ضروری کام کی وجہ سے انہیں اس کے لیے اٹھنا پڑا اور ارکان مجلس نے ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر فوراً مخالفت کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ ہم کو معلوم نہیں کہ اس واقعہ کو جناب یعقوب تک کس طرح پہنچا دیا گیا اور آیا انہوں نے خود اس کو اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا ہے یا راوی ہی نے یہ غلط بیانی کی ہے۔ بہر حال خواہ صورت واقعہ کچھ ہی ہو یہ ایک حقیقت ہے کہ مسٹر یعقوب کا یہ بیان کلیتہ" غلط ہے۔

حکیم صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد نے مجلس میں یہ خیال تو ضرور ظاہر کیا تھا کہ واپسی ٹکٹ کی شرط مذہبی مداخلت نہیں ہے مگر وہ اسے حکومت کی جانب سے قانونی صورت میں لازمی کر دینے کے اتنے ہی مخالف تھے جتنے مجلس کے دوسرے ارکان تھے پھر یہ بات بھی بالکل خلاف واقعہ ہے کہ مولانا آزاد اور حکیم صاحب چند منٹ کے لیے اٹھے تھے اور ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ریزولیوشن پاس کیا گیا تھا۔ اگر مسٹر یعقوب کا رپورٹر حقیقت میں اصل واقعہ بھول گیا ہے تو ہم اسے یاد دلاتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے تشریف لے جانے کے بہت بعد تک اس ریزولیوشن پر بحث ہوتی رہی تھی اور تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اسے پاس کیا گیا تھا۔

مسٹر یعقوب نے سب سے زیادہ مضحکہ انگیز بات یہ کہی ہے کہ مجلس عاملہ نے اس قانون کو مذہبی مداخلت ہونے کے ثبوت میں فقہ و حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ہمارے محترم دوست اگرچہ اسمبلی میں بار بار یہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ میں علوم دین سے واقف ہوں اور میں نے باقاعدہ دینیات کا درس لیا ہے مگر ان کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ کتب فقہ کی تدوین اور احادیث نبویؐ کے ارشاد کے زمانہ میں اس قسم کے کسی قانون کا مسئلہ درپیش نہیں تھا کہ اس کے لیے صریح احکام کا ریزولیوشن میں حوالہ دیا جاتا۔ فقہ و حدیث میں تو اس قسم کے وقتی مسائل کے متعلق صرف جامع اصول موجود ہیں۔ جن سے مفتی عصر خاص خاص حالات کے مطابق مسائل کا استنباط کرتا ہے۔ کاش مسٹر یعقوب

صاحب حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب کے مضمون کو ذرا غور اور فکر کے ساتھ پڑھ لیتے تو ان شکوک اور اوہام میں مبتلا نہ ہوتے۔

اس سے زیادہ ایک اور مضحکہ انگیز بات مسٹر یعقوب نے اسمبلی میں کہی تھی جس وقت مسٹر صادق حسن نے کہا کہ غیر مستطیع لوگوں پر حج فرض نہیں ہے۔ لیکن ان کو روکنا بھی جائز نہیں۔ کیونکہ بغرض اطاعت خدا کی راہ میں مصیبت برداشت کرنا موجب ثواب ہے تو اس پر مسٹر یعقوب نے کہا کہ ایسے لوگوں کے لئے تو اب بھی راستہ بند نہیں ہے۔ وہ بغیر پاسپورٹ کے پیدل جا سکتے ہیں غالباً اس وقت ہمارے معزز دوست نے مخالفت کے جوش میں اپنا توازن دماغی بالکل کھو دیا تھا۔ ورنہ بصحت ہوش و حواس ایسی لغو بات کہنا شاید وہ خود بھی گوارا نہ کرتے جسے سن کر کوئی شخص ان کی سلامتی عقل کی طرف سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ اگر جناب یعقوب صاحب اب بھی اپنی اسی رائے پر قائم ہوں تو ہم ان سے عرض کریں گے کہ وہ مہربانی فرما کر ہندوستان سے حج کو پاپیادہ جانے کے متعلق پروگرام شائع فرمادیں اور اس میں یہ بھی تصریح کردیں کہ یہ پیادہ سفر براہ سمندر ہوگا یا براہ افغانستان، ایران اور عراق و نجد۔

ایک جگہ مسٹر یعقوب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصر، ڈچ ایسٹ انڈیز اور اسٹریٹ سٹلمنٹ کا کوئی حاجی بغیر واپسی ٹکٹ کے حج کو نہیں جا سکتا مگر اس کے متعلق ہم ان سے عرض کریں گے کہ انہیں ایسے استدلال پیش کرنے سے پہلے کافی واقفیت بہم پہنچا لینی چاہیے۔ مصر میں حکومت جس طریقہ سے حجاج کی آسائش کا انتظام کرتی ہے اس کا تصور بھی غریب ہندوستانی نہیں کرسکتے۔ ایک عازم حج اپنے گھر سے نکلنے کے بعد اس وقت تک برابر حکومت مصر کی حفاظت میں رہتا ہے جب تک وہ اپنے گھر کو واپس نہ آجائے۔ راستہ میں ہر جگہ اس کی دیکھ بھال اور آرام و آسائش مصری افسروں کی نگرانی میں ہوتی رہتی ہے اور ایسی حالت میں خود حجاج ہی اس کو اپنی سہولت سمجھتے ہیں کہ آمدورفت کا خرچ حکومت کے حوالے کردیں۔ رہا حکومت ہالینڈ کا معاملہ سو اس کے متعلق یہ سب کو معلوم ہے کہ وہ مدتوں سے لوگوں کو حج سے روکتی رہی ہے اور آخر جب مسلمانان جاوا نے اپنے اس مذہبی حق کا سختی کے مطالبہ کیا تو اس نے ۱۸۵۲ء میں مجبوراً ان پر سے پاسپورٹ کے نذرانہ کی قید اٹھا کر واپسی ٹکٹ کی ذرا ہلکی قید لگادی تھی۔ پس اس سے استدلال

کرنے میں تو تائید کے بجائے الٹی ان کی تردید ہوتی ہے۔ یہی حال اسٹریٹ سٹلمنٹ کا ہے کہ اس کا فعل بھی حکومت ہند کے لیے کوئی آیت جواز نہیں بن سکتا۔

آخر میں ہم مسٹر یعقوب سے عرض کرتے ہیں کہ انہوں نے اور ان کے ہم نواؤں نے اس قانون کے متعلق اسمبلی میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ سراسر مسلمانان ہند کی مرضی کے خلاف تھا۔ اس کو مولانا محمد علی صاحب یا کسی اور خادم ملت پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر کے وہ اپنے لیے جائز ثابت نہیں کرسکتے۔ اس کی تلافی صرف اسی صورت سے ہوسکتی ہے کہ وہ اسمبلی میں اپنی ذاتی رائے کی نہیں بلکہ مسلمانان ہند یا کم از کم اپنے ووٹروں کی نمائندگی کریں۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ انہیں مسلمانوں کا اعتماد ہرگز حاصل نہیں رہے گا اور وہ اس قوم کی نظروں میں مبغوض ہوجائیں گے جو اشخاص سے نہیں بلکہ اعمال سے محبت کرتی ہے۔

* زاغلول پاشا کو بدنام کرنے کی کوشش

ٹائمز آف انڈیا کا نامہ نگار قاہرہ سے لکھتا ہے کہ زاغلول پاشا سے جب میں نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق کچھ دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا:

> ”میں اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اسے میرے کام میں کوئی دخل نہیں ہے۔ مصر کی سیاسی تحریک کو مذہب سے کچھ سروکار نہیں۔ میں اس معاملہ میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا کہ مسلمانان ہند انگریزوں یا ہندوؤں سے کس قسم کا برتاؤ رکھیں“۔

ہمارے خیال میں نامہ نگار مذکورہ کا یہ تار بھی اسی پروپیگنڈا کا ایک جزو ہے جو مسلمانان ہند کے بین الاسلامی جذبات کو کمزور کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زاغلول پاشا ایک خالص وطنی جذبات کے آدمی ہیں جن میں مصطفیٰ کامل مرحوم کی سی اسلامیت نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہیں اور ان کے لئے یہ کہنا قطعاً ناممکن ہے کہ ”مجھے اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے“۔

□ وائسرائے کی مطلق العنانی

{۶ر اپریل ۱۹۲۵ء}

حکومت ہند کے ایک غیر معمولی جریدہ میں اعلان کیاگیا ہے کہ گورنر جنرل بااجلاس کونسل قانون اصلاحات کی دفعہ ۶۷ الف بضمن (۷) کے ماتحت اپنے استثنائی اختیارات کو کام میں لا کر مسودہ مالیات کے حسب ذیل مطالبات کو منظور کرتے ہیں جنہیں لیجسلیٹو اسمبلی نے مسترد کردیا ہے۔

ریلوے کے سرمایہ میں نئی لائنوں کے لئے ۱۰ لاکھ روپیہ' چنگی کے محکمہ میں سوتی کارخانوں سے محصول وصول کرنے والے اسٹاف کے لئے ۷۷ ہزار روپیہ ایگزیکٹو کونسل کے مصارف سفر کے لئے ۱۲ ہزار روپیہ۔

گورنر جنرل نے ان مطالبات کو اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے ناگزیر صورت قرار دیا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ محض قانونی ضرورت سے استعمال کئے گئے ہیں یا فی الحقیقت گورنر جنرل کے فرائض کی بجاآوری ان مطالبات کی منظوری کے بغیر ناممکن ہے لیکن بہرصورت یہ امر یقینی ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے آئینی حیثیت سے اپنے ان غیر معمولی اختیارات کا قطعاً ناجائز استعمال کیا ہے جو انہیں قانون اصلاحات کے ماتحت حاصل ہیں۔ ایک بڑے ماہر قانون ہونے کی حیثیت سے ہماری طرح وہ خود بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ استثنائی اختیارات کا ایسا آزادانہ استعمال کسی طرح آئین و دستور کی روح کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی مدبرین جزیرہ انگلستان کے حدود سے باہر آئین کے احترام کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور ہندوستان میں ان کے نزدیک استبداد و مطلق العنانی ہی عین آئین ہے۔

یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں ہے کہ لارڈ ریڈنگ کو اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے اس قسم کی ضرورت لاحق ہوئی ہو بلکہ اس سے پہلے کئی مرتبہ انہیں ایسی ہی ضرورتیں پیش آچکی ہیں قانون اصلاحات کے لحاظ سے اب تک انہوں نے جس صورت سے اپنے استثنائی اختیارات کو بھی استعمال کیا ہے اس کی مثال ہمیں کسی آئینی حکومت میں نہیں ملتی اور نہ کسی دوسری جگہ ہم ان ضرورتوں کی مثال تلاش کرسکتے ہیں۔ جو ہمارے ماہر قانون وائسرائے کو پیش آتی رہتی ہیں پھر جب حالت یہ ہے تو ہمای سمجھ میں نہیں آتا کہ

ایک اصلاحی اور غیر اصلاحی حکومت میں کونسا خاص فرق ہے اور ہم کس امتیاز خصوصی کی بنا پر موجودہ دور کو ایک آئینی دور تسلیم کرلیں؟

* تحریف القرآن کی ایک نئی کوشش

قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ کچھ مدت پہلے سریانی زبان میں قرآن حکیم کا ایک نسخہ دستیاب ہونے کی خبر آئی تھی جس پر ہمیں اس وقت شبہ ہوا تھا کہ اب کوئی نیا فتنہ دینی اٹھایا جانے والا ہے۔ آج اس کی مزید تفصیلات آگئی ہیں اور ریلینڈس لائبریری بلیٹن میں اس نئے قرآن کے نکتہ شناس ڈاکٹر منگانا نے اپنے انکشاف جدید پر ایک طویل مضمون لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تک مسیحی دنیا جس بات کے لئے بے چین تھی اسے ڈاکٹر منگانا قرآن میں تحریف ثابت کرکے پورا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتا ہے کہ:

> ”یہ سریانی ترجمہ خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نہ صرف موجودہ قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بعض مقامات پر پوری پوری آیات ایسی ملتی ہیں جو رائج الوقت قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ اولین خلفاء میں سے ایک نے قرآن کے تمام نسخے ایک جگہ جمع کئے اور ان کی عبارتوں میں سے بہت سے حصے جو اس وقت رائج تھے نکال کر ایک مجموعی نسخہ مرتب کرایا اور تمام پچھلے نسخوں کو خورد برد کرکے اس نئے نسخے کو شائع کرادیا مگر اس سلسلہ میں بعض قدیم نسخے ایسے بھی تھے جو خلیفہ مذکور کو دستیاب نہ ہوسکے اور لوگوں کے پاس بچ رہے۔ چنانچہ یہ سریانی نسخہ بھی انہی باقی ماندہ نسخوں میں سے معلوم ہوتا ہے جنہیں خلیفہ نے نامناسب اور قابل اعتراض قرار دے کر برباد کرنا چاہا تھا مگر وہ اس کے ہاتھ نہیں آیا“۔

یہ قصہ جس مقصد کے لئے کھڑا کیا گیا ہے وہ مضمون کے ابتدائی الفاظ اور آخری دعویٰ کو پڑھنے کے بعد صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر منگانا اور اس کے ہمنوا دشمنان اسلام دراصل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں بھی انجیل کی طرح ترمیم ہوئی ہے اور آج مسلمان جس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اصلی قرآن نہیں ہے مگر شاید انہیں

معلوم نہیں کہ وہ تاریخ جمع قرآن کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور عبرانی اور سریانی قران پیدا کرنے سے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر قرآن صرف کاغذ ہی پر رہتا تو اس کا ضائع ہو جانا یا بدل دیا جانا ممکن تھا لیکن مسلمان تو عہد رسالت سے آج تک کبھی کاغذی قرآن کے محتاج ہی نہیں ہوئے۔ انہوں نے تو اس مقدس کتاب کو ہمیشہ اپنے دلوں میں اس طرح محفوظ کیا ہے کہ اگر آج اس کے تمام نسخے جمع کر کے دریا برد کردیئے جائیں اور دنیا میں قلمی قرآن کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہے پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ قرآن میں ایک حرف کی معمولی زیر و زبر کی بھی تحریف کی جاسکے۔

* مسئلہ برار کا فیصلہ

برار پر حضور نظام کے جائز دعوائے استحقاق کو آخری اور قطعی طور پر مسترد کرتے ہوئے جناب وائسرائے نے جو کچھ انہیں لکھا ہے اگر اسے قانونی پیچیدگیوں اور اصلاحی اینچ پینچ سے پاک کر کے صاف اور سادہ زبان میں پڑھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم قوت رکھتے ہیں اور تم کمزور ہو اس لئے تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہمارے غصب و تغلب کے خلاف عدل و انصاف کا مطالبہ کرو۔ حضور نظام نے یہ بالکل صحیح دعوی کیا تھا کہ جب حکومت دکن اور حکومت برطانیہ دونوں کی حیثیت اس نزاع میں فریقین کی ہے تو حکومت برطانیہ کو اس میں فیصلہ صادر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قانون انصاف کا یہ ایسا صریح اصول ہے جس سے کوئی بچہ بھی ناواقف نہیں ہے مگر جناب وائسرائے اس کے جواب میں یہ عجیب و غریب دلیل پیش کرتے ہیں کہ حکومت برطانیہ ہندوستان میں ایک بالاتر قوت کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ایسے معاملات میں بھی اسے فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے جن میں اس کی حیثیت ایک فریق کی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ برطانوی حکومت کو اس کی قوت و بالاتری نے تمام قوانین انصاف سے مستثنیٰ کردیا ہے اور کوئی شخص اس سے انصاف حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کی بالاتری کا خاتمہ کر کے قوت و طاقت میں اس کے مساوی درجہ پر نہ آجائے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر اس قسم کے مابہ النزاع مسائل میں کوئی ثالثی عدالت مقرر کی بھی جائے تب بھی اسے محض مشورہ دینے کا حق ہوگا اور آخری فیصلہ

صادر کرنے کا اختیار ہر صورت میں حکومت برطانیہ کے لئے محفوظ رہے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کسی آزاد تحقیقات سے حکومت ہند کے مقابلہ میں زبردست ریاست کا حق ثابت بھی ہو جائے تو حکومت ہند اپنے اس استحقاق کی بنا پر غصب کئے رکھنے پر اصرار کر سکتی ہے کیونکہ اسے بالادستی حاصل ہے۔ غلام ہندوستانیوں کے لئے حق اور آزادی کے صحیح طریق حصول کی جانب اس سے زیادہ واضح رہنمائی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ حکومت نے حضور نظام کے اس جائز دعوے کو ٹھکرا دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے ہم کو اور تمام ہندوستانیوں کو ایک نہایت قیمتی سبق دیا ہے جو ہمارے لئے ہمیشہ دلیل راہ بن سکتا ہے۔

* ریف میں جنگ کا آغاز

رپورٹر کے ایک تازہ تار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپین نے ریف میں از سر نو جنگ شروع کردی ہے اور جنرل ڈی سوزا کی قیادت میں اس کی فوجیں دوبارہ مجاہدین اسلام کے مقابلہ پر میدان میں اتر آئی ہیں۔ گزشتہ چند مہینہ تک جنگ و پیکار کا سلسلہ بند رہنے سے عام خیال پیدا ہو گیا تھا کہ امیر محمد بن عبدالکریم کے فاتحانہ اقدامات نے ہسپانیہ کو ایک کامیاب سبق دے دیا ہے جو آئندہ کے لئے اسے مزید ذلتیں اٹھانے سے باز رکھے گا مگر اس تازہ کارروائی نے اس خیال کی تردید کردی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہسپانی ڈکٹیٹر ان ذلیل شکستوں پر قانع نہیں ہے جو اب تک اسے نصیب ہو چکی ہیں۔

اسپین کی بہادری کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ اس نے جنگ کے اعادہ کے لئے خاص طور پر رمضان کے متبرک مہینے کو منتخب کیا ہے اور اس سے وہ توقع رکھتا ہے کہ مجاہدین ریف جو روزہ کے بہت پابند ہیں اس کے مقابلہ سے عاجز ہو جائیں گے۔ ہسپانی ڈکٹیٹر اس کو اپنے نزدیک کوئی بہت بڑی جنگی چال سمجھتا ہے مگر ہمارے نزدیک اس کا جنگی قوتیں رکھنے کے باوجود مجاہدین ریف کی اتنی سی کمزوری کا سہارا ڈھونڈنا خود ہی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ ان کے مقابلہ سے عاجز ہو چکا ہے تاہم واقعات بتا دیں گے کہ روزہ دار مجاہدین اس کے لئے پیٹ بھرے مجاہدین سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ کیونکہ وہ

شہادت کا شوق جو ان کی شہامت و شجاعت کا اصلی سرچشمہ ہے روزہ کی حالت میں کچھ اور بھی زیادہ قوی ہوجاتا ہے۔ مسلم آوٹ لک نے خوب کہا کہ اگر ہسپانی کمانڈر سرحد ہند کے کسی برطانوی افسر سے اس معاملہ میں مشورہ لیتا تو وہ ہرگز اس کو رمضان میں جنگ چھیڑنے کی رائے نہ دیتا۔ سرحد کے افغان جو روزہ کی پابندی میں بہت زیادہ سخت ہیں۔ جب کبھی رمضان میں حملہ کرتے ہیں توان کی جنگی قوتیں معمولی ایام سے بدرجہا زیادہ زبردست نظر آتی ہیں اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں کہ روزہ سے ہم کمزور نہیں بلکہ اور زیادہ قوی ہوجاتے ہیں۔

☐ مجاہدین ریف کی کامیابیاں

{ ۱۸ر مئی ۱۹۲۵ء }

الحمد اللہ ریف کے متعلق ریوٹر کے ذریعہ جتنی خبریں آرہی ہیں وہ سب امید افزا ہیں۔ اگرچہ مجاہدین ریف کے بارے میں مایوس کن حالات ہم تک پہنچائے جاتے ہیں لیکن دوربین نگاہوں کو جھوٹ کے پردوں میں سے بھی حق و صداقت کا روشن چہرہ نظر آجاتا ہے اور ان مفید مطلب گھڑی ہوئی خبروں سے بھی انہیں صاف معلوم ہو رہا ہے کہ فرانس نے جن بے یارو مددگار مجاہدین کو چینا سمجھ کر ہضم کر جانیکا ارادہ کیا تھا وہ آخر کو لوہے کے چنے نکلے جن سے اس کے گلے جبڑے کا حال خراب ہو رہا ہے۔ اگر فی الحقیقت فرانس میں کوئی مدبر موجود ہے تو وہ یقیناً اپنی حکومت کو یہ جنگ بند کردینے کا مشورہ دے گا کیونکہ جس انجام کو روکنے کے لئے اس نے یہ احمقانہ طریقہ اختیار کیا ہے وہ اس کی بدولت اور زیادہ قریب آجائے گا۔

☐ ملکی صنعت پر محصولات کا ناجائز دباؤ

{ ۱۰ر اپریل ۱۹۲۵ء }

ہفتہ گذشتہ میں بمبئی کے دو مشہور سوتی کارخانے بند ہو چکے ہیں اور سنا گیا ہے کہ چند اور کارخانے بھی حالت نزع میں ہیں۔ **"کنشا ہیٹٹ مل"** کے ڈائریکٹر **سر کنشا ہیٹٹ** نے اپنے کارخانے بند کرتے ہوئے حصہ داروں کے ایک جلسہ عام میں ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی کے موجودہ زوال پر بحث کرتے ہوئے اس امر کی صاف تصریح کر دی ہے

> "ہندوستانی کارخانوں کا تباہ ہو جانا یقینی ہے، تاوقتیکہ حکومت ان کی مدد نہ کرے اگر وہ چنگی کا محصول جو سوتی کپڑے پر عائد کر دیا گیا ہے، منسوخ نہ کیا گیا یا کسی اور صورت سے ہندوستانی کارخانوں کو مدد نہ پہنچائی گئی تو ان کے زندہ رہنے کی کوئی توقع نہیں ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی کارخانوں کی تباہی اور خستہ حالی کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہے جو تمام دوسری حکومتوں کی طرح ملکی مصنوعات کی ہمت افزائی میں صرف کوتاہی کرنے ہی پر قناعت نہیں کرتی۔ بلکہ اس پر ناجائز محصولات عائد کرکے ان کی راہ میں مزید مشکلات بھی عائد کرتی ہے۔ سوتی کپڑے کی صنعت پر چنگی کا محصول جس پر حال ہی میں اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں بحث ہو چکی ہے۔ اپنی طرز کا غالباً پہلا محصول ہے جو دنیا کی کسی حکومت نے ملکی کارخانوں پر عائد کیا ہے۔ خصوصاً موجودہ دور کی تاریخ میں تو اس کی مثال کہیں ملنی مشکل ہے گزشتہ ۳۰ سال سے ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں اس کے خلاف سختی کے ساتھ آواز بلند کر چکی ہیں اور آج کل خاص طور پر سوتی کارخانہ جات کے مالک اس پر سخت احتجاج کر رہے ہیں مگر حکومت نے اسے منسوخ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب سے ہندوستان میں کپڑے کے مل قائم ہوئے ہیں، حکومت ہند لنکاشائر کی خاطر انہیں تباہ کرنے کی پے در پے کوششیں کر رہی ہے۔ اول اول تو اس نے انگریزی کپڑے پر درآمد کا محصول معاف کرکے لنکاشائر کو ہندوستان میں سستا کپڑا بیچنے کا موقع دیا تاکہ نوزائیدہ وطنی صنعت اس کا مقابلہ نہ کر سکے مگر جب اس کے خلاف سختی کے ساتھ ایجی ٹیشن کیا گیا تو لارڈ ایلجن کی حکومت نے ۱۸۹۶ء میں انگریزی کپڑے پر ساڑھے تین فی صد محصول مقرر کیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی کارخانوں کے کپڑے پر بھی ساڑھے تین فی صد اکسائز ڈیوٹی مقرر کر دی۔ جس سے لنکاشائر اور ملکی کارخانے دونوں ایک سطح پر آ گئے۔

ابتداء ہی میں اس محصول پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس وقت سے اب تک برابر اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۱۷ء میں مسٹر چیمبرلین نے جو اس وقت وزیر ہند تھے، صاف اعتراف کیا تھا کہ

"یہ محصول ایک مستقل ناسور ہے، یہ ہمارے دشمنوں کے لیے کامیاب ہتھیار بن سکتا ہے اور یہ ایک کھلی بے انصافی ہے۔ جس سے ہر وفادار ہندوستانی کو تکلیف ہونی چاہیے"۔

لارڈ ہارڈنگ سابق وائسرائے ہند نے اپنے سرکاری مراسلہ میں لکھا تھا کہ: "یہ محصول ایک شدید بے انصافی ہے جو ہمارے ضابطہ قوانین میں پائی جاتی ہے" لارڈ ولنگڈن سابق گورنر مدراس نے لکھا تھا کہ: "مجھے اس ٹیکس کی بے انصافی میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہندوستان کو اب زیادہ عرصہ تک برطانیہ کی خاطر لوٹنا کسی طرح مناسب نہیں ہے"۔ لارڈ کارمائیکل سابق گورنر بنگال نے لکھا تھا کہ: "میں نے آج تک کسی معقول آدمی سے اس محصول کی حمایت میں ایک لفظ نہیں سنا"۔ ان اعترافات کے علاوہ سرکاری طور پر اس قسم کے وعدے بھی کئے جا چکے ہیں کہ اس محصول کو جلد سے جلد منسوخ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ نے وعدہ کیا تھا کہ "حکومت کی مالی حالت سنبھلتے ہی ایکسائز ڈیوٹی کو منسوخ کر دیا جائے گا" اور ۱۹۲۲ء میں سر میلکم ہیلی نے ممبر مال کی حیثیت سے اعلان کیا تھا کہ "یہ ٹیکس اپنی فطرت کے اعتبار سے کوئی اچھا ٹیکس نہیں ہے مگر چھ ماہ تک اور انتظار کرو تاکہ فسکل کمیشن کی سفارشات سے ہم معلوم کر سکیں کہ اس ٹیکس کی کمی کو کن ذرائع سے پورا کیا جا سکتا ہے"۔

پھر یہی نہیں بلکہ موجودہ ممبر مال سر بیسل بلیکٹ اور وزیر صنعت و تجارت سر چالس انیز نے بھی ۱۹۲۳ء میں اس محصول کو جلد منسوخ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ستمبر ۲۴ء میں سر چارلس انیز نے کہا تھا کہ "ہندوستان میں کوئی انگریز ایسا نہیں ہے جو اس ٹیکس کے عائد کئے جانے پر افسوس نہ کرتا ہو"۔ اور سر بیسل بلیکٹ نے کہا تھا کہ "اگر میرے عہد وزارت میں اس تاریخی ظلم کی تلافی کر دی جائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا" مگر باوجود ان سب باتوں کے جب اسمبلی کے موجودہ سیشن میں اس محصول کی تنسیخ کا ریزولیوشن پیش کیا گیا تو حکومت نے اسے منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا اور جب اس کی تحصیل کے محکمے کی مد میں (۷۷) ہزار کا مطالبہ کثرت رائے سے مسترد کر دیا گیا تو لارڈ ریڈنگ نے اپنے استثنائی اختیارات استعمال کر کے اس کی منظوری دے دی۔

حکومت کی اس غیر منصفانہ پالیسی کا یہ اثر ہے کہ ہندوستان میں صرف لنکا شائر ہی کی تجارت کو فروغ نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ملکی کارخانوں کے مقابلہ میں جاپان کو بھی

زبردست کامیابی ہو رہی ہے۔ چنانچہ تازہ ترین اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان جو ۱۵ ۔ ۱۹۱۴ء میں صرف ۲۸ لاکھ کا کپڑا اور بارہ لاکھ کا دھاگا ہندوستان بھیجتا تھا۔ آج وہ ساڑھے چار کروڑ روپے سالانہ کا کپڑا اور دس کروڑ روپے سالانہ کا دھاگا بھیج رہا ہو اور اس کی یہ تجارت رات دن ترقی کر رہی ہے۔

❑ ہندوستان پر انگریزوں کے احسانات

【۱۴ر اپریل ۱۹۲۵ء】

سر رابرٹ ہارن جو کسی زمانے میں دولت برطانیہ کے چانسلر رہ چکے ہیں، اور مانچسٹر گارجین کے بیان کے مطابق لارڈ برکن ہیڈ کی جگہ آئندہ وزیر ہند ہونے والے ہیں، حال میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ برما آئیل کمپنی کے تجارتی حالات کی جانچ پڑتال کے سوا یہاں انہوں نے ”اصلی ہندوستان“ کے حالات کی بھی کوئی تحقیق کی ہے یا نہیں، لیکن اگر ہم ان کے سفر ہند کے کارناموں کو اس تقریر کی روشنی میں دریافت کریں، جو انہوں نے یہاں سے واپس جا کر گلاسکو کے ایک جلسہ میں کی، تو ہمیں صاف طور پر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ”اصلی ہندوستان“ کے حالات سے بالکل بے خبر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوراں میں بڑے جوش کے ساتھ کہا ہے کہ:

> ”جو لوگ باشندگان ہند پر ہماری حکومت کی وسیع برکات کو تسلیم نہیں کرتے، وہ ہمیں ایک خود غرض تجارتی قوم کہہ کر خواہ کتنا ہی بدنام کریں، مگر کوئی قوت ہمارے نامہ اعمال سے ان عام انسانی فلاح و بہبود کے کارناموں کو نہیں مٹا سکتی، جو ہم نے بیماریوں کی روک تھام، قحط زدہ لوگوں کی اعانت، وحشیانہ رسوم کی بیخ کنی اور تہذیب و ترقی کے ذرائع کی توسیع کے لیے انجام دیئے ہیں“۔

ان الفاظ سے سر رابرٹ نے اپنے ووٹروں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت ہند کی تاریخ کے روشن ترین حقائق کو نظر انداز کر کے اس قسم کے دعاوی پیش کرنا، اگر شدید بے حیائی نہیں، تو کم از کم ہندوستان کے اصلی حالات سے انتہائی جہالت پر ضرور دلالت کرتا ہے، ممکن ہے کہ ہمارے انگریزی مدارس کے وہ طلبا جنہیں خود غرض انگریز مصنفین کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، برطانوی حکومت کی برکات کے قائل ہوں، لیکن ایسا ایک شخص جو انگریزی سلطنت کے صحیح کارناموں کا

مطالعہ کر چکا ہے، ایک لمحہ کے لیے بھی سر رابرٹ کے دھوکہ میں نہیں آسکتا، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جن چیزوں کو وہ حکومت کے شاندار کارناموں میں گنانا چاہتے ہیں، وہ دراصل برطانوی حکومت ہند کے دامن پر تاریک ترین داغ ہیں۔

سر رابرٹ نے چار چیزوں کو ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے بڑی برکات قرار دیا ہے۔ ایک وبائی امراض کا استیصال، دوسرے قحط زدہ لوگوں کی اعانت، تیسرے وحشیانہ رسوم کی بیخ کنی اور چوتھے تہذیب کی ترقی۔ اب ذرا حقائق کی روشنی میں ان چاروں برکتوں کی اصلیت پر ایک نظر ڈالیے۔

پہلی برکت کی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں وبائی امراض کی ترقی کلیتہ” برطانوی حکومت کی رہین منت ہے۔ پلیگ اور انفلوائنزا تو پیدا ہی اسی حکومت میں ہوئے ہیں اور باقی ہیضہ، چیچک اور مختلف قسم کے بخار وغیرہ وبائی امراض نے اس قوم کے عہد حکومت میں خاصی ترقی کی ہے۔ اس عظیم الشان برکت کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر سال تقریباً ۶۰ لاکھ ہندوستانی محض وباؤں اور متعدی بیماریوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور حکومت کی جانب سے ان امراض کی روک تھام کے لیے جو کچھ کوشش کی جاتی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی آبادی میں کم از کم ۱۰ کروڑ باشندے ایسے ہیں جن کو کوئی طبی امداد نہیں پہنچتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں اس وقت اموات کی شرح تقریبا ۳۰ فی صد ہے، حالانکہ کسی مہذب ملک کی شرح اموات تقریبا ۲۰ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔

دوسری برکت کی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں قحطوں کی ابتداء ہی انگریزی حکومت کے ساتھ ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں ساڑھے چھ سو برس کی طویل مدت میں جتنے قحط رونما ہوئے تھے، ان کی مجموعی تعداد ۱۶ سے زیادہ نہیں تھی، لیکن اس کے مقابلہ میں برطانوی حکومت کے یک صد و پنجاہ سالہ عہد حکومت میں جتنے قحط رونما ہوئے ہیں، ان کی تعداد کم و بیش ۴۰ ہے اور کم سے کم اندازے کے مطابق ان سے ۴ کروڑ باشندے موت کے گھاٹ اترے ہیں۔

تیسری برکت صرف انگریزی حکومت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ جب کسی ملک میں کوئی طاقتور حکومت قائم ہوتی ہے، تو ایسی رسمیں خود بخود فنا ہو جاتی ہیں۔

مثلاً مغلوں کی حکومت میں ٹھگی وغیرہ کا وجود نہیں تھا۔ ستی اور دختر کشی کی رسم اکبر کے عہد میں بڑی حد تک دور ہو چکی تھی اور اسی طرح دوسری رسموں کا بھی اسلامی حکومت کے دور ترقی میں کوئی وجود نہیں تھا۔ علاوہ ازیں یہ ایک حقیقت ہے کہ رسوم قبیحہ کے استیصال میں انگریزی حکومت کا اتنا حصہ نہیں ہے جتنا خود ہندوستانیوں کی اصلاحی تحریکات کا ہے۔ اس باب میں انگریز حکومت کو اگر کوئی فخر حاصل ہے' تو وہ صرف یہ کہ اس نے اصلاح پسند طبقہ کی مدد میں کافی مستعدی سے کام لیا۔

چوتھی برکت کی حیثیت یہ ہے کہ جن لوازم تہذیب و ترقی کو انگریزی حکومت کی اہم ترین برکات میں شمار کیا جاتا ہے' ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی ترویج محض ہندوستان کی فلاح و بہبود کی خاطر کی گئی ہو' بلکہ اصل میں وہ سب اسی خود غرضی کے ممنون احسان ہیں' جس کے نام سے ہمارے انگریز حکمران بہت چڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی تعلیم سر چارلس ٹریولین کے الفاظ میں محض اس لیے دی جا رہی ہے کہ ہندوستانیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھنڈا کر کے ان کے دلوں میں انگریز قوم کی محبت اور برتری کا نقش بٹھایا جائے۔ ریلوے اور ڈاک و تار کے محکمے لارڈ ڈلہوزی کے بیان کے مطابق صرف اس لیے قائم کئے گئے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی تجارت کے لیے ترقی کے تمام راستے کھل جائیں اور برطانوی حکومت ملک کے چپہ چپہ پر اپنا فوجی اقتدار قائم کر سکے۔ نہروں کی تعمیر اور ایسے ہی دوسرے امور نافعہ کی غرض و غایت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہندوستان میں انگریزی سرمایہ کو کثرت سے پھیلایا جائے اور ہندوستانی زمین کو زیادہ سے زیادہ نفع دینے کے لیے تیار کیا جائے۔ یہ ہے ان برکات کی حقیقت جن کو برطانوی مدبرین کھلے جلسوں میں پیش کرتے ہیں اور ذرہ برابر شرم محسوس نہیں کرتے۔

* علماء ہند اور تعدد ازواج

ہمدرد کی ایک قریبی اشاعت میں جو مکتوب فرنگ شائع ہوا ہے' اس کے ایک گوشہ میں ہم کو یہ جملے دیکھ کر سخت رنج ہوا کہ:

> ”ترکوں نے جس دن سے تعدد ازواج کو قانونی پابندیوں سے روکا ہے' مجھے ان کے مہذب' متمدن اور ترقی یافتہ ہونے کا یقین ہو چلا ہے۔ کم از کم میں تو

> نہیں یقین کرتا کہ اسلام نے پوری آزادی کے ساتھ تعدد ازواج اس طرح جاری کیا ہو، جس طرح اب ہندوستان کے علماء کرام اس کو اپنے اور دوسروں کے لیے جائز فرماتے ہیں اور میں تو ذاتی طور پر اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہوں اور عملی طور پر خود "ایڈیٹر ہمدرد" بھی میرے عقائد سے دور نہیں ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ میں کہتا ہوں موجودہ حالات میں تعدد ازواج ایک جرم قبیح ہے اور وہ کچھ کہتے نہیں، ہنس کر خاموش ہو جاتے ہیں"۔

مکاتب فرنگ صاحب جس ذہنیت اور قابلیت کے آدمی ہیں، اس کا حال ان کے اس بیان سے اچھی طرح کھل جاتا ہے کہ تعدد ازواج کی مذہبی اجازت پر قانونی پابندیاں عائد کر دینے کو وہ ترکوں کی تہذیب و مدنیت اور ترقی یافتہ ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ ان کو "علمائے کرام" سے شکایت ہے کہ وہ جس صورت سے تعدد ازواج کو اپنے اور دوسروں کے لیے جائز فرماتے ہیں، وہ ان کے عقیدہ کے مطابق احکام اسلامی کے خلاف ہے، لیکن اگر انہیں کبھی شیکسپیر اور ملٹن کے مطالعہ سے فرصت ملتی، تو وہ کسی مترجم قرآن کو پڑھ کر خود یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ علماء کرام نے نہیں، بلکہ خدا نے تعدد ازواج کو جائز فرمایا ہے اور اس کے لیے "عدل" کو لازمی شرط قرار دیا ہے۔ "علمائے کرام" نے اگر کچھ کیا ہے تو وہ صرف اسی حکم الہی کی تبلیغ ہے۔ انہوں نے نہ کبھی خدا کی لگائی ہوئی شرط عدل کو اٹھا کر اپنے یا کسی اور کے لیے تعدد ازواج کو جائز رکھا ہے اور نہ وہ اس الہی شرط سے آگے بڑھ کر کسی اور انسانی شرط کو جائز رکھنے پر تیار ہیں۔ پس اگر مکاتب فرنگ صاحب کو تعدد زوجات کی "رسم" وحشیانہ اور خلاف تہذیب معلوم ہوتی ہے، تو وہ بے تکلف قرآن حکیم پر معترض ہو سکتے ہیں۔ آخر یہ علماء کو آڑ بنا کر حملہ آور ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہم مولانا محمد علی صاحب کو نہایت ادب کے ساتھ ان باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور ان سے عرض کرتے ہیں کہ آپ "ہمدرد" کو اس قسم کی لغویات کا مجموعہ نہ بننے دیجئے۔

فریضہ حج اور حکومت

{۱۸ر اپریل ۱۹۲۵ء}

آج سے تقریباً دو ماہ پیشتر جب غدار شریف کے بیٹے امیر علی نے سرزمین حجاز کو اپنی طمع و آز اور ہوسناکی و غلط کاری کی جولانگاہ بنا کر دنیائے اسلام کی استدعائے مصالحت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا، تو بظاہر یہ نظر آ رہا تھا کہ حاجیوں کے لیے راستہ خطرات سے پر ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیتہ علمائے ہند نے اعلان فرمایا تھا کہ اس سال مسلمانان ہند حج کا ارداہ نہ کریں، ورنہ تکالیف و مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا، لیکن چند روز ہوئے سلطان ابن سعود نے جو خدمت اسلام و مسلمین کے لیے ہر وقت مستعدو کمر بستہ ہیں، مسلمانان عالم کو یہ مژدہ روح افزا سنایا تھا کہ بلد الامین تک پہنچنے کے لیے تمام راستہ پر امن ہے۔ قنفذہ، لیث اور رابغ کی بندرگاہیں کھلی ہیں۔ عمال حکومت مصروف خدمت حجاج چشم براہ ہیں۔ مسلمانان عالم فریضہ حج ادا کرنے کے لیے تشریف لائیں۔ اس اعلان نے سلطان ابن سعود کی خدمات اسلامی کو چار چاند لگا کر دنیائے اسلام کو یقین دلا دیا تھا کہ سلطان ابن سعود خدمت اسلام و مفاد مسلمین کے لیے ہر ممکن خدمت انجام دے رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ سلطان ابن سعود کے اس اعلان سے قصر حکومت برطانیہ میں تزلزل و ارتعاش کے اثرات محسوس ہونے لگے۔ چنانچہ حکومت ہند کے کارندے پولیس کمشنر بمبئی نے سرکاری کمیٹی کا اعلان شائع کر دیا، جس میں عازمان حج کو ادائے فریضہ حج کے لیے جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قانون حجاج کی تدوین اور اس پر بحث و تمحیص کے وقت حکومت اور حکومت کی پٹھو اسمبلی میں پر زور اور پر شکوہ الفاظ کے ذریعہ سے مسلمانان ہند کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ حکومت حج کی ادائیگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنا چاہتی۔ مسٹر محمد یعقوب اور ان کے ہم خیال ارکان اسمبلی بھی بار بار قسم کھا چکے ہیں کہ حکومت کم از کم اس مسئلہ میں مسلمانوں کی خیر سگالی اور بہی خواہی کے جذبات سے کام لے رہی ہے۔ یہ حضرات مخالفین قانون حج پر فقرے چست کرنے کی جرأت تک کر گزرے تھے اور قانون کی منظوری کو بزعم خود زبردست خدمت اسلام و مسلمین تصور کر رہے تھے۔ آج ہم مسٹر محمد یعقوب اور ان کے ہم خیال ارکان اسمبلی

سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اب بھی آپ کی آنکھیں کھلیں یا نہیں؟ کیا اب بھی آپ اپنے آپ کو حسب سابق دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہیں گے اور حکومت کی خیر سگالی کی قصیدہ خوانی فرمایا کریں گے۔

شاید مدبرین برطانیہ کا یہ خیال ہے کہ سلطان ابن سعود اور ان کے رفقائے کار کی قیادت میں مسلمانان عالم کا اجتماع برطانیہ کی استعماری حکمت عملی کے سخت منافی ثابت ہوگا۔ غالباً حکومت کے ارباب حل و عقد یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان خدام اسلام کی موجودگی میں دنیائے اسلام کے زبروست مذہبی اجتماع سے وہ فوائد و منافع مترتب ہونے لگیں گے جو حج اور اس اجتماع عظیم میں مضمر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ کے ارباب بست و کشاد اپنی عادت مستمرہ کے مطابق سرزمین حجاز کے غیور اور شجیع باشندوں کو جو ہر سال اس اجتماع عظیم کی تقریب پر سال بھر کے لیے سرمایہ فراہم کر دیا کرتے تھے اور آزاد زندگی بسر کرتے تھے، اس سال ان فوائد و منافع سے محروم کر دینا چاہتی ہے تاکہ بادیہ عرب کے آزاد و غیور بہادر مجبور ہو کر حکومت برطانیہ کے کارندوں کے سامنے دامن استمداد پھیلائیں اور حکومت ان سے معاہدات کر کے اس قصر استعماری کی بنیادیں استوار کر سکے، جسے کھود پھینکنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت موجود ہے۔ کاش سادہ لوح مسلمانان ہندوستان اور مسلمان ارکان اسمبلی جو دفتری حکومت کی چالوں سے ہمیشہ دھوکہ کھاتے ہیں، بیدار ہو جائیں اور اس خطرہ عظیم کے سدباب کی کوشش کریں!

ہم مسلمانان ہندوستان سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ بیش از بیش تعداد میں ادائے فریضہ حج کے لیے تیار ہو جائیں۔ جمعیت علمائے ہند تحقیق و تفتیش حالات کے بعد مفصل اعلان شائع کرے گی۔ امید ہے کہ عازمان حج اعلان کا انتظار فرمائیں گے۔

ہم حکومت کے کارندوں کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر انہوں نے عازمان حج کو روکنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوشش کی، تو سخت اضطراب و ہیجان پیدا ہو جائے گا۔ جس کے نتائج حکومت کے لیے سخت مضرت رساں ہوں گے۔ اس لیے اس قسم کی ہر حرکت کے تمام نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکام کے سر ہوگی۔

* لارڈ بالفور کا ورود فلسطین

عربی قوم نے لارڈ بالفور کے اعلان ”وطن الیہود“ کا جیسا حیرت انگیز جواب دیا ہے‘ وہ کمزور اور مظلوم اقوام کی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ برطانیہ نے دوران جنگ میں عربوں کو دھوکہ دیکر ترکوں کے خلاف انہیں استعمال کیا۔ آزادی کے وعدے کرکے انہیں غلام بنایا اور جب جنگ ختم ہوئی‘ تو ان کی امداد و اعانت کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی ۹۰ فیصدی آبادی پر دس فی صدی یہودیوں کو حاکم بنا دیا۔ مغلوب و مفتوح عرب اس بددیانتی کا تلوار سے جواب نہیں دے سکتے تھے۔ ان کی قوت ٹوٹ چکی تھی۔ جس بلا کو خود مول لیا تھا‘ اسے دفع کرنا ان کے امکان میں نہ تھا‘ مگر معلوم ہوا کہ یہ ساری کمزوریاں محض جسمانی تھیں۔ چنانچہ ورود بالفور کے موقع پر انہوں نے ثابت کردیا کہ ان کی روح اب بھی مغلوب نہیں ہوئی ہے۔ ان کے دل اب بھی غیر مسخر ہیں اور پوری عربی قوم خواہ وہ فلسطینی ہو یا شامی‘ خواہ وہ انگریزی حکومت میں ہو یا فرانسیسی حکومت میں‘ خواہ وہ پیغمبر عرب کی پیرو ہو یا ناصرہ کے مسیح کی‘ بلا کسی امتیارز و تفریق کے اس شدید بے انصافی کے خلاف ایک دل‘ ایک زبان اور ایک جسم ہے‘ جو فلسطین کو یہودی وطن بنا کر اس کے ساتھ کی گئی ہے۔ بالفور کا ارض مقدس پر قدم رکھنا تھا کہ فلسطین اور شام میں اس سرے سے اس سرے تک نفرت اور ناراضی کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی‘ کاروبار بند ہوگئے‘ بازاروں میں ہڑتال کردی گئی‘ مدارس کے طلباء باہر نکل آئے‘ سڑکوں پر اعلان بالفور کے ماتمی جلوس نکالے گئے‘ جلوس میں اس کے خلاف پرجوش تقریریں کی گئیں‘ اخبارات نے اداریے لکھے‘ مضامین لکھے گئے غرض یہ کہ وہ سب کچھ کیا گیا‘ جو ایک مجبور و بے کس قوم کسی ظلم کے خلاف اپنے دلی نفرت کے اظہار کے لئے کرسکتی ہے۔

قوت کے گھمنڈ اور طاقت کے غرور اور ملوکیت کے استبداد کا یہ ایسا جواب ہے‘ جس پر دنیا حیران رہ گئی ہے۔ عربی قومیت کے اس پرجوش مظاہرہ نے انگلستان اور فرانس کے تمام حریصان استعمار کی آنکھیں کھول دی ہیں اور جدید ترین خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شام اور فلسطین کے علمبرداران سیادت اس حقیقت کے انکشاف سے سخت پریشان ہوگئے ہیں کہ عربی قوم اپنے حقوق کی مدافعت کے لئے ایک ناقابل تسخیر جوش اور ایک معجز نما اتحاد عمل رکھتی ہے۔ وہ اب تک اس دھوکہ میں تھے کہ وہ عربوں کو تقسیم کرکے

ان کی قوت توڑ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں، مگر اب معلوم ہو گیا کہ فلسطین کی مصیبت میں شام اور شام کی مصیبت میں فلسطین ہر طرح ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔

اس موقع پر ہم کو وہ وقت یاد آتا ہے جب ہندوستان میں بھی ایسی ہی زبردست قومی روح موجود تھی۔ "قانون سیاہ" پر ۳۱ کروڑ کی پوری آبادی نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ جشن فتح پر سارا ہندوستان ایک ہو کر ماتم گسار تھا۔ شہزادہ ویلز کی آمد پر ہندوستان کے بچہ بچہ نے اپنی حریت خواہی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مگر افسوس غرض کے بندوں، ہوس کے غلاموں اور نفسانیت کے پرستاروں نے بہت جلدی اس روح آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ قومی اتحاد کے بند میں ذاتی مصالح نے رخنہ ڈال دیا۔ نفاق پرور عناصر کو قومی زندگی میں غلبہ حاصل ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوتیں غیروں کے مقابلہ میں صرف ہونی چاہئے تھیں، وہ آپس کی خانہ جنگی میں صرف ہونے لگیں۔ جن سروں کو آزادی کی راہ میں کٹنا چاہیے تھا وہ غلامی کی اینٹوں اور لاٹھوں سے پھوٹنے لگے۔ جن دماغوں میں حریت کا سودا سمایا تھا، انہیں شاہی کے خبط اور سنگھٹن کی ہوائے فاسد نے ماؤف کر دیا اور سارا ہندوستان نفاق کا گھر اور فساد کا آتش کدہ بن گیا۔

کاش ہمارے ابنائے وطن میں اتنی بصیرت ہوتی کہ وہ فلسطین اور شام سے سبق حاصل کرتے!

آگ کے ساتھ کھیل

{ ۲۲ر اپریل ۱۹۲۵ء }

ٹائمز آف انڈیا نے لارڈ بالفور کے سفر فلسطین اور اس کے اثرات پر ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ جس میں وطن یہود کے قیام پالیسی پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے عربی قومیت کے نازک حسیات کو آگ سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ برطانوی مدبرین دراصل فلسطین میں آگ سے کھیل رہے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جس وقت لارڈ بالفور نے نومبر ۱۷ء میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا اعلان کیا تھا اسی وقت بہت سے سمجھدار مدبرین نے اس پالیسی کی سخت مخالفت کی تھی۔ کیونکہ وہ عربی فطرت سے واقف تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ۷ لاکھ عربوں کو ایک لاکھ یہودیوں کا محکوم بنا دینا کیا معنی رکھتا

ہے۔ عربوں کو خواہ کتنی ہی حکومتوں میں تقسیم کردیا جائے اور ان کے مصالح و مفاد میں تفریق پیدا کرنے کی کیسی ہی کوشش کی جائے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ حلب، بیت المقدس، دمشق اور بغداد کے عرب سب کے سب اغیار کے مقابلہ میں ایک ہیں اور اپنے باہمی اختلافات سے دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع کبھی نہیں دے سکتے۔ لارڈ بالفور یا تو اس حقیقت سے واقف نہیں تھے یا انہوں نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کردیا۔ بہرحال دونوں صورتوں میں فلسطینی عربوں کے ہاتھوں ان کی جو تذلیل ہوئی ہے، وہ خود ان کے اپنے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔

ٹائمز لکھتا ہے کہ ہمیں لارڈ بالفور کی ذلت پر آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ عربوں نے انہیں بہت پریشان کیا، مگر عربوں کو شکایت ہے کہ ان کے منحوس اعلان کی بدولت وہ سات سال سے پریشان ہو رہے ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ لارڈ کرزن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی خارجی سیاست ایک تخریبی سیاست تھی لیکن لارڈ بالفور اور سیسل کے مقابلہ میں ان کی سیاست کو بدرجہا بہتر تعمیری سیاست کہا جا سکتا ہے، کیونکہ کوئی سخت سے سخت تباہ کار مدبر بھی وہ حماقت نہیں کر سکتا جو بالفور اور سیسل نے بیت المقدس میں کی ہے۔

* اتحاد اسلامی کا حیرت انگیز مظاہرہ

آگے چل کر ٹائمز نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، فلسطین کے جھگڑے میں شام کا ساتھ دینا اور بیت المقدس کی آواز پر دمشق کا لبیک کہنا اپنے اندر ایک عمیق درس بصیرت رکھتا ہے۔ اس کی رائے میں ان باتوں پر صرف وہی لوگ متحیر ہو سکتے ہیں، جو اتحاد اسلامی کی برقی قوت سے واقف نہیں ہیں، لیکن جن لوگوں نے ۱۹۱۹ء میں پنجاب کی بغاوت اور افغانستان کے حملہ کو ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے، وہ اس پر ذرہ برابر بھی تعجب کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ہم ایک ہی وقت میں تمام دنیائے اسلام کو مشرق سے لے کر مغرب تک بیدار ہوتے دیکھتے ہیں اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مصر بغاوت کا الم لے کر کھڑا ہوتا ہے، دوسرے سال ترکوں کی قومی فوج اپنے فاتحانہ اقدامات شروع کرتی ہے، شام میں فرانسیسی فوجوں پر شدید حملے کئے جاتے ہیں،

قبائل عراق تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ مدت کے لئے انگریزی حکومت کا تقریباً خاتمہ کر دیتے ہیں اور ۱۹۲۱ء میں امیر محمد عبدالکریم ہسپانیہ کے خلاف جنگ کی ابتدا کرتا ہے، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمان اپنے جذبات اور خیالات کے اعتبار سے بالکل ایک ہیں اور ان کی تمام تحریکات باہم ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔

ٹائمز لکھتا ہے کہ اتحاد اسلامی کا یہ مظاہرہ ہمارے لئے عبرت و بصیرت کا کافی سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کی موجودگی میں ہم کو توقع کرنی چاہیے کہ جو غلطی ایک دفعہ کی جاچکی ہے، اس کا پھر اعادہ نہ کیا جائے گا اور لارڈ بالفور کے "خطرناک تجربہ" کو اسلامی مذہبیت کی آگ بھڑکنے سے پہلے ختم کردیا جائے گا۔ اس کی رائے میں اگر برطانوی حکومت کچھ عقل رکھتی ہے، تو اسے فوراً تسلیم کرلینا چاہیے کہ فلسطین میں اس کی پالیسی ناکام ہوئی اور ایک ایسی حکومت قائم کردینی چاہیے جو باشندگان ملک کی مرضی کے مطابق ہو۔

مسئلہ فلسطین اور اسلامی قومیت پر ٹائمز کی یہ رائے کسی تبصرہ کی محتاج نہیں ہے۔ اس پر ہمیں صرف اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اینگلو انڈین دوستوں کے نقطہ نظر میں یہ ایک نہایت مبارک اصلاح ہے جو وسعت پذیر ہو کر مشرق اور برطانیہ کی بہت سی مشکلات کو حل کر سکتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی ہوشمندی کے آثار ہمارے ان دوستوں میں عموماً اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی شدید اسلامی مظاہرہ کی ترشی سے ان کی ملوکیت اور سرمایہ داری کی پالیسی کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں

* سنگھٹن اور خون

سنگھٹن کے متعلق عام طور پر دعوی کیا جاتا ہے کہ یہ ایک نہایت پرامن تحریک ہے جس کا مدعا ہندوؤں کی اندرونی تنظیم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مالوی جی نے اودھ ہندو مہاسبھا اور لالہ لاجپت رائے نے کلکتہ مہاسبھا کے خطبہ ہائے صدارت میں ان لوگوں کے بیانات کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے جو سنگھٹن کو ایک جارحانہ تحریک بتلاتے ہیں اور خصوصاً مالوی جی نے تو اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ یہ تحریک ہمسایہ اقوام کے ساتھ

جنگ کرنے سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتی، لیکن اگر ہم ان دو عظیم الشان ہندو لیڈروں کی صداقت میں کوئی شبہ نہ بھی کریں، تب بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ کم از کم ہندو قوم سنگھٹن کو ایک جنگی تحریک ہی سمجھتی ہے اور اسی لئے وہ اسے نہایت جوش و خروش کے ساتھ قبول کررہی ہے۔ ہندو عوام سے قطع نظر کیجئے کہ ان کے خیالات کو آسانی کے ساتھ غیر مستند قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہمیں ہندوؤں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور درجہ دوم کے لیڈروں میں بھی یہی خیال غالب نظر آتا ہے۔ چنانچہ حال میں بھائی پرمانند جی نے سنگھٹن کے ریزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے ہندو مہاسبھا میں جو تقریر کی ہے، اسے ہم شہادت کے طور پر پیش کرسکتے ہیں۔ انہوں نے سنگھٹن کو ہندو قوم کے بقائے حیات کا واحد ذریعہ بتلاتے ہوئے کہا کہ:۔

> "سنگھٹن کا تعلق جنگ سے بھی ہے۔ اگر جنگ نہیں تو سنگھٹن کی بھی ضرورت نہیں۔ جو جاتی سنگھٹن کی اصلیت نہیں سمجھتی، وہ اگر آج نہیں تو کل ضرور دنیا سے مٹ جائیگی۔ اگر آپ میں سنگھٹن موجود نہیں، تو آپ ہمیشہ جوتیاں کھاتے رہیں گے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ سنگھٹن کا اصلی مدعا جنگ ہے اور ہندو جاتی کو زندہ رکھنے کے لئے اسی کی ضرورت ہے۔ اب اگر اس کی یہ تاویل کی جائے کہ جنگ سے مراد خونریزی کی جنگ نہیں، بلکہ جہد للحیات ہے تو اس کا سدباب بھی خود بھائی جی ہی نے کردیا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:۔

> "اس مرض کا ایک ہی علاج ہے اور وہ سنگھٹن ہے۔ اس سنگھٹن کے لئے ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو جاتی کے لئے خون بہا دینے کو تیار ہوں۔ سنگھٹن کے قصر کی بنیادوں میں نوجوانوں کا خون سیمنٹ کا کام دے گا۔ اس پوتر کام کے لئے مجنوں کے مانند خون دینے والے سچے عاشقوں کی ضرورت ہے"۔

غالباً اس کے بعد کسی مزید تصریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

* حکومت اور انتظام حج

تمام ہندوستان کے طول و عرض میں سلطان ابن سعود کا وہ اعلان شائع ہو چکا ہے جس

میں انہوں نے مسلمانان عالم کو حج کے لئے آنے کی دعوت دی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ سفر حج میں ہر قسم کی آسانیاں اور راحتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ نیز ان کی طرف سے یہ بات بھی صاف کردی گئی ہے کہ مکہ معظمہ کے لئے صرف ایک جدہ ہی کا راستہ نہیں ہے جو حالت جنگ قائم ہونے کی وجہ سے حج کے لئے مانع ہوسکے، بلکہ قنفذہ، رابغ اور لیث کے بندرگاہ بھی حجاج کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں اور ان پر حکومت بجد کا قبضہ ہوجانے کی وجہ سے سفرحج کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے۔

اس تصریح کے بعد تمام مسلمانان ہند چشم براہ تھے کہ حکومت ہند کی جانب سے حجاج کے جہازوں کو قنفذہ، رابغ اور لیث کے بندرگاہوں پر ٹھہرانے اور حجاج کو اتارنے کا انتظام کردیا جائے گا اور اس قسم کا کوئی اعلان ہوجائے گا کہ فلاں تاریخ سے جدید انتظام کے ماتحت سفرحج کا آغاز ہوگا، مگر حال میں حج کمیٹی کی جانب سے جو اعلان شائع ہوا ہے، وہ تمام مسلمانوں کے لئے سخت مایوس کن، بلکہ ایک نہایت اہم فریضہ دینی میں مداخلت کا ہم معنی ہے۔ اس میں حجاز کی حالت کو خطرناک بتاکر مسلمانوں کو حج سے روکنے کی سعی کی گئی ہے اور صراحتہ" اس قسم کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ عازمان حج کی ہمت شکنی کی جائے گی۔ مسلمانان ہند کے لئے حج کمیٹی کا یہ فیصلہ حددرجہ اضطراب انگیز اور تشویش افزا ہے، وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب حج کا راستہ خطرات و مشکلات سے پاک ہوچکا ہے اور سلطان ابن سعود نے حجاج کو منزل مقصود تک امن و امان سے پہنچا دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، تو حکومت آخر کن مصالح کی بنا پر انہیں حج سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ اس باب میں حکومت کی جانب سے جتنی زیادہ مزاحمانہ کوشش کی جائے گی، اتنا ہی زیادہ مسلمانوں کا شک و شبہ بڑھتا جائے گا۔ حکومت اگر الجھن سے بچنا چاہتی ہے، تو اسے چاہیئے کہ سلطان بجد سے مراسلت کرکے یا بطور خود ان کے بتائے ہوئے تینوں بندرگاہوں کے متعلق تحقیقات کرے اور ان میں سے جو کوئی ہندوستانی حجاج کے لئے زیادہ مناسب اور آرام دہ ہو، اسے متعین کرکے جہازوں کی روانگی کا انتظام کردے۔

ہنگامہ کلکتہ

{ ۲۹ر اپریل ۱۹۲۶ء }

افسوس ہے کہ کلکتہ میں دوبارہ فساد ہوگیا اور اب تک جاری ہے۔ سات آٹھ روز سخت بدامنی اور طوائف الملوکی رہنے کے بعد پورے دو ہفتہ بھی امن نہ رہنے پایا تھا کہ پھر ہنگامہ و خونریزی کا ایک دور شروع ہوگیا اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ پچھلے فساد میں جو عظیم الشان نقصانات ہوئے تھے ان کا اندازہ ڈیڑھ دو کروڑ روپے سے زائد کیا جاتا ہے اور اس پر جانوں کا نقصان مزید ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جن مفسدوں نے یہ آگ بھڑکائی ہے ان کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی اور وہ شاید اس وقت تک نہ بجھے گی جب تک کلکتہ کی وبا سے بنگال و بہار کا ایک ایک شہراور ایک ایک گاؤں متاثر نہ ہولے گا۔

حیرت ہے کہ اس مرتبہ بھی حکومت اپنی پوری قوت کے ساتھ اس فساد کو فرو کرنے میں ناکام ہو رہی ہے۔ پچھلے فساد کے بعد اسے ۱۲ روز کی فرصت مل گئی تھی، جس میں وہ آسانی کے ساتھ قیام امن کی تدابیر اختیار کرسکتی تھی، مگر آج چار روز سے جو خبریں آرہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی موثر تدابیر اختیار نہیں کیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اتنی قوت نہیں رکھتی بلکہ اگر ہندوستان اور انگلستان کے انگریزی اخبارات اور خصوصاً سرمائیکل اوڈوائر کے ان خیالات کو پیش نظر رکھا جائے جو انہوں نے گزشتہ فساد پر ظاہر کئے تھے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ فتنہ فساد کے مرض کا کلی ازالہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ وہ ایک حریص اور طماع جراح کی طرح چاہتی ہے کہ زخم ہرا رہے اور اس کے مرہم کی ہمیشہ ضرورت باقی رہے اس لیے اس نے کلکتہ ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی فساد کی خبر پر تیشہ نہیں چلایا اور محض شاخوں کو کتر کتر کر اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیتی رہی۔

سنا ہے کہ فساد کے ایام میں جب بعض لوگوں کے کہنے پر حکام نے پولیس کی مدد طلب کی تو انہوں نے ٹیلیفون پر طعنہ دیا کہ بلاؤ گاندھی کو اور بلاؤ محمد علی کو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ کہاں تک صحیح ہے اگر فی الواقع پولیس نے لوگوں کو یہ طعنہ دیا ہے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ فسادات میں حکومت اور حکام ہی کا حصہ ہے۔ وہ

ہندوستانیوں کو جتانا چاہتے ہیں کہ تم لوگ اعتماد کے قابل نہیں ہو۔ بلکہ ہر حال میں کمزور کو طاقت ور کے آستانہ پر جھکنا پڑتا ہے لیکن انہیں کون بتائے کہ اگر گاندھی اور محمد علی کو حقیقت میں کچھ کرنے کا موقع ملتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

* مسلمانوں کے نقصانات

جدید فساد میں مسلمانوں کو جو نقصانات پہنچے ہیں ان کا فی الحال کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا لیکن گزشتہ فساد کے متعلق تحقیق شدہ اعداد شمار معلوم ہوگئے ہیں اور وہ نہایت ہولناک ہیں۔ مسلمان مقتولین کی تعداد ۶۰ کے قریب ہے جبکہ مجروحین کی تعداد ۸ سو کے قریب پہنچتی ہے۔ مفقودالخبر مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ۲ سو سے زائد کیا گیا ہے۔ دکانیں جس قدر لوٹی گئی ہیں ان کی فہرست میں ۱۷ نام ہیں اور وہ ابھی مکمل نہیں ہے مسلمانوں کی جائداد کا اندازہ لاکھوں میں ہے مساجد جن کو شہید کیا گیا ہے پانچ ہیں اور مزارات جو مسمار کیے گئے ہیں ۴ ہیں یہ ایک نامکمل سی فہرست ہے جو سنٹرل مسلم ریلیف کمیٹی (مرکزی اعانت مسلمین) نے شائع کی ہے اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کلکتہ میں سنگھٹن کی تعلیم کا منشاء کس خوبی کے ساتھ پورا کیا گیا ہے۔

کلکتہ میں یہ تباہ کاری کا عمل جس جذبہ کے تحت انجام دیا گیا ہے۔ وہ پنجاب پراونشل ہندو سبھا کے صدر استقبالیہ کی اس تقریر میں موجود ہے جو انہوں نے انبالہ میں اپنے سنگھٹنی بھائیوں کا استقبال کرتے ہوئے ارشاد فرمائی ہے اور جو انہوں نے پنجاب میں اسلامی اکثریت کے باعث ہندوؤں کی مشکلات کا نوحہ کرتے ہوئے کی۔

☐ بینک کا سود اور اس کا مصرف

{ ۲ر مئی ۱۹۲۵ء }

۱۸ر مارچ کو کونسل آف اسٹیٹ میں سیٹھ ہارون جعفر نے ایک ریزولیوشن پیش کیا تھا جس کا مدعا یہ تھا کہ سیونگ بینکوں اور حکومت کی ضمانتوں میں مسلمانوں کے سرمایہ کا جتنا سود جمع ہوتا ہے' اس کو کسی اور مصرف میں صرف کرنے کے بجائے مسلمان طلبہ کو تعلیمی وظائف دے کر انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیج دیا جائے۔ حکومت نے اس مطالبہ

کو اصولاً تسلیم کرلیا، مگر مصرف کے متعلق جواب دیا کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت اس خیال کی حمایت کرے گی تو اس روپے کو اسی کام میں صرف کردیا جائے گا، چنانچہ سیٹھ صاحب کی تجویز کو کونسل کے آئندہ گرمائی اجلاس کے لئے ملتوی کردیا گیا تاکہ اس وقت تک اسلامی رائے عامہ کی کافی تحقیق ہوجائے۔

جب سے ہندوستان میں بینک قائم ہوئے ہیں یہ مسئلہ علمائے اسلام کے زیر غور ہے کہ آیا بینک کا سود ربا کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ علمائے حکومت نے اس کو جائز ثابت کرنے کی بہت کوشش کی ہے، لیکن علماء کی اکثریت بلکہ سواد اعظم کا مسلک ابھی تک یہی ہے کہ بینک کا سود ربا ہے اور اس کا لینا حرام ہے۔

اس فتوے کی بناپر اکثر دیندار مسلمان بینک سے سود نہیں لیتے اور خصوصاً اسلامی اوقاف کا جتنا روپیہ بینکوں میں داخل کیا جاتا ہے اس پر کوئی سود نہیں لیا جاتا، لیکن اس میں ایک اور قباحت ہے جو سود لینے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ قواعد کی رو سے ہر بینک مجبور ہے کہ وہ تمام جمع شدہ سرمایہ پر ایک خاص شرح کے مطابق سود الگ کردیا کرے اور اگر صاحب سرمایہ اس کو لینے سے انکار کردے اور اس کا کوئی اور مصرف نہ بتائے تو اس وضع کردہ رقم کو سالویشن آرمی (مکتی فوج) کے فنڈ میں داخل کردے۔ اس قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کے سرمایہ کا منافع ایک کثیر مقدار میں ہر سال اس جماعت کو مل جاتا ہے اور وہ اس سے مسیحیت کی تبلیغ کرتی ہے۔

ایسی حالت میں شریعت اسلامی کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر بنکوں میں سرمایہ جمع کرانا ناگزیر ہی ہو تو اس کا سود وصول کرلینا نہ صرف جائز ہے، بلکہ ضروری ہے، کیونکہ سود لینے سے بدرجہا زیادہ بری بات یہ ہے کہ ہم اپنے روپے سے کفر کی اشاعت میں مدد دیں، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس روپے کو اپنی ذات پر صرف نہ کیا جائے، بلکہ اسے صدقہ کردیا جائے۔ اس باب میں فقہا کی صاف تصریح ہے کہ

ان الخبیث واجب التصدق فلا یاخذ الامن یجوز لہ اخذ الصدقہ

یعنی مال حرام کو صدقہ کردینا ضروری ہے اود وہ صرف ایسے شخص کو ہی دینا چاہیے، جس کے لیے صدقہ لینا جائز ہو۔ پس اس تصریح کے مطابق تمام وہ امور خیر جن میں صدقہ صرف کیا جاسکتا ہے، بنک کے سود کے مصرف صحیح بن سکتے ہیں۔ مثلاً فقراء و مساکین کی

اعانت، یتامی کی پرورش، نادار طلبہ کی امداد اور تبلیغ و حفاظت اسلام وغیرہ۔

سیٹھ ہارون جعفر صاحب کا ریزولیوشن بھی شریعت کے اس حکم کے مطابق بالکل درست ہے اور طلبا کی امداد و اعانت اس صدقہ کا بہترین مصرف ہے، لیکن اس کے لیے صرف علی گڑھ یونیورسٹی کی تخصیص کرنے سے بہتر صورت یہ ہے کہ اس روپیہ کو تمام صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ادبی تعلیم پر صرف کرنے کی بجائے مختلف قسم کی صنعتی تعلیم پر صرف کیا جائے۔ مثال کے طور پر جب یہ معلوم ہو جائے کہ ہر سال کتنی رقم اس میں جمع ہوتی ہے، تو اس کے بعد ایک خاص تعداد مقرر کر دی جائے کہ اتنے طلباء کو فن زراعت کی تعلیم دی جائے گی، اتنے طلباء انجینئرنگ کے مختلف شعبوں میں بھیجے جائیں گے اور اتنے اقتصادیات یا سائنس کی تعلیم میں۔

مگر اس تجویز سے صرف اسی روپیہ کی حفاظت ہوتی ہے جو سیونگ بنکوں میں جمع ہوتا ہے اور دوسرے چارٹرڈ بنکوں میں یہ قانون نافذ العمل نہیں ہوتا۔ ہمارے خیال میں اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے تحفظ کی بھی کوئی صورت پیدا کی جائے اور اگر اس کا کوئی باقاعدہ انتظام ممکن نہ ہو تو پھر چارٹرڈ بنکوں سے روپیہ نکلوا کر سیونگ بنکوں میں جمع کرایا جائے۔

✱ ہندوستان میں عیسائیت کی ترقی

ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ جس قدر زور شور کے ساتھ کی جا رہی ہے، اس کا اندازہ مسیحی مشنوں کی سالانہ رپورٹ سے ہوتا ہے۔ آج مسلمانوں میں تبلیغ تبلیغ کا فلک پیما شور جیسی بلند آہنگی کے ساتھ برپا کیا جا رہا ہے، اس سے تمام ہندوستان گونج اٹھا ہے، مگر اس کی حقیقت پر غور کیجئے تو نقارہ سے زیادہ ثابت نہ ہو گی۔ بر خلاف اس کے عیسائیوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور ایک قلیل عرصہ میں انہوں نے ایسا وسیع تبلیغی نظام پھیلا دیا ہے کہ اسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

۱۹۲۳ء کی مسیحی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ۱۶۷ مسیحی مشن کام کر رہے ہیں، جنہوں نے ۱۳۴۰ تبلیغی مرکز قائم کر رکھے ہیں اور ۲۱۸۷ مبلغ

خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہیں۔ ان سوسائٹیوں نے فن تبلیغ کی تعلیم کے لیے ۶۱ ٹریننگ کالج قائم کر رکھے ہیں اور ان کے گرجاؤں کو ۹۷۷۸۱ پادریوں کی خدمات حاصل ہیں۔ ان کے ۹۹ مذہبی اخبارات ہیں جو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں نکلتے ہیں اور ان کے لیے ۴۴۳ پریس قائم ہیں۔ ان کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ تعلیم ہے اور اس کے لیے انہوں نے ۱۵۸۴۰ سنڈے اسکول، ۶۱۰ ہائی سکول، ۵۰ کالج، ۹۸ زراعتی اسکول اور ۱۷۰ صنعتی اسکول قائم کئے ہیں جن میں ہندوستانیوں کو عیسائیت کی تبلیغ کی جاتی ہے اور ان میں ۴۸۰۴۴ اساتذہ تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا ذریعہ ہسپتال ہیں جن کی تعداد ۴۰۸ تک پہنچی ہوئی ہے اور ان میں ۱۵۹۸ ڈاکٹر اور نرسیں کام کرتی ہیں۔

ان زبردست تبلیغی مساعی کا نتیجہ ہم کو حسب ذیل اعداد و شمار میں نظر آتا ہے:۔

☐ نام صوبہ	ہندوستانی عیسائیوں کی تعداد
☐ آسام	۱۱۴۸۴۷
☐ بڑودہ	۷۲۴۷
☐ بلوچستان	۶۶۹۳
☐ بنگال	۱,۰۲,۲۱۱
☐ مدراس	۱۳۲۷۲۱۵
☐ بمبئی	۲۲۰۲۷۲
☐ صوبجات متحدہ	۱۶۶۳۱۹
☐ پنجاب	۳۰۳۳۳۲
☐ برما	۲۳۱۸۱۸
☐ بہار و اڑیسہ	۲۴۶۸۰۶
☐ صوبہ متوسط	۳۲۲۰۶
☐ صوبہ سرحدی	۲۰۲۰
☐ ریاست ہائے بہار	۴۶۱۱۵
☐ ریاست ہائے بمبئی	۱۳۷۳۶

☐ ریاست ہائے وسط ہند	۵۰۷۷
☐ ریاست ہائے صوبہ متوسط	۳۶۰۴۶
☐ ریاست حیدر آباد	۵۶۷۲۹
☐ ریاست ہائے مدراس	۱۴۴۸۲۳۳
☐ ریاست میسور	۵۷۷۱۹
☐ ریاست ہائے راجپوتانہ	۳۴۳۰
☐ دیگر ریاست ہائے ہند	۱۴۳۷۷
☐ کل ہندوستان	۴۴۵۰۴۵۲

اُن اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک تقریباً ۴۵ لاکھ ہندوستانی عیسائی مذہب اختیار کر چکے ہیں اور یہ رفتار جس قدر تیز ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ ۱۸۸۱ء کے مقابلہ میں اس وقت عیسائیوں کی تعداد ڈھائی گنی زیادہ ہے اور (۱۹۱۱ء) اور (۱۹۲۱ء) کے درمیان ۱۰ سال کے عرصہ میں ان کی آبادی نے ۷ لاکھ کے قریب ترقی کی ہے۔

کیا یہ مہیب اعداد و شمار ہمارے ان دوستوں کی آنکھیں کھولیں گے، جو رات دن تبلیغ تبلیغ پکار رہے ہیں، لیکن جن کا دائرہ عمل خود ان کی میز کرسی سے زیادہ وسیع نہیں ہے؟ ہم ان کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر آپ کام کرنا چاہتے ہیں تو اس فن کو مسیحی مبلغوں سے سیکھیے۔

* امتیاز نسل و رنگ

یورپین اقوام کا غرور قومیت اب اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ وہ سیاہ رنگ اقوام کو اپنے ساتھ ایک ہی سرزمین پر چلتے پھرتے اور رہتے سہتے بھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتیں۔ اس غرور کی نمائش خصوصیت کے ساتھ ان مقامات میں ہوتی ہے، جہاں یہ قومیں اپنی تجارتی اغراض سے نو آبادیاں قائم کرنے کے لیے جاتی ہیں اور اول اول رنگین اقوام کے ساتھ انہیں دوش بدوش رہنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے وہ ان نو آبادیوں کے اصل باشندوں کو نیست و نابود کرتی ہیں اور جب ان کی جائے نزول ان نجس عناصر سے پاک ہو جاتی ہے، تو

اس کے بعد ان لوگوں کی شامت آتی ہے جنہیں وہ مستعمرات کی تعمیر و آرائش کے لیے مزدور کی حیثیت سے لاتی ہیں اور اپنا کام نکال لینے کے بعد اس سیڑھی کی طرح پھینک دیتی ہیں جو بام پر چڑھ جانے کے بعد بے کار ہو گئی ہو۔

آج کینیا، فجی اور جنوبی افریقہ وغیرہ مستعمرات میں ہندوستانیوں کے ساتھ جو کچھ سلوک ہو رہا ہے، وہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ یورپین مستعمرین ان ملکوں میں گئے، تو اپنی خدمت گزاری کے لیے ہندوستان کے مزدوروں کو لیتے گئے، کیونکہ اس سے زیادہ سستا، محنتی اور بے زبان خادم انہیں اور کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ ایک مدت تک اس مزدور کو خوشی خوشی وہاں رکھا گیا اور اس کی محنت سے کام لے کر زمینوں کو رشک ارم بنا دیا گیا جو صدیوں سے وحشت کدہ بنی ہوئی تھیں، لیکن جب یہ مقصد حاصل ہو گیا، تو اسے دھتکار دیا گیا اور اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ گوروں کی ان بستیوں کے بے داغ حسن کو اس کالے دھبے سے کسی طرح پاک کر دیا جائے۔ طرح طرح کے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ رنگین اقوام پر قیود عائد کی جاتی ہیں۔ اینٹی ایشیاٹک انجمنیں قائم کی جاتی ہیں روسیاہوں کو طرح طرح کے ہتھ کنڈوں سے ملک بدر کیا جاتا ہے اور ہر طرح سے اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے فردوس وعدن میں اس سیاہ رنگ دوزخی کی بدولت قدیم وحشت کی کوئی یادگار باقی نہ رہے۔

حال ہی میں جنوبی افریقہ کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ صوبہ نٹال کی کونسل نے "ٹاؤن شپ آرڈی نینس" کے نام سے ایک قانون پاس کیا ہے، جس کی رو سے ہر میونسپل کمیٹی اور لوکل بورڈ کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو عام آبادیوں سے الگ کر کے مخصوص علاقوں میں رہنے اور کاروبار کرنے پر مجبور کریں۔ اس کا مدعا "افریقن کرانیکل" کے الفاظ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہندوستانیوں کو ان کے وسائل معاش سے محروم کر کے کسی طرح ملک چھوڑ دینے پر مجبور کیا جائے۔ یہ قانون جن شدید متعصبانہ خیالات کا نتیجہ ہے ان کا اندازہ ڈاکٹر اے مول کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انہوں نے "انجمن مخالف ایشیا" (اینٹی ایشیاٹک ایسوی ایشن) کے ایک جلسہ میں کہے تھے کہ:

> "اگر برطانوی حکومت نے ایشیا کی اقوام کے خلاف ہمارے اس جہاد میں

مداخلت کی تو ہم اس سے قطع تعلق کر لیں گے۔ ہمارے نزدیک جو شخص ایشیا والوں کا حامی ہے، وہ جنوبی افریقہ کے مستقبل کے لیے ایک شدید خطرہ ہے"۔

ایک طرف یہ جذبات اور اعمال ہیں اور دوسری طرف یہ کیفیت ہے کہ حکومت ہند ان مستعمرات کی حکومتوں پر دباؤ ڈالنا تو درکنار خود اپنے دائرہ نفوذ و اقتدار میں بھی ایسی کارروائیاں عمل میں لانے سے قطعی انکار کرتی ہے جو گوری قوموں کے ان مظالم کا کسی حیثیت سے بھی جواب ہو سکتی ہوں۔ کیا غلامی اور آزادی کا اس سے بھی زیادہ بین فرق کہیں اور نظر آ سکتا ہے؟

☐ ایک غلط فہمی کا ازالہ

{ ۱۰ مئی ۱۹۲۵ء }

ہم عصر صدائے مسلم نے اپنی قریبی اشاعت میں حج کے متعلق حکومت کے اعلان پر اظہار رائے کرتے ہوئے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری پوزیشن کے متعلق کچھ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اس نے ایک ہی وقت میں حکومت اور سلطان ابن سعود، دونوں کے اعلانات کو ان کے اصولی و بنیادی تضاد کے باوجود قابل اعتماد قرار دیا ہے اور اس کے بعد یہ توقع ظاہر کی ہے کہ "الجمعیۃ" جمعیۃ علماء ہند کا آرگن ہونے کی حیثیت سے اب دونوں میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا معزز ہمعصر حج کے متعلق ہماری پچھلی تحریرات کا مطالعہ کرتا رہا ہے، تو اس نے کس بنا پر یہ رائے قائم کر لی کہ ہم کبھی ابن سعود اور گورنمنٹ ہند کے اعلانات کا تضاد رفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، ہم نے حج کے معاملہ میں اس حقیقت کو واضح کر دینے کی پوری کوشش کی ہے کہ سلطان ابن سعود کا اعلان پوری طرح قابل اعتماد ہے اور حکومت نے اس باب میں جو روش اختیار کی ہے، وہ نہایت قابل اعتراض ہے، لیکن اگر اب بھی کسی شخص کو ہماری ان تصریحات کے متعلق شک و شبہ باقی ہے، تو ہم نہایت صاف الفاظ میں یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سلطان نجد کا دعوت نامہ کسی حیثیت سے بھی مشکوک نہیں ہے اور اب تک مختلف ذرائع سے جتنی معلومات ہم کو حاصل ہوئی ہیں، ان کی روشنی میں ہم حکومت کے اعلان کو شک و شبہ کے

سوا کسی اور نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ حکومت کے اعلان میں مسلمانان ہند کو جس طرح دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس پر نہایت تفصیل کی ساتھ ہم اپنے دو مقالات افتتاحیہ میں بحث کر چکے ہیں[1]۔ ان کے مطالعہ سے ہمارے ہمعصر کو اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اس نے اس اعلان کو جس اعتماد کے قابل سمجھا ہے، وہ فی الحقیقت اس کا ہرگز مستحق نہیں ہے اور سلطان نجد کے انتظامات حج کو ہی بنظر استحسان قبول کرنا چاہیے۔

* تخلیہ مصر کا مسئلہ

حال میں "ڈیلی میل" کے ذریعہ یہ خبر شائع کی گئی تھی کہ دولت معظمہ برطانیہ، مصر کو خالی کر دینے کی تجویز پر غور کر رہی ہے اور عنقریب اس کا ارادہ ہے کہ قاہرہ سے اپنی فوجیں ہٹا کر محض نہر سویز کی حفاظت کے لیے قنطرہ پر ایک فوجی مرکز قائم کر دے۔ اس خبر نے تمام دنیا کے سیاسی حلقوں میں حیرت و استعجاب کی ایک لہر دوڑا دی تھی، کیونکہ برطانوی قوم کی تاریخ میں یہ بالکل ایک نئی چیز تھی اور کوئی شخص جو اس قوم کی سیاسی فطرت کا علم رکھتا ہے، اس کی ہرگز توقع نہیں کر سکتا تھا، لیکن جب اس کے دو تین دن بعد ہی ٹائمز کے ذریعہ اس کی پر زور تردید شائع ہوئی تو دنیا کا تعجب و تحیر دور ہو گیا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ برطانوی فطرت میں ابھی تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصر کا تخلیہ کوئی معمولی چیز نہیں، بلکہ ایک عظیم الشان انقلاب کا ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ایک قوم غلامی کی بیڑیوں سے آزاد ہو جائے، بلکہ وہ در اصل یہ معنی رکھتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی مردم آزار قوم اپنی جفاکاریوں سے توبہ کر لے، اپنی ہوس استعمار سے باز آجائے، اپنی جوع الارض کی بیماری سے نجات حاصل کر لے اور اس قدر ایماندار اور حق پسند ہو جائے کہ مصری قوم کے ساتھ جو بے شمار وعدے کر چکی ہے، انہیں ۴۳ سال کی مسلسل بد عہدی کے بعد اب پورا کر دے۔ آج انگریزی قوم کو استعمار و استملاک کے میدان میں قدم رکھے ہوئے تین سو برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے، لیکن آج تک اس سے ایک حرکت بھی ایسی سرزد نہیں ہوئی، جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ کبھی اس کی فطرت میں کوئی اس قسم کا تغیر پیدا ہونا ممکن ہے۔ پھر بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ احتلال مصر جیسی اہم غلطی کی اصلاح پر آمادہ

ہو جائے۔

ٹائمز کی جانب سے ڈیلی میل کے بیان کی تردید بھی اپنے اندر ایک نہایت دلچسپ پہلو رکھتی ہے۔ اگر ڈیلی میل کا بیان ایک شریفانہ ایفائے عہد، ایک مدبرانہ احساس فرض اور ایک عاقلانہ صلاح کار کا ہم معنی تھا، تو ظاہر ہے کہ اس کی تردید بھی ان تمام انسانی خوبیوں کی تردید ہے اور ہم اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ

> “ڈیلی میل نے ہماری قوم میں جن اعلیٰ انسانی صفات کے دفعتہ” پیدا ہو جانے کی توقع پیدا کر دی ہے، ہم ان سے اب بھی اسی طرح معرا ہیں جس طرح ہمیشہ سے رہے ہیں، ہمارے مرض استعمار میں ابھی کوئی افاقہ نہیں ہوا اور یہ بالکل غلط ہے کہ ہم میں اب وہ شرافت پیدا ہو گئی ہے جو کسی قوم کو ایفائے عہد پر آمادہ کیا کرتی ہے”۔

حکومت اور مسئلہ حج

{ ۱۴ر مئی ۲۵ء }

اشاعت گذشتہ میں ہم اس مراسلہ کا ترجمہ درج کر چکے ہیں، جو حضرت صدر جمعیت علمائے ہند کے تار کے جواب میں محکمہ سیاسیات و مسائل خارجہ کی طرف سے وصول ہوا ہے۔ اس میں جس طرح ایک اہم مذہبی معاملہ کو ٹالنے کی کوشش کی گئی ہے اس کا اندازہ پہلی نظر ہی میں یہ دیکھ کر ہو جاتا ہے کہ “معاملہ زیر غور ہے”۔

مسلمانوں کے دینی امور سے حکومت کی بے تعلقی اور تغافل کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ بار بار توجہ دلانے پر بھی حج کے متعلق کوئی تفصیلی بیان شائع کرنے پر تیار نہیں ہوتی اور محض سہ حرفی جواب دے کر اس فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، اس غور کی ابتداء اس وقت سے بہت پہلے ہو چکی تھی، جب کمیٹی نے التوائے حج کا فیصلہ کیا تھا اور شاید اس پر ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ہم حیران ہیں کہ حکومت کے ارباب بست و کشاد ابھی تک غور ہی کئے جا رہے ہیں اور اتنی سی بات بھی بتانے کی تکلیف گوارا نہیں فرماتے کہ آخر یہ “غور” کب ختم ہوگا؟ حج کا زمانہ اب بہت قریب آ رہا ہے اور تھوڑی مدت بعد ہندوستان کے ہزارہا

حاجیوں کا حجاز تک پہنچنا اور ان کے لیے یکایک تمام انتظامات کا مکمل ہو جانا تقریباً ناممکن ہو جائے گا، پس اگر حکومت کو کوئی فیصلہ کرنا ہے، تو اس کا یہی وقت ہے، اس کے لیے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں، یا تو حج کو روک کر اپنے ملوکی اغراض کی پرورش کرے اور ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے جو مسلمانان ہند کے ایک اہم فریضہ دینی کی ادائیگی میں مزاحمت کرنے سے لازماً پیدا ہوں گے یا تدبر سے کام لے کر جلد سے جلد حج کے انتظامات مکمل کر دے اور ہندوستان کے عازمین حج کو فریضہ حج کی ادائیگی کی اجازت دے دی جائے۔ ان دونوں صورتوں پر کافی سے زیادہ غور کیا جا چکا ہے اور اب صرف اس کی ضرورت ہے کہ کسی ایک کو تیار کر کے اس کا اعلان کیا جائے۔ حکومت کے پاس دونوں پر عمل کرنے کے لیے کافی سامان موجود ہے۔ وہ حج کو روک کر اس کے نتائج کے مقابلہ کرنے کے لیے کافی سے زیادہ اسلحہ اور فوج رکھتی ہے اور اس کی اجازت دے کر مسلمانوں کے خوش کرنے کے لیے بھی اس کے پاس سرو سامان کی کمی نہیں ہے پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں اس قدر غور خوض میں منہمک ہے۔ آخر وہ کیا چیز ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے؟

ہمیں متعدد ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ علاوہ ان علانیہ کوششوں کے جو عازمین حج کی ہمت شکنی کے لیے ابتداء سے کی جا رہی ہیں، حکومت نے اس کام میں خفیہ ذرائع استعمال کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ پنجاب کے بعض مقامات پر "انفارمیشن بیورو" کی جانب سے اس قسم کے اشتہارات شائع کئے گئے ہیں، جن میں حجاز کے حالات کو نہایت بھیانک صورت میں پیش کر کے حج سے باز رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور بعض مقامات پر تو جاہل عوام کو بہکانے کے لیے ڈھنڈورا تک پٹوایا گیا ہے۔ ان باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سال حج کو روکنے میں حکومت کا کوئی خاص فائدہ ہے جس کے لیے وہ ہر قسم کے ذرائع اختیار کر رہی ہے۔

ایسی حالت میں حکومت کے مجمل جواب کا مطلب ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ ہمیں بہ لطائف الحیل ٹال دینا چاہتی ہے اور وہ صرف اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ: "کسی صورت سے مسلمانوں کو اس وقت تک بہلایا جائے جب یہ کہہ کر آسانی کے ساتھ معاملہ رفع دفع کیا جا سکتا ہو کہ اب وقت گزر گیا ہے۔ اگر صورت حال یہی ہے

تو حکومت کے تدبر پر ہزار افسوس!

* حج کے انتظامات

بہر حال حکومت کے ارادے خواہ کچھ ہی ہوں، ہمیں برابر اپنی کوششوں میں مشغول رہنا چاہیے اور اپنی ان تھک مساعی سے ثابت کر دینا چاہیے کہ ہمیں کسی قسم کی مزاحمتیں اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اگر اس طرح حکومت کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے عین وقت پر حج کا راستہ کھول دیا، تو ظاہر ہے کہ سب کوششیں نیگ سے لگ جائیں گی لیکن اگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تو ہمارے انتظامات سے یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جائے گی کہ اس سال کے حج میں حکومت کی مزاحمت کے سوا اور کوئی امر مانع نہیں تھا اور اس سے مسلمانان ہند کو اپنی مذہبی آزادی اور حکومت کی مذہبی غیر جانب داری کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں مولانا شوکت علی صاحب کی مساعی قابل قدر ہیں۔ انہوں نے جہاز راں کمپنیوں سے گفتگو کر کے یہ بات بالکل صاف کر لی ہے کہ تمام کمپنیاں حجاج کو لے جانے کے لیے تیار ہیں اور رابغ کو حاجیوں کے لیے پسند کرتی ہیں۔ "خلافت" میں مولانا کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ٹرنر موریسن کمپنی حج کے وقت تک ۴ ہزار حجاج کو ڈیڑھ لاکھ من غلہ سمیت رابغ پہنچانے پر آمادہ ہے اور اس کا ایک جہاز تو بندرگاہ پر تیار کھڑا ہے جس کے لیے صرف سرکاری اجازت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ نمازی کمپنی اور شوستری کمپنی بھی کمشنر بمبئی سے اجازت مانگ رہی ہیں اور ان کے پاس تمام انتظامات مکمل ہیں۔ اسی اشاعت میں ہم نے مولانا کا وہ خط شائع کیا ہے جو انہوں نے جہاز راں کمپنیوں کو بھیجا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کمپنیوں سے مولانا نے ایک سمجھوتہ بھی کر لیا ہے، جس کے مطابق کمپنیوں نے ساحل سمندر تک حاجیوں کو بحفاظت تمام پہنچا دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اور اس کے بعد مولانا نے سلطان ابن سعود کے اعلان پر اعتماد کر کے ان سے اقرار کر لیا ہے کہ حجاج محض اپنی ذمہ داری پر مکہ تک سفر کریں گے۔

اب اس کے بعد صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ پھر سلطان ابن سعود کی طرف رجوع کیا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ قنفذہ اور لیث کے بجائے صرف رابغ پر اپنے تمام انتظامات مکمل کر دیں اور جلد سے جلد مسلمانان ہند کو ان کی تکمیل سے مطلع فرمائیں تاکہ حکومت کے لیے حجاز میں امن نہ ہونے کا کوئی بہانہ باقی نہ رہے۔ مولانا شوکت علی صاحب نے اپنے مضمون میں یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے کہ وہ امیر علی اور سلطان نجد سے التوائے جنگ کی درخواست کریں گے اور اگر انہوں نے اس کو منظور کر لیا تو پھر جنگ کا بھی کوئی عذر باقی نہ رہے گا' لیکن ہمارے سلطان ابن سعود تو شاید خوشی سے اس کے لیے تیار ہو جائیں' کیونکہ شہور حرام کی حرمت کے علاوہ خود ان کے مصالح بھی التوائے جنگ کے مقتضی ہیں' مگر امیر علی کو توحج کے لیے التوائے جنگ کا مشورہ دینا گویا "بادشاہی حجاز" کی تمام امیدوں سے دست بردار ہو جانے کا مشورہ دینا ہے' اب تو اس کی ساری امیدوں کا مرکز صرف یہی رہ گیا ہے کہ کسی طرح اس سال کا حج روک دیا جائے' کیونکہ اگر اس مرتبہ حج ہو گیا' تو پھر اس کے لیے مکہ کے تخت پر دوبارہ متمکن ہونے کی کوئی توقع باقی نہیں رہے گی۔ ایسی حالت میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اسے فریضہ حج کی حرمت کا واسطہ دے کر التوائے جنگ پر آمادہ کیا جا سکے۔

* ایک مفید تجویز

انتظامات حج کے سلسلہ میں ایک اور تجویز جریدہ زمیندار نے پیش کی ہے' جس کا مفاد یہ ہے کہ جمعیت خلافت' جمعیت علماء اور مسلم لیگ تینوں جماعتوں کے سربرآوردہ ارکان باہمی مشورہ سے ایک مشترکہ وفد مرتب کریں اور اس کو ۱۵ر مئی تک حجاز روانہ کر دیں تاکہ وہ وہاں پہنچ کر سلطان ابن سعود سے ملے۔ حاجیوں کی آسائش کے متعلق ضروری انتظامات کا اطمینان کرے۔ جو انتظامات ابھی تک غیر مکمل ہیں' ان کی تکمیل میں مدد دے اور ہندوستان سے حاجیوں کے پہنچنے پر ان کے سفر' قیام' خوردو نوش اور حفاظت کے تمام سامانوں کا کفیل بن جائے۔ ہمارے خیال میں یہ ایک مفید تجویز ہے' لیکن اب وقت اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ اس پر عمل کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اول تو ۱۲ر شوال تک کسی وفد کو مرتب کر کے روانہ کر دینا مشکل' پھر اگر جوں توں کر کے یہ ہو بھی گیا تو ذیقعدہ کے

دوسرے ہفتہ سے پہلے اس وفد کی جانب سے کوئی اطلاع ہندوستان تک پہنچنی محال ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اگر اس وفد کی اطلاع کے بعد ہندوستان میں حج کا اعلان کیا گیا اور ہر طرف سے حجاج ٹوٹ پڑے تو ایام حج تک انہیں حجاز پہنچانا اور دفعتہ" ہزارہا آدمیوں کے لیے انتظام کرنا محال ہو جائے گا۔ ان تمام مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہمارے خیال میں "زمیندار" کی تجویز نا قابل عمل ہے، البتہ اس سے زیادہ بہتر صورت پر اس وقت عمل ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سابق وفد حجاز کو جسے امیر علی نے مکہ معظمہ جانے سے روک دیا تھا، چند مزید ارکان کے ساتھ جلد از جلد حجاز بھیج دیا جائے تاکہ وہ وہاں جا کر اپنی نگرانی میں حاجیوں کو بلدالحرام تک پہنچوائے۔ سلطان کے انتظامات کا عمیق نظر سے مطالعہ کرے اور ان تمام امور کو انجام دے جو پچھلی مرتبہ مکہ تک نہ پہنچ سکنے کی بدولت رک گئے تھے۔ اگرچہ اب لڑائی بند کرانے کے امکانات تو ختم ہو چکے ہیں، لیکن اس کے علاوہ دوسرے مقاصد مہمہ ایسے موجود ہیں، جن کے حصول کی خاطر ہمیں اپنے ارباب تفکر و تدبر کو حجاز بھیجنا چاہیے۔ اس کے لیے حج سے بہتر اور کونسا موقع ہو سکتا ہے۔ ہمارے نمائندے اس سے فائدہ اٹھا کر حجاج کی مشکلات کا امعان نظر کے ساتھ مطالعہ کریں گے اور لگے ہاتھوں وہ کام بھی انجام پا جائے گا، جس کی ضرورت عرصہ سے مسلمانان ہند محسوس کر رہے ہیں۔

اگر ممکن ہو تو اس وفد میں ان ارکان کے علاوہ جو پہلے منتخب کئے جا چکے تھے، مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں کے نمائندے بھی شامل کر لیے جائیں، اور خصوصاً حضرات "اہل سنت" کو تو اس میں شرکت کی دعوت دینا عین مصلحت ہے، تاکہ وہ سب مل کر سلطان نجد کے اعمال و نیات کا پورے غور کے ساتھ محاسبہ کریں اور جو صحیح صحیح حالات ہوں، ان سے دنیا کو آگاہ کر کے موجودہ ظنون و اوہام کا کلیتہ" خاتمہ کر دیں۔

ہم مولانا شوکت علی کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ہر صوبہ سے خلافت کمیٹی کے ایک ممبر کو حجاج کے ساتھ بھیجنے کی تجویز ملتوی کر کے اس تجویز پر غور کریں اور اگر اہل الرائے حضرات اسے مناسب سمجھیں تو جلد سے جلد اس پر عمل کرنے کی سعی فرمائیں۔

* حجاز کی جدید اطلاعات

آج کی اشاعت میں ہم نے بلاد عرب کے زیر عنوان حجاز کے متعلق بعض نہایت اہم اطلاعات شائع کی ہیں۔ ان کا مآخذ ایک پرائیویٹ خط ہے، جو تازہ عربی ڈاک میں وصول ہوا ہے۔ یہ خبریں ایسے موقع پر آئی ہیں کہ ہم اس پر کوئی تفصیلی رائے زنی نہیں کر سکتے، اس لیے اسے اشاعت آئندہ پر ملتوی کر کے فی الحال صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قارئین کرام ان کو غور سے مطالعہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ شریف حسین کا خاندان اپنے اقتدار کے ان آخری لمحات میں بھی کیسی کیسی افسوسناک غداریاں کر رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ محاصل جدہ کو رہن رکھنے، مصری عیسائیوں کو فوج میں بھرتی کرنے اور غیر عربی مسلمانوں کو عرب سے بے دخل کرنے کی اطلاع تمام مسلمانوں کے لیے بے حد سبق آموز ہے۔ ہم حیران ہیں کہ جن بدبختوں کا نامہ اعمال اس قدر سیاہ ہے، ان کی حمایت کس منہ سے بمبئی، دکن اور ہندوستان کے دوسرے گوشوں میں کی جا رہی ہے؟ کیا یہی وہ خدمات ہیں جن کے صلہ میں شریف حسین اور اس کا خاندان ارض حرم کی خدمتگاری، بلکہ "بادشاہی حرمین شریفین کے خواب دیکھ رہا ہے۔

❑ رائگاں طلبی

{۱۸؍ مئی ۱۹۲۵ء}

ڈاکٹر کچلو نے صدر جمعیت خلافت کی حیثیت سے امیر علی کو تار دیا ہے کہ فریضہ حج کا احترام کر کے جنگ ملتوی کر دیں۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں یہ ایک طرح کی رائگاں طلبی ہے، کیونکہ جس چیز کا ہم اس غدار ابن غدار سے مطالبہ کر رہے ہیں، اس کے متعلق خود ہمیں بھی یقین ہے کہ وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ اشاعت گذشتہ میں مسئلہ حج پر بحث کرتے ہوئے ہم عرض کر چکے ہیں کہ امیر علی کے لیے اس مرتبہ کا حج ایک حیثیت سے پیام اجل کا حکم رکھتا ہے اور اس سے حج کے لیے سہولت بہم پہنچانے کی درخواست کرنا دراصل اسے خودکشی کی دعوت دینا ہے، مگر اس سے اتمام حجت مقصود ہے، تو خیر ورنہ اسے دراصل عبث سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔

صرف یہی نہیں کہ امیر علی کے مصالح اسے التوائے جنگ کی تجویز پر آمادہ نہیں کر سکتے، بلکہ ہمیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی نظروں میں مسلمانان عالم کی آواز کوئی وزن نہیں رکھتی۔ عالم اسلامی کے متعلق اس کے جو کچھ خیالات ہیں، ان کا حال اسی بات سے اچھی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ وہ غیر عرب مسلمانوں کو عربی معاملات میں دخل دینے کا مجاز ہی نہیں سمجھتا۔ ایسی حالت میں وہ مسلمانان ہند کی اس درخواست پر جیسی کچھ توجہ کرے گا، وہ ظاہر ہے۔

* بشارت حج

یہ خبر سن کر تمام مسلمانان ہند کو بے اندازہ مسرت ہوئی ہے کہ آخرکار حکومت نے موقع کی نزاکت کا احساس کرکے بہترین تدبر سے کام لیا اور گزشتہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے فریضہ حج کے متعلق اس نے جو افسوسناک پالیسی اختیار کر رکھی تھی، اس سے باز آگئی۔ اگرچہ ابھی تک اس کے نقطہ نظر میں کوئی بنیادی تغیر واقع نہیں ہوا ہے، کیونکہ وہ اب بھی عدن کے برطانوی پریذیڈنٹ اور ملک معظم کے قونصل مقیم جدہ کے لاطائل بیانات شائع کرکے عازمان حج کی ہمت شکنی کے لئے ویسی ہی کوششیں کر رہی ہے، جیسی پہلے کر رہی تھی، لیکن ہمیں اس کی نیت سے نہیں بلکہ اس کے عمل سے غرض ہے اور ہم خوش ہیں کہ اب وہ مذہبی مداخلت و مزاحمت کا ہم معنی نہیں رہا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا شوکت علی اور مولوی شفیع داؤدی کی مساعی جمیلہ خاص طور پر قابل تبریک و تہنیت ہیں۔ ان دونوں حضرات نے فریضہ حج کو سرکاری مزاحمتوں سے آزاد کرانے کے لئے جیسی سرگرم کوششیں کی ہیں ان کا حال قارئین کرام برابر اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دین و ملت کے سچے خادم کس طرح اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے ان تھک سعی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ دونوں بزرگ حج کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے اور مسلمانان ہند اپنے انہی "ہمدردوں" پر بھروسہ نہ کرتے، تو حکومت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی وہ زیادہ سے زیادہ ذی قعدہ ہی تک اقدام عمل کی اجازت دے سکتی تھی، تو یقیناً اس سال کا حج رک جاتا اور حکومت اپنے اس عظیم الشان تجربہ میں کامیاب ہوجاتی کہ اگر کبھی اسے اپنے مصالح کے

لئے ضرورت ہو، تو وہ حج جیسے اہم فریضہ دینی تک کو روک سکتی ہے۔ بہرحال اب کہ حج کا راستہ کھل گیا ہے، ہم مسلمانان ہند کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ان تمام شکوک و شبہات کو دور کردیں جو سرکاری و غیر سرکاری مصالح کی خاطر ان کے دلوں میں پیدا کئے گئے ہیں۔ آج پورے دس سال کے بعد ہم اپنی خوش نصیبی سے یہ وقت دیکھ رہے ہیں کہ ارض مقدس ان نجاستوں سے پاک ہوگئی ہے، جنہوں نے ایک غاصب و جابر شخص کے استیلاء کی بدولت اس کی طہارت کو ملوث کردیا تھا۔ مقام شکر ہے کہ تاریخ نے عہد بنی امیہ کے ایک خاص دور ظلم و جور کو ارض حرم میں زیادہ عرصہ تک نہیں دوہرایا اور وعدہ الٰہی کے مطابق بندگان حق کے لئے یہ پاک سرزمین بہت جلد ہی دارالامان بن گئی۔ خدا نے اپنے ایک بندے کو بھیج کر اس سے "تطہیر بیت" کا وہی مقدس کام پورا کرالیا ہے، جس کا حکم آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے حضرات ابراہیم و اسماعیل (علیہ السلام) کو دیا تھا اور اب دوبارہ یہ مہبط وحی الٰہی صحیح معنوں میں مثابتہ للناس وامنا بن گیا ہے۔ بس ضرورت ہے کہ مسلمان پروانوں کی طرح فوج در فوج اس شمع حرم کے گرد جمع ہوجائیں جس کی روشنیوں سے دلوں کے نہاں خانے مستنیر ہوتے ہیں اور فریضہ حج کو دوبارہ اسی ذوق و شوق کے ساتھ زندہ کریں، جو جنگ عظیم سے پہلے اس کی ادائیگی میں ظاہر کیا جاتا تھا۔ گزشتہ چند سال سے حسین کے مظالم اور حجاز کی بدامنیوں کی داستانیں مصیبت زدہ حاجیوں کی زبان سے سن سن کر عامتہ المسلمین کے دلوں پر ایک ہیبت سی طاری ہوگئی تھی اور بعض مواقع پر تو حج کو ملتوی کردینے کے لئے باقاعدہ تحریکیں تک شروع کردی گئی تھیں جن سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے حج کا ارادہ فسخ کردیا تھا، مگر اب خدا کا شکر ہے کہ وہ تمام موانع دور ہوچکے ہیں اور باوجود حالت جنگ قائم ہونے کے حجاز میں کامل امن و امان قائم ہوگیا ہے۔

* جدہ کے برطانوی قونصل کی غلط بیانی

گورنمنٹ نے حال میں جو بیان شائع کیا ہے، اس میں جدہ کے برطانوی قونصل کی جانب سے بعض اس قسم کی باتیں درج کردی گئی ہیں جن سے حجاج کی ہمت شکنی مقصود ہے۔ مثلاً یہ لکھ دیا ہے کا رابغ سے مکہ معظمہ تک جو راستہ جاتا ہے، وہ رقبۂ جنگ میں

واقع ہے اور جو قافلے اس پر سے گزریں گے، انہیں بھی اسی قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو جنگی علاقہ سے گزرنے والوں کو پیش آیا کرتی ہیں، لیکن یہ بیان قطعاً غلط ہے اور ہم قارئین کرام کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ محض انہیں فریب دینے کے لئے شائع کیا گیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک معظم کے قونصل صاحب شریف علی کے گہرے دوست ہیں اور ابتداء ہی سے انہوں نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی قونصلانہ پوزیشن سے اپنے دوست کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس علاقہ کو وہ رقبہ جنگ قرار دیتے ہیں، وہ اصل میدان جنگ سے بیسیوں میل دور ہے۔ امیر علی کی حکومت تو محض شہر جدہ تک محدود ہے اور نجدی افواج نے خشکی پر ہر طرف سے اس کی ناکہ بندی کر رکھی ہے تاوقتیکہ وہ اپنی مٹھی بھر فوج کو لیکر اس ناکہ بندی کو توڑ نہ دے اور خاص طور پر حجاج کا راستہ روکنے کے لئے رابغ سے مکہ جانے والی سڑک پر حملہ نہ کرے۔ یہ علاقہ اور کسی صورت سے رقبہ جنگ نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ ناممکن ہے لیکن اگر بفرض محال یہ ہو بھی گیا تو کیا کوئی شخص یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے کہ امیر علی اپنی ان تمام شقاوتوں کے باوجود جو اسے اپنے باپ سے ورثہ میں ملی ہیں، خدا کی راہ میں سفر کرنے والے احرام بند مسلمانوں پر بلاوجہ فوج لے کر آن پڑیگا۔ نہ صرف یہ کہ کوئی شخص جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان موجود ہو، اس گناہ عظیم کا ارتکاب نہیں کر سکتا، بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اس کے لئے ایسی جرأت کرنا ناممکن ہے جو تمام عالم اسلامی کو اس سے قطعاً متنفر کردیگی اور جس کے بعد حجاز پر اس کی اور اس کے سارے خاندان کی حکمرانی کا کبھی امکان باقی نہیں رہے گا۔

* حجاز کے لئے ایک مشترک وفد

ہم گزشتہ اشاعت میں مشترکہ وفد کی تجویز پیش کر چکے ہیں۔ اگر قوم کے ارباب حل وعقد نے اس پر غور فرمایا تو یقین ہے کہ وہ اس قسم کے ایک وفد کی ضرورت و اہمیت اچھی طرح محسوس کرلیں گے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں اب معاصر زمیندار کی تجویز پر

عمل کرنے کی صورت باقی نہیں ہے۔ مولانا شوکت علی کی تجویز بے شک مفید اور قابل عمل ہے، لیکن وہ ہماری ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی۔ ہماری ضرورت اس وقت یہی نہیں ہے کہ ہر صوبہ کا ایک نمائندہ امیرحج کی حیثیت سے اپنے صوبہ کے حجاج کی نگرانی کرے، ان کو آرام و آسائش پہنچانے کا انتظام کرے اور حجاز کے عام حالات کے متعلق یہاں آکر رپورٹ پیش کرے، بلکہ ہمیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے امور کی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے جو اس سے زیادہ اہم ہیں۔ مثلاً یہ کہ حجاز میں ہندوستانی حاجیوں کے لئے کس قسم کے انتظامات ہیں اور ان میں کس قدر توسیع و اضافہ کی ضرورت ہے؟ سلطان ابن سعود کا طرز حکومت کیا ہے اور وہ حجاز کے لئے کس حد تک مفید ہے۔ دول اجنبیہ سے سلطان کس قسم کے تعلقات رکھتے ہیں اور اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ وہ بعض معاہدات کی رو سے اجنبی حکومتوں کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہیں؟ حجاز کے آئندہ انتظام کے متعلق سلطان کے کیا ارادے ہیں اور وہ اس میں مسلمانان عالم کی شرکت کو کس حد تک قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ حجاز کی موجودہ اخلاقی و ذہنی حالت کیا ہے؟ وہ کس حد تک اصلاح کی محتاج ہے؟ اصلاح کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ اور مسلمانان ہند اس میں کس حد تک حصہ لے سکتے ہیں و قس علی ھذا۔

علاوہ ازیں ایسے موقع پر جبکہ تمام عالم اسلام کے نمایندے ایک جگہ اکٹھے ہوں گے، دوسرے بین الاسلامی کام بھی انجام دیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً مختلف اسلامی ممالک کے عام حالات معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ ہر ملک کے مسلمانوں کی اخلاقی ذہنی اور سیاسی حالت معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر حجاج میں کچھ علماو داعیان بھی ہوں تو ان کے ذریعہ رابطہ بین المللی کے قیام کی کوشش کی جاسکتی ہے اور حج کے موقعہ پر ہر سال ایک موتمر اسلامی کے انعقاد کے لیے بھی عملی تحریک کی جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اہم دینی و ملی ضروریات معمولی لوگ پوری نہیں کرسکتے، بلکہ ان کے لئے ہمارے ارباب فکر ورائے کو جانے کی ضرورت ہے اگر ہم نے ان کاموں کو معمولی کارکنان خلافت کے سپرد کردیا، تو وہ نہ انہیں باحسن وجوہ انجام دے سکیں گے۔ نہ ان کی الگ الگ رپورٹیں کچھ زیادہ مفید مطلب ہوں گی اور نہ ہم ان کی مدد سے کوئی قطعی پالیسی طے کرسکیں گے پھر جبکہ ہم اپنے قومی فنڈ سے اس کام پر ایک معقول رقم خرچ

کرنے پر تیار ہیں، تو بہتر یہی ہے کہ اس سے ایک ایسا وفد بھیجا جائے جو ایک ہی وقت میں اعلیٰ و ادنیٰ دونوں خدمات انجام دے سکے۔

ہمیں مسرت ہے کہ جمعیت علمائے ہند نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کردی ہے اور خاص اس مقصد سے صدر محترم نے مجلس عاملہ کے ارکان کو دیوبند میں اجتماع کی دعوت دی ہے۔ اور مولانا شوکت علی کو بھی تار کے ذریعہ توجہ دلائی ہے کہ وہ اس معاملہ میں جمعیت خلافت کی ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرکے فیصلہ سے اطلاع دیں۔ امید ہے کہ جمعیت خلافت بھی اس کام میں اتحاد عمل کرے گی اور جلد سے جلد ایک مشترک وفد حجاز بھیج دیا جائے گا جس میں خصوصیت کے ساتھ گزشتہ وفد کے ارکان بھی شامل ہوں گے۔

* وحدت اسلامی کے لئے ایک مبارک تحریک

طہران کے اخبار "وطن" نے اپنی ۱۵۔ رمضان کی اشاعت میں ایک اعلان شائع کیا ہے جو وحدت اسلامی کے لئے معاصر موصوف کے مبارک احساسات پر دلالت کرتا ہے اور اسے دیکھ کر ہمیں مسرت ہوتی ہے کہ اب تمام بلاد اسلامیہ میں انتشارات کے افسوسناک نتائج کو محسوس کرکے اجتماع ایتلاف کے لئے سعی کی جارہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

> "آج مغربی اقوام کے مقابلہ میں عالم اسلام کی حالت جس قدر اندوہناک اور امم شرقیہ کی صورت جس قدر پریشان کن نظر آتی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مشرقی قوموں کے درمیان روابط و علائق کی بہت کمی ہے۔ ہم نے اس حقیقت کو ہمیشہ محسوس کیا ہے اور جریدہ وطن کی ابتدائے حیات سے جس کو آج ۱۷ برس گزر چکے ہیں، ہم اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کی تجاویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے رہے ہیں"۔

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ موتمر اسلامی میں اپنا نمائندہ وفد ہر سال بھیجا کریں تاکہ ہمارے خیالات عالم اسلامی اور دنیائے مشرق کے ارباب فکر و رائے تک پہنچ سکیں اور اس طرح ہمیں اسلام اور مشرق کی خدمت کا شرف حاصل ہو۔ ایسے بلند اور مبارک کام کے لئے ہم عالم مشرقی کے تمام اکابر رجال اور ارباب

صحافت سے جنہیں مشرق کی ترقی اور رائے عامہ کی تعلیم سے دلچسپی ہو' درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے اس جدید خیال کی حمایت کریں اور جہاں تک ممکن ہو کسی قسم کی ذہنی' مادی اور روحانی اعانت سے دریغ نہ کریں۔

چونکہ ہم مشرق کے ارباب فکر کی ایک بڑی جماعت سے واقف نہیں ہیں' اس لئے ہم تمام ان لوگوں سے جن تک یہ ادبی اپیل پہنچے اور جو اس کے مقصد سے ہمدردی رکھتے ہوں' درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں ایسے لوگوں کے پتے بھیجیں تاکہ ہم اپنا اخبار بھیج سکیں۔

جو لوگ ہم سے مراسلت کرنا چاہتے ہوں وہ "وطن" طہران (ایران) کے پتہ پر خط و کتابت کریں۔

ہم معاصر محترم کو اس کے اسلامی احساس پر مبارکباد دیتے ہیں اور قارئین کرام کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اس مفید کام میں اس کی مدد کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ممالک اسلامیہ میں رابطہ اخوت دینی کو استوار کرنے کی سخت ضرورت ہے اور اگر آج ہم اس رابطہ کو مضبوط کرنے میں کامیاب ہو جائیں' تو سمجھنا چاہئے کہ گویا حریت و استقلال کے میدان میں ہم نے آدھی بازی جیت لی۔

اس تائید کے ساتھ ہم معاصر موصوف کو یہ مشورہ بھی دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ دنیائے اسلام میں ادبی و ذہنی اتحاد کے لئے فارسی سے زیادہ بہتر ذریعہ عربی ہے کیونکہ فارسی سے صرف وسط ایشیا کے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور عربی تمام عالم اسلامی کی بین الاقوامی زبان ہے' اس لئے اگر جریدہ وطن کو ان دونوں زبانوں میں نکالا جائے تو زیادہ مفید ہو گا۔

✱ مجاہدین ریف کے لئے یوم الدعا

۲۲ر مئی کو ملک کی تمام مساجد میں دعا کی جائے

بمبئی ۱۱ر مئی- میں ہندوستانی اور اسلامی جرائد کی وساطت سے التماس کرنا چاہتا ہوں کہ ۲۲ر مئی کو نماز جمعہ کے بعد ہندوستان بھر کی مساجد میں ریف کے غیور و شجاع بھائیوں کی حفاظت و نصرت کے لئے دعا کرنے کا اہتمام کیا جائے جو اپنے وطن اور آزادی کے دفاع کے لئے شمشیر بکف ہیں۔ بہادران ریف ہر سچے' بہادر' فراخ دل اور آزادی

کے حامی شخص کی طرف سے دعا اور خیر خواہی کے مستحق ہیں۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ مجلس مرکزیہ خلافت جمعیتہ العلماء، جمعیتہ تبلیغ اور دیگر اسلامی انجمنوں کے صدر ایسی اپلیں شائع کریں۔

مجاہدین ریف کے لیے یوم الدعا

{ ۲۲ر مئی ۱۹۲۵ء }

آج دعا کا دن ہے! اللہ کے مومن و مخلص بندوں کی ایک مٹھی بھر جماعت اقصائے مشرق میں ۴ سال سے اپنے دین و ایمان اور حریت و استقلال کی خاطر مشغول جہاد ہے اور یورپ کی ایک قاہر سلطنت کے پنجہ سے نجات حاصل کرنے کے بعد ایک دوسری عظیم الشان قوت کے حملوں کی آماجگاہ بن گئی ہے جو پہلی قوت سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ ہم مسلمان اتنی قدرت نہیں رکھتے کہ اس مظلوم غزا پیشہ قوم کی حمایت میں وہاں جاکر اعدائے دین سے جنگ کریں۔ ہمارا اگر کچھ بس ہے، تو وہ صرف اپنے دلوں، اپنی زبانوں اور اپنی جیبوں پر ہے پس ضرورت ہے کہ ہر مسلمان آج کے دن کامل خشوع و خضوع کے ساتھ مجاہدین ریف کی فتح کے لئے خداوند قدوس سے دعا کرے اور پیسہ، دھیلا، روپیہ جتنی بھی توفیق ہو، ان بے یارومددگار مظلوموں کی اعانت کے لئے چندہ دے۔

* مجاہدین ریف اور ہندوستانی مسلمانوں کا فرض

مادہ پرستی کے اس دور تاریک اور سائنس کے اس ارتقاء کے زمانہ میں اللہ والوں کی ایک مٹھی بھر جماعت نے اپنے فطری حقوق حریت و آزادی کے لئے مصمم عزم کے بہترین نتائج کا جو زندہ مرقع دنیا والوں کے سامنے پیش کیا ہے، اس کا ایک ایک نقش اس قابل ہے کہ اسے نہایت غور سے دیکھا جائے۔ ہسپانیہ کی افواج قاہرہ جو یورپ کے جدید اور مکمل ترین اسلحہ حرب سے مسلح اور کمربستہ تھیں گنے چنے بے سروسامان مجاہدین فی سبیل اللہ کے مقابلے میں اس طرح گرد ہوئیں، جس طرح باطل حق کے سامنے اور رات کی تاریکی سورج کی چمک کے سامنے گرد ہوجاتی ہے۔ کون کہتا تھا کہ مجاہدین ریف اس جدوجہد آزادی میں سرخرو ہوں گے، یورپ کی دنیا میں اس نحیف اور کمزور جماعت کا فتح

مند ہونا سائنس اور آتشیں اسلحہ جنگ کی طاقت سے انکار کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اخبارات کے نامہ نگار مجاہدین ریف کی ہر کامیابی کو سخت ترین ہزیمت کا پیش خیمہ بتاتے ہیں اور کہتے تھے کہ جسقدر بلندی سے کوئی چیز گرا کرتی ہے' اسی قدر تباہ ہوا کرتی ہے' لیکن ارباب عزیمت جانتے تھے کہ اسلام کے نام لیوا اپنے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے اور حریت و آزادی کے حصول کے لئے ہمیشہ اسی قسم کی امثال و نظائر پیش کرتے رہے ہیں۔

امیر محمد بن عبدالکریم غازی اور ان کے سرفروش مجاہد نہ صرف مسلمانان عالم بلکہ ہر اس ملک اور قوم کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں جو آزادی کو نعمت اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کو قابل ستائش خیال کرتی ہے۔ غازیان ریف نے ہسپانیہ سے علی الاعلان کہ دیا ہے کہ ۱۔حکومت ہسپانیہ اہل ریف کی خود مختاری تسلیم کرلے ۲۔میلہ اور سیوتا کے سوائے تمام ہسپانوی علاقہ خالی کردے۔ ۳۔چھ لاکھ پونڈ تاوان جنگ ادا کرے۔ ۴۔ پانچ توپ خانے ۵۔دس ہزار رائفلیں اور ۶۔ تیس لاکھ کارتوس حوالے کرے۔

لیکن اب غور فرمائیے کہ مجاہدین ریف کی اس مختصر جماعت کو اس عظیم الشان جنگ میں کن کن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ اس جنگ کے دوران میں کتنے مجاہدین شہید ہوئے ہوں گے اور ان شہداء کے اہل و عیال کا کیا حال ہوگا؟ آزادی اور حریت کے لئے جان دینے والوں پر کیسے کیسے آسمان نہ ٹوٹے ہوں گے ان بہادروں کے مصائب' زخمیوں کی تعداد اور ان کی حالت کا اندازہ کرنے کے بعد ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ایسی بہادر جماعت کی مدد کے لئے ہم کیا کرسکتے ہیں۔ انسانیت کا تقاضا ہے اور ہمدردی بنی نوع انسانی اس امر کی مقتضی ہے کہ ہم ان مجاہدین کی حفاظت کے لئے جو کچھ پیش کرسکتے ہیں پیش کردیں' تاکہ دنیا کو معلوم ہوجائے کہ ہندوستان کے باشندے ہر اس قوم کو جو حریت و آزادی کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہے' کس قدر عزت و قعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیا آپ ان شہیدوں کے ہونہار بچوں اور ان غازیوں کے بھوکے نونہالوں کو فراموش کردیں گے اور ان کی مدد نہ فرمائیں گے؟ ہمیں امید ہے کہ آپ ایسے بہادروں کی اولاد اور ایسے جان بازوں کے اہل و عیال کی امداد کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔

* مالوی جی اور دولت آصفیہ

مالوی جی کے داخلہ حیدر آباد کے خلاف حضور نظام کے امتناعی فرمان پر ہندو قوم میں جو ہیجان برپا ہوگیا ہے، وہ ایک بالکل قدرتی جذبہ ہے جس سے کوئی قوم بھی خالی نہیں ہوتی۔ ہر قوم کے دل میں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، اپنے اکابر و اعاظم کی عزت و محبت کا جذبہ طبعاً پیدا ہوتا ہے اور وہ ان کے خلاف ہر قسم کی جائز و ناجائز کارروائی کو ناپسند کیا کرتی ہے۔ پس جہاں تک اظہار ناراضی کا تعلق ہے، ہم ہندوؤں کو اس کے لئے مجبور سمجھتے ہیں اور جب تک خود ہم میں اپنے اعاظم کی قدر باقی ہے ہم انہیں اس پر الزام دینے کا کوئی حق نہیں رکھتے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہندو بھائی معمولی احتجاج کی حد سے گزر کر نہایت ناروا حملوں اور سخت ناپاک الزامات پر اتر آئے ہیں۔ ان کے ایک خاص طبقہ نے جو ہمیشہ ہندو مسلمانوں میں عداوت بڑھانے کے لئے ایسے مواقع کا منتظر رہتا ہے، اسے ایک ہندو مسلم سوال بنا دیا ہے اور حسب معمول اعلی حضرت نظام کے خلاف ایک ایسا شدید ایجی ٹیشن برپا کر دیا گیا ہے جسے کسی قدیم عداوت کے سوا کسی اور چیز کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ معمولی اخبارات اور تھرڈ کلاس لیڈروں کو جانے دیجئے کہ وہ غریب تو محض پیشہ ورانہ ایجی ٹیٹر ہوتے ہیں جنہیں تہذیب، معقولیت اور سمجھداری سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ صرف انہی تک محدود رہتا، تو ہم یقیناً خاموشی و درگزر سے کام لیتے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہندو قوم کے بڑے بڑے لیڈر بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے حقیقی رہنما بھی اس کام میں شریک ہوگئے ہیں اور یہ دراصل انہی کے اشارہ سے سب کچھ ہو رہا ہے۔

غالباً اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کسی شخص کو بھی انکار نہ ہوگا کہ لالہ لاجپت رائے، پنڈت مالوی اور سوامی شردھانند اس وقت ہندوؤں کے سب سے بڑے رہنما ہیں اور اسٹیج پر یہ تینوں حضرات جمع ہیں۔ ان کی ہر آواز پوری ہندو قوم کی متفقہ آواز کا حکم رکھتی ہے۔ ایسے ذمہ دار لیڈروں کی موجودگی میں دہلی کے ایک جلسہ کے اندر جو ریزولیوشن پاس کیا گیا ہے، اس کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ:

> "دہلی کے ہندوؤں کا یہ عظیم الشان جلسہ نظام حیدر آباد کے اس تازہ فرمان کو جس کے ذریعہ ہندو جاتی کے پرم پوجیہ، شانتی سروپ سارے دیش کے مانیہ نیتا

> پنڈت مدن موہن، مالویہ جی کا داخلہ جو مذہبی کانفرنس کی صدارت کی غرض سے وہاں تشریف لے جانے والے تھے، ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ریاست حیدر آباد کے ۹۶ فی صدی ہندوؤں کے دہارمک حقوق میں صریح غیر منصفانہ مداخلت اور نظام صاحب کے مذہبی تعصب کا مظہر قرار دیتا ہے اور اس کے خلاف زبردست ناراضگی کرتا ہے۔ شائد واضعین ریزولیوشن اور تمام حاضرین کو معلوم نہیں تھا کہ ریاست حیدر آباد دکن میں ہندوؤں کی آبادی ۹۶ فی صد نہیں بلکہ ۴۵-۵۰ فی صدی ہے۔"

اس ریزولیوشن کو خود لالہ لاجپت رائے نے پیش کیا۔ سوامی شردھانند اور پنڈت دین دیال شرما نے اس کی تائید کی اور مالوی جی نے اس کی تائید میں ہاتھ اٹھایا۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ اس میں پوری ہندو قوم کی طرف سے ملک کے سب سے بڑے فرمانروا اور اسلای ہند کی عظیم تر شخصیت پر مذہبی تعصب کا الزام عائد کیا گیا، تو غالباً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انہی بزرگوں کی موجودگی میں لالہ دیش بند گپتا نے حضور نظام کی شان میں نہایت گستاخانہ تقریر کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ۔

> "پوجیہ مالوی جی جیسے بزرگ نیتا کو ریاست میں داخل ہونے کی اجازت نہ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، اگر نظام صاحب نے اپنے حکم کو واپس نہیں لیا، تو انہیں پتہ لگ جائے گا کہ اس قسم کے احکامات کا کیا نتیجہ ہوا کرتا ہے"۔

لیکن ان میں سے کسی نے بھی انہیں اس بدزبانی سے منع نہیں کیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ ان الفاظ کو بیٹھے سنتے رہے۔۔ اس سے برادران ہنود کی اخلاقی و ذہنی حالت اور ان کے ذمہ دار لیڈروں کے عدم تدبر پر جس قدر روشنی پڑتی ہے اسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

تاہم اگر حقائق سے یہ بات ثابت ہوجائے کہ پنڈت مالویہ کے داخلہ حیدر آباد کی ممانعت محض تعصب پر مبنی ہے اور اس میں کوئی ملکی مصلحت شامل نہیں ہے، تو ہم اپنی قوم کی سب سے بڑی شخصیت کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود ہندوؤں کے ان شرمناک الزامات کو خاموشی سے برداشت کرسکتے ہیں، لیکن ہمارے پاس اس بات کے ثبوت میں کافی سے زیادہ قاطع دلائل موجود ہیں کہ حضور نظام کا حکم نہ صرف تعصب سے قطعاً مبرا

ہے بلکہ ان کے ملکی مصالح کا عین مقتضاء وہی تھا جو انہوں نے کیا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ریاستوں میں اس قسم کے امتناعی احکام کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ ہندوستان کی ریاستوں میں سے اکثر ایسی ہیں جن میں کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کا داخلہ ضرور بند ہوا ہے، مگر کبھی اس فعل کو تعصب پر مبنی قرار نہیں دیا گیا۔ کشمیر میں مسٹر داس کا داخلہ بند ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔ ابھی حال ہی میں ریاست جے پور نے مسٹر جمنا لال بجاج پر بے جا قیود عائد کردی ہیں راجپوتانہ کی ریاستوں میں سیاسی آدمیوں پر ہمیشہ اسی قسم کے احکام نافذ کئے جاتے رہتے ہیں۔ رامپور میں مولانا محمد علی و شوکت علی کے ساتھ جو ظالمانہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے، اس کی مثال ابھی بالکل تازہ ہی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ رامپور خود ان کا وطن ہے۔ نواب صاحب ان کے ہم مذہب ہیں اور ان سے دونوں بھائیوں کے دیرینہ تعلقات ہیں، مگر ان سب باتوں کے باوجود نواب صاحب نے ایسی مصیبت کے وقت بھی جبکہ ان کی والدہ محترمہ مرض الموت میں مبتلا تھیں اور وہ کسی سیاسی مقصد سے نہیں بلکہ محض اپنی والدہ کے آخری لمحات زندگی میں ان سے ملنے جا رہے تھے۔ انہیں حدود ریاست میں داخل نہ ہونے دیا اور مجبوراً بی اماں مرحومہ بستر مرگ سے اٹھ کر اپنے عزیز و محبوب بیٹوں سے ملنے کے لئے دہلی تشریف لے آئیں۔ ان واقعات پر سارے ہندوستان میں اظہار ناراضی کیا گیا۔ کسی شخص نے انہیں نظر استحسان سے نہیں دیکھا، مگر کبھی کسی کو اس بات کا سان و گمان بھی نہیں ہوا کہ ان کی بنا کوئی مذہبی تعصب ہے ایک مسلمان ریاست کی جانب سے ایک مسلمان معزز خاتون کے ساتھ یہ بے رحمانہ سلوک صاف بتلا رہا ہے کہ اس قسم کے واقعات مذہب سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے۔ ان کی اصل صرف ملکی مصالح ہیں جنہیں تدبر انسانیت اور معقولیت کے خلاف تو کہا جا سکتا ہے، مگر مذہبی تعصب ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

خود ریاست حیدر آباد میں بھی ایک سیاسی لیڈر کا داخلہ بند کئے جانے کی یہ کوئی مثال نئی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بیسیوں مواقع پر اسی قسم کے احکام نافذ کئے جا چکے ہیں۔ مسٹر جناح کو ایک قلیل مدت کے نوٹس پر حدود ریاست سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ مسٹر تلک پر بھی اسی قسم کے احکام نافذ کئے گئے تھے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی پر بھی قیود عائد کرنے کا واقعہ کچھ زیادہ پرانا نہیں ہے اور تلاش کی جائے تو اس قسم کی

مثالیں اور بہت سی مل سکتی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے پہلے نہ کبھی ان احکام کو متعصبانہ قرار دیا گیا، نہ کسی صاحب عقل و خرد انسان نے اسے تعصب کا شاخسانہ قرار دیا اور نہ کسی مجنونانہ ایجی ٹیشن کے لئے استعمال کیا گیا۔ پس دراصل یہ پہلی مثال ہے کہ ایک ریاست میں کسی سیاسی لیڈر کے داخلہ کی ممانعت کو ہندو مسلم رنگ دے کر مورد لعن و طعن بنایا گیا ہو اور اس لحاظ سے ہمیں کہنا چاہیے کہ یہ تعصب کا رنگ اس کا اصلی رنگ نہیں ہے، بلکہ یہ چشم یرقان کا قصور ہے کہ اس میں ہر چیز زرد ہی نظر آیا کرتی ہے۔

ہمارے ہندو دوستوں کو شاید وفور غیظ و غضب میں یاد نہیں رہا کہ اعلی حضرت شہریار دکن نے ہمیشہ اپنی قلمرو کو پر امن تعلیمی تحریکات کے سوا کسی قسم کی تخریبی تحریکات سے متاثر نہیں ہونے دیا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں ہندوستان کے اندر بہت سی تحریکیں پیدا ہوئیں، لیکن انہوں نے دکن تک ان کے جراثیم نہ پہنچنے دیئے۔ دوسری تحریکات تو درکنار، خود خلافت کی تحریک تک جس میں خود اعلیٰ حضرت کی دلی ہمدردیاں بھی شامل تھیں اور مذہباً ان کا فرض تھا کہ وہ اس سے ہمدردی کرتے، انہوں نے اپنی رعایا کو اس میں بھی شریک نہ ہونے دیا اور خلافت کے مبلغین کو حکام ریاست نے سزائیں تک دیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم تبلیغ کا معاملہ ہے۔ تبلیغ اسلام ہر مسلمان کا فرض ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ حضرت بھی اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اسلام کی حقانیت پر ہر سچے مسلمان کی طرح ان کا بھی ایمان ہے، لیکن باوجود اس کے انہوں نے محض اس خیال سے کہ تحریک تبلیغ کے ساتھ کہیں وہ منافرت باہمی کے جذبات بھی ان کے حدود مملکت میں نہ پھیل جائیں جو برطانوی ہند میں شدھی و تبلیغ کے تصادم سے پیدا ہو گئے ہیں، حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کو اپنے ہاں تبلیغی نظام قائم کرنے سے منع فرما دیا اور تمام ان مخلص مسلمانوں کے مشورے قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جو ممالک محروسہ سرکار عالی میں اشاعت اسلام کرنا چاہتے ہیں پھر جبکہ اعلیٰ حضرت تمام تحریکات حتی کہ خود دینی تحریکات کی اشاعت بھی اپنے ملک میں گوارا نہیں فرماتے اور انہیں روکنے میں ہندو مسلم کی کوئی تمیز نہیں رکھتے، تو برادران ہنود کس بنا پر یہ امید کر سکتے ہیں کہ آپ پنڈت مالوی جی کو شدھی و سنگھٹن کا پرچار کرنے کے لئے ریاست میں داخل ہونے دیں گے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ انہی پنڈت جی کی بدولت

آج سارا ہندوستان شر و فساد کا آتش کدہ بنا ہوا ہے' انہی کی ریشہ دوانیوں سے حیدر آباد کی ہندو رعایا کے ایک حصہ میں خاندان آصف جاہی جیسے عدل پرور و نصفت شعار خاندان کے خلاف نافرمانی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں' انہی کے پرچار کا نتیجہ گلبرگہ کے فساد کی صورت میں ابھی تھوڑی ہی مدت قبل ظاہر ہو چکا ہے اور انہی کے ہمنواؤں نے حیدر آباد میں ایک "بااختیار اسمبلی" قائم کرنے کے لئے شور مچا رکھا ہے۔

لالہ لاجپت رائے جی تعجب سے فرماتے ہیں کہ!

> "نظام کو مالوی جی جیسے امن اور شانتی کے مجسمہ سے اتنا بیر اور وحشت کیوں ہے۔ اگر مالوی جی کے متعلق کسی کو شک ہوا ہوتا کہ وہ فساد کراتے ہیں' تو یہ فرمان ٹھیک ہوتا' مگر وہ تو شانتی سروپ ہیں۔ جب ان کے ساتھ یہ برتاؤ ہے' تو میرے جیسے آدمی کے ساتھ معلوم نہیں کیا سلوک ہوتا"۔

مگر ہمیں لالہ جی سے بھی زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اگر مالوی جی جیسے شخص کو امن اور شانتی کا مجسمہ کہا جائے' تو پھر بدامنی اور اشانتی کا مجسمہ کس کو کہا جائے گا۔ مالوی جی کی پچھلی تقریروں کے نتائج کو دیکھئے۔ فساد ملتان کے بعد سے انہوں نے جو کچھ کارروائیاں کی ہیں' ان پر نظر ڈالیے۔ ان کی سنگھٹنی تعلیمات نے ہندوستان کے امن وامان پر جتنا برا اثر ڈالا ہے' اس پر غور کیجئے۔ ان کی اینٹوں کے بھٹے نے جتنے سر پھوڑے ہیں' انہیں شمار کیجئے اور اس کے بعد ہمیں بتایئے کہ ایسے شخص کو کس حیثیت سے شانتی سروپ کہا جا سکتا ہے اور ایک ایسا فرمانروا کیونکر اسے اپنے علاقہ میں داخل ہونے کی اجازت دے سکتا ہے' جو اپنے ملک کو ہر قسم کی اضطراب انگیز تحریکات سے محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ دور نہ جایئے' اسی جلسہ میں جس کے اندر لالہ لاجپت رائے نے مالوی جی پر شانتی کے مجسمہ اور امن کے داعی ہونے کا الزام عائد کیا ہے' چند ہی لمحات پہلے مالوی جی نے جو تقریر کی ہے' اس سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ الزام کس حد تک صحیح ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جس شخص کی تعلیم یہ ہو کہ "اپنے دھرم اور استریوں کی رکشا کرنے کے لئے ہندوؤں کو اپنے اندر اتنی شکتی پیدا کرنی چاہئے کہ جو کوئی ان پر حملہ کرے یا ان کا گھر جلائے' تو وہ اس کا سر توڑ دیں۔

جو شخص ہندوؤں میں یہ جنگی روح پیدا کرنا چاہتا ہو کہ اپنی شکتی کو جگالو' گرد گووند

سنگھ کو یاد کرو جس نے ہندوؤں کو جگایا تھا۔ مہابیر کو یاد کرو اور برمچریہ اور دیا بام سے شکتی پیدا کرو اور پرن کرو کہ جان جائے مگر دھرم نہ جائے۔ دشمن کے سامنے سے بھاگو مت۔ مرجاؤ یا مرد کی طرح رہو“۔

”جو شخص ہندوؤں میں اس خیال کا پرچار کرتا ہو کہ ”ہندو ربل نہیں ہیں۔ برابر کی لڑائی میں ہندو دنیا کے پردہ پر کسی دوسری جاتی سے کمزور نہیں ہیں‘ البتہ ان میں کمی یہ ہے کہ وہ بدمعاش نہیں ہیں۔ شریر نہیں ہیں ڈاکو‘ قاتل‘ رہزن اور لٹیرے نہیں ہیں۔ امن پسند اور شانت ہیں اور اسی لئے دوسری قومیں انہیں پامال کرتی ہیں“۔

جو شخص کھلے بندوں اپنی قوم سے کہتا ہو کہ !”ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے بہت کم باہر سے آئے ہیں‘ ورنہ سب کے سب یہاں دھوکہ‘ لالچ‘ جبر اور ہماری ناسمجھی کے کارن مسلمان بنالئے گئے ہیں“ اور جو شخص ہندوؤں کو اس طرح ڈرا ڈرا کر ابھارنے کی کوشش کرتا ہو کہ ”مسلمانوں کی فوج ہمارے پیچھے پڑگئی ہے اس کے مقابلہ پر مستعد ہونا ضروری ہے۔

کیا ایسا شخص امن عالم کے لئے خطرہ نہیں ہے؟ کیا اس کی تعلیمات کا لازی نتیجہ ہندوؤں کے آمادہ جنگ اور مسلمانوں کے مستعد مقابلہ ہونے کی صورت میں رونما نہیں ہوگا؟ اور کیا ایسے شخص کے متعدی اثرات سے اپنی ہندو مسلم رعایا کو محفوظ رکھنا کسی فرمانروا کے لئے مجرمانہ تعصب کہلایا جاسکتا ہے؟ مہربانی کرکے ہمارے ہندو دوست ان سوالات پر ذرا ایمانداری کے ساتھ غور کریں اور اس کے بعد سوچیں کہ جس چیز کا الزام وہ اعلی حضرت نظام الملک جیسے عادل و منصف بادشاہ پر عائد کررہے ہیں‘ وہ دراصل کس کا حصہ ہے۔

لیکن اگر ہمارے ہندو دوست پھر بھی قائل نہ ہوں اور برابر حضور نظام کو تعصب کا الزام دیتے رہیں‘ تو ہم کہیں گے کہ آپ انہیں الزام دینے سے پہلے خود ہندو مہاراجاؤں کی خبر لیجئے۔ ہندو ریاستوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ بدسلوکیاں کی جارہی ہیں اور ہندو رئیس جس طرح ہندوؤں کی افتراق انگیز تحریکات میں حصہ لے رہے ہیں‘ ان کی ایک مثال بھی آپ کو کسی اسلامی ریاست میں نہیں مل سکتی۔ مہاراجہ اندور خود ”ہندو اخبارات کے بیان کے مطابق شدھی کے لئے ۸۰ ہزار کا گراں قدر عطیہ دیتے ہیں۔

مہاراجہ بڑودہ اپنے ہاں مسلم راجپوتوں کی ایک پوری قوم کو شدھ کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور سوامی شردھانند کو ان کی ریاست میں اس کام کے لئے پوری آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں، مہاراجہ بھرت پور مسلمانوں کی مسجدیں منہدم کرتے ہیں۔ ہندو مبلغین کو شدھی کا پرچار کرنے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں اور تاکید کردیتے ہیں کہ کوئی مسلمان مبلغ ان کے حدود و ریاست میں داخل نہ ہونے پائے۔

مہاراجہ دربھنگہ سنگھٹن و شدھی کی تحریکات میں علانیہ حصہ لیتے ہیں اور اپنے عمل میں مالوی جی سے ایک قدم پیچھے نہیں رہتے۔ مہاراجہ کشمیر اپنی ریاست میں شدھی کے پرچارکوں کو علانیہ مدد دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی دل آزاری اور مذہبی توہین میں کوئی دقیقہ فردگزاشت نہیں کرتے اور فریاد کرنے والوں کی جائیدادیں ضبط کرکے انہیں جلاوطن کردیتے ہیں پھر جب ہندو ریاستیں یہ سب کچھ کرتی ہیں اور ان کے آبگینہ عدل وانصاف کو اس سے کوئی ٹھیس نہیں لگتی، تو کیا وجہ ہے کہ حضور نظام کو محض مالوی جی کا داخلہ بند کردینے پر تعصب کا الزام دیا جاتا ہے؟ ہمارے ہندو بھائیوں کو کبھی اپنے گریبان میں بھی تو منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے۔

✱ عجیب و غریب منافقت

لالہ لاجپت رائے نے صوبہ پنجاب سے اپیل کی ہے کہ وہ ہر سال کانگریس کے لئے پچاس ہزار روپیہ دیا کرے اور اس اپیل کے دوران میں لکھا ہے کہ: "کانگریس کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرو اور جو مخالفین اس کے کام میں سدراہ ہوں انہیں کامیابی کا موقع حاصل نہ ہونے دو"۔ ایک طرف تو ہمارے محترم لالہ جی کانگریس کی حمایت میں پنجاب کو مشورہ دیتے ہیں اور دوسری طرف ہندو مہاسبھا کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر برملا کہتے ہیں کہ ہندو قوم کانگرس کے ہاتھ میں اپنے مفاد کو محفوظ نہیں سمجھتی۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں، مگر قدرت نے لالہ جی کو منافقت کا کچھ ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا کیا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں نہایت کامیابی کے ساتھ ان دونوں کو نباہ سکتے ہیں

* مصر میں قادیانی فطرت کا نمونہ

چند مخلص ہندی نوجوانوں نے مصر میں **جمعیتہ الرابطتہ الہندیتہ** کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا مقصد ہے کہ ان ہندوستانیوں کے درمیان باہمی معاونت کا رابطہ قائم کیا جائے، جو مصر میں مقیم ہیں۔ تنگدستی و ناداری کے وقت ان کی مدد کی جائے اور جو ہندوستانی مصر میں نادار اور اجنبی ہوں انہیں اجنبیت کی تکالیف سے نجات دلائی جائے۔ چونکہ اس کی اغراض میں کوئی مذہبی غرض شامل نہ تھی اور ہندوستانیت کے تعلق سے ہر ہندوستانی بلا امتیاز مذہب و مسلک اس برادری کا ایک رکن تھا، اس لیے بانیان انجمن نے (جو تقریباً سب سنی مسلمان ہیں) ایک قادیانی بزرگ کو بھی اس میں شامل کر لیا، لیکن قادیانی حضرات جس قسم کی فطرت لے کر آئے ہیں، اس سے وہ لوگ ناواقف تھے۔ انہیں بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ جماعت سازش تفرقہ اندازی اور صید بازی اور فریب میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔ انہوں نے محض **وسیع الخیالی** اور وطنی ہمدردی سے کام لے کر ان حضرات کو اپنی انجمن میں شامل کیا تھا اور جہاں تک رکنیت انجمن کا تعلق ہے، اس میں کچھ ہرج بھی نہیں تھا، لیکن زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ انہیں اپنی رواداری کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور قادیانی صاحب نے ان کے بعض ساتھیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی جماعت میں تخم ریزی شروع کر دی۔ سب سے پہلے وہ انجمن کے ایک سرگرم کارکن بنے پھر جب اس کے ارکان میں کچھ رسوخ حاصل کر لیا تو ان کو لالچ دلایا کہ میں تمہاری انجمن کو پچاس ہزار پونڈ کا وقف لے کر دوں گا اور اس طرح چند آدمیوں کو اپنے بھروں پر چڑھا کر کوشش شروع کر دی کہ اسے انجمن کا سیکرٹری بنا دیا جائے۔ جو لوگ ناسمجھ تھے وہ تو اس معاملہ کو اسی "رواداری" اور "**وسیع الخیالی**" کے نقطہ نظر سے دیکھتے رہے جس سے ابتداء میں کام لیا گیا تھا اور نہ سمجھ سکے کہ اس کی تہہ میں کیا چیز پوشیدہ ہے، لیکن جن کو خدا نے کچھ بصیرت عطا کی تھی، انہوں نے پہلی نظر میں خطرہ کو محسوس کر لیا اور مزاحمت شروع کر دی۔ اس کشمکش کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن برادران وطن کی خدمت کا کوئی کام کرنے کے بجائے اندرونی جھگڑوں میں مبتلا ہو گئی اور اس کے ارکان میں سخت جھگڑے پڑ گئے۔

حال ہی میں اس انجمن کی ورکنگ کمیٹی کے صدر حکیم صدیق محمد صاحب کا جو خط ہمارے پاس آیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ شخص تین سال سے یہاں قادیانیت کی تبلیغ کر رہا ہے، مگر ابھی تک کوئی مصری اس کے دام فریب میں نہیں پھنسا۔ اس لیے اب اس نے غریب ہندیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا ہے، کیونکہ یہاں اس کی تبلیغ کے لیے میدان صاف ہے"۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قادیانی صاحب انجمن مذکورہ کی نظامت صرف اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی ذمہ دارانہ پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر مرزائیت کی تبلیغ کریں۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ سوال رواداری و وسیع **الخیالی** کا نہیں رہتا، بلکہ حفاظت دین کا ہو جاتا ہے۔ ایک ہندو کسی مسلمان کو یا ایک مسلمان کسی ہندو کو اپنے ہاں کوئی ذمہ داری کا عہدہ بخش دے، تو یہ اس کی رواداری ہے، لیکن اگر وہ اس پوزیشن کو اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے استعمال کرنے لگے تو پھر اس کا فرض ہے کہ پہلے ہی لمحہ میں اسے اس پوزیشن سے الگ کر دے، کیونکہ پھر یہ رواداری نہیں رہتی، بلکہ مذہبی خودکشی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انجمن کے لیے اس قسم کی رواداری میں ایک اور خطرہ بھی ہے جو نہ صرف اس کے وجود بلکہ مصر میں رہنے والے اور آئندہ جانے والے عام ہندوستانیوں تک کو نقصان پہنچائے گا اور وہ یہ کہ جب اس انجمن کا سیکرٹری ملک کے عام مذہب کے خلاف ایک نئے دین کی تبلیغ کرے گا اور وہ دین بھی ایسا جسے تمام سنی مسلمان سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تو یقیناً عام مصریوں کو یہی شبہ پیدا ہو گا کہ پوری انجمن ہی قادیانیوں کی ہے اور ایسی حالت میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی ملک میں اور خصوصاً ایک مشرقی ملک میں چند غریب الوطن آدمیوں کا اس حیثیت سے مشتبہ ہو جانا کہ وہ وہاں کے عام لوگوں کا مذہب بگاڑ رہے ہیں، ان کو عام نظروں میں کس حد تک مبغوض بنا سکتا ہے اور اس سے انہیں کیسے کیسے نقصان پہنچ سکتے ہیں؟

یہ تفرقہ اندازی و مسلم آزاری جس قدر افسوس ناک ہے، ظاہر ہے لیکن ہمارے ہاں کے قادیانی بہت ضدی ہیں ان کی فطرت کا مقتضاء یہی ہے۔

وحدت کلمہ اسلام کی ایک مبارک کوشش

{ ۲۶ر مئی ۱۹۲۵ء--۲ر ذی قعدہ ۱۳۴۳ھ }

* علمائے بریلی اور دیوبند کا اتحاد

علماء کے باہمی اختلافات اور خصوصاً وہ جو فکر و رائے کے اختلاف سے بڑھ کر نزاع و مخاصمت کی صورت اختیار کر جائیں' امت کے لیے ایک ایسی لعنت کی حیثیت رکھتے ہیں' جن کے نتائج بد آج مسلمانوں کی ذلت' نکبت اور دینی بے حسی کی صورت میں عالم آشکارا ہیں۔ رسول امین **علیہ الصلاۃ والسلام** نے علماء کو اپنا وارث قرار دے کر انہیں امت کی نگہبانی و رہنمائی سپرد فرمائی تھی اور وہ تمام ذمہ داریاں ان پر ڈال دی تھیں جو ایک فوج کے قائد' ایک قافلہ کے سردار اور ایک گلہ کے چرواہے پر عائد ہوتی ہیں' مگر انہوں نے ان سب ذمہ داریوں کو فراموش کر دیا اور اصلاح احوال امت کے بجائے جزوی و فروعی اختلافات میں پڑ گئے' حتیٰ کہ انہی کو عین مقصد سمجھ کر اصل مقصود کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ایک دین کے کئی دین بنائے' ایک امت کو کئی امتوں میں بانٹ لیا۔ رسول امین ﷺ کی امانت میں بے **تکلف** خیانت کی' اس سبق کو بھول گئے جو **اقیموالدین ولا تتفرقو افیہ** میں پوشیدہ ہے۔ اس حکم الٰہی کو فراموش کردیا جو **لا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا و کل حزب بما لدیھم فرحون** میں دیا گیا تھا۔ اس الٰہی وعید سے بے خوف ہو گئے' جو **لا تکونوا کالذین تفرقو او اختلفوا من بعد ما جاء ھم البینات واولئك لھم عذاب عظیم** میں بار ہا کیا گیا تھا۔ اصلی فرض کو چھوڑ کر آپس کے "تنازع" میں مبتلا کئے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ **تذھب ریحکم** کی وعید الٰہی کے مطابق ان کی ہوا اکھڑ گئی' ان کا زور ٹوٹ گیا' امت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا اور جو قوت وحدت و اجتماع کی صورت میں ایک دنیا کو تسخیر کر لینے کے قابل تھی' وہ انتشار و اختلاف کی بدولت شیاطین جن و انس کی غلامی کی لیے خود ہی تیار ہو گئی۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ **فساد العالم فساد العالم**

عالم دین کا فساد دنیا جہان کو فساد میں مبتلا کرتا ہے

جس طرح ایک عضو رئیس پر کسی خاص مرض کے غالب آجانے سے بدن کی رگ رگ اس سے متاثر ہو جاتی ہے اور جس طرح قافلہ سالار کے راہ بھول جانے سے سارا قافلہ

گمراہ ہو جاتا ہے' اسی طرح علماء کا بگڑ جانا ساری امت کے بگڑ جانے کا ہم معنی ہے اور ان کے راہ حق سے ہٹ جانے کی بدولت پوری کی پوری قوم بھٹک جاتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے وہ وقت بہت ہی منحوس تھا جب علماء کی مقدس جماعت اس فساد اجتماعی سے متاثر ہو گئی اور انہوں نے ارشاد و ہدایت دینی کا متبرک کام چھوڑ کر آپس کی نزاعوں سے اپنی قوت برباد کرنی شروع کر دی۔ اس کا المناک نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف امت پر علماء دین کا ہجوم ہے ارکان شریعت کو ڈھانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں' اسلام کا عین وجود خطرہ میں مبتلا ہے اور دوسری طرف اس کے رہنما دنیا ومافیہا سے بے خبر آپس میں لڑنے' ایک دوسرے پر حملے کرنے اور دین کی مستحکم بنیادوں میں رخنہ ڈالنے میں مشغول ہیں۔

یوں تو یہ حالت ہر زمانہ میں افسوس ناک رہی ہے' اور آج سے نہیں' بلکہ ایک مدت سے امت کا صحیح درد رکھنے والے مخلص مسلمان اس پر آنسو بہا رہے ہیں' مگر خصوصیت کے ساتھ اس کے الم انگیز اثرات کو ہم نے اس وقت محسوس کیا جب جنگ عظیم کے بعد اسلام کو ہر طرف سے مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا اور ایک مصیبت ختم ہونے میں نہ آتی تھی کہ ایک دوسری مصیبت رونما ہو جاتی تھی۔ اس وقت ہمیں خیال ہوا کہ کم از کم اب تو علماء کو سنیت اور وہابیت کے جھگڑے چھوڑ کر اپنے صحیح فرائض کی جانب متحدہ اقدام عمل کرنا چاہیے' ورنہ اگر چندے یہی حال رہا تو یہ امت مسلمہ خدا نخواستہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے ۲۴ء میں علماء ہند کی ان دو زبردست جماعتوں کے درمیان رفع نزاع کی کوشش شروع کی' جو دیوبند اور بریلی سے انتساب رکھتی ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں علماء ہند کی سب سے زیادہ بااقتدار جماعتیں ہیں۔ مسلمانان ہند کا سواد اعظم ان کا پیرو ہے۔ ان کے آپس کے اختلاف نے امت کو دو ٹکڑیوں میں اس طرح تقسیم کر رکھا ہے کہ ایک دوسری سے متنفر اور ایک دوسری کی جانی دشمن ہے اور ان کا باہم متحد ہو جانا نہ صرف ہندوستان کی پوری سنی آبادی کے متحدہ ہو جانے کا ہم معنی ہے' بلکہ اس سے ہندوستان کے باہر بھی دور دور تک جمع کلمہ مسلمین کا کام انجام پا سکتا ہے۔

ہمارا سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ آگرہ میں ہم نے جناب مولانا نعیم الدین صاحب

سے اس مسئلہ پر تبادلہ خیالات کیا' جو اس وقت بریلوی جماعت کی طرف سے فتنہ ارتداد کے دفعیہ میں مشغول تھے اور اس طرح ہمارے ان کے درمیان ایک مقصد کا اشتراک موجود تھا۔ چند ملاقاتوں میں مولانا ہم سے اس باب میں متفق ہو گئے کہ دیوبند اور بریلی کے درمیان جو مسائل مابہ النزاع ہیں ان کا تصفیہ ہو جانا امت کے لیے ایک عظیم الشان باعث برکت ثابت ہوگا اور اس کے بعد یہ بات طے پائی کہ ہم دیوبندی جماعت کو اور وہ بریلوی جماعت کو اتحاد پر آمادہ کر کے جہاں تک ممکن ہوگا' ان کے درمیان ایک باقاعدہ صلح نامہ کرا دینے کی کوشش کریں گے۔

اس قرارداد کے مطابق ہم نے جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اس جانب توجہ دلائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی جلیل القدر جماعت کو مصالحت کے لیے آمادہ فرمائیں۔ مولانا کی ذات مبارک سے ہم کو کامل توقع تھی کہ وہ اس درخواست کو ہرگز رد نہ فرمائیں گے۔ چنانچہ امید کے مطابق جواب میں ہمیں مولانا کا ایک گرامی نامہ ملا جس میں ہماری تجویز کا حسب ذیل ابتہاج انگیز فقرات سے خیر مقدم کیا گیا تھا۔

> "ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت دن بدن ہوتی جاتی ہے اور اسلام کے استیصال کی جس سرعت اور مکاریوں کے ساتھ کوشش کی جارہی ہے' اس کو دیکھتے ہوئے اس وقت اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہندوستان کے جمہور اہل اسلام یعنی حنفی سنی جماعتوں میں اتحاد پیدا ہو جائے ہماری دیرینہ خواہش ہے کہ یہ اختلاف رفع ہو جائے۔ اگر ایسی کوئی تحریک کی گئی' تو جماعت دیوبند نہایت خوشی اور مسرت سے ہر ایسی سعی کا خیر مقدم کرے گی اور مجھے یقین ہے کہ اس میں کامیابی بھی ہو گی"۔

جناب مولانا کی اس مصالحانہ آمادگی نے ہماری جرأت اور توقعات میں اور زیادہ اضافہ کر دیا اور ہم نے اس بھروسہ پر جماعت دیوبند کے مقتدر ارکان سے مصالحت کے بنیادی شرائط پر گفتگو کی جس کے نتائج اور بھی زیادہ حوصلہ افزاء برآمد ہوئے اور اکابر دیوبند نے نہایت مسرت کے ساتھ اتحاد کا خیر مقدم کیا اور فرمایا گیا کہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ' مولانا محمد قاسم نانوتویؒ وغیرہ ائمہ جماعت کی جن تحریرات پر

جماعت بریلی نے کفر کا فتویٰ دیا ہے، اگر ان عبارتوں کا وہی مطلب لیا جائے جو علمائے بریلی نے ان سے اخذ کیا ہے تو ان کا قائل ہمارے نزدیک بھی اسی طرح کافر ہے، جس طرح ان کے نزدیک ہے، لیکن دراصل نہ ان عبارتوں کا وہ مفہوم ہے جو ان سے لیا گیا ہے، نہ لکھنے والے بزرگوں کا وہ منشا تھا جو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور نہ ہم ان معانی پر اعتقاد رکھتے ہیں جو ان سے نکالے گئے ہیں۔ تاہم اگر صرف انہی عبارتوں کے نکال دینے پر ہمارے اور علماء بریلی کے درمیان اتحاد ہو سکتا ہے، تو ہم وحدت کلمہ اسلام کی خاطر انہیں خوشی کے ساتھ حذف کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ اور ہم کو یقین ہے کہ خود ان بزرگوں کی ارواح بھی اس پر خوش ہوں گی جو امت کی بھلائی اور اسلام کی فلاح کو اپنی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

علمائے دیوبند کی اس پر جوش آمادگی نے ہمارے کام کے نصف حصے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اب اس کے بعد دوسرا نصف حصہ یہ تھا کہ علمائے بریلی بھی مصالحت کی جانب اتنا ہی اقدام کریں اور پھر باہم ایک معاہدہ ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے جناب مولانا نعیم الدین صاحب کو متعدد خطوط لکھے، مگر افسوس ہے کہ انہوں نے ہمارے مخلصانہ معروضات پر کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اور اگر توجہ فرمائی بھی تو ایسے انداز میں جو نہایت غیر مصالحانہ اور ہماری ان کی مفاہمت کے بالکل خلاف تھا۔ ان کی بارگاہ سے مایوس ہونے کے بعد دوسری مایوسی ہم کو اس وقت ہوئی جب مراد آباد میں جمعیتہ العلماء کے اجلاس خصوصی کے موقع پر جماعت بریلی نے صلح و آشتی کے تمام امکانات کو ٹھکرا کر جمعیت کے خلاف اہل شہر میں مقاطعہ کی زبردست تحریک شروع کر دی تھی اور باجود دوستانہ استدعاؤں کے اس نے اپنے رویہ پر اصرار کیا تھا۔ اس کے بعد بھی ہمیں کچھ تھوڑی امید باقی تھی، مگر جب اس شہر مراد آباد میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں جماعت بریلی کے موجودہ سردار مولانا حامد رضا خان صاحب نے صدر کی حیثیت سے نہایت صفائی کے ساتھ "مدعی اسلام" فرقوں سے اتحاد کرنے کو نہ صرف ناممکن، بلکہ اپنے مذہب کے لیے نقصان دہ بتلایا، تو ہماری تمام توقعات پر پانی پھر گیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ابھی مسلمانوں کے لیے بھلے دن نہیں آئے ہیں۔

لیکن **کل امر مرھون باوقاتھا** ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور خدائے

علیم و خبیر کی مصلحتیں جس کام کے لیے جو وقت مقرر کر دیتی ہیں‘ اس سے پہلے انسان خواہ کتنی ہی کوششیں کر ڈالے‘ اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ خدا کی شان دیکھیے کہ جس چیز کے لیے ہم نے لاکھ سعی کی وہ ہماری کوششوں سے حاصل نہ ہوئی‘ مگر ایک مدت گزرنے کے بعد اب خدائے کارساز نے کچھ ایسی چارہ گرمی فرمائی کہ خود بخود ہمیں حاصل ہوتی نظر آرہی ہے۔ چنانچہ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء بریلی میں وقت کی نزاکت‘ اسلام کی زبوں حالت اور تجویز اتحاد کی دینی اہمیت کا کافی احساس پیدا ہو گیا ہے اور جمعیت رضائے مصطفیٰ اور اس کے ہم خیال علماء کے زیرِاہتمام لاہور میں ایک حزب الاحناف کا جلسہ ہو رہا ہے۔ جس کے ارکان علمائے بریلی کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے صحیح اسلامی تدبر کو کام میں لاکر اتحاد کے مقصد جلیل کی طرف خود اقدام کیا ہے اور ان کے ناظم مولانا حبیب اللہ صاحب کی جانب سے ایک اعلان شائع ہوا ہے جس میں اہل سنت کی دو جلیل القدر جماعتوں کے اختلافات کو موجودہ خطرات کے زمانہ میں اسلام کے لیے سخت نقصان رساں بتلا کر علمائے دیوبند کو مصالحت کی دعوت دی گئی ہے۔

یہ اقدام ہمارے لیے بے حد مسرت افزا ہے۔ جیسا کہ قارئین کرام کو معلوم ہو چکا ہے‘ علمائے دیوبند پہلے ہی مصالحت کے لیے آمادہ ہو چکے ہیں۔ اب اس کے بعد صرف علمائے بریلی کے آمادہ ہو جانے کی کسر تھی۔ سو الحمد للہ کہ اب وہ بھی دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ علمائے دیوبند ان کی اس دعوت کو ضرور قبول فرمائیں گے اور بہت جلد ہمیں تمام اسلامی ہند بلکہ سارے عالم اسلامی کو یہ مژدہ جانفزا سنانے کا شرف حاصل ہو جائے گا کہ علمائے امت کی جو دو جلیل القدر جماعتیں گوناگوں اختلافات کی بدولت آپس کے تفرقوں میں مبتلا ہو گئی تھیں‘ وہ اسلام کی رفع شان اور اعلائے کلمتہ الحق کی خاطر اب ایک ہو گئی ہیں اور انشاء اللہ‘ اب ان کی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے کی بجائے اسلام کی خدمت اور اعدائے اسلام کے مقابلہ میں صرف ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ وقت مسلمانان ہند کے لیے بے حد مبارک ہوگا‘ جب یہ عظیم الشان کام انجام کو پہنچ جائے گا۔ آج مسلمانوں کی تمام خرابیوں کا سرچشمہ علماء کی غفلت اور ان کا باہمی تفرقہ ہے۔ اس تفرقہ کا مٹ جانا اور ان کا اپنی متحدہ قوت کے ساتھ

احیائے امت کی سعی شروع کر دینا ایک ایسا زبردست کام ہوگا کہ اس سے مسلمانوں کے موجودہ مصائب کا نصف حصہ خود بخود زائل ہو جائے گا۔ ہم تنظیم کے محتاج ہیں۔ ہمیں اپنی معاشرتی اور تمدنی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی دینی بے حسی اور مذہبی ناواقفیت کو دور کرنا ہے۔ ہمیں اپنی جہالت اور بے علمی کا علاج کرنا ہے۔ ہمیں اعدائے دین کے حملوں سے اسلام کی حفاظت کرنا ہے، مگر ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں ہے جو علماء کی مدد کے بغیر انجام پا سکتا ہو، بلکہ سچ یوں ہے کہ یہ سب کام دراصل علماء اور صرف علماء کے ہیں۔ پس اگر علماء اپنے تفرقوں کو مٹا کر ان اہم فرائض دینی کی طرف متوجہ ہو جائیں، تو کسی تنظیم، کسی اصلاح اور کسی دفاعی تحریک کے لیے چیخ و پکار کی ضرورت نہیں۔ تمام کام خود بخود انجام پا جائیں گے اور دنیا کے دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی حالت کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔

❑ باجی راؤ اول کی برسی اور اس کے اخلاقی اثرات

{ ۲۹ر مئی ۱۹۲۵ء }

تاریخی شخصیتوں کی یادگار منانا ایک قدیم دستور ہے۔ ہر قوم اپنے اعاظم کی یاد کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھتی ہے اور یہ ایک فطری بات ہے کہ کسی قوم میں جو کوئی بڑا آدمی ہو گزرتا ہے، اس کے کارناموں کو لوگ فخر کے ساتھ یاد رکھتے ہیں۔ اس یادگار کا مقصد محض ان کے نام یاد رکھنا یا محض ان کے واقعات زندگی کو داستان کی طرح سننا اور سنالینا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس نصب العین کے حصول پر انہوں نے تنازع للقوہ کے میدان میں جنگ کی ہے، جن اجتماعی و انفرادی مقاصد کی انہوں نے نظری یا عملی حیثیت سے وکالت کی ہے، ان کی یاد باقی رکھی جائے، ان سے سبق حاصل کیا جائے، ان سے جوش عمل اور قوت مجاہدہ اپنے اندر پیدا کی جائے اور قومی زندگی کو انہی کے اتباع میں چلنے کی تعلیم دی جائے۔ پس اس قسم کی یادگاریں دراصل ان اعاظم کی ذات اور تشخص کی یادگاریں نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے مقاصد حیات ان کے مدعائے زندگی اور ان کے شخصی اصولوں کی یادگاریں ہوتی ہیں اور درحقیقت وہ ایک اعتراف اور ایک پسندیدگی کی علامت ہوتی ہیں جو قوم میں ان کے اعمال، اقوال اور مقاصد کے لیے

موجود ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنی پسند اور اپنے میلان کے مطابق اپنے اعاظم کا انتخاب کرتی ہے اور ان کی یادگار منا کر فی الحقیقت اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ وہ ان کے کارناموں کو اپنے اجتماعی نصب العین کا نمونہ سمجھتی اور انہی کے نقش قدم پر چلنا چاہتی ہے۔ بعض قومیں اپنے مذہبی بزرگوں کی برسیاں مناتی ہیں اور اس سے ان کے مذہبی میلان کا پتہ چلتا ہے۔ بعض اپنے جنگی ابطال کی یادگاریں قائم کرتی ہیں اور اس سے ان کی جنگجویانہ سپرٹ ظاہر ہوئی ہے۔ بعض کے دل میں اپنے علماء کی بہت زیادہ قدر ہوتی ہے اور یہ ان کی علم دوستی پر دلالت کرتی ہے۔ بعض کو اپنے بادشاہوں سے بہت محبت ہوتی ہے اور اس سے ان کی شاہ پرستی کا اظہار ہوتا ہے۔ غرض ہر قوم اپنے خاص میلان کے مطابق کسی شخص کو اپنا ہیرو بناتی ہے اور اس کی یادگار منانے سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے اندر اس کی تعلیمات کو زندہ رکھے۔

جہاں تک اعاظم کے انتخاب اور ان کی یادگار قائم رکھنے کے طریقہ کا تعلق ہے' ہر قوم اس میں آزاد ہے اور کسی کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ ہر قوم کو پورا حق حاصل ہے کہ جس شخص کو چاہے اپنا ہیرو بنائے اور جس طرح چاہے' اس کے کارناموں اور مقاصد حیات کو زندہ رکھے' مگر جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا' یہ انتخاب دراصل اپنے اندر ایک عمیق معنی پوشیدہ رکھتا ہے اور قومی زندگی پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوا کرتا ہے۔ پس اگر کسی قوم کے حق میں دخل انداز ہوئے بغیر ہم اس کے انتخاب پر محض ایک ناقدانہ نظر ڈال کر صرف یہ بات دریافت کریں کہ کس قسم کے جذبات نے اسے ایک خاص شخص یا چند اشخاص کو اپنا ہیرو منتخب کرنے پر آمادہ کیا ہے اور ان کی یادگاریں منانے سے اس میں کس قسم کے خیالات کی پرورش ہوگی' تو یہ ہمارے لیے بھی سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک زمانہ ہوا کہ مسٹر تلک آنجہانی نے پونا میں سیوا جی کی یادگار قائم کی تھی اور سال کے سال اس کی برسی منایا کرتے تھے۔ یہ تحریک بہت جلد ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کر گئی اور مہاراشٹر اور صوبہ متوسط کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے مقامات پر بھی سیوا جی کی برسی منائی جانے لگی۔ اب اس میں ایک اور اضافہ کیا گیا ہے اور صوبہ متوسط

میں مرہٹہ لیڈروں نے باجی راؤ اول کی برسی بھی منانی شروع کر دی ہے جس کے متعلق ہر تاریخ دان شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ مرہٹہ قوم میں سیواجی کے بعد سب سے بڑا اور سب سے زیادہ کامیاب دشمن اسلام گزرا ہے۔ اس انتخاب کی وجہ ہماری سمجھ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتی کہ مغلیہ سلطنت کے دور اخیر میں یہی دونوں شخص مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے اور ہندوستان سے اسلام کی حکومت کو مٹانے میں انہی دونوں نے سب سے زیادہ کوشش کی تھیں' کیونکہ اگر ان "خوبیوں" اور "قابلیتوں" کو ان دونوں سے سلب کر لیا جائے تو ان کے اندر کوئی انسانی صفت ایسی باقی نہیں رہتی جو قابل ستائش و پرستش ہو۔ وہ نہ کوئی مذہبی پیشوا تھے نہ کوئی بڑے مدبر تھے' نہ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی خاص انقلاب پیدا کیا' نہ ان کا اخلاقی درجہ ہندو قوم کے عوام سے کچھ بلند تھا اور نہ وہ علوم و تمدن کے مربی و سرپرست تھے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمیں کسی قوم کے حق انتخاب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ برادران ہنود اپنے ہیرو منتخب کرنے اور ان کی یادگار منانے میں قطعاً آزاد و مختار ہیں' لیکن ہم ایک ہمسایہ قوم ہونے کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ اس ملک میں ہماری اور ان کی قسمت ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور مستقبل میں ہمیں اور ان کو اپنی ایک مشترکہ قومی تاریخ بنانی ہے' یہ کہنے کا پورا حق رکھتے ہیں کہ ان کا یہ انتخاب ہندوستان کے بین القومی تعلقات کے لیے ایک سم قاتل ہے' کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی دشمنی کا جذبہ بہت زیادہ راسخ ہو گیا ہے۔ وہ ہر اس شخص کے کارناموں کو سراہتے ہیں' جس نے گذشتہ زمانہ میں اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں جن کی زندگی کا مقصد وحید ہندوستان سے اسلام کا نام و نشان مٹا دینا تھا اور ان کی یادگار منا کر اپنے اندر ویسے ہی جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان لوگوں کے دلوں میں موجزن تھے اور جن کی تحریک پر انہوں نے مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔

اگر ہمارے ہندو دوست برا نہ مانیں' تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی ایسے اعاظم کی کمی نہیں ہے۔ ہماری تاریخ ان لوگوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی اقتدار کو قائم کیا اور چند ہزار نبرد آزماؤں کی قوت سے کروڑوں ہندوؤں کے

دلوں پر اپنی ہیبت کا سکہ بٹھا دیا۔ تم اپنے سیواجی اور باجی راؤ پر فخر کرتے ہو، لیکن اگر وہ ہمارے ہاں پیدا ہوتے تو باعث ننگ و عار ہوتے۔ ہمارے اعاظم کے مقابلہ میں ان کی زندگیاں لٹیروں اور قزاقوں کی زندگیاں تھیں۔ ہماری قوم کے ہیرو محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاؤالدین خلجی، ظہیرالدین محمد بابر اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے لوگ ہیں جنہیں تم محض بت شکن اور ہندو کش کہہ کر دل کا غبار نکال لیتے ہو ورنہ وہ اسلام کی نشاط ثانیہ کے ہیرو اور علم و حکمت کے زبردست مربی تھے۔ تاہم ان تمام خوبیوں اور قابلیتوں کے باوجود نہ ہم ان کی یادگار مناتے ہیں اور نہ ان کی برسیاں کرتے ہیں اور نہ ان کی ارواح کو اپنا ہدیہ اخلاص پہنچانے کے لیے مجالس منعقد کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ انہیں دشمنوں کی افتراق انگیز تاریخوں نے "ہندو کش" مشہور کر دیا ہے اور ہندو قوم ان کو اپنے مذہب اور اپنی قومیت کا دشمن سمجھتی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے ہندو بھائی اس بات کی اہمیت کو بالکل محسوس نہیں کرتے۔ ان کا ایک خاص طبقہ انہیں ایک ایسی ڈگر پر لیے جا رہا ہے، جس کا انجام ہمارے نزدیک خانہ جنگی، مستقل بدامنی اور ہندوستان کے مستقبل کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دینے والی خون ریزی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ وہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف دشمنی و عداوت کے جذبات بھڑکانے کے لیے کوئی موقع فروگذاشت نہیں کرتا اور جس ذریعہ سے بھی ممکن ہو، انہیں جنگ اور انتقام کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے۔ ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر بفرض محال مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ ویسا ہی برا سلوک کیا تھا جیسا تم ان کی طرف منسوب کرتے ہو اور اگر فی الحقیقت گذشتہ زمانہ میں انہوں نے بے حد ظلم و ستم کئے ہیں، تو خدا را ہمیں بتلاؤ کہ اب ان واقعات کو دوبارہ زندہ کرنے سے کون سا خاص فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کوئی عقلمندی کی بات ہے کہ اگر ہمارا ماضی خراب تھا، تو ہم اس کی خاطر اپنے حال اور مستقبل کو بھی برباد کر لیں؟ کیا ان پچھلے قصوں کو دوہرا کر تم ہندوستان یا ہندو قوم کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہو؟ تم تاریخ کو اپنا دستور العمل بنا رہے ہو، حالانکہ وہ اپنے اندر صرف عبرت کا سامان رکھتی ہے۔ تاریخ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کو پڑھ کر دوہرانے کی کوشش کی جائے، بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ جو کچھ پہلے ہو گزرا ہے، اس سے عبرت حاصل کی جائے اور مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اس

کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر تاریخ کہتی ہے کہ تمہارا ماضی خراب تھا، تو تمہیں چاہیے کہ اس خرابی کے اسباب پر نظر ڈالو اور آیندہ کے لیے اس کے اعادہ سے بچنے کی کوشش کرو۔

اگرچہ آج کل ہمارے مرہٹے اور آریہ دوستوں کی بدولت برادران ہنود کے دلوں میں بغض و عناد کے جذبات بہت زیادہ ترقی کر رہے ہیں اور ان کی موجودگی میں ہمیں امید نہیں ہے کہ وہ ان مخلصانہ نصیحتوں پر غور کریں گے لیکن ہم انہیں ان جذبات کے لازمی نتائج سے متنبہ کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آپس کے عناد اور باہمی دشمنی کا نتیجہ نہ کبھی اچھا ہوا کرتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے مٹا دینے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً مسلمان بھی انہیں فنا کر دینے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔ اگر وہ ہندو راج کو اپنا منتہائے نظر بنالیں گے، تو یہ ایک طبعی بات ہے کہ مسلمان بھی سوراج کو چھوڑ کر مسلم راج کو اپنا مقصود بنالیں۔ اگر وہ مسلمانوں سے انتقام لینے کی تیاری کریں گے، تو ناممکن ہے کہ مسلمان بھی ان سے انتقام لینے کی تیاری نہ کریں پھر کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کوششوں اور تیاریوں میں انہیں یا مسلمانوں کو کامیابی ہو جائے گی؟ ممکن ہے کوئی مجنون ایسا بھی ہو جو اس بات کو ممکن الوقوع سمجھتا ہو لیکن آپس کے باہمی خلفشار سے نہ ہندوؤں کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ مسلمانوں کو نہ ہندو راج قائم ہو سکتا ہے نہ مسلم، یہ ملک یا تو دونوں کا بن کر رہے گا یا ایک کا بھی نہ رہ سکے گا۔ اس کشمکش اور خانہ جنگی کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا، ہے تو وہ صرف یہ کہ یہاں ہمیشہ کے لیے غیر ملکی تسلط قائم ہو جائے اور ہم ہندوستانیوں کو مل جل کر کوئی متحدہ حکومت قائم کرنا کبھی نصیب نہ ہو۔

* زعمائے اسلام کا اجتماع:

اس سال کے حج میں منجملہ اور بہت سی خصوصیات کے ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اب کے مرکز اسلام میں بعض نہایت عظیم الشان زعمائے ملت حسیفی کا اجتماع ہو گا اور مدتوں کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں کو وہ بات نصیب ہو گی جو فریضہ حج کے مصالح شرعی میں ایک اہم مصلحت تھی۔ اس سے پہلے قارئین کرام کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ

شمال افریقہ کے سب سے بڑے دینی پیشوا اور مجاہد' طرابلس کے بطل عظیم حضرت شیخ سنوسی الکبیر حجاز پہنچ گئے ہیں اور یہ خبر بھی متعدد طریقوں سے حد تواتر کو پہنچ گئی ہے کہ انہیں امیر مکہ بنائے جانے کا مسئلہ طے ہو چکا ہے۔ اب ایک اور ذریعہ سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جماعت زیدیہ کے مسلمہ پیشوا اور یمن کے محبوب ترین سردار حضرت امام یحیٰی بھی اپنی بڑی جماعت کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے جانے والے ہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ خود سلطان ابن سعود مکہ معظمہ میں تشریف رکھتے ہیں' ان دونوں بزرگوں کا اجتماع حج میں شریک ہونا اسلام کے مستقبل کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عالم اسلامی کے یہ تین زبردست لیڈر اپنے تدبر' بلند خیالی' حق پرستی اور دردمندی اسلام کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں اور یقین ہے کہ جہاں کہیں یہ ایک جگہ جمع ہوں گے وہاں اسلام کی ترقی و حفاظت کے سوا کسی اور چیز کے لیے سعی وجہد نہ ہوگی۔

اس کے علاوہ ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ اگر ابن سعود اور امام یحیٰی کے درمیان اتحاد ہو گیا تو ایک ہی وقت میں عرب سے ادریسی' علی اور حسین تینوں کا خطرہ دور ہو جائے گا۔ جزیرۃ العرب کے پورے مغربی علاقہ میں ساحل یمن سے لے کر حدود شام تک اجنبی دسائس کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی اور قلب عرب بحرین سے لے کر سواحل بحر قلزم تک صحیح معنوں میں استقلال کی نعمت سے بہرہ ور ہو جائیگا پھر اگر یہ بھی صحیح ہو کہ سلطان ابن سعود نے حضرت شیخ سنوسی کو امیر مکہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے' تو اس سے دنیائے اسلام کی ایک اور بڑی مشکل بھی حل ہو جائے گی۔ دنیائے اسلام کو اس وقت اپنے مرکز ارضی میں ایک ایسے امیر کی ضرورت ہے جو ایک طرف تو اپنے مذہبی معتقدات کے لحاظ سے جمہور امت کے نزدیک مقبول ہو اور دوسری طرف اسلام کے دینی و سیاسی مصالح کی صحیح حفاظت کر سکتا ہو۔ شیخ سنوسی کی امارت ان دونوں ضروریات کو پورا کردے گی اور پھر خلافت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا' کیونکہ شیخ موصوف ایک سیاسی مدبر ایک مجاہد غیور اور ایک سچے محافظ ملت ہونے کے علاوہ ایک تبحر عالم' ایک سنی المذہب مسلمان اور ایک صاحب نسبت درویش بھی ہیں اور ان سب باتوں کے ساتھ انہیں قریشی اور آل رسول ہونے کا شرف بھی حاصل ہے جس سے ان کے جامع الشروط ہونے میں کوئی کلام باقی نہیں رہتا۔

چنانچہ مذکورہ بالا اعاظم رجال کے ممکنہ اجتماع سے کفر کے ایوان ملوکیت پر زلزلہ برپا ہو گیا ہے۔ برطانیہ کے ماہر عربیات مسٹر سینٹ جان بھی اس کے خیال سے کانپے جا رہے ہیں اور وہ اپنی سلطنت کو اس وقت سے ڈرا رہے ہیں جب خلافت اپنے حقیقی مفہوم اور اپنی اصلی شان کے ساتھ پورے تیرہ سو برس بعد دوبارہ قائم ہو جائے گی اور جس طرح قلب مضبوط ہو جانے سے بدن کی رگ رگ میں طاقت آجاتی ہے، اسی طرح عالم اسلامی کے نظام عصبی میں نئے سرے سے جان آنی شروع ہو جائے گی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ مسٹر فلبی نے اپنے ایک مضمون میں برطانیہ کو اس خطرہ کی روک تھام کے لیے متنبہ کیا ہے، مگر جف القلم بماہو کائن، اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی کا فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور انشاء اللہ اب وہی ہو کر رہے گا، جس سے ہمارے دشمن خائف ہیں۔

* اہل حجاز کی امداد

حجاز سے جو تازہ اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ارض مقدس میں ہر قسم کے سامان خورد و نوش کی افراط کے باوجود روپے کی اس قدر کمی ہے کہ وہاں کے لوگ بے انتہا تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جیران بیت اللہ تو درکنار بام حرم کے کبوتروں تک کے لیے آستانہ خلافت سے دانہ آیا کرتا تھا، مگر حسین کے دہ سالہ جابرانہ دور حکومت میں ارباب دول مفلس اور مفلس محتاج و فاقہ کش ہو گئے، ان کی دولتیں ایک طماع امیر کے خزانہ میں بھر گئیں اور اب جو کچھ کسر باقی رہ گئی تھی، اسے اس کے بیٹے علی نے جدہ کی ناکہ بندی کر کے پورا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے علماء و اعیان بلد الامین کی طرف سے ایک اپیل شائع ہو چکی ہے، جس میں اہل مکہ کی ناگفتہ بہ حالت بیان کر کے امداد کی درخواست کی گئی تھی۔ بعض لوگوں نے اس کو جھٹلانے کی کوشش کی۔ لیکن اب بمبئی کے ایک تاجر کتب کے پاس مکہ معظمہ سے جو خطوط آئے ہیں، ان سے نہ صرف ان واقعات کی تصدیق ہوتی ہے، بلکہ ساکنان حرم کی زبوں حالی کا اور بھی زیادہ انکشاف ہوتا ہے۔ ہم تمام مسلمانان ہند سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس نازک وقت میں جیران بیت اللہ (اللہ تعالی کے گھر کے ہمسائے) کی مدد کریں۔ حجاج

کے جہازات ہفتہ کے ہفتہ روانہ ہوں گے۔ ان پر ہر شہر یا صوبہ کے لوگ اپنے ایک معتمد نمائندہ کے ہاتھ امدادی رقوم یا اجناس بھیج سکتے ہیں۔ اگر اس موقعہ پر مسلمانوں نے غفلت سے کام لیا، تو اندیشہ ہے کہ جو مصائب گذشتہ جنگ عظیم میں رسول عربی ﷺ کے ہمسائیوں پر نازل ہو چکے ہیں، وہی اب بیت اللہ کے ہمسائیوں پر بھی نازل ہونے لگیں گے۔

مسلمانوں کی غیرت ملی پر ایک تازہ حملہ

{ ۲ر جون ۱۹۲۵ء }

* بیرون دہلی کے قبرستانوں کا معاملہ

معاصر محترم ہمدرد نے اپنی ۲۷ر مئی کی اشاعت میں قبرستانوں کا معاملہ کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ تحریر کیا ہے جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیرون دہلی دروازہ کے قبرستانوں کے معاملہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے پہلے معاصر موصوف اپنے ایک نوٹ میں یہ المناک خبر درج کر چکا تھا کہ رائے سینا کی امپیریل میونسپلٹی نے ان قبرستانوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ ۱۵ر مئی سے ان میں مردوں کی تدفین بند کر دی گئی ہے، لیکن شہر میں اس کے متعلق کسی قسم کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ صرف "پایونیر" میں میونسپلٹی کی طرف سے ایک نوٹس شائع کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ دہلی کی اسلامی پبلک تک اس واقعہ کی اطلاع نہیں پہنچ سکتی۔ غریب ناواقف مسلمان اپنی میتیں ان قبرستانوں میں لے کر پہنچتے ہیں، تو انہیں دفن کرنے کی اجازت نہیں ملتی اور کہا جاتا ہے کہ اگر یہاں دفن کرو گے، تو ۵۰ روپے جرمانہ ہو جائے گا۔ حکومت دہلی نے ان قبرستانوں کے عوض قلعہ لال کوٹ اور کوٹلہ فیروز شاہ کے درمیان ایک وسیع احاطہ زمین دے دیا ہے، مگر وہاں کسی قسم کا بندوبست نہیں ہے، نہ گورکن ہے نہ پٹاؤ کا انتظام ہے، نہ کوئی سایہ دار درخت ہے اور نہ کوئی کنواں یا پانی کا نل ہے۔ ایک چٹیل میدان پڑا ہوا ہے۔ جہاں لوگ میت کو لیے بھٹکتے پھرتے ہیں اور آخر سخت پریشانی اٹھانے کے بعد قدم شریف کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ خبر درج کرنے کے بعد معاصر موصوف نے امام صاحب جامع مسجد سے اصل واقعات کی تحقیق کی ہے اور ان سے معلومات حاصل کر کے بتفصیل تمام حالات درج کر دئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے حسب ذیل افسوس ناک حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

ا۔ گورنمنٹ نے مہدیوں کے قبرستان بخشو کا تکیہ اور دیگر قبرستانوں کو معاوضہ دیکر خرید لیا ہے اور تکیہ دار لوگ اس معاوضہ کو وصول کر چکے ہیں۔

۲۔ ان قبرستانوں کے عوض جو زمین دی گئی ہے اس کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے۔

۳۔ اس کمیٹی کے ارکان کو ڈپٹی کمشنر نے خود نامزد کیا ہے اور اس میں مسجد فتحپوری، جامع مسجد اور موید الاسلام کی کمیٹیوں کے پانچ پانچ ممبر شامل کردیئے گئے ہیں۔

۴۔ قبرستان جن شرطوں پر دیا گیا ہے، وہ حد درجہ سخت اور ناقابل قبول ہیں۔ ان سے مسلمانوں کا مدفن بالکل ڈپٹی کمشنر کے زیر اقتدار چلا گیا ہے اور کسی موقع پر ان کی بدولت مسلمانوں کو تکلیف پہنچنے کا قوی امکان ہے۔ نمونہ کے لیے چند شرطیں ملاحظہ ہوں:۔

ا۔ انتظام ڈپٹی کمشنر کے ماتحت رہے گا۔

ب۔ کسی قسم کی تعمیر بلا اجازت ڈپٹی کمشنر نہ ہوسکے گی۔

ج۔ زمین کو متعدد قطعات میں تقسیم کیا جائے گا۔ تقسیم خود ڈپٹی کمشنر کرے گا۔ وہی اس کے حدود مقرر کرے گا اور بتدریج ہر قطعہ میں تدفین کے شروع کرنے کی اجازت دیا کرے گا۔

د۔ اجرتوں اور قیمتوں میں حذف و اضافہ بلا اجازت ڈپٹی کمشنر نہ ہوسکے گا۔

ر۔ کمیٹی کو ہر ایک قاعدہ کی جو ڈپٹی کمشنر یا اور کوئی حاکم مجاز مقرر کرے، تعمیل کرنی ہوگی۔

س۔ اگر ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوگا کہ قواعد کی تعمیل نہیں ہوتی یا قواعد شکنی ہوتی ہے یا قواعد شکنی ہونے دی جاتی ہے، تو وہ کمیٹی کو بدل کر دوسری کمیٹی مقرر کرے گا۔

ط۔ اگر کسی ممبر کی جگہ خالی ہو، تو کمیٹی خود اسے منتخب کرے گی۔

ع۔ ڈپٹی کمشنر کو اختیار ہوگا کہ جس ممبر کو چاہے، موقوف کردے۔

یہ شرائط اس قدر قابل اعتراض ہیں کہ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں قبول کر لینے کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب حکومت کا دائرہ نفوذ و اقتدار ہمارے زندوں سے گزر کر ہمارے مردوں تک بھی پہنچ جائے۔ صرف یہی نہیں کہ رعایا کی داخلی زندگی کے اسقدر دوراز کارشعبوں تک میں حکومت کے اختیارات کا وسیع ہو جانا اصولاً سخت قابل اعتراض ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ حکومت کی

مداخلت کے اتنے وسیع حقوق مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوں گے۔ ان شرطوں کے مطابق حکومت نے اس قبرستان پر مسلمانوں کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس کی حیثیت ایک سرکاری ملکیت کی سی ہوگی، جسے حکومت جب چاہے بند کرکے توسیع شہر یا امپیریل سٹی کی دوسری اغراض کے لیے کام میں لا سکتی ہے اور اگر اس نے ایسا نہ بھی کیا، تو کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ وہاں مسلمانوں کی مرضی کے مطابق کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ کمیٹی مسلمانوں کی نمائندہ نہیں، بلکہ ڈپٹی کمشنر کی تابع فرمان ہوگی۔ اس کا کوئی ممبر سرکاری احکام کے خلاف عمل نہ کر سکے گا۔ اگر کرے گا، تو اس کی جگہ کوئی دوسرا سرکاری پٹھو مقرر کر دیا جائے گا۔ اس کے ہر قطعہ میں مردوں کو دفن کرنے کے لیے بھی ڈپٹی کمشنر سے اجازت لینی پڑے گی اور آئندہ زمانہ میں جو حکم بھی ڈپٹی کمشنر دے گا اس کی بلاچون و چرا تعمیل کرنی ہوگی۔ ایسی ذلت آمیز شرطوں کو قبول کرکے اس نئے قبرستان کو لے لینا مسلمانوں کی غیرت قومی کے لیے سخت عار ہے۔ اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اسے مسترد کرکے وہ اپنی میتوں کو بستی حضرت محبوب الٰہی یا قطب صاحب لے جا کر دفن کریں۔

لیکن اصل سوال یہ نہیں ہے کہ یہ شرطیں سخت ہیں یا نرم اور نہ ہمیں اس سے کچھ بحث ہے کہ جدید قبرستان میں کوئی انتظام ہے یا نہیں۔ ہمارا اصلی نقطہ بحث یہ ہے کہ حکومت نے کس حق کی بنا پر ہمارے پچھلے قبرستانوں کو لیا ہے؟ اور آیا مسلمان اس بات کو برداشت بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے اسلاف کی یادگاروں کو مٹا کر ان پر سڑکیں اور شاہی محل سراؤں کے اصطبل بنائے جائیں؟ ہمیں جدید قبرستان کی کمیٹی اور خصوصاً امام صاحب جامع مسجد سے سخت شکایت ہے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی کے مدعی ہونے کے باوجود ان تمام معاملات سے باخبر رہے اور انہوں نے مسلمانان شہر کو بالکل خبر نہیں دی کہ ان کے بزرگوں کا نام و نشان مٹانے کے لیے کیا تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ کم از کم امام صاحب کا تعلق تو مسلمانان شہر کے ساتھ ایسا ہے کہ ایسی تمام باتوں سے وہ انہیں جمعہ کے جمعہ خبردار کر سکتے ہیں۔ ان کا کام محض ممبر پر کھڑے ہو کر ایک مطبوعہ خطبہ سنا دینے اور دو رکعت نماز پڑھا دینے سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ اگر اپنے فرائض کا صحیح احساس کریں، تو شہر کا جائز نمائندہ ان کے سوا اور کون ہو سکتا ہے پھر ہمیں حیرت ہے کہ وہ کونسا احساس

فرض تھا، جس نے انہیں اس اہم معاملہ میں خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کیا؟

بہرحال جو کچھ بھی ہوا، اس پر افسوس کرنے کے بعد اب ہم صاف طور پر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان اس معاملہ میں صبر سے کام نہیں لے سکتے اور نہ لینا چاہیے۔ جو معاملہ تمام مسلمانان شہر، بلکہ ایک حیثیت سے (جسے ہم آگے چل کر واضح کرتے ہیں) تمام مسلمانان ہند کے لطیف حسیات مذہبی سے تعلق رکھتا ہے، اس پر حکومت کو کوئی حق نہیں کہ خاموشی کے ساتھ کوئی فیصلہ کردے اور اپنے اختیار سے جو چاہے کاروائی کر بیٹھے۔ اگر اس نے ہمارے پچھلے قبرستانوں کو خرید لیا ہے، تو ہم اس خرید و فروخت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر حکومت کی شاہی ضروریات کا دائرہ اب اس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے کہ وہ اپنی سڑکوں اور عمارتوں کے لیے ہمارے اسلاف کی یادگاریں مٹا دینے پر مجبور ہے، تو ہمیں اندیشہ ہے کہ کل ہماری مسجدوں کا بھی نمبر آ جائے گا اور شاہی ضروریات کی خاطر ہماری کوئی چیز بھی ان کی نظروں میں محترم نہ رہے گی۔ اس باب میں تسامح سے کام لینا اور گذشتہ راصلوہ و آئندہ را احتیاط کہہ کر چشم پوشی کر جانا ہماری انتہائی بے غیرتی پر دلالت کرتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس وقت تمام مسلمانان دہلی ان قبرستانوں کے متعلق پچھلی کارروائی کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کردیں اور پوری قوت سے اس سوال کو دوبارہ اٹھائیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ ان قبرستانوں میں سے کوئی وقف شدہ تو نہیں ہے۔ اگر وقف شدہ ہے، تو اس کی بیع و شراً قانون شریعت کے مطابق کسی طرح جائز ہی نہیں ہو سکتی۔ الوقف لا یملک، جب وقف سوائے خدا کے اور کسی کی ملک ہی نہیں تو اسے بیچنے کا کس کو حق پہنچتا ہے۔ متولی اس کا محض نگہبان ہوتا ہے۔ اس کا وارث نہیں ہوتا، نہ وہ اسے بیچنے کا حق رکھتا ہے، نہ رہن رکھنے کا نہ ہبہ کرنے کا اور نہ کسی کو بخش دینے کا۔ امام ابویوسف کی صاف تصریح موجود ہے کہ:

الوقف عبارۃ عن حبس العین علی ملک اللہ علی وجہ تصل المنفعۃ الی العباد فیزول ملک الوقف عنہ الی اللہ فیلزمہ ولا یباع ولا یوہب ولا یرتہن ولا یورث۔

لیکن اگر وہ وقف نہیں ہیں، بلکہ تکیہ داروں نے اپنے طور پر انہیں خرید کر قبرستان بنا لیا ہے، تو انہیں فروخت کرنے سے پہلے عام مسلمانوں کو اس معاملہ کی خبر کر دینی

چاہیے تھی، کیونکہ یہ زمینیں صرف انہیں کی ملک نہیں ہیں، بلکہ مسلمانوں کے بھی اس سے عمیق روحانی تعلقات ہیں اور اگر وہ مجتمعاً یا منفرداً انہیں خریدنے پر تیار ہوں، تو تکیہ داروں کا فرض ہے کہ ان کے سوا کسی اور کے ہاتھ انہیں فروخت نہ کریں۔ پس اس لحاظ سے بھی زمینوں کی فروخت کا دوبارہ اعلان کیا جائے اور مسلمانوں کو آخری موقع دیا جائے کہ اگر ان کے دلوں میں اپنے اسلاف کی یادگاروں کا احترام موجود ہے، تو انہیں مشترکہ چندہ سے خرید کر ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کردیں۔

یہ معاملہ محض زمینوں کی بیع و شرا کا نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی غیرت ملی سے اس کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ ایک زمین دے کر اس کے عوض میں دوسری زمین مل جانے سے ہم کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو سکتے، اگرچہ مسلمانوں کے مذہب میں قبور کا وہ احترام جائز نہیں ہے جو قبر پرستی کی حد تک پہنچ جائے، لیکن شریعت کی نگاہ میں اموات مومنین کی اتنی بے وقعتی بھی نہیں ہے کہ ان کے نام و نشان کو عمداً مٹا کر ان کی ہڈیوں پر سڑکیں اور عمارتیں تعمیر کی جائیں۔ احادیث میں بیسیوں ایسی ہی روایتیں موجود ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قبروں سے تکیہ لگا کر بیٹھنے تک کو منع فرمایا ہے۔ عمرابن حزم ؓ کی روایت ہے کہ:۔

رانی رسول ﷺ متکئا علی قبر فقال لاتوذ صاحب ھذا القبر۔

یعنی مجھے آنحضرت ﷺ نے ایک قبر سے تکیہ لگائے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ اس قبر والے کو تکلیف نہ دو۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ

قال رسول اللہ ﷺ لن یجلس احد کم علی جمرہ فتحرق ثیابہ فتخلص الی جلدہ خیر لہ من ان یجلس علی قبر۔

یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا انگارا پر اس طرح بیٹھ جانا کہ اس کے کپڑے جل اٹھیں اور اس کی جلد سے چمٹ جائیں اس سے یہ بہتر ہے کہ کوئی کسی قبر پر بیٹھے۔ ایک اور روایت ہے کہ حضور نے ایک شخص کو جوتے پہنے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ یاصاحب السبتیین القبہا او جوتوں والے ان کو اتار کر چل پھر اللہ کے مومن بندوں کی ہڈیوں کا شارع علیہ السلام کی نظروں میں اتنا احترام ہے کہ ان پر بیٹھنا یا ٹیک لگانا تک درست نہیں سمجھا، تو کیا کوئی مسلمان اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے

سامنے ان خفتگان خواب راحت کے سینوں پر گاڑیاں چلیں' گھوڑے بندھیں اور ہر طرح کی غلاظتیں پھینکی جائیں۔

پھر یہ معاملہ یہیں تک نہیں رہ جاتا' رونا تو یہ ہے کہ انہی قبرستانوں میں ایک قبرستان مہدیوں کا بھی ہے اور یہ وہ قبرستان ہے جہاں علوم دینیہ کی عزت مدفون ہے' اس جگہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے خانوادہ مقدس کے اکثر بزرگ دفن ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت خواجہ میر درد اور دیگر اکابر و صوفیائے کرام کے مزارات بھی یہیں ہیں۔ ان لوگوں کی خاک کا ایک ایک ذرہ ہمارے لیے کائنات کی تمام دولتوں سے زیادہ قیمتی ہے اور ہم ان کی ہڈیوں کو کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی اقتدار کے دور اخیر میں اسلام کی عزت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں' جن کے سینوں سے علوم و معارف کی روشنیاں نکل کر تمام اقطاع و اکناف ہند میں پھیل گئی تھیں' جن کے دم سے آج اس گئی گذری حالت میں بھی ہندوستان میں علوم دین کی شمع روشن ہے اور جن کی گرانقدر خدمات کو اسلام اس وقت تک نہیں بھلا سکتا جب تک وہ زندہ ہے۔ کیا کوئی مسلمان سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ وہ ان بزرگوں کی ہڈیوں پر امپیریل سٹی کی تعمیر کو گوارا کرے گا؟

آج گورنمنٹ ہم کو یقین دلا سکتی ہے کہ ہم ان قبروں کو ہاتھ نہ لگائیں گے اور ان کا احترام ہر طرح ملحوظ رکھیں گے' لیکن جب وہ انہیں خرید چکی ہے" تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل وہ اپنے مالکانہ حقوق کو استعمال کرنے سے باز رہے گی پھر اگر وہ ایسا یقین دلانے کے لیے بھی تیار ہو' تو ہماری غیرت ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اپنے بزرگوں اور ایسے محترم پیشواؤں کی ہڈیاں اس کے ہاتھ بیچ دیں۔ انگریزی قوم کے دل میں خود اپنے اعاظم کی بھی بڑی قدر موجود ہے۔ کیا وہ ہمیں بتا سکتی ہے کہ وہ اتنی زبردست اور تاجر قوم ہونے کے باوجود کس قیمت پر ویسٹ منسٹر ایبے کو ہمارے ہاتھ فروخت کرنے کے لیے تیار ہے؟ اور کچھ نہیں' تو کم از کم ہم یہی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ شیکسپیر کی قبر کو کس چیز کے معاوضہ میں دے سکتی ہے؟ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں کہ لوزین کانفرنس میں اس نے گیلی پولی کے برطانوی مقتولین کی قبروں پر

اس قدر سخت مباحثہ کیا تھا کہ کئی مرتبہ محض اس جھگڑے کی بدولت صلح ملتوی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جو قوم اپنے معمولی معمولی سپاہیوں کی ہڈیوں کو اتنا قیمتی سمجھتی ہو، اس کے لیے دوسری قوموں کے اعاظم کی یادگاروں کو اتنا بے حقیقت سمجھنا حد درجہ شرمناک ہے۔

آخر میں ہم ایک دفعہ پھر مسلمانان دہلی کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں غفلت سے ہرگز کام نہ لیں۔ یہ محض قبرستانوں کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ان کی غیرت قومی کا مسئلہ ہے اور اس کا حل یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ان قبرستانوں کے عوض ہم کو جدید قبرستانوں میں سایہ دار درخت، پانی کے نل اور تدفین کے ضروری انتظامات مکمل مل جائیں۔ جو لوگ اس مسئلہ کا اتنا آسان سا حل تجویز کر رہے ہیں ان کی قومی غیرت پر ہمیں افسوس ہوتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنی عزت کا بہت ارزاں سودا تجویز کیا ہے۔

* حکومت مصر اور حج

حکومت مصر کی جانب سے حج کے متعلق جو اعلان کیا گیا ہے، اسے ریوٹر ایجنسی کے ذریعہ خاص طور پر ہندوستان بھیجا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کے لیے دلیل کا کام دے جو اس سال حج کو خلاف مصلحت قرار دیتے ہیں، لیکن در اصل یہ اعلان اگر کسی چیز کو ظاہر کرتا ہے، تو وہ صرف یہ ہے کہ حکومت ہند اور وزارت مصر دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ایک ہی مرکز ہے جہاں کے تاروں پر دونوں گردش کرتی ہیں اور ایک خاص پالیسی کے ماتحت دونوں کو عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ اگرچہ حکومت ہند کے آخری اعلان اور زیور پاشا کے اس اعلان میں الفاظ کا فرق ضرور موجود ہے، لیکن جہاں تک معانی و مطالب کا تعلق ہے، دونوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مسلمانان ہند نے حکومت کی مرضی کے خلاف سفر حج کو محض اپنی ذمہ داری پر شروع کیا ہے، اسی طرح مسلمانان مصر نے بھی اپنی حکومت کی مخالفت کے باوجود راہ خدا میں سفر شروع کر دیا ہے اور زیور پاشا کی وزارت انہیں خود انہی کی ذمہ داری پر حج پر روانہ کرنے کے لیے مجبور ہو گئی ہے۔

تنہا مصر ہی میں نہیں، بلکہ اس مرتبہ ترکی میں بھی کامل ۱۱ سال کے بعد سفرِ حج کا آغاز ہو رہا ہے اور خود بلادِ عرب کے بھی اکثر مقامات سے خبریں آ رہی ہیں کہ وہاں کے لوگ جنگ کی ذرہ برابر پرواہ کئے بغیر بلد امین کی جانب روانہ ہونے کے لئے کمربستہ ہیں۔

پنجاب ہندو کانفرنس

[۶ر جون ۱۹۲۵ء]

*** اجتماع امرتسر کے اغراض و مقاصد پر ایک تنقیدی نظر :**

ہندوستان کے جماعتی مسائل میں ابتدا سے ہمارا مسلک یہ رہا ہے کہ ہم کسی قوم کی انفرادی تنظیم کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ اگر وہ صحیح اصولوں پر ہو، تو اسے اجتماعی تنظیم اور ملک کی مجموعی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں پوری آبادی کا نہ تو کوئی ایسا متحدہ نظام ہو سکتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو اور نہ ایسی حالت میں اس قسم کے نظام کا قائم ہونا ممکن یا مفید ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس ۳۳ کروڑ کی آبادی کو مختلف عقائد، مختلف تمدن، مختلف رسوم و شعار اور مختلف قومی حسیات نے الگ الگ قوموں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اگر کسی صورت سے یہ ممکن ہوتا کہ یہ اختلافات رفع ہو کر پوری آبادی ایک قوم بن سکتی ہے، تو یقیناً ایک متحدہ نظام قائم کرنا ممکن تھا، لیکن ہر سلیم العقل انسان سمجھتا ہے کہ ان اختلافات کا رفع ہونا زمین و آسمان کے بدل جانے کا ہم معنی ہے۔ اس لیے وہ یہی رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ہر قوم کو اپنی ذاتی اصلاح و تنظیم کے لیے الگ الگ جماعتیں بنانی چاہئیں اور صرف بین القومی اور خارجی مسائل کے لیے ایک ایسا متحدہ نظام ہونا چاہیے، جس میں جمع ہو کر سب کے سب اپنے متحدہ مصالح کی حفاظت اور ملک کی مجموعی فلاح و بہبود کے لیے تدابیر سوچ سکیں۔

جہاں تک اصول کا تعلق ہے، اس رائے کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کی مختلف العقیدہ قومیں جب تک اپنی داخلی زندگی کو درست نہ کریں گی، جب تک وہ اپنی اندرونی خرابیوں اور کمزوریوں کو دور نہ کریں گی اور جب تک وہ اجتماعی امراض کا علاج کر کے صحیح یا تندرست نہ بن جائیں گی، اس وقت تک ہندوستان میں من حیث المجموع کوئی ترقی نہ کر سکے گا اور دنیا کی اقوام میں متحدہ ہندوستان کی طاقت ہرگز تسلیم نہیں کی جائے گی، لیکن عملی حیثیت سے یہ انفرادی تنظیم بہت سے نازک پہلو رکھتی ہے، جن کا لحاظ کیے بغیر مشغول کار ہونا فائدہ کے بجائے ہلاکت کا یقینی

ذریعہ بن سکتا ہے۔ ہندوستان کی تمام قومیں اور خصوصاً وہ عظیم الشان قومیں جو ملک کے ہر گوشہ میں پہلو بہ پہلو رہتی ہیں اپنے عقائد اور قومی رسوم و شعائر کے اختلافات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے اصولی و فروعی اختلافات بھی رکھتی ہیں جو انہیں آسانی سے باہم متصادم کر سکتے ہیں۔ ان کی تاریخ، ان کی تہذیب، ان کی رسوم اور ان کے احساسات اکثر مقامات پر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور اگر وہ اپنی تنظیمی قوتوں کو ان اختلافات اور تصادم کے امکانات کے دور کرنے میں صرف کرنے کی جگہ ان کی آبیاری اور صرف انہی کی پرورش میں صرف کرنے لگیں، تو اس سے نہ ہندوستان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، نہ ان قوموں کی اندرونی اصلاح میں کوئی مدد مل سکتی ہے اور نہ ان اغراض کو کسی قسم کا نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ جن کے لیے وہ آپس میں لڑتی ہیں، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مخالفانہ تنظیم سے ملک کی ترقی رکتی ہے، امن و امان کو نقصان پہنچتا ہے، سیاسی غلامی کی بندشیں مضبوط ہوتی ہیں اور ہمسایہ قوموں کی باہمی جنگ سے ہمیشہ جس قسم کے جانی، مالی اور اخلاقی نقصان ہوا کرتے ہیں، وہ سب دونوں قوموں کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

اسی نقطہ نظر سے ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ اگر انفرادی تنظیم کا مدعا محض داخلی اصلاح ہو، تو اسے کسی حیثیت سے بھی مردود، مبغوض یا غیر مفید نہیں کہا جا سکتا بلکہ مفید اور اصلاحی سمجھا جائے گا، لیکن اگر اس کا مدعا انتقام کی تیاری کرنا، بغض و عناد کے جذبات پیدا کرنا اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرکے اپنی منتشر قوتوں کو متحد کرنا ہو، تو ایسی تنظیم ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شریف آدمی کی تائید حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کی تائید دراصل شر و فساد کی تائید ہے، بدامنی و جنگ جوئی کی تائید ہے اور ایک ایسی چیز کی تائید ہے جو از سرتاپا شیطانی عناصر سے مرکب ہے۔

آئیں! اب اس بنیادی اصول کے مطابق ہم اس پراونشل ہندو کانفرنس پر ایک نظر ڈالیں جو ابھی ابھی امرتسر میں منعقد ہوئی ہے۔ اس کانفرنس اور ایسی دوسری کانفرنسوں کو ہم اصولی حیثیت سے برا نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں، ہمیں کسی قوم کی انفرادی تنظیم پر اصولاً کوئی اعتراض نہیں۔ اگر ہم اپنی دینی اصلاح کے لیے جمعیت العلماء قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر ہم اپنے خارجی مصالح کی حفاظت کے لیے خلافت کمیٹی

قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر ہم اپنے اندرونی سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے مسلم لیگ قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں، تو یقیناً ہندو بھی حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنی اجتماعی امراض کی اصلاح اور اپنی اندرونی قوتوں کی تنظیم کے لیے ہندو سبھا قائم کریں، ہندو کانفرنسیں منعقد کریں اور تمام ممکن العمل ذرائع اختیار کریں۔ ہندوؤں کی اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں ہیں، ان کو ہم بھی افسوس ناک سمجھتے ہیں اور ہماری یہ خواہش ہے کہ وہ جلد سے جلد دور ہو جائیں۔ چھوت چھات، صغرسنی کی شادیاں، ذات پات کی تفریق، بیواؤں کی شادی نہ کرنا اور ایسی ہی دوسری رسوم نہ صرف ہندوؤں کی ترقی کے راستہ میں ایک زبردست رکاوٹ ہیں، بلکہ ان سے بالواسطہ تمام ہندوستان کی ترقی رکی ہوئی ہے اور ہر سچا محب وطن دل سے چاہتا ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے۔

اگر ہندو مہا سبھا اور اس کی ماتحت مجالس کا مقصد صرف اسی قسم کی اصلاح ہو، تو اس سے کسی عقلمند انسان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں ان کا وجود صرف جائز ہی نہیں، بلکہ مفید ہے اور ان کی یقیناً ہندو قوم کو ضرورت ہے، لیکن اگر ان کا مقصد اس کے سوا کچھ اور ہو، اگر وہ کسی انتقامی جذبہ کے ماتحت وجود پذیر ہوئی ہوں، اگر ان میں ہندوؤں کو اصلاح کے لیے نہیں، بلکہ ہمسایہ قوموں کے مقابلہ کے لیے تیار کیا جاتا ہو، اگر ان میں محبت اور میل جول کی نہیں، بلکہ بغض و عناد کی تعلیم دی جاتی ہو اور اگر ان کا مدعا یہ ہو کہ ہندوؤں کو مل کر رہنے کے بجائے لڑ کر چلنا سکھایا جائے، تو ہم یقیناً ان پر اعتراض کرنے کا حق رکھتے ہیں اور بے شک ہمیں کہنا چاہیے کہ ان کا وجود ملک کے لیے بے حد خطرناک ہے۔

اس امر کا فیصلہ ہمیں قیاسات کے بجائے اس کانفرنس کی کارروائیوں پر کرنا چاہیے۔ ہر جماعت کے اغراض و مقاصد کے بہترین ترجمان خود اس کے بانی اور عملی رہنما ہوتے ہیں۔ ان کی زبان اور ان کے اعمال و افعال میں خواہ کتنی ہی سیاسی چالاکی استعمال کی جائے، مگر وہ دلوں کے مقاصد کی نہایت صفائی کے ساتھ غمازی کرتے ہیں اور دوربین نگاہیں ان کے اندر اس چیز کو ڈھونڈ ہی نکالتی ہیں جو خوشنما پردوں کے نیچے چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ پس ہندو کانفرنس کے مقاصد کو معلوم کرنے کے لیے ہم تین چیزوں پر تنقیدی نگاہ ڈالیں گے اور انہیں سے یہ معلوم کریں گے کہ یہ اجتماع اصلاح کے لیے

منعقد ہوا تھا یا فساد کے لیے۔

ایک لالہ دونی چند کا خطبہ استقبالیہ

دوسرے ڈاکٹر گوکل چند قائم مقام صدر کا خطبہ افتتاحیہ

اور تیسرے لالہ لاجپت رائے منتخب صدر کا خطبہ صدارت

لالہ دونی چند نے اپنے خطبہ میں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنگھٹن کی تحریک کوئی جارحانہ تحریک نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد محض اندرونی اصلاح و تنظیم ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سنگھٹن کی تحریک اس سے رتی بھر کم یا زیادہ نہیں ہے کہ اپنی سلامتی کے جذبہ کا اظہار کیا جائے وہ کسی اعتبار سے بھی انڈین نیشنل کانگرس کے مقاصد کے منافی نہیں ہے، بلکہ اس کو کانگرس کا ایک ضمیمہ سمجھنا چاہیے" اور ایک اور جگہ انہوں نے اس تحریک کی تشریح یوں کی ہے کہ "ہندو چاہتے ہیں کہ ان کی عمر طویل ہو اور وہ اپنی زندگی شادمانی اور فارغ البالی کے ساتھ بسر کر سکیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی پر کمزوری، بے غیرتی کا کوئی دھبہ نہ ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص کسی جاتی کی اس قسم کی خواہشات اور تمناؤں کے متعلق کس طرح اعتراض کر سکتا ہے؟ کیا حفاظت خود اختیاری کا خیال کرنا کوئی پاپ ہے اور کیا اپنی حفاظت کے جذبہ کو عملی صورت میں لانا قابل ملامت فعل ہے؟ بخلاف اس کے یہ شریف ترین جذبہ انسانی ہے یہ انسانی سرشت میں ٹھہراؤ اور استقلال پیدا کرتا ہے اور انسان کو کردار و عمل کی پختگی بخشتا ہے یہ دلائل بظاہر اس قدر مضبوط ہیں کہ ان کے جواب میں سنگھٹن کی تعریف اور تائید کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لالہ صاحب کے سوالات کا جواب بقول ان کے "ایک پر زور ہاں کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا"" مگر آگے چل کر خود لالہ صاحب ہی نے ان دلائل کا تار و پود بکھیر دیا ہے اور ہندوؤں کو اندرونی اصلاح کی بجائے مسلمانوں کے مقابلہ پر تیار ہونے کی ترغیب دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

> "ہندو ہمیشہ اسی وہم میں مبتلا رہے کہ اپنے مفاد کی بے حد قربانیوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری جماعت بھی ویسا ہی طرز عمل اختیار کرے گی اور اس امر کے عرصہ دراز تک منتظر رہے، لیکن ملتان، سہارنپور، کوہاٹ، دہلی اور دیگر مقامات کے افسوسناک واقعات کے بعد انتظار مزید ایک حماقت ہوگا"۔

اس کے بعد انہوں نے لالہ لال چند آنجہانی کے مضامین کا حوالہ دیا ہے جن کے متعلق واقف کار لوگ جانتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے اور ہندوؤں کو ان سے پرہیز کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ لالہ دونی چند ان کی تعلیمات میں دوبارہ جان ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس وقت تو ہم میں لال چند جی کے مشوروں پر عمل کرنے کی بصیرت نہیں تھی، مگر اب آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ آگے چل کر وہ مسلمانوں کو احسان فراموشی اور محسن کشی کا الزام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے خلافت کے لیے مصیبتیں برداشت کیں، جیل گئے، لاکھوں روپیہ خلافت کمیٹی کو دیا اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر حکومت برطانیہ پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ آخر ترکی سے صلح کرنے پر مجبور ہو گئی۔

> "لیکن یہ قربانیاں بھی رائیگاں گئیں اور مسلمانوں کی ذہنیت میں ہندو بھائیوں کے متعلق ذرا بھی ترقی نہ ہوئی۔ ترکوں کی فتوحات کے نشہ میں وہ سرشار ہو گئے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوؤں نے یہ قربانیاں محض ان کے خوف سے کی تھیں، مزید فتوحات کے لیے ان کی ہوس بڑھ گئی ہے اور وہ ہندوؤں کے خرچ پر مزید فوائد اور ترجیحی سلوک کے لیے شوروغوغا کر رہے ہیں۔
>
> ملتان کوہاٹ اور دیگر مقامات کے واقعات کی تفصیل میں جانا بے سود ہے، کیونکہ سب جگہ ایک ہی قسم کے واقعات دہرائے گئے ہیں۔ یعنی ہندوؤں پر بغیر کسی اشتعال دلائے جانے کے حملے ہوئے، مال و زر لوٹا گیا، مکانات جلائے گئے، عورتوں کی بے عزتی اور مندروں کی بے حرمتی کی گئی کہیں کہیں انہوں نے اپنے بچاؤ کے لیے مقابلہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جاتی کے معزز اصحاب گرفتار کئے گئے اور ان پر مقدمات چلائے گئے۔ بعض حالات میں انہیں سزائیں دی گئیں اور بعض مقدمات میں انہیں مہینوں تک پیشیاں بھگتنی پڑیں"۔

اس کے بعد لالہ صاحب نے ان ذرائع سے بحث کی ہے جو ان حالات کا خاتمہ کرنے کے لیے اختیار کرنے چاہئیں اور اس سلسلہ میں منجملہ دیگر ذرائع کے چند ذریعے یہ بھی بیان کئے ہیں:۔

۱۔ ہندو اپنی جسمانی حالت کو بہتر بنائیں کیونکہ ”جسمانی کمزوری دوسرے لوگوں کو ناجائز فائدہ اٹھانے کی دلیری مہیا کرتی ہے، آپ کو اس قدر مضبوط بننا چاہیے کہ دوسرے لوگ یہ خیال کرنے لگیں کہ آپ کو نقصان پہنچانا یا دھمکانا بچوں کا کھیل نہیں ہے“۔

۲۔ دنگلوں کی ایسی باقاعدہ تنظیم ہونی چاہیے کہ آنے والی نسلیں اپنی نسبت یہ محسوس کریں کہ وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ وہ حریف فرقوں کے حملوں کو، جو گذشتہ زمانہ کے خاص خصائص رہے ہیں رد کر سکتی ہیں“۔

۳۔ ہندو قوم کے مختلف فرقوں کو باہم متحد کرنا چاہیے۔ ایسی حالت میں ”جبکہ ایک بیرونی خطرہ ہمیں چاروں طرف سے محصور کرنے کی دھمکی دے رہا ہو، ہمارے پاس اپنے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کے جاری رکھنے اور اپنے فرقوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں اب ہم ایک ایسی جدوجہد میں مصروف ہیں، جس میں ناکامی کا مطلب ذلت و رسوائی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ پس تمام دوسرے خیالات کو موجودہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت کے سامنے جھک جانا چاہیے“۔

یہ ذرائع بیان کرنے کے بعد لالہ صاحب نے مختلف مابہ النزاع مسائل پر ہندو نقطہ نظر سے بحث کی ہے اور آخر میں دوبارہ ہندو قوم کو ان الفاظ میں متحد ہو جانے اور سنگٹھن کرنے کی تلقین کی ہے:۔

> ”ملتان، سہارن پور، دہلی، کوہاٹ اور دیگر مقامات میں مسلمانوں نے آریہ سماجیوں، سناتنیوں اور سکھوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ انہوں نے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے۔ پس اب وقت ہے کہ ہم اپنے اختلاف کو مٹا دیں اور ہر قسم کے خیالات رکھنے والے ہندوؤں کو باہم متحد ہو جانا چاہیے اور ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی طرح کام کرنا چاہیے۔ صوبہ بھر کے ہندوؤں کے پاس اس قدر مسالہ موجود ہے جس کی وجہ سے وہ ایک ایسی طاقتور اور زبردست قوم بن سکتے ہیں جو دوسری قوموں سے اپنی عزت و وقعت کرا سکتی ہے“۔

ہم نے یہ طویل اقتباسات محض اس لیے پیش کر دئے ہیں کہ ہماری رائے اور تنقید کے بغیر قارئین کرام خود ان کے مطالعہ سے اس چیز کو اخذ کر لیں، جو ان میں پوشیدہ

ہے ایک معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی بھی ان کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرے گا کہ لالہ دونی چند نے اپنے خطبہ صدارت کی ابتدا میں سنگھٹن کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جو دلائل پیش کئے تھے، وہ محض دنیا کو دھوکہ دینے اور وکیلانہ چال میں پھانسنے کے لیے تھے، ورنہ دراصل ان کے دل میں انتقام اور جنگ کا جذبہ بھرا ہوا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جہاں تک سنگھٹن کے ظاہری مقصد کا تعلق ہے وہ کوئی ناجائز تحریک نہیں ہے۔ ہندوؤں کو پورا حق پہنچتا ہے کہ اپنی جسمانی حالت درست کریں، کشتیاں لڑیں، مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کریں اور اپنی قومی بیماریوں کے علاج میں تمام قوتیں صرف کر دیں، لیکن جیسا کہ لالہ صاحب کے پچھلے بیانات سے ثابت ہے، اس کا بنیادی و حقیقی مقصد صرف مسلمانوں کا خاتمہ کرنا ہے اور یہی چیز ہے، جو اس کو ایک مفسدانہ اور جنگجویانہ تحریک بنا دیتی ہے۔ اندرونی تنظیم کوئی بری چیز نہیں، لیکن ہمسایہ قوم پر الزامات عائد کرکے اور اس کے نام نہاد مظالم کے افسانے بیان کرکے لوگوں کو اس شرارت پر آمادہ کرنا یقیناً فساد انگیز ہے۔ دنگل قائم کرنا اور ورزشیں کرکے جسمانی قوت بڑھانا کوئی گناہ نہیں، لیکن اگر اس کا مقصد دوسروں کا سر پھاڑنا ہو تو یہ یقیناً گناہ ہے۔ کسی قوم کے مختلف فرقوں کو اتحاد کی دعوت دینا بلاشبہ ایک مبارک کام ہے، لیکن اگر وہ اتحاد دوسروں کے مقابلہ کے لیے ہو، تو وہ یقیناً شر و فساد کا موجب ہو گا۔

پس جہاں تک لالہ دونی چند کا تعلق ہے، ان کے خیالات کی روشنی میں پنجاب ہندو کانفرنس کو ہم ایک تعمیری اجتماع کے بجائے ایک تخریبی اجتماع سمجھنے پر مجبور ہیں اور اس لحاظ سے وہ اجتماعی تنظیم کے اس معیار پر پورا نہیں اترتا جسے ہم نے اپنے مضمون کی ابتدا میں پیش کیا ہے۔

{ ۱۰ر جون ۱۹۲۵ء }

اشاعت گذشتہ میں ہم لالہ دونی چند کے بیانات سے اس امر کو واضح کر چکے ہیں کہ اگر صدر استقبالیہ کے خیالات کو اس کانفرنس کے اصلی مقاصد کا صحیح نمائندہ تسلیم کر لیا جائے، تو یقیناً یہ کانفرنس ہندو مہا سبھا کی دوسری شاخوں کی طرح ایک خالص انتقامی کانفرنس تھی اور اس کی تہ میں اصلاح و تنظیم کے پاک جذبات کی بجائے نفرت و عداوت کے مفسدہ انگیز جذبات پوشیدہ تھے۔ اب ہم کانفرنس کی دوسری ذمہ دار شخصیت ڈاکٹر

گوکل چند نارنگ کے خطبہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں جنہیں لالہ لاجپت رائے کی غیر موجودگی میں کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔

اگرچہ ڈاکٹر نارنگ نے لالہ دونی چند کے مقابلہ میں مغرب کے اصطلاحی تدبر کو بہت زیادہ استعمال کیا ہے اور اپنے اصلی جذبات کو نفاق کے پردوں میں چھپا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے‘ لیکن ان کا خطبہ بھی کانفرنس کی اصلیت کو نمایاں کرنے میں دونی چند صاحب کے خطبہ سے کچھ کم نہیں اور اگر کوئی ذرا تفحص سے کام لے‘ تو بڑی آسانی کے ساتھ اس کے لفظی گورکھ دہندے کے اندر چھپے ہوئے شاہد معنی کا روئے جہاں برہم کن دیکھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص طور پر جس چیز کا التزام کیا ہے‘ وہ یہ ہے کہ حتی الامکان کسی جگہ مسلمانوں کا نام نہ آنے پائے۔ جتنے حملے اور جتنے الزامات ہوں‘ سب ایک غیر معلوم الاسم جماعت پر ہوں اور یہ بات خود سننے والوں کی فراست پر چھوڑ دی جائے کہ ان کا اصلی ہدف کون ہے‘ لیکن ہمارے خیال میں یہ "چالاکی" ان کے لیے چنداں مفید نہیں ہے‘ کیونکہ مسلمانوں کا یا کسی اور جماعت کا نام نہ لینے سے نفس معاملہ کی نوعیت نہیں بدلتی۔ ان کی تحریک پر ہمارا اعتراض صرف اس لیے نہیں ہے کہ وہ ہمارے یا کسی خاص جماعت کے دشمن ہیں‘ بلکہ ہمارا اصلی اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو ہمسایہ اقوام کے مقابلہ میں عام اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا کوئی اور‘ نفرت و انتقام کے جذبات پیدا کرکے ابھار رہے ہیں اور یہ بات ان حملوں اور الزامات سے ثابت ہے جو ایک غیر معلوم الاسم دشمن پر ان کے خطبہ صدارت میں عاید کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بھی لالہ صاحب کی طرح اپنی بحث کا آغاز اس سوال سے کیا ہے کہ:

> "آیا مذہبی فرقہ وارانہ کانفرنسیں جائز ہیں یا نہیں؟" اور یہ کہ "ہندو آرگنائزیشن پر ایک جوابی اور انتقامی تحریک ہونے کا جو الزام لگایا جاتا ہے‘ وہ کہاں تک صحیح ہے؟""

ان دونوں سوالات کے جواب میں‘ جہاں انہوں نے تنظیم وغیرہ کا حوالہ دیا ہے‘ اس کو ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں‘ اس لیے ہم اسے کسی اور وقت کے لیے ملتوی کرتے ہیں‘ لیکن جس جگہ وہ اصولاً اس انفرادی نظام کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے

ہیں، وہ ہمیں ان کے اصلی مدعا تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

> "ہندو مسلمان عیسائی وغیرہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کے اجزا ہیں جس طرح کسی بڑی مشین کو تیار کرنے کے لیے پہلے مختلف پرزوں کو علیحدہ علیحدہ ڈھالا جاتا ہے، پھر کوئی باکمال مستری یا فٹر انہیں مناسب جگہوں پر لگا دیتا ہے، تو مشین تیار ہو جاتی ہے، اسی طرح ہندو اگر اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں کہ ہم مسلمان اور ہندوستان کی دوسری قومیں اس سرزمین کی متحدہ قومیت کی مشینری کے کل پرزے ہیں تو اس قسم کی کانفرنسیں ہرگز نقصان دہ نہیں بلکہ مفید ثابت ہوں گی۔ احتیاط صرف اس قدر ضروری ہے کہ ایسی کانفرنس کے لیڈروں کو سمجھ لینا چاہیے کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بجائے اپنے تئیں اس مشین کا پرزہ سمجھنا ہی دیش اور قوم کی حقیقی خدمت ہے"۔

یہ تقریباً وہی خیالات ہیں جو اس مضمون کی ابتداء میں ہم نے انفرادی تنظیم کے متعلق پیش کئے تھے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے حقیقی خیالات یہی ہوتے، تو جہاں تک ان کا تعلق ہے، پنجاب ہندو کانفرنس کسی اعتراض کے نہیں، بلکہ تائید و تحسین کے قابل ہوتی، لیکن یہ زریں خیالات پیش کرنے کے چند ہی لمحوں بعد انہوں نے جو گل فشانی شروع کی ہے وہ ثابت کرتی ہے کہ یہ محض وکیلانہ خطابت تھی جسے ہندو کانفرنس کی پیروی میں صرف کیا گیا تھا ورنہ دراصل یہاں بھی وہی انتقامی جذبات موجود ہیں جو سنگھٹن کے تمام بانیوں اور مویدوں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ ہندو دھرم کی قوت حیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

> "ہندو جاتی ایک شیر ہے جس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے اور وہ بیمار اور چلنے پھرنے کے ناقابل ہے۔ ادھر ادھر کے جنگلی جانور اس سے چھیڑخانی کر رہے ہیں اور تاک میں بیٹھے ہیں، مگر یہ شیر مرنے والا نہیں۔ اس کا گوشت ان کے معدوں میں ہرگز نہیں جائے گا، بلکہ جونہی یہ شیر رو بصحت ہو گیا، ان جانوروں کو اپنی حفاظت کرنے میں مشکل پیش آئے گی"۔

اس جملہ میں ہمسایہ اقوام کو جنگلی جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہندو جاتی کے بیمار شیر کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں اور انہیں دھمکی دی گئی ہے کہ جب شیر تندرست ہو

جائے گا، تو ان جانوروں کی خیر نہیں ہے۔ یہ خیالات ہندو قوم میں اپنی ہمسایہ قوموں کے متعلق جس قسم کے جذبات پیدا کر سکتے ہیں، انہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب ان خطرات کا ذکر کرتے ہیں جو ہندو جاتی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

> "ہندو جاتی تو لاوارث کھیتی ہے۔ کوئی جانور جا گھسے، یا کوئی آدمی کاٹ لے یا سردی گرمی سے سوکھ جائے، کوئی پرسان حال نہیں۔ ہندوؤں کے اندر اس قدر احساس کہاں جو اس کھیتی کو برباد ہوتے دیکھیں اور بچاؤ کی تدبیر کریں۔ ماجھے کے علاقہ میں کسان اور کاشت کار ذرا سی فصل کے نقصان پر آمادۂ فساد ہو جاتے ہیں، مگر ہم ہیں کہ ہماری ساری کھیتی لوٹی جا رہی ہے اور ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ لٹیرے اس قدر ہیں کہ الامان والحفیظ، بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہندوؤں کے سوا (ہندوستان میں) لٹیرے ہی لٹیرے (بستے) ہیں"۔

ان الفاظ میں ایک طرف ہمسایہ قوموں کو لٹیرا بتایا گیا ہے، دوسری طرف ہندوؤں کو غیرت دلائی گئی ہے کہ یہ لٹیرے تمہیں لوٹ رہے ہیں اور تم بے حس پڑے ہو اور تیسری طرف انہیں کاشتکار کی مثال دے کر مقابلہ پر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ خیالات نفرت، عداوت اور انتقام تینوں چیزوں سے مرکب ہیں اور ان کے زہریلے اثرات کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔

ان خطرات کو ظاہر کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ہندوؤں کو اندرونی اصلاح کی جانب توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری اس خستہ حالی کا سبب فقط جسمانی کمزوری ہے اور اس کا علاج ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہندو صغر سنی کی شادیاں چھوڑیں، برہم چاریہ کو ترقی دیں، روپیہ جمع کرنے کی حرص میں فنا نہ ہو جائیں، مقوی غذائیں کھائیں، آرام طلبی چھوڑ کر محنت کے کام کریں، پیدائش زیادہ کرنے کے وسائل اختیار کریں، بیماریوں کے استیصال کی کوشش کریں، بیوہ عورتوں کے نکاح کی رسم جاری کریں اور جہاں تک ممکن ہو ہندوؤں کی تعداد گھٹنے نہ دیں، بلکہ اسے اور بڑھائیں۔ اصولی حیثیت سے اصلاحی مقاصد میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو کسی معقول آدمی کے نزدیک قابل اعتراض ہو، مگر ان انتقامی جذبات نے، جنہیں ان اصلاحات کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، انہیں مایہ تعمیر کے

بجائے سامان تخریب بنا دیا ہے اور ایسی حالت میں ان کا قابل اعتراض ہونا ظاہر ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے ہندو قوم کے پرسٹیج (وقار) کا ماتم کیا ہے اور یہاں بھی وہی نفرت اور انتقام کے جذبات موجود ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

> ”جہاں ہماری تعداد زیادہ ہے وہاں بھی اغیار کو یقین ہے کہ اگر ہم ہندوؤں کو لوٹیں اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کریں، تو پوچھنے والا کوئی نہیں کیا کوئی ہندو عورت یہ یقین رکھتی ہے کہ اگر کوئی بدمعاش اس کی طرف انگلی اٹھائے، تو اس کا بھائی یا دیور یا جیٹھ اپنا کام کاج چھوڑ کر اس کی حفاظت کے لیے دشمن کو جان سے مار ڈالے گا، خواہ اسے سولی پر لٹکنا پڑے، کم از کم اتنا تو ثابت کردے گا کہ اس کی موجودگی میں کوئی ماں کا لال کسی ہندو عورت کو چھیڑنے کی جرائت نہیں کر سکتا“۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں ہمسایہ قوموں کی چیرہ دستیوں نے ہندو عورتوں کی عصمت تک کو غیر محفوظ بنا دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کو آمادہ پیکار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال ہندوؤں میں نفرت کے جذبات پیدا کرنے کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ صرف ڈاکٹر صاحب ہی نہیں، بلکہ سنگھٹن کا ہر پرچارک اس کو آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

اسی پرسٹیج کے ماتم میں ڈاکٹر صاحب نے سہارن پور اور حیدر آباد کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

> ”سہارن پور میں میں نے لوٹی ہوئی دوکانوں کو بچشم خود دیکھا ہے۔ اگر مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ ہندوؤں کو مدافعت یا بے عزتی کے ازالہ کا احساس ہے، تو کیا ایک دوکان بھی لوٹی جاتی؟ سہارن پور کے اردگرد تمام دیہات ہندوؤں کے ہیں اگر انہیں قومی وقار کا احساس ہوتا اور پھر سہارن پور کا ایک مکان بھی لٹ جاتا، تو میں اسے معجزہ سمجھتا“۔
>
> گلبرگہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔
>
> ”گلبرگہ حیدر آباد کی ریاست میں واقع ہے۔ وہاں حکومت مسلمانوں کی ہے۔ لیکن ۹۰ فی صد آبادی ہندوؤں کی۔ وہاں ہماری تمام عبادت گاہیں معرض خطر

میں ہیں۔ کشمیر میں راج ہندوؤں کا ہے، لیکن اکثریت مسلمانوں کی۔ وہاں بھی ہمیں آرام نصیب نہیں۔ یہ سب کچھ فقط قومی وقار نہ ہونے کا نتیجہ ہے"۔

اس آخرالذکر بیان میں ڈاکٹر صاحب نے جیسا کھلا افتراء باندھا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، مگر ہندوؤں کی بے کسی کا نقشہ دکھانے اور حیدر آباد کی اسلامی ریاست کو بدنام کرنے کے لیے انہوں نے علانیہ جھوٹ بولنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔

آگے چل کر اچھوت ادھار کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اچھوتوں کی تحریک کوئی مذہبی اصلاح کی تحریک نہیں ہے، بلکہ ایک سیاسی مقابلہ کی تحریک ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ:۔

> "اس وقت مسلمان سات کروڑ اور آپ بائیس کروڑ، لیکن آپ کی حالت یہ ہے کہ اکثر دفعہ آپ ڈر کے مارے لحاف سے منہ نہیں نکالتے۔ اگر سات کروڑ اچھوت بھی ان کے ساتھ مل گئے، تو تمہیں زندہ درگور ہو جانا پڑے گا۔ اچھوت کی قدر و قیمت آپ اہل پانی پت سے پوچھیے۔ اگر آج سے بیس سال پہلے ایک موقع پر وہ تمہاری خدمت نہ کرتے، تو شاید تمہیں پانی پت کی چوتھی لڑائی کا منہ دیکھنا پڑتا"۔

یہ ہیں وہ خیالات، جو ہندو کانفرنس، امرتسر کی دوسری ذمہ دار شخصیت نے پیش کئے ہیں۔ آپ نے ان طویل اقتباسات میں دیکھ لیا کہ ساری تقریر اول سے لے کر آخر تک انتقامی جذبات سے پر ہے اور ہندوؤں کی اندرونی اصلاح کا ایک معمولی سا جزو بھی ایسا نہیں ہے جسے نفرت، عداوت اور انتقام سے ملوث نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی اجتماع کا صدر اہل اجتماع کے خاص اعتماد اور ان کی طرف سے خاص ذمہ داریوں کا حامل ہوتا ہے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر نارنگ کے یہ خیالات کانفرنس کی غالب اکثریت کے خیالات ہیں اور ایسی حالت میں ہندوؤں کی اس انفرادی تنظیم کے متعلق حامیان صلح و اتحاد کا جو کچھ فیصلہ ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

{ ۱۴ر ۱۸ر جون ۱۹۲۵ء }

اب ذرا کانفرنس کے اصلی پردھان لالہ لاجپت رائے کے خطبہ صدارت پر ایک نظر

ڈالیئے۔ ان کی گذشتہ تقریروں اور خصوصاً ہندو مہا سبھا کے خطبہ صدرات پر تمام ہندوستان میں جو نکتہ چینیاں کی گئی تھیں، انہوں نے اب ان کے اندر ذرا احتیاط کا مادہ پیدا کر دیا ہے اور اگرچہ ان کے نصب العین اور طریق کار میں تو کوئی فرق پیدا نہیں ہوا، لیکن اس مرتبہ ان کی زبان بہت زیادہ حالت اعتدال پر آگئی ہے۔ انہوں نے اپنی توجہ زیادہ تر ہندوؤں کی اندرونی خرابیوں کی طرف مبذول رکھی ہے۔ ان کو مضبوط ہونے اور ترقی کرنے کی ترغیب دی ہے اور انہیں یقین دلایا ہے کہ تمہاری فلاح غیروں کو کوسنے میں نہیں، بلکہ اپنی حالت درست کرنے میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں سے دوستی کرنے کے خیال کو بھی ترقی دینے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلہ میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جنہیں اگر وہ ابتدا سے پیش نظر رکھتے، تو شاید ہندو مسلمانوں کے تعلقات اس قدر کشیدہ نہ ہونے پاتے، بلکہ اگر اب بھی وہ صداقت کے ساتھ ان خیالات کی وکالت شروع کر دیں، تو یقیناً بہت جلد ہندوستان کا مطلع دو ہمسایہ قوموں کی افسوس ناک کشیدگی سے صاف ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے لکھا ہے کہ "سیاسی مطالبات کی بنیاد پر آپس کے تعلقات خراب کر لینا سخت غلطی ہے۔ اس بارے میں نہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے کوئی شکایت ہونی چاہیے اور نہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے۔ اصولی بحث نہایت دوستانہ طریقہ سے جاری رہ سکتی ہے، لیکن ان اختلافات کی وجہ سے دونوں جماعتوں میں دشمنی پھیلانا اور فساد پھیلانا نہایت ناواجب ہے"۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ:

> "نہ ہم مسلمانوں کو نکال سکتے ہیں اور نہ مسلمان ہم کو۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کو اسی ملک میں رہنا ہے۔ غلام رہیں تو اور آزاد ہو جائیں تو۔ ہمارا ساتھ ٹوٹنا محال ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان اختلافات کو محدود رقبہ میں رہنے دیا جائے"۔

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ لالہ جی نے بھی اپنے دو پیش روؤں کی طرح ان خیالات کو محض نمائش کے لئے پیش کیا ہے، ورنہ دراصل ان کی تعلیمات بھی ویسی ہی زہر آلود ہیں جیسی آپ لالہ دونی چند اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی دیکھ چکے ہیں۔ اسی ہندو مسلم تعلقات کی بحث میں انہوں نے اپنے مصالحانہ خیالات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور

مسلمان لیڈروں پر ایسے زہر آلود الزامات بھی عائد کئے ہیں جو ان کی تمام صلح جوئی پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ "اگر مسلمان لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کو دھمکیاں دیکر ہندوستان کا سوراجیہ حاصل کرسکتے ہیں تو وہ غلطی پر ہیں" اور یہ کہ "اگر مسلمان ہندوؤں کو دشمن اور یورپین اقوام کو اپنا دوست سمجھتے ہیں، تو معاملہ دیگر ہے"۔

صرف یہی نہیں، بلکہ لالہ جی نے ہندوؤں کو اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کے لئے بھی منافرت کا ہتھیار استعمال کیا ہے، چنانچہ سنگھٹن کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "تمہارے اندر اس قدر ذاتیں ہیں، اس قدر فرقے ہیں، اس قدر جماعتیں ہیں، اس قدر باہمی تعصبات ہیں کہ تمہارے دشمن تمہاری ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر نہ صرف اپنا سنگھٹن کرنے سے روکتے ہیں، بلکہ تمہیں نشانۂ تضحیک بھی بنانے ہیں۔ واقعی تمہارے اندر بہت زیادہ منافرت اور اختلافات ہیں اگر چندے یہی حالت رہی تو تمہاری اکثریت اقلیت میں تبدیل ہوجائے گی اور ہندوستان بھر میں تمہاری وہی حالت ہوجائے گی جو اس وقت صوبہ سرحد اور سندھ میں ہے"۔

ایک اور جگہ ہندوؤں کو آپس کے اختلافات سے بچنے اور اتحاد کرنے کی تلقین اس طرح کی ہے کہ:

> "آریہ سماجیوں پر واجب ہے کہ اپنی طاقت کے بھروسے پر گھمنڈ میں نہ آئیں بلکہ اپنے اندر انکساری کی عادت پیدا کریں، ورنہ یاد رکھیں کہ اس کھنڈن منڈی کی غیر مشروط اور بے قابو شدہ عادت کا پھل وہی ہوگا جو کوہاٹ میں ہوا۔ سناتن دھری بھی اب آریہ سماجیوں کی تقلید کرنے لگے ہیں ان کی خدمت میں بھی میں ادب سے وہی کوہاٹ کا نقشہ پیش کروں گا"۔

ہمسایہ قوموں کو "دشمن" کی حیثیت سے پیش کرنا انکی اکثریت سے اپنی قوم کو ڈرانا اور فسادات کو نمونہ بناکر انہیں ایک قوم کے خلاف دوسری کو متحد کرنے کے لئے استعمال کرنا جس پوشیدہ جذبہ عناد پر دلالت کرتا ہے، اس کی موجودگی میں ہندو مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دینا اور دشمنی و فساد کی اشاعت کو ناواجب بتلانا جس قدر وقیع ہوسکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

لالہ جی نے اپنے مقصد کے لئے اس ناپاک مکروہ طریقہ کو بھی استعمال کیا ہے، جو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بغض و عناد پھیلانے کی غرض سے حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے اور وہ ہندو عورتوں کے اغوا کی داستانیں بیان کرکے ودھوا آشرم بنانے اور استریوں کی رکھشا کرنے کی تحریک ہے۔ ہمیں عورتوں کی حفاظت، بیواؤں کی اعانت اور لاوارث عورتوں کی امداد پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں، بلکہ ان کاموں کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ ہمیں ان بدمعاشوں سے بھی کوئی ہمدردی نہیں، جو عورتوں کو بھگانے اور ان کی عصمتوں پر حملے کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں، بلکہ وہ ہماری نظروں میں بھی اتنے ہی قابل نفرت ہیں، جتنے ہندوؤں کی نظروں میں ہیں، لیکن ہمارے نزدیک قابل اعتراض چیز دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے اغوا کا مجرم کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے بدمعاش ہندوؤں میں بھی ہیں اور مسلمانوں میں بھی۔ ان کے حملے دونوں قوموں پر یکساں ہوتے ہیں اور اکثر اوقات وہ مل کر کام کرتے ہیں۔ بقول مولانا محمد علی کے ان لوگوں کا کوئی مذہب ہی نہیں ہوتا۔ ان کو کسی خاص قوم کی طرف منسوب کرکے اس قوم کو بدنام کرنا ایک اصولی غلطی ہے، مگر افسوس ہے کہ لالہ جی جیسے ذمہ دار ہندو لیڈر نے بھی اس معاملہ میں وہی رویہ اختیار کیا ہے جو ادنیٰ درجہ کے فساد انگیز اشرار اختیار کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں بھی ہندو عورتوں کے باقاعدہ اغوا (Organised Kidnapping) کی شکایت موجود ہے اور وہ اس شوروغل پر یقین ظاہر کرتے ہیں جو اس قسم کے خودساختہ اغوا پر ہندو اخبارات نے خاص مقاصد کے لئے مچانا شروع کردیا ہے۔

لالہ جی نے اپنے اس الزام بغض و عناد کے مشن میں تاریخ کو بھی استعمال کیا ہے، اگرچہ بظاہر اس سے ان کا مقصد ہندوؤں کو یہ تعلیم دینا تھا کہ وہ محمود غزنوی، بابر، اکبر اور اورنگ زیب وغیرہ مسلمان فاتحین کو مطعون کرنے کے بجائے خود اپنے مان سنگھ، ٹوڈرمل، جے سنگھ اور جسونت سنگھ کو مطعون کریں کہ ان کے اصلی دشمن یہی لوگ تھے، لیکن فی الحقیقت انہوں نے اس تذکرہ سے ہندو مسلمانوں کے تاریخی اتحاد پر ایک ضرب لگائی ہے۔ ہندوستان کی ان دونوں قوموں کو متحد کرنے کا ایک بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ان کی متحدہ تاریخ ہو جس میں ناگوار پہلوؤں کو نظرانداز کرکے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے، جو ان کے باہمی حسن سلوک اور بھائی چارے کی یادگار ہوں۔ اس لحاظ سے تاریخ کے صفحات پر

مان سنگھ، ٹوڈر مل وغیرہ ہندو مسلم اتحاد کے قدیم نشانات ہیں جن سے متحدہ ہندوستان کی بہت سی روایات وابستہ ہیں، مگر لالہ جی نے ٹھیک اسی پالیسی کے مطابق جسے برطانیہ کے سیاسی مورخوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر وضع کیا تھا، ان لوگوں کو ہندوؤں کا اصلی دشمن قرار دیا ہے اور اس طرح اپنی قوم کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ صرف سیواجی اور پرتاپ سنگھ ہی کی روایات پر عمل کریں۔

یہ کانفرنس کے پردھان اور ہندو قوم کے سب سے بڑے ذمہ دار لیڈر کی خیالات تھے۔ انہیں بھی آپ نے دیکھ لیا کہ تعمیر و اصلاح کے بجائے تمام تر توجہ تخریب و فساد پر صرف کی گئی ہے اور اگر تعمیر کی کوشش بھی کی گئی ہے تو اس کا ذریعہ تخریب ہی کو بنایا گیا ہے۔ اب اس کے بعد کوئی چیز قابل لحاظ باقی رہ جاتی ہے، تو وہ کانفرنس کی کارروائی ہے۔ جس طرح اس کے لیڈروں اور ذمہ دار عہدہ داروں کے دماغ پر نفرت اور انتقام کے جذبات مستولی ہیں، اسی طرح اس کی کارروائی ریزولیوشن اور تمام تقریریں تعمیر اور اندرونی اصلاح کی تجاویز سے یکسر خالی ہیں۔ اول سے لے کر آخر تک ان میں صرف افتراق انگیز جذبات بھرے ہوئے ہیں جن کا مدعا ہمسایہ قوموں سے جنگ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پہلا ریزولیوشن کوہاٹ کے متعلق تھا اور اس میں کوہاٹی مظلوموں کے ساتھ اظہار ہمدردی اور "مسلمانوں کے فعل شنیع پر اظہار نفرت" کیا گیا تھا۔ اس پر پروفیسر گلشن رائے، مہاشہ خوشحال چند، لالہ میلا رام اور پنڈت راجندر مصرا نے جو تقریریں کیں، ان کی تفصیلات ہمارے سامنے نہیں ہیں، مگر ان کے خلاصے جو کچھ ہندو اخبارات میں آئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سخت الفاظ میں مسلمانان کوہاٹ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کی گئی اور صوبہ سرحد میں ہندوؤں کا مستقبل بہت خطرناک بتلایا گیا۔ دوسرا ریزولیوشن پنجاب کی میونسپل کمیٹیوں کے متعلق تھا اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور میاں سر فضل حسین کی پالیسی پر سخت اعتراضات کر کے نہایت غصہ کے ساتھ اپنے اس یقین کا اعادہ کیا گیا تھا کہ کسی ہندو لیڈر کو لاہور اور انبالہ کی میونسپل کمیٹی کے لئے کھڑا نہ ہونا چاہیے۔ اس کے محرک بھائی پرمانند نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ کرنے اور ہندوؤں کو میونسپلٹیوں سے نکالنے کے لئے بڑی بڑی چالیں چلی گئی ہیں اور ان کے مقابلہ کی صرف یہ صورت ہے کہ تمام دوسرے صوبوں

کے وزرائے تعلیم مسلمانوں کے خلاف بھی وہی پالیسی اختیار کریں جو پنجاب میں میاں فضل حسین نے ہندوؤں کے خلاف اختیار کی ہے۔ تیسرا ریزولیوشن فرقہ وار نیابت کے متعلق تھا اور اس میں "قوم پرستی" کو بہانہ بنا کر ہندو اکثریت کی حاکمانہ قوت بحال رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوتھے ریزولیوشن میں ساہو کارہ بل کی مخالفت کی گئی اور اس کے محرکین ومؤیدین نے صاف طور پر اعلان کیا کہ میر مقبول محمود نے یہ مسودہ قانون صرف ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کے لئے پیش کیا ہے۔ پانچویں ریزولیوشن میں اعلیٰ حضرت نظام دکن کے اس فرمان پر اظہار نفرت کیا گیا جس کے ذریعہ آپ نے قلمرو آصفیہ میں پنڈت مالوی کا داخلہ بند کیا ہے اور اس پر مختلف ہندو مقررین نے جو تقریریں کیں وہ سب زہر میں بجھی ہوئی تھیں۔ مہاشہ کرشن ایڈیٹر پرتاپ نے، تو صاف الفاظ میں اعلان کردیا کہ "نظام کی ریاست میں ہندوؤں کے حقوق قطعاً محفوظ نہیں ہیں"۔ چھٹے ریزولیوشن میں ہندو دیویوں کی رکھشا کی تجویز پیش کی گئی اور اس کی تائید میں جتنی تقریریں کی گئیں، سب میں بیک آواز یہی ماتم کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہندو دیویوں کی عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے، اس لیے ہندوؤں کو ان کی حفاظت میں اپنی جانیں تک لڑا دینی چاہئیں۔ باقی ریزولیوشن ہندو سبھاؤں کے قیام اور ہندو سنگھٹن کی تقویت کے متعلق تھے اور وہ انہی خیالات کے ماتحت تھے، جو سنگھٹن کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔

اب اگر اس کارروائی پر اور ان ذمہ دار ہندو رہنماؤں کی تقریروں پر جو کانفرنس کے بانی اور لیڈر ہیں، ایک مجموعی نظر ڈالی جائے، تو ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد مسلمانوں کی مخالفت اور دشمنی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ صدر استقبالیہ اور صدر انجمن سے لے کر ادنی مقرر تک جو شخص کھڑا ہوا، اس نے صرف ایک ہی راگ الاپا اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ کا راگ تھا۔ ہم نے کانفرنس کی پوری روئیداد پر انتہائی تجسس کے ساتھ متعدد مرتبہ نظر ڈالی اور اس امر کی پوری کوشش کی کہ کسی جگہ ہم کو تخریب اور فساد انگیزی کی بجائے تعمیر اور اصلاح کا روئے دلآرام نظر آجائے، مگر افسوس کہ ایک چیز بھی ہم کو ایسی نظر نہ آئی۔ ایسی حالت میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کی انفرادی تنظیم جن اصولوں کے مطابق جائز اور مفید قرار دی جاسکتی ہے، وہ ہندوؤں کی انفرادی تنظیم میں یکسر مفقود ہیں اور اس لئے کوئی محب وطن

جس کے دل میں ہندوستان کی بہی خواہی کا ذرہ برابر بھی جذبہ موجود ہے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی تائید نہیں کر سکتا۔

اگرچہ آج کل تفرقہ اور منافرت کے جذبات اس قدر عام اور عمیق ہو چکے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کوئی مخلصانہ نصیحت قبول نہیں کی جا سکتی، لیکن ہم اپنے ہندو بھائیوں کے لیڈروں کو یہ نصیحت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ تم جن طریقوں سے اپنی اندرونی بیماریوں کا علاج کرنا چاہتے ہو وہ قطعاً غلط ہیں اور ان سے بیماری دور ہونے کی بجائے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ تعمیر کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسے تخریب سے پاک رکھا جائے، کیونکہ تخریب میں ہمیشہ ایسی جاذبیت ہوتی ہے کہ تمام تر توجہ تعمیر کے بجائے اسی کی طرف منعطف ہو جایا کرتی ہے اور اس طرح تعمیر کا کام بیکار ہو جاتا ہے۔ پس اگر تم فی الحقیقت اپنی مذہبی، تمدنی اور اخلاقی کمزوریوں اور انتقام کے جذبات کو یک قلم دور کر دو اور ہمسایہ قوموں سے لڑنے کے بجائے ان کے بہترین دماغوں کی تائید حاصل کرو تو اس طرح فرقہ وارانہ منافرت پر قابو پا کر ہندوستان کو شاہراہ ترقی پر ڈالا جا سکتا ہے، لیکن اگر تمہارا مقصد محض جنگ ہے، اگر تم دوستانہ تعلق اور امن و چین کی زندگی سے تنگ آ گئے ہو اور اگر تمہارا جی آپس کی لڑائی اور خانہ جنگی کے لئے بیتاب ہے، تو ایک مرتبہ اس کے انجام پر غور کر لو اور اگر وہ بھیانک منظر تمہیں پسند آئے جو اس تنافر کی بدولت گزشتہ فسادات میں کئی مرتبہ پیش آ چکا ہے، تو اپنی خواہش کا صاف صاف اعلان کر دو تاکہ سارا ہندوستان امن اور صلح کی تمام امیدوں کو خیرباد کہہ کر اس ہولناک کشمکش کے لئے تیار ہو جائے جس کا انجام اس کی دائمی غلامی، ہمیشگی کی ذلت اور ایک پائیدار رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

❑ ہندو عورتوں کا اغوا

{ ۶ر جون ۱۹۲۵ء }

آج کل ہندو اخبارات میں بدھواؤں اور کنیاؤں کے اغوا کی خبریں بڑے زور و شور کے ساتھ گشت لگا رہی ہیں اور یہ وبا اس حد تک ترقی کر رہی ہے کہ پنجاب ہندو کانفرنس میں لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ تک نے اس کی سخت شکایت کی ہے۔ ان لوگوں کے بیانات سے سننے والے کے دل میں خیال ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں نے ہی ہندو عورتوں کو اغوا کیا ہے حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی واقعات نہیں ہیں۔ دونوں قوموں کے اچھے لوگ اس قسم کی شکایت ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ آجکل ہمارے ہندو دوست ہر واقعہ کو ہندو مسلم مسئلہ بنا کر اس سے فائدہ اٹھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔

✱ موپلا قوم کی تباہی

قارئین کرام کو معلوم ہے کہ موپلا قوم کو اب برطانوی علاقہ سے نکال دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اسے جزائر انڈمان میں بسانے کی تجویز ہو رہی ہے تاکہ ہندوستان میں اس بہادر قوم کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ اگرچہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ جن موپلوں کو حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے وہ اور ان کے اعزا خود ہی یکجا رہنے کے لئے انڈمان میں آباد ہونا چاہتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قوم کی گزشتہ تاریخ اور خصوصیت کے ساتھ ۱۹۲۱ء کی بغاوت نے برطانیہ عظمیٰ کو اتنا خوف زدہ کر دیا ہے کہ وہ اس کا کھوج مٹا دینا چاہتی ہے اور صرف یہی نہیں کہ ہندوستان میں اس کے وجود کو پسند نہیں کرتی، بلکہ اسے فنا کر دینے کے لئے اپنی وسیع مملکت میں اس کے لئے ایک ایسے مقام کو منتخب کر رہی ہے جو آب و ہوا اور خراب جائے وقوع کے لحاظ سے دنیا کے بدترین جزائر میں سے ہے اور جسے خود حکومت ہند کا مقرر کیا ہوا جیل کمیشن بھی انسانی بود و باش کے ناقابل تسلیم کر چکا ہے۔

یہ ایک ایسا ظلم ہے جس پر کوئی سچا انسان افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر

اسلامیت کے تعلقات سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے‘ تو خالص انسانی نقطہ نظر سے ایک پوری قوم کی قوم کو محض سیاسی وجوہ کی بنا پر ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دینا انتہائی قساوت پر دلالت کرتا ہے جو یقیناً ہر مہذب انسان کے نزدیک باعث ملامت ہے‘ لیکن جب ہم اس مسئلہ کو اسلامیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں‘ تو یہ دیکھ کر ہمارے رنج و الم کی انتہا نہیں رہتی کہ اس بدنصیب قوم کو محض اس لئے مٹایا جا رہا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اسلام کا سچا جوش اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج ہندوستان کے طول و عرض میں ایک اسلامی آبادی بھی ایسی نہیں ہے‘ جس میں اس کے برابر دینی حرارت موجود ہو۔ اس کا بچہ بچہ اسلام کے نام پر سر کٹانے کے لئے مستعد رہتا ہے۔ اس کا ہر فرد صحیح معنوں میں ایک مجاہد اسلام ہے۔ اس کے خصائص بعینہ وہی ہیں جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس کے عرب آباؤ و اجداد اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی یہی وہ حرکت ہے جس کی پاداش میں اس کے اکابرین کو سنگینوں میں پرویا گیا اور گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے بعد اب اس کے معصوم و مظلوم بچوں کو کالے پانی کی سرزمین میں دفن کیا جا رہا ہے۔ ایک مسلمان کی غیرت ایمانی اور اخوت اسلامی پر یہ حالت جیسی کچھ شاق ہو سکتی ہے‘ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک مومن قلب ہی کی ضرورت ہے۔

* حضور نظام سے ایک التجا

موپلا قوم کو اس المناک انجام سے بچانے کے لیے خود اسی قوم کے بعض معزز افراد نے ایک نہایت مفید تجویز پیش کی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس مقصد کے لئے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہو سکتی۔ حال ہی میں مسلمانان مالابار کا ایک جلسہ مولانا شیخ محمد کوبا کے زیر صدارت بمقام کالی کٹ منعقد ہوا ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو حکومت کے اس الزام کی پر زور تردید کی گئی ہے کہ موپلا قوم خود انڈمان میں آباد ہونا چاہتی ہے اور موپلا مردوں‘ عورتوں اور بچوں کو ان کے وطن عزیز سے نکال کر کالے پانی میں آباد کرنے کی تجویز پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ موپلوں کو اس بحری سفر میں بھی وہی ہولناک نتائج نظر آ رہے ہیں‘ جو ۱۹۲۱ء کے حادثہ ریل کی صورت میں نمودار ہوئے تھے۔ اس کے بعد حکومت ہند سے حسب ذیل ریزولیوشن میں ایک مسترحمانہ التجا کی گئی ہے۔

> ”اگر ایک مٹھی بھر غیر مسلح موپلوں کا وجود اس وسیع اور طاقت ور برطانوی شہنشاہیت کے لئے منبع خطرہ تصور ہو، تو براہ مہربانی ان کی نوآبادیوں کے لئے یا تو ہزہائینس بیگم صاحبہ بھوپال یا محی الملت والدین فرمانروائے دکن کے ممالک محروسہ میں انڈمان کی بجائے انتظام کیا جائے“۔

اگرچہ اس ریزولیوشن کا خطاب بظاہر حکومت ہند سے ہے، لیکن دراصل وہ اعلی حضرت خسرو دکن اور علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی انسانی ہمدردی اور اسلامی حمیت سے ایک بیکسانہ فریاد ہے جس پر ان دونوں خادمان ملت کے مومن قلوب یقیناً توجہ کریں گے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے بھوپال کے علاقہ میں اتنی زیادہ زمینیں نہیں ہیں کہ وہاں موپلوں کے ایک بڑے حصہ کو آباد کیا جاسکے، کیونکہ یہ علاقہ زیادہ ترخشک ہے اور جو سرسبز شاداب قطعات ہیں، وہاں پہلے سے کافی آبادی موجود ہے۔ ان میں اگر موپلوں کی نوآبادیات قائم بھی کی گئیں، تو حد سے حد پچیس تیس ہزار آدمیوں کے لئے جگہ نکل سکے گی، البتہ اگر اعلی حضرت نظام الملک اس جانب متوجہ ہوں، تو وہ اپنی وسیع مملکت میں تقریباً پوری موپلا آبادی کو جگہ دے سکتے ہیں۔ ایک زمانہ سے اعلی حضرت کی حکومت اپنے ممالک محروسہ کی آبادی بڑھانے کے لئے تجاویز سوچ رہی ہے اور سر علی امام کے دور حکومت میں نوآبادیات کی ایک اسکیم بھی منظور ہوچکی ہے جس کی رو سے برطانوی ہند کے لوگوں کو مملکت آصفیہ کے غیرآباد علاقوں میں بسانے اور زمینیں عطا کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ اس مدبرانہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی ہمارے نزدیک اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے کہ حکومت دکن برٹش گورنمنٹ سے درخواست کرکے موپلوں کو اپنے ہاں منتقل کرلے۔ اس سے ایک طرف تو برٹش گورنمنٹ کا منشا پورا ہوجائے گا، دوسری طرف ایک اسلامی قوم کامل تباہی سے بچ جائے گی اور تیسری طرف خود ریاست کی خوشحالی میں بھی زبردست ترقی ہوگی۔ موپلا قوم ایک محنتی اور جفاکش قوم ہے۔ صنعت و زراعت اور تجارت کے میدان میں اس کی قابلیتیں تاریخی شہرت حاصل کرچکی ہیں۔ عرب و ہند کے تجارتی تعلقات کی تاریخ میں اس قوم کے کارنامے اب بھی زندہ جاوید ہیں۔ اس کی بہادری و ایمانداری اس پر مزید ہے۔ اس کی مدد سے نہ صرف ریاست کی آبادی، خوشحالی

اور اقتصادی فلاح میں ترقی ہوگی، بلکہ وہ انتظامی مشین میں بھی بہت کار آمد اور قابل اعتبار کل پرزے مہیا کرسکے گی۔

ہمیں یقین ہے کہ حضور نظام اپنے بے نظیر تدبر کو کام فرماکر اس معاملے میں کوئی عملی تحریک فرمائیں گے اور اپنے مسلم پرورانہ کارناموں میں ایک ایسے شاندار کارنامے کا اضافہ کریں گے، جو اسلامی ہند پر ان کے سب سے بڑے احسان کی حیثیت سے تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا عبدالجبار خیری اور احمدی جماعت

{ ۱۰؍ جون ۱۹۲۵ء }

ہمیں مولوی صدرالدین صاحب مشہور احمدی مبلغ کی ایک تقریر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ۲۴، ۲۷؍ مئی کے "پیغام صلح" میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مولوی صاحب موصوف نے مولانا عبدالجبار خیری اسلامی مبلغ مقیم برلن کے متعلق ایک شدید غلط بیانی کی ہے جس سے مولانا کی پوزیشن کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تمام واقف کار لوگ جانتے ہیں کہ مولانا عبدالجبار ایک باخبر اور وسیع النظر عالم ہیں اور کئی سال سے نہایت خاموشی کے ساتھ اسلام کی خدمت میں مشغول ہیں۔ برلن میں اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے آپ کو تقریباً ۶ سال ہو چکے ہیں اور ایک بڑی جماعت ان کی اعلیٰ خدمات پر شاہد ہے، مگر احمدی جماعت کا یہ امتیازی خاصہ ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسری جماعت کو ایک آن نہیں دیکھ سکتی اور دوسروں کی خدمات کو اپنی طرف منسوب کرنے میں انتہائی دلیری سے کام لیتی ہے۔ اس کے مبلغین جب برلن پہنچے، تو سب سے پہلے مولانا خیری کا وجود اس کی نظروں میں کھٹکا اور اس نے اپنا میدان صاف کرنے کے لیے ان جیسے خاموش اسلامی مبلغ کو خواہ مخواہ بدنام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ خود برلن میں ان کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا گیا، اس کی تفصیلات کا، تو یہاں موقع نہیں، مگر ہندوستان میں اس پروپیگنڈا کی تازہ ترین قسط یہ ہے کہ "پیغام صلح" کے ذریعہ انہیں "ایک معمولی طالب علم" مشہور کیا جارہا ہے جس کے متعلق پہلے تو صدرالدین صاحب بہت اچھے خیالات لے کر گئے تھے، مگر وہاں پہنچ کر جو گفتگو کی تو وہ ٹھیک طرح بات بھی نہ کرسکا!

ہم قارئین کرام کو بتانا چاہتے ہیں کہ وہ شخص جس کو ایک معمولی طالب علم مشہور کیا جا رہا ہے، برلن کی جمعیت متحدہ اسلامیہ کا صدر ہے اور یہ وہ جماعت ہے جس میں حجاز، فلسطین، شام، عراق، کردستان، مصر، سوڈان، حبش، طرابلس، تیونس، الجزائر، مراکش، ہندوستان، ایران، افغانستان، ترکی، قفقاز وسط ایشیا اور تمام دیگر ممالک اسلامی کے مسلمان شامل ہیں۔ اس کے مختلف شعبے ہیں اور ان کے صدر ڈاکٹر منصور رفعت (ترک)، اسماعیل حلمی (مصری)، کپتان ڈاکٹر ذکی کرام (عرب)، ابراہیم یوسف (سوڈانی) اور محمد بن عرابی (مراکشی) جیسے لوگ ہیں۔ اس طالب علم کی کوششوں سے ڈاکٹر ہوبرٹ بانگ (امریکہ کے ایک فلسفی عالم) پروفیسر فیرنسی (بوڈا پسٹ یونیورسٹی کے معلم قانون بین الاقوامی)، ڈاکٹر شورب (فن تعلیمات کے ماہر)، ڈاکٹر کیمیت (ایک با اثر جماعت کے صدر اور ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر) جیسے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اس طالب علم کے مداحوں میں نواب صدر یار جنگ بہادر، نواب عماد الملک بہادر، نواب سر امین جنگ بہادر نواب حیدر نواز جنگ بہادر اور نواب مسعود جنگ بہادر جیسے بلند پایہ لوگ شامل ہیں۔ اس طالب علم کے متعلق نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات حیدر آباد دکن لکھتے ہیں کہ "میں ان کی قابل قدر خدمات اور اعلیٰ قابلیت کا معترف ہوں"۔

ان شواہد و حقائق کی موجودگی پر ہم مولوی صدرالدین صاحب کے استخفاف پر سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی دیدہ دلیری قابل داد ہے۔

* رابغ پر علی کا حملہ

پورٹ سوڈان سے مسٹر قمراحمد کے تار نے تمام ہندوستان میں اضطراب برپا کر دیا ہے کہ حجاج کا پہلا جہاز جہاں گیر روک لیا گیا ہے اور علی نے رابغ کا محاصرہ کر کے اس پر گولہ باری شروع کر دی ہے۔ یہ آل شریف کے سیہ نامہ اعمال میں ایک جدید کارنامہ کا اضافہ ہے جو یقیناً اپنی لعنت آفرینیوں کے لحاظ سے اس کے تمام پچھلے کارناموں پر سبقت لے گیا ہے۔ اول تو شہور حرام میں جن کا احترام عہد جاہلیت کے کفار تک کرتے تھے، جنگ کو جاری رکھنا اور اس پر اصرار کرنا ایک بے نظیر شقاوت تھی۔ اس پر مزید یہ کہ اس نے حج سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو روکنے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں اپنے ایجنٹوں کو اس

مقصد کے لیے بھیجا، مصر کو حفاظت حجاج کے متعلق صاف جواب دے دیا اور تمام اسلامی ممالک میں منادی کرادی کہ اس سال حج کو کوئی نہ جائے، گویا حج کی فرضیت اس کی پادشاہی حجاز کے ساتھ مشروط ہے۔ اب ان سب حرکات پر یہ آخری حرکت سونے پر سہاگہ کا حکم رکھتی ہے۔ کیا اس نے عین منزل مقصود کے سامنے ان ۱۱۵۸ بندگان حق کو روک لیا ہے، جو خدا کی راہ میں احرام باندھ کر سنت ابراہیمی ادا کرنے کے لیے بیت اللہ الحرام کی طرف جا رہے تھے۔ ان بے ضرر انسانی ہستیوں کا مقصد سفر جنگ سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ وہ نہ علی کے دشمن تھے نہ ابن سعود کے دوست۔ وہ دونوں فریقوں میں سے کسی کی بھی اعانت یا مخالفت کے لیے نہیں جا رہے تھے۔ انہیں محض خدا کے گھر کا طواف کرنا تھا اور بس۔ ان کے حجاز پہنچنے سے اگر کسی کی اعانت ہونی تھی تو وہ فقط جیران بیت اللہ کی جن سے کسی مسلمان کو وجہ پرخاش نہیں ہو سکتی، مگر باوجود اس کے علی نے ان کو روک دیا اور اس پاک مقصد کی بھی کوئی پرواہ نہ کی جو اس سفر کے لیے ان کے پیش نظر تھا۔

وہ لوگ جو حج کی مخالفت میں چیخ پکار اور ریشہ دوانیاں کر رہے تھے، آج علی کی اس کارروائی سے خوش ہوں گے، لیکن اگر وہ ذرا مسلمان بن کر اس مسئلہ پر غور کریں، تو انہیں علی کو آفرین کہنے کی بجائے اس پر نفرین بھیجنی پڑے گی۔ علی کا یہ آخری کارنامہ اسقدر قابل نفرت ہے کہ کم از کم اس کے بعد تو کوئی مسلمان اسے حجاز کی حکومت کا اہل نہیں سمجھ سکتا۔ ذرا سوچنے کا مقام ہے کہ قنفذہ، لیث اور رابغ پر ابن سعود کے قبضہ کو آج کئی مہینہ کی مدت گذر چکی ہے اور اگر علی چاہتا، تو اب تک کئی مرتبہ ان پر حملہ کر چکا ہوتا، مگر اب سے پہلے اس نے کبھی ان کا محاصرہ کرنے یا ان پر گولہ باری کرنے کی کوشش نہیں کی۔ خصوصیت کے ساتھ قنفذہ کی جانب سے، تو افواج نجد کو برابر رسد بھی پہنچ رہی تھی اور کئی مرتبہ خبر رساں ایجنسیاں دنیا میں اعلان کر چکی تھیں کہ نجدی کشتیاں سواحل حبش سے سامان خوراک لا رہی ہیں، مگر اس پر بھی اس نے کوئی خاص کارروائی نہیں کی پھر آخر کیا وجہ ہے کہ عین حج کے موقع پر اس کے جہاز حرکت میں آئے اور ٹھیک اس وقت جب حجاج کا پہلا جہاز ساحل حجاز سے نصف یوم کی مسافت پر پہنچ چکا تھا، اس نے بحری جنگ کا ارادہ کرکے خاص اسی بندرگاہ پر حملہ کر دیا جس کو حاجیوں کے اتارنے کے

لیے منتخب کیا گیا تھا؟ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ارادت مندان آل شرافت اس غیر مسلمانہ حرکت کی کیا توجیہ فرمائیں گے، مگر ایک صاحب عقل و خرد انسان، تو اس کا مطلب صرف یہی سمجھ سکتا ہے کہ علی نے مسلمانوں کو ادائے فریضہ حج سے باز رکھنے کی ناپاک کوشش کی ہے اور اس کی شقاوت نے اسے خدا کے راستہ میں بھی حائل ہونے سے باز نہیں رکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جدہ اور حجاز کے درمیان حالت جنگ قائم ہے اور جنگ کے زمانہ میں ایک فریق پر دوسرے فریق کا حملہ کوئی نئی بات نہیں، مگر یہ عذر علی کی بریت میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی جگہ کوئی غیر مسلم ہوتا، تو اسے معذور تسلیم کیا جا سکتا تھا، لیکن ایسی حالت میں جبکہ دونوں فریق مسلمان ہیں، اس قسم کی کوئی مجبوری قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اول تو حج کے موقع پر دونوں فریقوں کا فرض تھا کہ چند ماہ کے لیے جنگ ملتوی کر دیتے۔ دوسرے اگر جنگ جاری رکھنے کے لیے کوئی مجبوری تھی بھی، تو منطقہ جنگ کو حج کے راستے سے خارج کر دیتے مزید برآں علی کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ ابن سعود کو نقصان پہنچانے کے لیے رابغ کے بجائے قنفذہ اور لیث پر حملہ کر دیتا یا جس طرح پہلے بحری جنگ کی بجائے بری جنگ کا سلسلہ جاری تھا، اسی طرح اب بھی اسی کو جاری رکھتا۔ خاص حج کے موقع پر جنگی تدابیر میں تغیر پیدا کرنا اور اس قسم کا طرز عمل اختیار کرنا جس سے راہ خدا میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، کوئی مجبوری نہیں، بلکہ کھلی شقاوت ہے اور کوئی سچا مسلمان اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔

❑ حاجیوں کی حفاظت اور برطانیہ کی ذمہ داری

{ ۱۸ر ۱۴ر جون ۱۹۲۵ء }

یہ امر اب پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ امیر علی نے رابغ کا محاصرہ کر کے اس پر گولہ باری شروع کر دی ہے۔ ۹ر جون کو برطانوی دارالعوام میں مسٹر میک نیل نے جو تقریر کی ہے، اس میں اس خبر کی تصدیق موجود ہے اور اس کے متعلق دولت معظمہ برطانیہ کی پالیسی بھی بیان کر دی گئی ہے۔ مسٹر میک نیل فرماتے ہیں کہ! ”اس گولہ باری نے دوبارہ سلطنت کو اس امر پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس سال حج ملتوی کر دینے کا مشورہ

دے" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دولت برطانیہ اس معاملہ میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ "یہ مداخلت اس غیر جانبدارانہ پالیسی کے بالکل خلاف ہوگی، جو مذہبی معاملات میں اس نے ہمیشہ سے اختیار کر رکھی ہے"۔ رائیٹر کا بیان ہے کہ مسٹر میک نیل نے اپنی تقریر کے خاتمہ پر اس بات کا صاف صاف اعلان کر دیا کہ:۔

> "ہم نے اسلامی مقامات مقدسہ پر قبضہ کرنے کے جھگڑے میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور اگر ہم کبھی ایسا کریں گے بھی، تو وہ صرف ایسی ہی صورت میں جبکہ برطانوی مفاد کی حفاظت کے لیے اس کی ضرورت ہو"۔

یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ حکومت برطانیہ نہ صرف ہمارے مذہبی حقوق کی حفاظت کرنے سے انکار کرتی ہے، بلکہ ان اصولی ذمہ داریوں کو انجام دینے پر بھی تیار نہیں ہے جو ہندوستان کی حکمران قوت ہونے کے اعتبار سے بیرون ہند میں رعیت کے حقوق کی نگرانی کرنے کے متعلق اس پر عائد ہوتی ہیں۔ ابھی چند ہی روز کی بات ہے کہ حکومت ہند نے حاجیوں کی مشکلات کو کم کرنے اور انہیں حالت جنگ کے امکانی مصائب سے بچانے کے لیے ضروری کارروائی کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس کے علاوہ خود ملک معظم کی حکومت نے بھی امیر علی اور سلطان ابن سعود کو متنبہ کیا تھا کہ وہ حاجیوں کی حفاظت کریں، مگر اب جبکہ امتحان کا وقت آیا ہے، حکومت اپنی ذمہ داریوں کے انجام دینے سے پہلو تہی کر رہی ہے اور اپنی تنبیہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ اول تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر حکومت کی تنبیہ محض نمائشی نہ تھی، تو علی جیسا پشۂ بے حقیقت اس عظیم الشان سلطنت کے حکم سے کیونکر سرتابی کی جرأت کر سکتا تھا، جس کے وظیفوں پر اب تک اس کا اور اس کے باپ کا کاروبار چلتا رہا ہے۔ برطانیہ اسلحہ کی ترسیل روک کر علی کو حاجیوں کی حفاظت کا پابند کر سکتا ہے، لیکن اگر یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ نے سنجیدگی کے ساتھ اس کو تنبیہ کی تھی اور اس نے واقعی سرکشی سے کام لیا ہے، تو برطانیہ کی اس پالیسی کے معنی سمجھنے سے ہم قطعاً قاصر ہیں کہ وہ اپنی ۷ کروڑ اسلامی رعایا کے مذہبی حقوق کی حفاظت سے انکار کر رہی ہے، حالانکہ سمندر پر اس حفاظت کی ذمہ داری اس پر لازماً عائد ہوتی ہے اور وہ اپنے اعلانات میں خود بھی اس کو اپنے سر لے چکی ہے۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے چند ماہ قبل جب قاہرہ کے بازار میں برطانیہ کے اقتدار کو ایک معمولی سا صدمہ پہنچا تھا، تو سکندریہ کے سامنے بحر متوسط کا پورا جنگی بیڑہ جمع ہو گیا تھا اور ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر مصر کی آدھی پونی آزادی چھین لی گئی تھی، مگر آج جبکہ بحر احمر میں برطانیہ کی سات کروڑ اسلامی رعایا کے ایک عظیم ترین مذہبی حق کو دھمکی دی جا رہی ہے، برطانوی سلطنت پر سکوت مزار طاری ہے۔ اس کی قوتیں مفلوج ہو رہی ہیں اور ایک بے بس گلہ بان کی طرح وہ اپنی بھیڑوں سے کہہ رہی ہے کہ اگر "جدہ کا شیر" تمہیں آگے جانے نہیں دیتا، تو تم واپس آجاؤ۔ کیا اس کے صاف معنی یہ نہیں ہیں کہ جو قوت ہماری گاڑھی کمائیوں سے پیدا کی گئی ہے، اسے استعماری اغراض کے حصول اور شاہی مصالح کی حفاظت پر، تو صرف کیا جا سکتا ہے، مگر ہمارے حقوق کی نگرانی و محافظت پر صرف نہیں کیا جا سکتا؟

بہر حال ہم برطانیہ عظمیٰ کو صاف بتلا دینا چاہتے ہیں کہ اگر اس نے حجاج کو رابغ یا کسی اور بندرگاہ پر اتارنے کا انتظام نہیں کیا اور اگر حاجیوں کو پورٹ سوڈان سے ناکام و نامراد واپس آنا پڑا، تو اس سے مسلمانوں کے اندر سخت غیظ و غضب کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ ہر احرام بند حاجی حکومت کے اس تغافل اور ناروا طرز عمل کا زندہ مجسمہ ہوگا اور جہاں جہاں وہ جائے گا، اس کی مظلومیت اس کے ساتھ جائے گی اور تمام مسلمانوں کے نازک مذہبی جذبات میں اس کو دیکھ کر سخت ہیجان برپا ہوگا۔

* ترکی میں جمہوری استبداد

موجودہ ترکی جمہوریت نے عالم وجود میں آتے ہی جبر و استبداد کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے سامنے سلطان عبدالحمید خان کی استبدادیت بالکل ماند پڑ گئی ہے۔ اس قلیل مدت میں اس نے اپنے سیاسی مخالفین کے استیصال کے لیے جتنی زیادتیاں کی ہیں، ان کی مثال ہم کو عثمانی خاندان کی مطلق العنانی کے دور میں کہیں نہیں ملتی اور اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک حریت فکر و رائے اور شخصی آزادی کا تعلق ہے، ترکی کے لیے موجودہ جمہوریت گذشتہ شخصی حکومت سے بدرجہا زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ اب تک تو محض جمہوریت کے دفاع کو بہانہ بنا کر جبر و ستم کی مشق کی

جارہی تھی، مگر اب کمالی جماعت نے اپنے ارادوں کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور جماعت ترقی پرور کے خلاف اعلان جنگ کرکے اس نے اپنی اس طے شدہ پالیسی کا صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ وہ ترکی سے مذہبیت کا خاتمہ کرکے چھوڑے گی اور جو جماعت خواہ وہ ترکی کے کیسے ہی محسنوں کی جماعت ہو، مذہبیت کو باقی رکھنے کے لیے اس کی مخالفت کرے گی، اسے تلوار کے زور سے مٹا دیا جائے گا۔ عید بیرام کے موقع پر مصطفیٰ کمال پاشا کا پیغام جامعہ ترکیہ کی کانگرس میں عصمت پاشا کا اعلان اور حال میں ترقی پرور جماعت کے استیصال کے لیے وزارت کا فرمان، یہ سب کی سب چیزیں اس پوشیدہ حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ ترکی کی برسر اقتدار جماعت پر افرنجیت کا بھوت سوار ہو چکا ہے اور وہاں اب مغربی الحاد مذہب کو کھلا کھلا چیلنج دے رہا ہے۔ اگرچہ دنیائے اسلام کو دھوکہ دینے کے لیے عصمت پاشا کی وزارت اپنے اعلانات میں یہ پرانے جملے استعمال کر رہی ہے کہ ہم صرف انہی جماعتوں کا استیصال کرنا چاہتے ہیں جو مذہب کی آڑ میں سیاسی اغراض حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، مگر اب یہ حقیقت کوئی راز نہیں رہی ہے کہ دراصل ان کی جماعت مذہب کی سیاسی قوت کو فنا کرنا چاہتی ہے اور ان جماعتوں کو توڑ رہی ہے، جو خلافت کی حامی، مذہب کی محافظ اور ترکی کو لامذہبیت سے بچانے کی خواہاں ہیں۔

آج بیرون ترکی کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر خاموش کیا جا رہا ہے کہ ترکی کے معاملات کو خود ترک ہی بہتر سمجھتے ہیں، اس لیے بیرونی مسلمانوں کو ترکوں کے داخلی معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اب ترکی ایک عظیم خطرہ میں پھنسنے والا ہے اور اس کے ہر سچے بہی خواہ کا فرض ہے کہ ان مصلحتوں کو نظرانداز کرکے اسے نہایت صفائی کے ساتھ اس خطرہ سے متنبہ کر دے۔ اس وقت مصطفیٰ کمال پاشا کی جماعت اپنے اس اقتدار سے سخت ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے جو اسے یورپین استعمار کے کامیاب مقابلہ کی بدولت حاصل ہو گیا ہے۔ اس کا فرض تھا کہ اس اقتدار کو ترکوں کی اصلاح و ترقی کے راستے میں لگا دیتی اور ایسے اصول اختیار کرتی جس سے قوم میں تفرقہ پیدا ہونے کی بجائے ایک مقصد شریف کے لیے اتحاد پیدا ہو جاتا، لیکن اس نے اپنی اس قوت کو کام میں لا کر اپنے خاص سیاسی اصول بزور لاگو کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ

وہ اصول بھی ایسے ہیں جو ایک چھوٹی سی فرنگ پرست جماعت کے سوا پوری قوم کے عمیق دینی جذبات کے سخت مخالف ہیں۔ ترکی قوم کے بہترین دماغ اس کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک جماعت ”ترقی پرور“ کے نام سے قائم کی ہے جس میں رؤف بے، کاظم قرہ، بکر پاشا، علی فواد پاشا، نور الدین پاشا اور فوزی پاشا جیسے اکابر امت ترکیہ شامل ہیں اور وہ سب اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ کمالی جماعت کی اس انتہا پسندی کو حالت اعتدال پر لے ائیں، مگر یہ جماعت فوجی طاقت کے گھمنڈ پر ان کے خلاف سخت کارروائیاں کر رہی ہے اور تازہ اطلاعات کے مطابق اس نے محض اس جرم کی بنا پر ان کی پارٹی کو توڑ دیا ہے کہ ”وہ مذہب کی آڑ میں سیاسی اغراض حاصل کرنا چاہتے ہیں“۔ وہ جماعت جس کے خلاف یہ استبدادی حکم دیا گیا ہے ایسے با اثر مدبروں سے مرکب تھی جن کی مدد کے بغیر ترکی میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ترکی کی جنگ حریت میں بہترین خدمات انجام دی ہیں اور ترکی قوم کے اوپر اس کے احسانات مصطفیٰ کمال پاشا کی جماعت سے کسی طرح کم نہیں ہیں، بلکہ ایک حیثیت سے دیکھا جائے، تو رؤف بے اور ان کے حامیوں کی خدمات کے مقابلہ میں عصمت پاشا اور مصطفیٰ کمال پاشا کی خدمات حدیث العہد ہیں۔ یہ لوگ اب تک محض اس خیال سے خاموش رہے کہ یہ وقت آپس کے جھگڑوں کا نہیں، بلکہ متحدہ کوشش سے جدید ترکی کی تعمیر کا ہے، مگر اب ان کو کھلا چیلنج دے دیا گیا ہے اور ایسی صورت میں وہ اپنے پاک مقاصد کی مدافعت کے لیے جوابی حملہ کرنے پر مجبور ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کشمکش ترکی کے مستقبل کے لیے سخت خطرناک ہے۔ ترکی کو ابھی آزاد ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔ اس کے دشمن ابھی تک تاک لگائے بیٹھے ہیں اور عنقریب اسے اپنی بقائے حیات کے لیے ایک اور جنگ میں شریک ہونا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی دو طاقتور جماعتوں کا باہم گتھ جانا، ترکی قوم کے لیے حد درجہ مضرت رساں ہے اور بعض اوقات یہ اندیشہ بہت قوی ہو جاتا ہے کہ اس کی بدولت ترکی قوم کہیں دوبارہ اپنے دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار نہ ہو جائے۔

☐ دہلی کا امن

{ ۲۲ر جون ۱۹۲۵ء }

سمجھ میں نہیں آتا کہ فساد میں ایسی کونسی جاذبیت ہے کہ ایک جماعت اس کے لیے ان تھک کوششیں کر رہی ہے اور کسی موقع کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی۔ انسان کی تمدنی زندگی بلکہ صحیح معنوں میں انسانی زندگی کے لیے فساد ایک ایسی بدترین لعنت ہے کہ اسے تمام لعنتوں کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہمسایہ دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ ایک انسان دوسرے کو درندوں کی طرح پھاڑ کھانے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کی تمام ملکوتی صفات بہیمیت سے مغلوب ہو جاتی ہیں اور تمام وہ ہمسائیگی کے تعلقات، شہریت کے روابط اور ہمدردی و محبت کے جذبات یکسر فنا ہو جاتے ہیں، جو تمدنی زندگی کی جان اور امن و رفاہیت کی بنیاد ہوتے ہیں، اس سے زیادہ ایک انسانی آبادی کے لیے کون سی شدید مصیبت ہو سکتی ہے، مگر افسوس ہے کہ ایک خود غرض جماعت ان تمام باتوں کو اچھی طرح جانتے بوجھتے بھی اس کی تمنا کرتی ہے، اس کے اسباب مہیا کرتی ہے اور اپنی ساری کوششیں ایسے جذبات کی اشاعت میں صرف کرتی ہے۔ جن سے مختلف العقیدہ قوموں میں صلح و آشتی کے ساتھ مل جل کر رہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ گذشتہ ایک سال کی مدت میں اس جماعت کی انہی کوششوں کی بدولت دہلی کا امن دو مرتبہ آتش فساد کی نذر ہو چکا ہے اور اس کی بدولت شہر پر جو کچھ مصائب نازل ہوئے ہیں، ان سے بچہ بچہ واقف ہے۔ کئی بے گناہوں کی جانیں گئیں، بیسیوں بلکہ سینکڑوں آدمی زخمی ہوئے۔ کاروبار بالکل سرد پڑ گئے۔ پشت ہا پشت کے دوستانہ تعلقات جو ایک قدیم تہذیب کے گہوارہ میں رہتے رہتے دونوں قوموں کے درمیان استوار ہو گئے تھے، بغض و عناد سے بدل گئے، دونوں قومیں ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے لگیں، ہمسایہ کو ہمسایہ پر اعتماد نہ رہا اور مدتوں یہ حالت رہی کہ کوئی شخص شہر کی گلیوں اور بازاروں میں اپنے آپ کو محفوظ خیال نہیں کرتا تھا۔ یہ سب کچھ اس بدنصیب شہر پر گزرا، مگر ابھی تک فساد پسندوں کی پیاس بجھ نہیں سکی اور ہم دیکھتے ہیں کہ بقرعید کی آمد آمد پر پھر فساد کا ڈھنڈورا پٹنا شروع ہو گیا ہے۔

فساد کی اصلی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پہاڑی دھیرج کے راستہ سے گائے لے جانے کی اجازت دے دی ہے اور اس سے ہندوؤں کے نہایت نازک مذہبی جذبات کو سخت صدمہ پہنچا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ فساد کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایک جماعت کا اپنے مذہبی اعمال کو انجام دینا فساد کے لئے محرک نہیں ہوتا، بلکہ دراصل دوسری جماعت کے مذہبی جذبات کا حد سے زیادہ نازک بن جانا اس کے لئے محرک ہوا کرتا ہے اور ہمسایہ اور مختلف العقیدہ قومیں صلح و آشتی کے ساتھ صرف اسی صورت میں رہ سکتی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری، تحمل اور فراخ حوصلگی کا سلوک کریں۔ دونوں اپنے اپنے فرائض و عبادات کو اس طرح انجام دیں کہ نہ ان سے دوسروں کو تکلیف ہو اور نہ دوسرا ان سے تکلیف محسوس کرے اور دونوں میں اتنی سیر چشمی ہو کہ اگر ایک کا کوئی مذہبی عمل دوسرے کے مذہب کے خلاف بھی ہو، تو وہ اسے صبر کے ساتھ برداشت کر لے۔ جذبات کی نزاکت اور ذرا ذرا سی بات پر ان میں ٹھیس لگ جانے کی عادت کو لے کر دو قومیں تو درکنار، دو آدمی ایک گھر میں نہیں رہ سکتے اور ان میں فساد ہو جانا یقینی ہے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ عادت رہے گی کہ اپنے مذہبی اور قومی جذبات کو دوسروں پر جبراً مسلط کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنے مذہب کا دوسروں سے زبردستی احترام کرانا چاہیں گے۔ تو یقیناً فساد کا منبع ہمیشہ جاری رہے گا اور خواہ ایک نہیں ہزار پہاڑی دھیرج کے راستے کھول لے یا بند کر دیے جائیں، اس بہتے ہوئے منبع آتش کو کوئی چیز بند نہیں کر سکے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ ہندو کچھ ایسے جذبات اپنے دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے ہیں، جنہیں دنیا کا کوئی سچا مذہب ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی تعلیمات میں جگہ نہیں دے سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر مذہب نے اپنے شعائر کے احترام و تقدیس کا حکم دیا ہے، لیکن کسی مذہب کی یہ تعلیم نہیں ہے کہ ان کا دوسروں سے بھی احترام کرایا جائے اور اگر دوسرے ایسے نہ کریں تو ان کے سر توڑ دیے جائیں۔

اسلام نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے ان کی حرمت صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہے غیر مسلم انہیں حرام سمجھنے پر مجبور نہیں ہیں اور کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے

مذاہب کے پیروؤں پر جبراً اپنے مذہب کے احکام تحریم کو نافذ کرائے۔ اسی طرح ہندو مذہب کے نزدیک بھی جو افعال ناجائز ہیں، وہ صرف ہندوؤں ہی کے لئے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے پیروان کے ارتکاب سے باز رہنے پر مجبور نہیں ہیں اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ہندو مذہب نے اپنے پیروؤں کو قطعاً یہ حکم نہیں دیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ان سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ ہر مذہب کا یہ بنیادی اصول ہے کہ اس کے احکام و اوامر صرف اسی کے پیروؤں پر نافذ ہوتے ہیں اور اس کے عقائد کا دائرہ اس کے اپنے ہی حلقہ اثر تک محدود ہوتا ہے۔ اگر لوگ اس بنیادی اصول پر سختی کے ساتھ قائم رہیں، تو ان کے اندر انتہائی مذہبی رسوخ ہونے کے باوجود کسی قسم کا مفسدانہ اشتعال پیدا نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ جتنے زیادہ مذہب کے پابند ہوں گے، اتنے ہی زیادہ پرامن اور صلح جو ہوں گے۔

پس وہ جذبات جنہیں مذہب کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل شیطانی وساوس ہیں جنہیں انسان کی جبلی بہیمیت نے اپنے اندر خود بخود راسخ کرلیا ہے۔ انہیں کسی مذہب کی تائید حاصل ہونا، تو درکنار، مذاہب کی بعثت کا بنیادی مقصد انہیں دلوں سے نکالنا اور قطعاً محو کردینا ہے۔ آج ہندوستان کا امن مذہب کا نام لے لے کر غارت کیا جا رہا ہے اور مذہب کے چند جھوٹے علمبرداروں نے ملک کے جاہل عوام میں ایسی سپرٹ پیدا کردی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا بالکل بھول گئے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارا ملک اس وقت صحیح مذہبی روح سے بالکل خالی ہے اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، سب محض اس لئے ہو رہا ہے کہ ایک جماعت نے شہرت و اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہر اس چیز کی تائید کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، جس سے جہلائے کے وحشیانہ جذبات مطمئن ہو سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی بدولت ملک کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ عوام میں تحمل اور رواداری کا مادہ بالکل باقی نہیں رہا۔ ایک قوم کے ہاں کوئی خوشی کا تہوار آتا ہے، تو دوسری قوم اس کے مقابلے پر صف ماتم بچھانے کی تیاری کردیتی ہے۔ ایک جماعت اپنے فرائض و عبادات انجام دینے کی کوشش کرتی ہے، تو دوسری جماعت اس کے راستہ میں مزاحم ہونے کے لئے مستعد ہوجاتی ہے۔ فرائض اور حقوق کا توازن یکسر مفقود ہوگیا ہے۔ جذبات اور حسیات میں کسی قسم کا اعتدال نہیں رہا۔ بات بات پر تصادم ہوجاتا ہے اور حسیات آپس

میں ٹکرا جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں فساد کے لئے کسی خاص سبب کی حاجت نہیں ہے۔ ہر بات سے فساد ہوسکتا ہے اور کسی خاص سبب کو دور کردینے سے اس کا رک جانا قطعاً محال ہے۔ یہ دراصل راستوں کا تعین یا گائے اور قربانی کا سوال نہیں ہے، بلکہ دلوں کے کھوٹ کا سوال ہے۔ راستوں کے کھولنے اور بند کرنے سے اس میں کوئی خاص تغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر دلوں میں فساد کا مادہ بھرا ہوا ہے، تو وہ ضرور پھوٹ کر بہے گا، خواہ ایک راستہ نہیں ہزار راستے بند کردیئے جائیں۔

* شریفانہ مفاہمت

اشاعت گزشتہ میں ہم آئندہ بقرعید کے امکانات فساد پر بحث کرتے ہوئے اس امر کو واضح کرچکے ہیں کہ راستہ، آرتی یا اذان کے قضیئے ہندوؤں اور مسلماونوں کی باہمی کشیدگی کے کوئی بنیادی و جوہری اسباب نہیں ہیں، بلکہ طبیعتوں کی منافرت اور دلوں کے کھوٹ نے ان کو محض اپنا بخار نکالنے کے لئے بہانہ بنالیا ہے، ورنہ یہ جھگڑے اس قدر بے حقیقت اور اتنے معمولی ہیں کہ اگر دونوں قومیں تھوڑی دیر کے لئے تمام تعصبات سے پاک ہوکر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں، تو انہیں خود شرم آنے لگے کہ کیوں انہوں نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکر اپنے مستقبل کو خراب کرلیا۔ دہلی میں جس چیز پر متاع امن وامان کے لٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے، وہ صرف اتنی سی بات ہے کہ مسلمان ایک راستہ سے گائے لے جانا چاہتے ہیں اور ہندو اسے پسند نہیں کرتے۔ اگر دیکھا جائے، تو یہ ایک نہایت معمولی سی بات ہے۔ کسی راستہ کے استعمال کرنے یا نہ کرنے میں ایسی کوئی اہمیت نہیں کہ دو بڑی قومیں جو صدیوں سے ایک جگہ رہتی چلی آئی ہیں، اس پر بچوں کی طرح لڑیں اور دنیا بھر میں اپنے آپ کو ذلیل کرلیں، مگر صرف ایک ضد ہے جس نے اسے اتنا بڑا سوال بنادیا ہے، یہ ضد دلوں سے نکل جائے اور دونوں قوموں کے افراد ذرا فراخ دلی سے کام لیں، تو ایک لمحہ کے اندر یہ قضیہ ختم ہوسکتا ہے۔ جہاں تک حق کا سوال ہے، ہندو اپنے پاس اس امر کے دلائل رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس راستے سے گائے لے جانے کا کوئی حق نہیں ہے اور مسلمان اپنے پاس اس امر کے دلائل رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ (باستثنائے سال گزشتہ) ادھر سے گائے لے گئے ہیں اور اس لئے انہیں اب

بھی لے جانے کا حق حاصل ہے۔ اگر دل صاف ہوتے، تو یہ حق کی بحث نہایت شریفانہ طریقہ سے جاری رہ سکتی تھی۔ دونوں فریق اپنے اپنے دلائل و شواہد پیش کرتے، ایک غیر جانبدار پنچایت ان کو سنتی اور جب کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہو جاتا، تو دوسرا فریق ٹھنڈے دل سے اس کو قبول کر لیتا، لیکن دلوں کے بغض نے فیصلہ صرف قوت کے قاضی پر چھوڑ دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سال بھی شہر کا امن و مان غارت ہوا اور اس سال بھی اس کا اندیشہ ہے۔

ہمارے نزدیک اس قسم کے قضیوں کا بہترین حل محبت اور دوستی کے اندر پنہاں ہے۔ جو کام جبر و زور سے نہیں نکل سکتا، اسے محبت بڑی آسانی کے ساتھ نکال لیتی ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ ضد ہمیشہ ضد کو پیدا کرتی ہے اور جبر کے مقابلہ میں صرف جبر ہی پیش کیا جاتا ہے۔ جس طرح جو کے دانہ سے گیہوں کا پیدا ہونا محال ہے، اسی طرح ضد سے تسلیم و تنازل کا پیدا ہونا بھی قطعاً محال ہے۔ پس جب تک ہندوؤں کی طرف سے روکنے پر اصرار رہے گا مسلمانوں کی طرف سے بھی جانے پر اصرار رہے گا، مگر جب ہندو اس اصرار کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کی محبت سے اپیل کریں گے، تو پھر مسلمانوں کا یہ فرض ہو جائے گا کہ اپنے بھائیوں کے جذبات کا لحاظ کر کے اس راستہ کو چھوڑ دیں، بلکہ ہم، تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ اگر ایسی صورت میں بھی مسلمان اپنے اس حق سے دست بردار نہ ہوں، تو وہ حد درجہ قابل ملامت ہوں گے اور یقیناً کوئی شخص ان کی تعریف نہ کرے گا۔ یہ صرف خیالی اور وہمی بات نہیں ہے بلکہ اسی شہر میں اور تمام ہندوستان میں بارہا اس محبت کے ہتھیار کو استعمال کیا جا چکا ہے اور شاید ملک کا بچہ بچہ گواہی دے گا کہ ہمیشہ یہ ہتھیار کارگر ثابت ہوا ہے۔ دہلی میں ہندو مسلم اتحاد ہونے سے پہلے ہر سال بقرعید پر ڈہائی سو تین سو گائیوں کی قربانی ہوتی تھی۔ ۱۹۱۹ء کے بعد جب اتحاد و محبت کا دور آیا، تو یہ تعداد گھٹ کر صرف ۲۸ رہ گئی اور پھر جب تعلقات میں ضد اور دشمنی کے عناصر شامل ہو گئے، تو نوبت ساڑھے تین سو اور چار سو تک پہنچ گئی۔ اسی طرح تمام اقطاع ہند میں اس امر کا تجربہ کیا جا چکا ہے کہ جب کبھی ہٹ اور ضد سے کام لیا گیا، تو فساد رونما ہوا جب محبت کا ہتھیار استعمال کیا گیا، تو گردنیں خود بخود اس کے آگے جھک گئیں۔ دلوں نے خود بخود اس سے گھائل ہونے کی لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور وہ فتنے جن کے خود

طے ہونے کی کوئی آس باقی نہ رہی تھی، آناً فاناً میں از خود طے ہو گئے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اب مدتوں کے کھچاؤ کے بعد دہلی میں دوبارہ یہی محبت کا جھکاؤ پیدا ہونے والا ہے۔ شہر کی ایک مقتدر اور سنجیدہ جماعت حقائق کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس گم شدہ حقیقت کو پا گئی ہے کہ ضد کا نتیجہ نہ صرف بدامنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نہ صرف اس سے شدید ذلتیں اور زبردست نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں، بلکہ وہ مقصد بھی کبھی حاصل نہیں ہوتا، جس کے لئے ضد کی جاتی ہے۔ پس اب وہ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ہندوؤں کو راستہ روکنے کے تمام ارادوں سے باز آجانا چاہیے اور اس معاملہ کو صرف مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کے جذبات کا پاس کریں یا نہ کریں۔ چنانچہ حال ہی میں دہلی ہندو سبھا نے مسلمانان شہر سے یہ اپیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے لطیف مذہبی جذبات کا لحاظ کرکے پہاڑی دھیرج کا راستہ گائے لے جانے کے لئے استعمال نہ کریں۔ ہم اپنے اس خیال کا بار بار اعادہ کر چکے ہیں کہ راستہ کا سوال ہر سنجیدہ انسان کے نزدیک نہایت حقیر سوال ہے اور ہماری دلی خواہش یہ تھی کہ اگر برادران ہنود کی طرف سے راستہ روکنے پر اصرار نہ بھی کیا جائے، تب بھی مسلمانوں کو راستہ چھوڑ کر اپنی شرافت، امن پسندی، اور اخلاقی جرات کا ثبوت دینا چاہئے، مگر اس اصول کے مطابق کہ ضد ہمیشہ ضد پیدا کرتی ہے، ہمیں اور تقریباً تمام ذمہ دار مسلمانوں کو اس بات کی بالکل توقع نہ تھی کہ ہندوؤں کی جانب سے جبر اور ضد باقی رہنے کی صورت میں مسلمان عوام ہمارے مخلصانہ مشوروں کو قبول کریں گے، لیکن اب ہندو سبھا نے ہمارا کام ہلکا کر دیا ہے۔ اس نے اپنی امن پسندی کا حق ادا کر دیا ہے، وہ دوستی کا ہاتھ لے کر آگے بڑھ آئی ہے اور اب یہ مسلمانوں کا کام باقی رہ گیا ہے کہ وہ اپنی اس شرافت کا ثبوت دیں جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو دنیا کی تمام قوموں سے فائق سمجھتے ہیں۔

ہمیں علم ہے کہ اس معاملہ میں عام مسلمانوں کے جذبات کیا ہیں؟ ہم خوب جانتے ہیں کہ پچھلے سال کے واقعات کا اثر ان کے دلوں پر بڑی حد تک باقی ہے وہ اس معاملہ کو اپنی قومی عزت کا معاملہ سمجھنے لگے ہیں۔ عوام کے دلوں میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ جو حق پچھلے سال ان سے چھیننے کی کوشش کی گئی تھی، اسے اب استعمال کرنے کا وقت ہے اور

اب کے اسے ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ ان کے اندر بھی ضد کا مادہ اسی طرح جاگزیں ہے جس طرح ہندو قوم کے جہلاء میں جما ہوا ہے، لیکن ہم اپنے عزیز بھائیوں سے عرض کریں گے کہ تم نفاق اور اتحاد دونوں کا مزا چکھ چکے ہو۔ تم نے تین چار سال تک وہ دور بھی دیکھ لیا، جب ہندو اور مسلمان شیروشکر تھے، ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے اور اس اتحاد و محبت کی بدولت نہ صرف شہر میں امن و رفاہیت کا دور دورہ تھا، بلکہ تم نے اغیار کے دلوں میں بھی اپنی عزت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور وہ تمہاری متحدہ قوت سے خوفزدہ ہوگئے تھے پھر اس کے بعد تم نے وہ زمانہ بھی دیکھ لیا جب سینکڑوں برس کے برادرانہ تعلقات خراب ہوگئے۔ دلوں میں نفرت اور عداوت کے جذبات بھڑکنے لگے۔ ایک کو دوسرے پر اعتماد نہ رہا۔ رات دن کے میل جول، لین دین اور کاروبار میں ایک دوسرے کی کاٹ اور مزاحمت کرنے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ شہر کا امن، جس سے دونوں کے مفاد وابستہ تھے، دو مرتبہ غارت ہوا اور اس سے دونوں کو مالی، جسمانی اور اخلاقی نقصان برداشت کرنے پڑے۔ پس اب چونکہ تم دونوں حالتوں کا اچھی طرح مشاہدہ کرچکے ہو، اس لیے تمہیں ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ آیا تمہارے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضد کرکے لڑنا زیادہ مفید ہے یا آپس میں ایک دوسرے سے مراعات کرکے اتحاد و محبت کے ساتھ رہنا۔ یہ ظاہر ہے کہ اسی شہر میں تم کو بھی رہنا ہے اور ہندوؤں کو بھی، نہ تم ہندوؤں کو یہاں سے نکال سکتے ہو، نہ ہندو تم کو۔ لڑکر رہو یا مل کر۔ بہرحال تم سب کو یہیں رہنا اور یہیں مرنا ہے پھر اگر دلوں میں نفرت رکھ کر اور آپس میں لڑبھڑ کر رہو گے، تو ہمیشہ خود بھی تکلیفیں اور نقصان اٹھاؤ گے اور دوسروں کو بھی تکلیفیں اور نقصان پہنچاؤ گے، لیکن اگر عفوودرگزر اور چشم پوشی کے ساتھ کام لے کر اور ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا لحاظ کرکے اتحاد و محبت کے ساتھ رہو گے تو ہمیشہ خوش رہو گے تمہاری اور سارے شہر کی اس میں بھلائی ہے اور اس بادشاہی شہر کو ہندوستان میں جو عزت حاصل ہے اس کے قائم رہنے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ یہ کسی مذہبی فریضہ کا سوال ہوتا یا مسلمانوں کے کسی حق کا سوال ہوتا، تو ہم ایک لمحہ کے لئے اس سے دست برداری کا مشورہ نہیں دے سکتے تھے، بلکہ ہمارے بھائی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی حقوق کی مدافعت کرنا ہمارا اولین فرض

ہے اور ہم نے ہمیشہ اپنی پوری قوت ان کی حفاظت میں صرف کردی ہے۔ کسی مقصد کے لئے، خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ ہو، اپنے مذہبی یا قومی حق سے دست بردار ہو جانا ہمارے مسلک کے بالکل خلاف ہے، لیکن یہاں تو دست برداری کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں تو صرف یہ سوال ہے کہ جب برادران ہنود تمہارے حق سے کوئی تعرض کئے بغیر تم سے ایک برادرانہ درخواست کر رہے ہیں کہ ہمارے مذہبی جذبات کا پاس کرکے پہاڑی دھیرج کے راستہ کو گائے لے جانے کے لئے استعمال نہ کرو، تو کیا تمہارا اخلاق یہ گوارا کرتا ہے کہ اس التماس کے مقابلہ میں بھی وہی خشونت پیش کرو جو صرف خشونت ہی کے مقابلہ میں صرف کی جاسکتی ہے، جب تک ہندوؤں کی طرف سے ضد اور سختی تھی اس وقت تک تم بھی بشریت کے تقاضے سے ضد کرنے پر مجبور تھے اور اس کے لئے تمہیں کم از کم کوئی الزام نہیں دیا جاسکتا تھا، مگر اب جبکہ وہ ضد چھوڑ رہے ہیں، تو تمہیں بھی فراخ حوصلگی سے کام لے کر پچھلے واقعات کو فراموش کردینا چاہیے اور اپنے حق پر قائم رہتے ہوئے ان کی درخواست قبول کرلینی چاہئے۔ تمہاری قومی شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ جب تمہاری قوت کے بجائے تمہاری انسانیت اور محبت ہی سے اپیل کی جائے تو اس کا جواب قوت سے نہیں بلکہ انسانیت اور محبت سے دیا جائے۔ بصورت دیگر دنیا میں یقیناً ہندوؤں کی تعریف کی جائے گی اور تمہاری عزت کو بٹہ لگ جائے گا۔

* مفاہمت کی شرائط

یہ ہمارے دلی جذبات تھے جنہیں ہم نے نہایت خلوص اور صداقت کے ساتھ مسلمانان دہلی کے سامنے پیش کردیا ہے۔ اب ہم مفاہمت کے متعلق بھی اپنے خیالات صفائی کے ساتھ بیان کردینا چاہتے ہیں تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے زعماء واعیان ان پر غور کرکے کسی معقول سمجھوتہ تک پہنچنے میں مدد لے سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندو سبھا کے ریزولیوشن نے مفاہمت کے راستہ سے ایک بڑی روک ہٹادی ہے اور اب ہم اس کے بہت قریب آگئے ہیں، لیکن اس روک کا ہٹ جانا نفس مفاہمت کا ہم معنی نہیں ہے۔ دراصل ضرورت اس امر کی ہے کہ اب جلد سے جلد دونوں قوموں کے بااثر اور ذمہ دار لیڈر اپنی اپنی قوم کی عام رائے سے استصواب

کرنے کے بعد اس معاملہ کے متعلق تمام مابہ النزاع مسائل طے کرلیں اور دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسی صاف اور واضح مفاہمت ہوجائے کہ بعد میں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہ رہے اور آج کی ہماری کوششیں صرف اسی سال کے لئے نہیں بلکہ مدت مدید کے لئے کار آمد بن سکیں۔ اگر اس وقت ہم نے محض الجھنوں سے بچنے کی خاطر جزئیات و تفصیلات کو ابہام میں رکھنے کی کوشش کی اور صرف جذبات سے اپیل کرکے کام نکالنا چاہا' تو شاید اس سال کے لئے' تو صلح و صفائی ہوجائے' لیکن ہمیشہ کے لئے نزاع کا سرچشمہ بند نہ ہوگا اور ہر دفعہ ہمیں اسی خطرہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ اس وقت ایک مصالحانہ فضا پیدا کرکے تمام جزئی و فروعی مسائل طے کرلئے جائیں۔

اس باب میں اختصار کے ساتھ ہماری رائے یہ ہے کہ برادران ہنود اس بحث کو بالکل ختم کردیں کہ پہاڑی دھیرج کے راستہ سے گائے لے جانا مسلمانوں کا حق ہے یا نہیں۔ اگر بالفرض محال ان کا حق نہ بھی ہو' تو وہ اسے تسلیم کرکے وعدہ کرلیں کہ ہم کبھی مسلمانوں کے اس حق کو جبراً یا قانوناً سلب کرنے کی کوشش نہ کریں گے اور اس کے بعد مسلمان یہ عہد کرلیں کہ ہم ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا لحاظ کرکے اپنے اس حق کو اس وقت تک کبھی استعمال نہ کریں گے' جب تک برادران ہنود اپنے عہد پر قائم رہیں گے۔ اس صورت میں تسلیم و تنازل کی تمام شرطیں پوری ہوجائیں گی یعنی مسلمانوں کی یہ ہٹ بھی پوری ہوجائے گی کہ اس سڑک پر ان کا حق تسلیم کیا جائے اور ہندوؤں کی یہ خواہش بھی پوری ہوجائے گی کہ یہ راستہ گائے لے جانے کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ ہمارے نزدیک سمجھوتہ کی اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی اور ہم امید کرتے ہیں کہ دونوں جماعتوں کے ذمہ دار اصحاب اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔

* ایک مفید تجویز

اس کے ساتھ ہی ہم ایک اور تجویز بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک راستہ کے جھگڑے کو بڑی حد تک مٹا دے سکتی ہے۔ قبل ازیں قربانی کے موقع پر شہر کی تمام گائیوں کو ایک مذبحہ پر لے جاکر ذبح کرنے کی رسم دہلی میں نہیں تھی۔ اور اب بھی ہندوستان کے اکثر و بیشتر شہروں میں نہیں ہیں۔ اس شرط سے نہ صرف یہ کہ لوگوں کو مسلخ

لے جاکر ذبح کرانے اور پھر وہاں سے گوشت اٹھوا کر لانے میں دقت ہوتی ہے، بلکہ منظر عام پر گائے اور اس کے گوشت کو تین تین مرتبہ لانے سے برادران ہنود کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے اور اس سے اسباب نزاع کو مزید ترقی ہوتی ہے۔ پس اگر اس شرط کو ہٹادیا جائے، تو یہ مستقل منبع فساد آسانی سے بند ہو سکتا ہے۔ رہا حفظان صحت کا سوال، تو اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ بجائے گھروں پر الگ الگ ذبح کرنے کے ہر اسلامی محلہ میں ایک خاص جگہ مقرر کردی جائے جہاں گایوں کی قربانی کرنے والے لوگ اپنی اپنی گائیں لے جاکر ذبح کرالیا کریں۔ اس سے علاوہ متعدد آسانیوں کے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں کے جذبات کو صدمہ پہنچنے کا کوئی امکان نہ رہے گا اور اسلامی محلوں میں نہایت خاموشی کے ساتھ قربانی ہوجایا کرے گی۔

* ایک عجیب غلط فہمی

ہمارے پاس اودھ اخبار کا ایک پرچہ خاص طور پر بھیجا گیا ہے، جس میں مسٹر مشیر حسین قدوائی نے حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ حاجیوں کا راستہ کھلوانے کے لیے دولت برطانیہ سے حجاز میں مداخلت کی درخواست کر رہے ہیں اور اس پر سخت اظہار افسوس کرتے ہوئے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں، تو کچھ عجب نہیں کہ ایک روز قیام امن کے لیے برطانیہ سے پورے حجاز پر قبضہ کرلینے کی درخواست کی جائے گی۔ ان الزامات کی بنیاد غالباً وہ برقی پیغامات ہیں جو حجاج کی حفاظت کے متعلق ہر دو بزرگوں نے وائسرائے کو بھیجے تھے اور اگر یہ صحیح ہے، تو ہم مسٹر قدوائی کی اس سخن فہمی پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے عزیز دوست نے ان پیغامات کو پوری طرح پڑھنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں فرمائی اور محض سنی سنائی باتوں پر مغلوب الغضب ہو کر ایک مراسلہ لکھ دیا ہے، ورنہ شاید انہیں اس طرح کا مکتوب سپرد قلم کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ان کے اعتراضات کا بہترین جواب، تو مولانا کفایت اللہ صاحب کے اس مضمون میں موجود ہے جو "**الجمعیتہ**" کی گذشتہ اشاعت میں "بندرگاہ رابغ اور برطانیہ کا جنگی جہاز" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، لیکن ہم خاص اس برقی پیغام کے متعلق اپنے سخن فہم دوست سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کے کس لفظ سے انہوں نے

مداخلت کے مطالبہ کا مفہوم نکالا ہے۔ اس میں تو وائسرائے سے صرف اس امر کی درخواست کی گئی ہے کہ وہ سمندر پر حاجیوں کی حفاظت کی ان ذمہ داریوں کو ادا کریں' جو لازماً ان کی حکومت پر عائد ہوتی ہیں اور ہر عقلمند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی مطالبہ نہیں اور نہ کسی حیثیت سے مداخلت کے مطالبہ کا ہم معنی ہو سکتا ہے۔ آج سے نہیں' بلکہ جس روز سے مسلمانان ہند برطانیہ حکومت کے ماتحت آئے ہیں' برطانیہ ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور وہ مجبور ہیں کہ جب تک برطانوی جھنڈے کے ماتحت رہیں' اس سے اپنی حفاظت کا مطالبہ کریں۔ اگر یہ واقعہ آج سے پندرہ سال پہلے ترکی حکومت کے زمانہ میں بھی پیش آتا اور کوئی قوت حج کے راستہ میں حاجیوں کو روکتی' تو ہم برطانوی جہاز پر بیٹھ کر ترکی حکومت یا کسی اور حکومت سے یہ درخواست نہیں کر سکتے تھے کہ ہمیں جدہ تک بحفاظت پہنچانے کا بندوبست کرے' بلکہ قدرتی طور پر ہمیں برطانیہ ہی سے اس کی درخواست کرنی چاہیے تھی اسی بحری حفاظت کی ضمانت پر اب تک حج کیا جاتا رہا ہے اور اس مرتبہ بھی اسی پر اس کا آغاز کیا گیا تھا۔ پس اگر راستہ میں حاجیوں کو روکنے کی کوشش کی گئی اور اس پر برطانیہ سے حفاظت کا مطالبہ کیا گیا' تو یقیناً کوئی نئی یا غلط بات نہیں کی گئی اور کسی طرح بھی اس کے یہ معنی نہیں لیے جا سکتے کہ اس سے برطانیہ کو معاملات حجاز میں مداخلت کا مشورہ دینا مقصود تھا یا اس کا مدعا یہ تھا کہ برطانوی فوجوں کی حمایت میں حج کیا جائے۔

ایک مسٹر قدوائی ہی نہیں بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس معاملہ میں ایک پوری جماعت حرمت حجاز کے بہانہ سے خدام خلافت کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور مولانا شوکت علی جیسے شخص پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ بلاد مقدس میں برطانوی مداخلت کا مطالبہ کر رہے ہیں' لیکن ان کے جواب میں ہم صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتے ہین کہ الحمد للہ! جمعیۃ العلماء اور جمعیت خلافت تو اب تک جزیرۃ العرب کی حرمت کے لیے مر مٹنے کے عہد پر قائم ہے' البتہ وہ لوگ اپنے ایمان کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لیں جو عرب اور دنیائے اسلام کی باگیں ایک ملت فروش کے ہاتھ میں دینے پر اب تک اصرار کر رہے ہیں۔

* موپلوں کی مظلومی

آخر کار حکومت ہند نے انڈمان میں موپلوں کی نو آبادی قائم کرنے کی تجویز پر عملدر آمد شروع کر دیا اور اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس سلسلے میں نو آباد کاروں کی پہلی قسط بھیج دی گئی ہے جس میں ۵۰۰ بچے اور عورتیں ہیں۔ ہم اس سے پہلے کئی مرتبہ اس حقیقت کا اعلان کر چکے ہیں کہ یہ ایک صریح ظلم ہے جو بد نصیب موپلا قوم پر کیا جا رہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ یہ کارروائی سوائے انتقام کے اور کچھ نہیں ہے۔ موپلہ قوم کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خواہش نہیں ہے کہ انڈمان کی مہلک آب و ہوا میں جا کر اپنے آپ کو تباہ کر لے، اس کے بعض افراد کو یہ خواہش ظاہر کرنے پر زبردستی آمادہ کیا گیا ہے اور در حقیقت حکومت کے سوا کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ موپلوں کو ان کے گھروں سے نکال کر کالے پانی بھیج دیا جائے۔ مارشل لا کی سختیوں اور فوجی تسلط کے ہولناک مظالم سے حکومت کا دل پوری طرح نہیں بھرا۔ اسے اس قوم کی بہادری اور مذہبی حرارت سے ایک مستقل خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اسے دور کرنے کے لیے وہ نہ صرف ہندوستان کو اس کے وجود سے پاک کرنا چاہتی ہے، بلکہ کالے پانی لے جا کر اس کی آیندہ نسلوں کو ہمیشہ کے لیے مٹا دینا چاہتی ہے۔ یہ پالیسی ایسی افسوسناک بلکہ قابل نفرت ہے کہ کوئی انسان جس میں ذرہ برابر بھی بنی نوع انسان کی ہمدردی کی حس موجود ہے۔ موپلوں کی اجتماعی نسل کشی کی تائید نہیں کر سکتا۔

* مسیحی خطرہ

کلکتہ میں مسیحی مشنریوں کی کانفرنس نے جو ریزولیشن پاس کئے ہیں وہ تمام مسلمانان ہند کو عموماً اور مسلمانان بنگال کو خصوصاً ایک عظیم خطرہ کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سالہا سال کے تجربات کے بعد مسیحی مبلغین نے اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں تثلیث کے پرچار کے لیے اگر کوئی صوبہ سب سے زیادہ موزوں ہے، تو وہ بنگال ہے اور اب انہوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس صوبہ کے مسلمانوں کی متاع دین و ایمان لوٹنے کے لیے خاص تدابیر کریں گے۔ اگر یہ فیصلہ کسی زندہ قوم میں بیٹھ کر کیا گیا ہوتا، تو غالباً اب تک پوری قوم کی قوم مدافعت کے لیے مستعد ہو جاتی اور

مرض کا حملہ ہونے سے پہلے دفاع کی تیاریاں مکمل کر لی جاتیں، مگر افسوس، مسلمانوں کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ عین ان کے گھر میں بیٹھ کر یہ طے کیا جاتا ہے کہ ان کے جہل سے فائدہ اٹھا کر ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا جائے گا اور وہ اس طرح بے خبر ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔

ہم مسلمانان ہند کو صاف طور پر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ مسیحی مبلغین ان کی طرح بے عمل اور منصوبہ باز نہیں ہیں کہ کہیں کامیابی کے مواقع دیکھ کر وقتی جوش میں ایک سکیم بنالیں اور دنیا کے سامنے لمبے چوڑے ارادے پیش کر کے بیٹھ رہیں۔ ان کی جماعتیں تو از سرتاپا عمل ہیں اور کوئی بات اس وقت تک منہ سے نکالتی ہی نہیں جب تک اس پر عمل کرنے کا پورا تہیہ نہیں کر لیتیں۔ پس اگر انہیں ہندوستان کے سب سے بڑے اسلامی صوبہ کو مسیحیت کی حلقہ بگوشی سے بچانا ہے، تو وہ اسلام کی حفاظت کے لیے مستعد ہو جائیں اور بنگال میں علوم دین کی اشاعت کا ایسا انتظام کریں کہ کوئی کلمہ گو اپنے مذہب کی ناواقفیت کے باعث عیسائی مشنریوں کے دام میں نہ پھنس سکے۔ ہمارا یہ خطاب خاص طور پر علمائے بنگال کی طرف ہے کیونکہ قرب کی وجہ سے دفاع کا فریضہ سب سے پہلے انہی پر عائد ہوتا ہے۔ اگر فرصت ہوئی، تو انشا اللہ کسی وقت ہم تدابیر دفاع کے موضوع پر بھی اظہار خیال کریں گے۔ فی الحال یہ احساس دلانا ہے۔ کہ کبھی خود ہم تبلیغ کے فریضہ کو ادا کیا کرتے تھے۔ اب ہم دفاع سے بھی غافل ہو چکے ہیں۔

* اٹلی اور افغانستان

افغانستان میں ایک اٹالین انجینئر مسٹر پپرنو کو پھانسی دیئے جانے کا واقعہ اب ایک مستقل سیاسی جھگڑے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے یورپ کی سلطنتوں نے یہ اصول مقرر کر لیا ہے کہ اپنے تابعین کے قتل کو بہانہ بنا کر کمزور حکومتوں سے ناجائز سیاسی مطالبات منوانے یا کم از کم ان کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ سرا جیوو، البانیہ اور قاہرہ کے سیاسی خون اسی اصول کے تختہ مشق بن چکے ہیں اور اب افغانستان کی باری ہے۔ یونان کو کارنو کے بحری مظاہرہ سے گھٹنوں کے بل گرا کر اٹلی کے کچھ ایسے حوصلے بڑھ گئے ہیں کہ وہ افغانستان سے پپرنو کے خون کا بدلہ لینے کی کوشش کر رہا ہے اور اس

نے اس حقیقت کو بھی نظرانداز کر دیا ہے کہ یہ شخص خونی تھا اور اسے ایک خون کے بدلے میں باقاعدہ مقدمہ چلانے کے بعد پھانسی دی گئی ہے۔ جب سے دولت افغانیہ نے اس کو ملازم رکھا تھا، اسی وقت سے اس کا رویہ نہایت بیہودہ تھا۔ وہ ہر شخص سے لڑتا تھا۔ اپنے افسروں اور عام لوگوں سے بد زبانی کرتا تھا۔ ماتحتوں پر دست درازی کر بیٹھتا تھا اور اب بات بات پر ریوالور نکال لیتا تھا۔ ایک معزز سرکاری افسر ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ چشم پوشی سے کام لیا گیا اور صرف فہمائش پر قناعت کی گئی، لیکن اس سے اس کے حوصلے اور بڑھ گئے اور ایک مرتبہ اس نے کابل کے ڈاک خانہ میں چند ٹیلیفون کے ملازموں اور پولیس کے سپاہیوں کو زدو کوب کیا۔ اس پر قومندانی میں شکایت کی گئی اور عدالت نے اس کو طلب کیا۔ اس نے حاضری سے انکار کر دیا اور اپنے گھر میں محبوس ہو کر پولیس کے سپاہیوں پر فائر کئے جن سے چند مجروح ہوئے اور ایک شہید ہو گیا۔ آخر مکان کا محاصرہ کر کے بزور اسے گرفتار کیا گیا اور عدلیہ قومندانی میں حکومت نے اپنے حق کا اور مقتول کے ورثاء نے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ شہادتوں کے بعد قتل ثابت ہو گیا اور عدالت نے حکومت اور ورثاء دونوں کا حق تسلیم کر کے قصاص کا حکم دے دیا۔ بعد میں پیرنو نے مقتول کے ورثاء کو خون بہا دے کر راضی کر لیا اور انہوں نے معاف بھی کر دیا، لیکن حکومت اپنے حق سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے ایک وفادار ملازم کے خون کا بدلہ لئے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق ۲۶ مئی کو اس نے پیرنو کی روح قبض کر لی۔

یہ ایک بالکل جائز اور قانونی کارروائی تھی۔ حکومت افغانستان کو پورا حق تھا کہ وہ اپنے ملک میں ہر غیر ملکی شخص کو اپنے ابنائے وطن کے خون کا احترام کرنے پر مجبور کرے۔ اگر اٹلی اور برطانیہ کو اپنے ملک کے ایک ایک فرد کی خاطر ملکوں کی آزادیاں چھیننے اور سلطنتوں کو ذلیل کرنے کا حق حاصل ہے، تو یقیناً افغانستان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ایک فرزند وطن کا خون چند پونڈوں یا چند ہزار روپوں کے عوض فروخت نہ کرے اور اس کے قاتل کو قتل کر کے تمام غیر ملکیوں کو اچھی طرح متنبہ کر دے کہ کسی افغانی کا خون طرابلسی اور غلام ہندوستانی کی طرح بے قیمت نہیں ہے۔ اٹلی کو اور ہر یورپین ملک کو افغانستان کا یہ جائز حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کا یہ مطالبہ کہ افغانستان

اسے سات ہزار پونڈ تاوان دے خون بہا واپس کرے اور اٹالین جھنڈے کو سلام کرے' از سر تا پا لغو' قطعاً ناقابل قبول اور ایک یورپین کی فطری ہٹ دھرمی کا آئینہ دار ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اٹلی کے قومی تعصب نے اس میں اتنی عقل باقی ہی نہیں چھوڑی ہے کہ وہ کسی قسم کے قانونی و اصولی ملحوظات پر دھیان دے سکے۔

تاہم یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر افغانستان نے اس کے مطالبات مسترد کر دیئے اور یقیناً وہ ایسا کرے گا' تو ایسی صورت میں وہ انہیں منوانے کی کیا صورت اختیار کر سکتا ہے۔ افغانستان پر جنگی قوت کے مظاہرہ سے دباؤ ڈالنے کا خیال' تو اس قدر مضحکہ انگیز ہے کہ شاید مسولینی بھی اس کا تصور نہیں کرے گا۔ وہ اگر کچھ کر سکتا ہے' تو صرف یہ کہ افغانستان سے سفارتی تعلقات منقطع کر لے' لیکن اس میں خود اسی کا نقصان ہے کیونکہ افغانوں کو' تو اس کے علاوہ اور بھی بہت سے یورپین ممالک ایسے مل جائیں گے' جہاں سے انجینئر اور ماہرین فن دستیاب ہو سکتے ہیں' لیکن اٹلی کو اپنے ماہرین اور سرمایہ دار کمپنیوں کے ذریعے قدرتی دولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے کسی اور افغانستان کا ملنا مشکل ہے۔

معلوم نہیں کہ افغانستان نے اٹلی کے ناجائز اور مضحکہ انگیز مطالبات کا کیا جواب دیا' لیکن ریوٹر کے تاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا ہے اور اس کی پہلی قسط یہ ہے کہ افغانستان کا جمع شدہ روپیہ اٹالین بینکوں سے ضبط کرلیا گیا اور افغانستان کو جو اسلحہ بھیجے جارہے تھے' وہ روک لئے گئے۔ اب غالباً اس کے بعد آخری مرحلہ یہ ہوگا کہ افغانی سفیر مقیم روما کو روانگی کا پاسپورٹ دے دیا جائے گا اور اٹالین سفیر مقیم کابل کو واپس بلا لیا جائیگا۔ یہ زیادہ سے زیادہ کارروائی ہے جو اٹلی افغانستان کے ساتھ کر سکتا ہے' مگر اس کے مقابلہ میں افغان کیا کریں گے۔ وہ یقیناً اپنے ہاں کے تمام اٹالین ملازموں کو نکال دیں گے۔ اٹالین کمپنیوں کو اگر کسی قسم کی مراعات ملی ہوئی ہوں گی' تو انہیں واپس لے لیں گے۔ اٹلی والوں کے لئے افغانستان میں سرمایہ لگانے اور وہاں کی قدرتی دولتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا اور آئندہ ترقی یافتہ افغانستان سے اٹلی کو کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

مسولینی پر اقتدار پسندی اور سخت گیری کا بھوت سوار ہے اور وہ یونان جیسی چھوٹی

ریاستوں کو دبا کر یہ سمجھنے لگا ہے کہ اب اسے ہر کمزور سلطنت کو دبا لینے کا پروانہ حاصل ہوگیا ہے، لیکن افغانستان کے معاملہ میں اسے بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ

نہ ہرجائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

* عرب میں تبلیغ مسیحیت

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ وہ اعلان شائع کیا جاتا ہے جو ایک مشہور مسیحی جماعت نے جزیرہ عرب میں تبلیغ مسیحیت کے لیے شائع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی جماعتیں عرب میں نصرانیت کی اشاعت کرنا چاہتی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ حج کے اجتماع پر ان کی نظریں لگی ہوئی ہیں، کیونکہ وہ تمام دنیائے اسلام میں کسی تحریک کو پھیلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ابھی مسلمانوں کو اتنا ہوش نہیں آیا کہ وہ حج کے موقع سے فائدہ اٹھائیں اور اگر ہوش آیا بھی، تو ان کے تنافس اور اغراض پرستی نے انہیں ایک مفید ترین اسلامی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیا، لیکن مسیحی مبلغین کی تیز نگاہوں نے اسے تاڑ لیا ہے ور اب وہ قوم اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے جس کے پاس اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے والی قوت عمل موجود ہے اور جو صرف باتیں ہی نہیں بناتی، بلکہ انہیں کرکے بھی دکھا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی مسیحی جماعت کے لیے جو لکھوکھا پونڈ سالانہ کی آمدنی رکھتی ہو، سو مبلغوں کا مہیا کرنا اور انہیں عرب بھیج دینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ مسلمان نہیں ہیں جن کے کاغذوں پر کسی اسکیم کا آنا عمل کی دنیا میں آنے کا کبھی مترادف نہیں ہوتا یہ تو وہ قوم ہے جو سوچنے کے ساتھ عمل بھی شروع کر دیتی ہے، اس لیے اگر ہم یہ سمجھیں کہ عنقریب اسلام کے مرکز اور گہوارہ میں کفر و بے دینی کا علم بلند ہونے والا ہے، تو یہ کوئی بے جا اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ دوسرے ارتداد کا خطرہ ہے جو تیرہ سو برسوں کے بعد عرب میں رونما ہو رہا ہے اس وقت حضور خاتم النبیین ﷺ کی پاک تعلیم کا تازہ تازہ اثر موجود تھا۔ آپ کے تربیت کردہ نفوس قدسی زندہ تھے جو اسلام کی شمع پر پروانوں کی طرح نثار ہونے والے تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس وقت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے اولوالعزم صحابی کے

ہاتھ میں اقتدار کی باگیں تھیں جنھوں نے اپنے جوش ایمانی اور اپنے عزم راسخ سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور اسے مٹا دیا، مگر افسوس کہ آج ان میں سے کوئی ایک چیز بھی عرب میں موجود نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیم اس حد تک سرد ہو چکی ہے کہ عام اہل بداوہ کو کلمہ پڑھنا اور نماز ادا کرنا تک نہیں آتا۔ صحابہ کی قدسی نفس جماعت کی جگہ اب عرب کی کارفرما طاقت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو صرف اپنے نفس کی پرورش کا سامان چاہتے ہیں، خواہ وہ انگریزوں کی غلامی سے حاصل ہو یا اٹلی کی خدمت سے یا ملوک و امراء کی خوشامد سے۔ رہا وہ عزم راسخ اور صادقانہ جذبہ خدمت دین جس سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فتنہ ارتداد کے استیصال کی جرأت حاصل ہوئی تھی۔ سو اس کا ایک شمہ بھی آج کے ملوک عرب میں نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ وہ اس سرزمین میں نور حق کی حفاظت کرے، جس کو ہمیشہ کے لیے کفر و بے دینی سے پاک کر دینے کی خدمت اس نے اپنے حبیبؐ کے سپرد کی تھی۔ ہم تمام تبلیغی جماعتوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس عظیم خطرہ کی طرف توجہ کریں اور گہوارہ اسلام کو اس سے بچانے کی فکر کریں۔ عرب کا ارتداد خاکم بدہن اسلام کے مٹنے کا ہم معنی ہے۔ اس کی روک تھام کرنا ہمارا سب سے پہلا فرض ہے۔

* ایران اور جمعیت اقوام

ایران نے جمعیت اقوام کی مجلس اسلحہ کا بائیکاٹ کرکے تمام دنیا کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ اب وہ اس ایران سے بالکل مختلف ہے جو اپنی آزادی اور خودداری کو روس و برطانیہ کے قدموں پر نثار کر چکا تھا۔ یورپ کے کفن چوروں کی انجمن نے اسے کمزور سمجھ کر برطانیہ کی استعماری خواہشات پر قربان کرنا چاہا تھا اور خلیج فارس کی جہاز رانی پر بے جا قیود عائد کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس نے صاف الفاظ میں ان کو متنبہ کر دیا ہے کہ وہ خود اپنے سمندر میں اپنے حقوق پر اس تعدی کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا اور اگر جمعیت اقوام اسی طرح طاقتور سلطنتوں کے مقاصد کمزور حکومتوں کے خرچ پر پورے کرانے کی کوشش کرے گی، تو اسے خود اس کے چھوڑ دینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوگا۔

ریوٹر نے اپنے تاروں میں اس قضیہ کی حقیقت چھپانے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کی پردہ پوشیوں کے باوجود یہ امر واقعہ آفتاب کی طرح روشن ہو چکا ہے کہ یہ جھگڑا ایران اور جمعیتہ اقوام کا نہیں ہے، بلکہ براہ راست برطانیہ اور ایران سے تعلق رکھتا ہے۔ برطانیہ کی یہ قدیم پالیسی رہی ہے کہ ہندوستان کے راستہ میں جتنے ملک اور سمندر واقع ہیں، وہ ان پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہاں کوئی قوت ابھرنے نہ پائے اور کسی موقع پر جزیرہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان مواصلات بحری منقطع نہ ہو سکیں۔ اس پالیسی کے ماتحت اس نے جبرالٹر سے لے کر ساحل ہند تک جگہ جگہ اپنے بحری استحکامات قائم کئے ہیں۔ بحرابیض کے دونوں دہانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ سویز کا راستہ کھلا رکھنے کے لیے مصر اور فلسطین پر تسلط قائم کر لیا ہے۔ بحراحمر کی حفاظت کے لیے حجاز اور یمن میں ریشہ دوانیاں کر رہا ہے۔ آبنائے باب المندب کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے دونوں کناروں پر استحکامات قائم کر لیے ہیں اور بحر ہند کے تحفظ کی خاطر جنوبی عرب کے سواحل اور خلیج فارس کے تمام ممالک (باستثنائے ایران) پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ ایران کا وجود جنگ سے پہلے تک تو اس کے نزدیک عدم کے برابر تھا، اس لیے اس سے کوئی اندیشہ نہ تھا، مگر اب جنگ کے بعد سے اس میں از سرنو جان آ رہی ہے اور وہ ایک زبردست طاقت بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ پس اب اس استعماری پالیسی کے ماتحت اس کے دبانے کی کوشش بھی شروع کر دی گئی ہے، جس کی پہلی قسط غالباً یہ تھی کہ خلیج فارس کے راستہ ایران میں اسلحہ و سامان جنگ کے داخلہ پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ اول اول تو ایران اس کی کنہ کو سمجھ نہیں سکا اور اس نے بحث و مباحثہ کے ذریعے اس قید کو دور کرانے کی کوشش کی، مگر جب سر پرسی کاکس نے صاف الفاظ میں جنرل حبیب اللہ خاں کو بتلا دیا کہ حکومت ہند ایران کو ان قیود سے مستثنیٰ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی، تو انہیں اصل حقیقت معلوم ہو گئی اور انہوں نے برطانیہ کے ملوکی اغراض کی بندگی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

کاش ان واقعات سے ہندوستان کی مدہوش فساد آبادی سبق حاصل کرے اور ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے کہ اسے غلام رکھنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کی جا رہی ہیں۔

* مولانا عبدالجبار خیری

کسی گزشتہ اشاعت میں ہم ان غلط بیانیوں کی تردید کر چکے ہیں، جو مولانا عبدالجبار خیری کے متعلق مولوی صدرالدین صاحب احمدی مبلغ نے اپنی ایک تقریر میں کی تھیں۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب موصوف نے "پیغام صلح" میں پھر ایک طویل بیان شائع کیا ہے اور اس میں اپنی صلح پسندی کا ثبوت پیش کرنے کے ساتھ ہی پھر ایسی چند باتیں کی ہیں جن سے ایک خاموش اور مخلص خادم اسلام کی پوزیشن عامۃ المسلمین کی نظروں میں خراب ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم اس بحث کو مناظرہ کی شکل نہیں دینا چاہتے، لیکن صداقت کا اظہار ہمارا فرض ہے اور خصوصیت کے ساتھ اسلام کے سچے خادموں کو گمراہ کن پروپیگنڈا کا شکار ہونے سے بچانا ہم اپنی ایک ضروری خدمت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ذیل میں چند سطور اس مسئلہ پر لکھی جاتی ہیں۔

مولوی صدرالدین صاحب نے جو کچھ واقعات لکھے ہیں انہیں ہم بحیثیت ایک عینی شاہد کے جھٹلانے کی کوشش نہیں کر سکتے، لیکن چونکہ وہ اس معاملہ میں ایک فریقانہ حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا ہمارے نزدیک ان کے بیانات پر یقین کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے پاس ایسے غیر جانبدار لوگوں کی شہادتیں موجود ہیں جو مولانا عبدالجبار اور مولوی صدرالدین دونوں حضرات سے کوئی وجہ اتحاد نہیں رکھتے اور ان کی بناپر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا موصوف پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں، وہ استخفاف کی رقیبانہ کوشش کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ان شہادتوں میں سے ایک معتبر ترین شہادت کو ہم بنظر اختصار یہاں درج کرتے ہیں۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۳ء کے بمبئی کرانیکل میں ایک جرمن ڈاکٹر شو ٹبس لکھتا ہے۔

> ".. تاہم ابھی جرمنی میں عام طور پر پوری طرح اسلام کی حقیقت کو روشن کرنے اور فاسد عقائد کو بدلنے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس مقصد کے لئے بہت سے اعلیٰ قابلیت رکھنے والے مسلمان یہاں مقیم ہیں۔ چنانچہ ان خادمان اسلام میں سے ایک نہایت ممتاز ہستی پروفیسر عبدالجبار خیری دہلوی کی ہے۔ وہ اسلام کی خاطر ایک جوشیلے اور مستعد جنگ آزما ہیں اور صحیح معنوں میں اسلام کے سچے خادم ہیں۔ وہ حقائق کو ان کے اصلی ناموں سے پکارتے

ہیں اور محض کورانہ تقلید نہیں کرتے۔ اپنی مسلمہ علمی قابلیت اور عزائم و مقاصد کے خلوص کی بناپر انہوں نے ایک ایسی آگ روشن کی ہے اور اس سرگرمی کے ساتھ اپنا کام شروع کردیا ہے کہ نبی عربی کے دین کی اشاعت اس سے بہتر طریقہ سے نہیں ہوسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر مومن ان باتوں پر آمنا و صدقنا نہیں کہتا جو پروفیسر عبدالجبار کہتے ہیں اور خود ان کے بعض ہم مذہب بھی ان کو بہت زیادہ تیز اور اپنے آراء و افکار پیش کرنے میں حد سے زیادہ بے پرواہ خیال کرتے ہیں، مگر میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ خود ان کے مخالف بھی جو آراء و افکار میں کبھی ان سے اتفاق نہیں کرتے ان کی روزمرہ زندگی میں ان کے سچے دوست ہیں کیونکہ وہ ان کی پاکیزگی اخلاق کی بڑی قدر کرتے ہیں اور ان کی خالص اور سچی شخصیت نے جس میں دنیاوی مطامع کا شمہ بھی شامل نہیں ہے، ان کو عزیز تر بنادیا ہے۔ ان کا مقصد ہر شخص کے سامنے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے لئے مصروف سعی ہیں اور ان کی زندگی یکسر مذہب سے عبارت ہے۔ آرام و آسائش، صحت اور دنیا کے مادی منافع ان کے لئے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ جرمن زبان میں عام طور پر تقریریں کرتے ہیں اور ہر وقت سوالات کرتے اور سوالات کے جوابات دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے ایک ماہانہ رسالہ "اسلام" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا ہے، جس کا مقصد وحید قرآن و حدیث کے مطالب کو آسان پیرایہ میں بیان کرنا ہے جن پر عمل کرکے دنیاوی اور اخروی کامرانی حاصل ہوتی ہے"۔ اس بیان میں مولانا عبدالجبار کے جو کچھ خیالات ڈاکٹر شوٹبس نے بیان کئے ہیں، وہی ایک سچے خادم اسلام کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں، لیکن مولانا کی خدمات کا شاہد صرف یہی ایک شخص نہیں ہے، بلکہ ہمیں یقین ہے کہ اگر ان پر اور بھی شہادتیں جمع کی جائیں تو وہ ایک ضخیم طومار کی شکل میں سامنے آئیں گی"۔

* کلکتہ نیو مارکیٹ کی قبر

کچھ عرصہ سے کلکتہ نیو مارکیٹ کے عین وسط میں ایک مسلمان کی تدفین پر جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے وہ کسی اخبار بین شخص سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کلکتہ کارپوریشن کے غیر مسلم ممبر برابر اس امر پر اصرار کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ حرکت ہر حیثیت سے ناجائز ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو قبر کھود کر لاش وہاں سے اٹھا دینی چاہیے مگر مسلمان ممبر اس کے سخت مخالف ہیں اور ان سے زیادہ عوام کے جذبات اس بارہ میں بہت زیادہ مخالفانہ ہیں اس قضیہ کے انجام کی ہمیں خبر نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ وہ اب اپنی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل جس کی قانونی رائے پر آخری فیصلہ کا انحصار رکھا گیا تھا، قبر اکھاڑنے کے حق میں اپنی رائے دے چکا ہے اور غالباً عنقریب کارپوریشن کی اکثریت اپنی خواہش پر عملدر آمد کا فیصلہ کرنے والی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیصلہ سے قبل کارپوریشن اور کلکتہ کی تمام پبلک کو ایک خاص امر کی طرف توجہ دلائیں۔

سب جانتے ہیں کہ اس معاملہ میں مسٹر داس آنجہانی کی کیا رائے تھی۔ انہوں نے بارہا اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا کہ "میں قبر کو اکھاڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ کارپوریشن سے یہ اپیل بھی کر چکے تھے کہ قبر کے معاملہ کو اتنا پیچیدہ نہ بناؤ کہ سوراج پارٹی کا اتحاد غارت ہو جائے۔ انہوں نے آخر وقت میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر قبر اکھاڑنے کا فیصلہ کیا گیا، تو میں کارپوریش کی صدارت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ ان تمام باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے اس عزیز و محبوب لیڈر کے دل میں اس معاملہ کی کیا اہمیت تھی اور وہ دراصل کیا چاہتا تھا۔ اگر مسٹر داس زندہ ہوتے، تو وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے خود کوشش کر سکتے تھے، مگر اب جبکہ وہ ہم میں موجود نہیں ہیں، تو یہ تمام باشندگان کلکتہ کا فرض ہو گیا ہے کہ ان کا لیڈر جس خواہش کو اپنے دل میں لے گیا ہے، وہ اسے پورا کریں۔ اہل کلکتہ کے دل میں مسٹر داس کی جو محبت تھی، وہ اس بے نظیر مجمع سے ظاہر ہے جو ان کی ارتھی کے ساتھ اسٹیشن سے مرگھٹ تک گیا تھا۔ خود کارپوریشن کے ممبران کی جو عزت کرتے تھے وہ ان المناک تقریروں سے معلوم ہوتی ہے جو ان کی تعزیت کے لئے کی گئی تھیں۔ یہ عزت اگر ان کی ذات کے لئے تھی، تو یقیناً بے

قیمت تھی، لیکن اگر ان کے مقاصد کے لئے تھی، تو اس کے لئے کم سے کم قربانی کی ضرورت ہے اور وہ یہی ہے کہ کارپوریشن کے ممبر اور کلکتہ کے باشندے اپنے محبوب لیڈر کی روح کو آخری خراج تحسین ادا کرتے ہوئے اس کی خواہش پر اپنی خواہش کو قربان کردیں۔

* حضور نظام کے خلاف پروپیگنڈا

پونا میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جس نے اعلی حضرت میر عثمان علی خان بہادر کی حکومت کو بدنام کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ کچھ عرصہ سے ہم برابر دیکھ رہے ہیں کہ قلمرو نظام کے متعلق جتنا پروپیگنڈا ہوتا ہے، اس سب کا منبع یہی ضلع مہاراشٹر ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وہاں سے ایک اور خبر شائع ہوئی ہے کہ ضلع پربھنی کے ایک گاؤں میں مہادیو کی مورتی توڑ دی گئی ہے اور "مرہٹہ" نے اسے گلبرگہ کے "بت شکنوں" کی رہائی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ایسی حالت میں مملکت آصفیہ کے تمام سچے بہی خواہ اعلیٰ حضرت کو یہی مشورہ دیں گے کہ ایسی خبروں کی تردید کے لئے نہایت مستعدی کے ساتھ انتظام فرمایا جائے۔

* موپلوں کے لئے دام تزدیر

غنیمت ہے کہ موپلہ قوم کے لیڈر مسٹر محمود شہزاد اور اپی صاحب اب حکومت کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوگئے ہیں اور انہوں نے اپنی قوم کو ایک المناک تباہی سے بچانے کی جدوجہد شروع کردی ہے۔ اول اول یہ حضرات باوجود عقلمند اور باخبر ہونے کے حکومت کے دھوکے میں آگئے تھے۔ حکومت نے موپلوں کو اپنے ظالمانہ ارادوں کے دام میں پھانسنے کے لئے جو خوشنما تدبیریں اختیار کی تھیں، وہ تھوڑی دیر کے لئے ان حضرات کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئی تھیں اور ہمیں اندیشہ پیدا ہوچلا تھا کہ اگر کبھی ان کی آنکھیں کھلیں بھی تو وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا، لیکن ہمیں مسرت ہے کہ وہ عین وقت پر بیدار ہوگئے اور جن غیر معمولی چالبازیوں سے پانچ سو موپلا بچوں اور عورتوں کو پھسلا کر انڈمان جانے کے لئے آمادہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے ان لیڈروں کو آنے والے خطرہ سے

پوری طرح آگاہ کردیا ہے۔

قارئین کرام حیرت کریں گے کہ حکومت اپنی اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے ایسے ایسے ناپاک اور سخت شرم انگیز طریقے اختیار کررہی ہے جن کا کوئی شریف آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر انڈمان کے موپلہ قیدیوں سے ان کے عزیزوں کو اس قسم کے خطوط لکھوائے جارہے ہیں کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہ رہی ہیں، زمین نہایت زرخیز ہے، آب وہوا بڑی اعلیٰ درجہ کی ہے، یہاں کے مقابلہ میں مالا بار کی کچھ حقیقت نہیں اور ہمارے لئے یہاں سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی۔ بعض قیدیوں کو رہا کرکے مالابار بھی بھیج دیا گیا ہے تاکہ ذاتی اثر ڈال کر اپنے عزیزوں اور دوستوں کو انڈمان جانے کے لئے راضی کریں۔ ان کے پاس روپے کی کثرت ہے اور وہ اپنی دولت دکھاکر اپنے اعزہ و اقارب کو اس طرح لالچ دلاتے ہیں کہ انڈمان میں ہم نے یہ روپیہ اپنی محنت سے کمایا ہے اگر تم لوگ وہاں چلو، تو تم بھی ایسے ہی دولت مند بن سکتے ہو۔ اپی صاحب نے ان لوگوں کے متعلق خود کہا ہے کہ یہ دراصل سدھائے ہوئے پرندے ہیں جنہیں شکاری نے بھولے بھالے ہم جنسوں کو دام میں پھانس لانے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ ایک طرف موپلوں کو دھوکہ دینے کے لئے اس قسم کی شرمناک تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں اور دوسری طرف سرکاری افسر قسمیں کھاکھا کر غریب عوام کو یہ یقین دلا رہے ہیں کہ بخدا ہم کسی ذاتی مقصد کے لئے تمہیں انڈمان نہیں بھیجنا چاہتے ہیں، بلکہ اس میں خود تمہاری ہی بھلائی پیش نظر ہے۔

ممکن ہے کہ ان باتوں سے حکومت اپنی اس ظالمانہ اسکیم میں کامیاب ہوجائے، لیکن وہ اس طرح اپنا رہاسہا اعتبار بھی کھو دے گی اور اس سے ہر ہندوستانی کے دل میں اس کے خلاف سخت ناراضی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ ہمارے نزدیک اب یہ معاملہ اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ صرف معمولی احتجاج پر قناعت نہ کرنی چاہیے، بلکہ ایک طرف صاف الفاظ میں حکومت کو متنبہ کردینا چاہیے کہ تمام ہندوستان اس اسکیم کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے خلاف عملی جدوجہد شروع کردینی چاہیے تاکہ ناواقف موپلے آسانی سے حکومت کے دام تزویر میں نہ پھنس سکیں۔

❑ مشکلات حج اور حکومت

{۲۹ر جون ۱۹۲۵ء}

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ حجاج کے آزمودہ کار دوست مسٹر محمد یعقوب کا مراسلہ سفرحج کے متعلق صحیح واقعات کے زیر عنوان درج کیا گیا ہے۔ اس میں ہمارے مکرم دوست نے جس حد تک واقعات کی تحقیق و تفتیش کرکے انہیں پبلک کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہیں اور انہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نمایندگی کے فرائض کو محسوس کیا، لیکن جب ہم اس کو باربار مطالعہ کرنے کے بعد اس کی روح کا تجسس کرتے ہیں تو ہمیں صاف کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے یہ مراسلہ خدمت قوم کے نقطہ نظر سے نہیں، بلکہ خدمت حکومت کی غرض سے لکھا ہے۔ ان کے تمام ارشادات کا خلاصہ اگر کچھ ہے، تو وہ صرف یہ کہ حکومت نے التوائے حج کا مشورہ دینے میں نہایت دانشمندی کی تھی۔ علمائے کرام اور خادمان خلافت نے خواہ مخواہ اپنی ذاتی یا سیاسی اغراض سے مسلمانوں کو حج کے لئے ابھار کر خطرہ میں مبتلا کردیا اور اب یہ حکومت کی مزید مہربانی و عنایت ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف عمل کرنے والے حاجیوں کو بچانے کی کوشش کررہی ہے۔ یہ انداز بیان صاف کہہ رہا ہے کہ اس کا مدعا حکومت کی جانب سے صفائی پیش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور اگر یہ مراسلہ سر حبیب اللہ کے ایما سے نہیں تو کم از کم ان کی استرضاء اور رضاجوئی کے لئے لکھا گیا ہے ممکن ہے کہ ہم اپنے اس فیصلہ میں غلطی پر ہوں، لیکن مضمون جس اسپرٹ میں لکھا گیا ہے، اس سے ہمارے نزدیک ہر شخص یہی رائے قائم کرنے پر مجبور ہے۔

بہرحال ہمارے معزز مراسلہ نگار کا مقصود خواہ کچھ ہی ہو، ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ان کے جتنے بیانات غلط فہمی میں ڈالنے والے ہیں یا جن مسائل میں وہ خود غلط فہمی میں مبتلا ہیں، ان کی وضاحت کے ساتھ تصحیح کردیں۔ سب سے پہلے یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہماری طرف سے کسی خاص غرض کے لئے لوگوں کو حج کی ترغیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ اس طرح حکومت کو بدنام کرنے کے ایک موقعہ سے فائدہ اٹھانا مقصود نہیں تھا، بلکہ بحالت امکان ایک اہم ترین فریضہ دینی کو جاری کرانا مقصود تھا جس کے متعلق ہم نیک نیتی کے ساتھ یہ رائے رکھتے تھے کہ اسے بلاوجہ روکا جارہا ہے۔

جب تک حجاز سے امن و امان کی اطلاعات ہم تک نہیں پہنچی تھیں، ہماری خود یہی رائے تھی کہ امسال حج کو ملتوی کردینا چاہئے۔ چنانچہ اس پر حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب کا وہ اعلان شاہد ہے جو سلطان ابن سعود کے دعوت نامہ سے قبل الجمعیۃ اور تمام دیگر اخبارات میں شائع کیاگیا تھا، لیکن جب سلطان ابن سعود کی جانب سے پے در پے دو مرتبہ حج کے دعوت نامے آئے اور علماء واعیان مکہ کی جانب سے ایک اپیل ہم تک پہنچی جس میں جیران بیت اللہ کی افسوسناک حالت بیان کرنے اور مسلمانان عالم سے اعانت کی درخواست کرنے کے ساتھ تمام عالم اسلامی کو اس امر کا یقین دلایا گیا تھا کہ حجاز میں کامل امن و امان ہے، راستے بالکل محفوظ ہیں اور رابغ، تنفذہ اور لیث کے بندرگاہ کھلے ہوئے ہیں، تو شرعی حیثیت سے حج کے لئے کوئی امرمانع نہیں رہا اور ہم نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے تمام مسلمانوں کو اس کی اطلاع دیدی کہ امسال حج کو جاسکتے ہیں۔

مسٹر یعقوب ہمارے شوق بے پروا پر اس "شوریدہ سری" کا الزام عائد کرنے میں قطعاً حق بجانب نہیں ہیں کہ ہم نے امسال فریضہ حج کی ادائیگی پر زور دے کر احکام شریعت پر عمل دوآمد کی جانب توجہ دلائی، کئی مرتبہ مسئلہ حج کے سلسلہ میں انہوں نے بھری اسمبلی کے سامنے ایسے بے سروپا خیالات کا اظہار کیا تھا ـــــــ وہ خود جانتے ہوں گے کہ استطاعت ہونے اور کوئی امرمانع نہ ہونے کی صورت میں حج سے باز رہنا جائز نہیں ہے اور جو شخص ایسی حالت میں لوگوں کو ادائے فرض کی ترغیب دیتا ہے وہ یقیناً احکام شرع کے عین مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر راستہ محفوظ نہ ہوتا تو بے شک ہماری اس ترغیب پر اعتراض ہوسکتا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے راستوں کی حفاظت کا کافی اطمینان کرلیا تھا۔ جہاں تک خشکی کا تعلق ہے ہم نے حاجیوں کی حفاظت کے لئے سلطان ابن سعود کی صریح ضمانتوں پر اعتماد کیا اور اس میں ہم ہرگز غلطی پر نہیں تھے اور نہ انشاء اللہ آئندہ ثابت ہوں گے۔ رہا سمندر کا راستہ، سو اس کے متعلق ہم معقول وجوہ کی بناپر حکومت کے اس عذر کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ وہ سمندر پر ہماری حفاظت کرنے سے عاجز ہے۔ ہمارا اس سے یہ ہرگز مطالبہ نہیں تھا کہ وہ حج کا راستہ کھولنے کے لئے علی سے جنگ کرے یا حجاز میں اپنا اثر استعمال کرے، بلکہ ہمارا مدعا صرف یہ تھا کہ وہ ان ذمہ داریوں کو انجام دے جو برطانوی جھنڈے کے ماتحت سفر کرنے کی

صورت میں اس پر بہرحال عائد ہوتی ہیں اور جنہیں وہ اپنی جانبداری کو ذرہ برابر ٹھیس لگائے بغیر انجام دے سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات حکومت کے امکان میں تھی اور اس بناپر ہم اس سے یہ مطالبہ کرنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ جو بات اس کے امکان میں ہے اسے انجام دینے سے تساہل برت کروہ حج کو خواہ مخواہ نہ روکے۔

یہ صحیح ہے کہ حکومت نے ابتداء ہی میں خطرات و مصائب کا اظہار کرکے التوائے حج کا مشورہ دیا تھا اور یہ مشورہ اس اعلان کا ہم معنی تھا کہ وہ حفاظت حجاج کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتی تھی' لیکن متعدد وجوہ کی بناپر ہمارے نزدیک حکومت کا یہ عذر صحیح نہیں تھا اس لئے خطرات و مصائب کو جس صورت میں پیش کیاگیاتھا وہ شک میں ڈالنے والی تھی۔ اگر آپ اخبارات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں یا اگر آپ نے حج کے متعلق اس کے اعلانات کا بنظر غور مطالعہ کیا ہے' تو آپ کو خود اعتراف ہوگا کہ اس سلسلہ میں اس نے متعدد غلط بیانیاں کیں۔ عجیب عجیب لاحاصل عذرات پیش کئے۔ پہلو تہی کے متعدد طریقے اختیار کئے اور خصوصیت کے ساتھ ملک معظم کے قونصل مقیم جدہ نے تو اپنے گہرے دوست علی کے ساتھ حق رفاقت ادا کرکے اپنی جائے نظربندی سے ایسی ایسی خبریں بھیجیں جن سے ایک گہری سازش کا پتہ چل رہا تھا۔ ان سب باتوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور تھے کہ اس سال حج کو روکنے میں حکومت کی کوئی خاص مصلحت پوشیدہ ہے اور اس بناپر ہمارا یہ فرض تھا کہ ایسی تمام مصالح کا سختی سے مقابلہ کریں جو حکومت کو ہمارے مذہبی فرائض کے راستہ میں حائل ہونے پر مجبور کرتے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر اسلامی اخبارات اور اسلامی جمعیتوں نے حج کا راستہ کھولنے کے لئے سختی کے ساتھ حکومت سے مطالبہ کیا۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہ تھے کہ اس سال حج کو کوئی سیاسی رنگ دیاگیا تھا۔ یا اس معاملہ سے حکومت کے خلاف کوئی سیاسی مقصد حاصل کرنا تھا' بلکہ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مسلمان اپنے مذہبی فرائض کو حکومت کی مصلحتوں پر قربان ہونے کے خطرہ سے بچانا چاہتے تھے اور انہوں نے آئندہ کے لئے بھی اس خطرہ کا سدباب کردینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

آپ اس کو سالہائے ماسبق کے خلاف ایک غیر معمولی تحریک قرار دے کر شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور آپ کا انداز بیان کہے دے رہا ہے کہ رائے عالی میں یہ تمام تحریک

حب علی کے لئے نہیں، بلکہ بغض معاویہ کے لئے تھی، مگر یہ محض آپ کا حسن ظن ہے ورنہ ہم کہاں اور یہ نیم سرکاری ذہنیت کہاں؟ بہتر ہوتا کہ آپ حکومت کے جوش عقیدت سے اپنی قوت استدلال کو مغلوب نہ ہونے دیتے اور کم از کم منطقی حیثیت سے اپنے اس اعتراض کا تجزیہ کرکے دیکھ لیتے کہ آیا اس مسئلہ میں یہ اعتراض صحیح بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ غیر معمولی تحریک اگر قابل اعتراض ہو سکتی ہے، تو وہ صرف اسی صورت میں جبکہ حالات معمولی ہوں، لیکن اگر حالات غیر معمولی اور سالہائے ماسبق کے خلاف ہوں تو یقیناً اس کے مقابلہ میں غیر معمولی اور سالہائے ماسبق کے خلاف تحریک کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے اور اس پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ سالہائے ماسبق میں حکومت کی جانب سے التوائے حج کا کوئی مشورہ نہیں دیا گیا تھا۔ اور جہاں تک ہمیں یاد ہے، شملہ کی چوٹیوں پر اس زمانہ میں بھی مسلمانان ہند کی ہمدردی کے لئے کسی خاص تشویش کے آثار نمایاں نہیں تھے تب کوئی خاص مسئلہ بھی نہیں اُٹھا تھا، اس لیے مسلمانوں کو ترغیب حج کے لیے کسی غیر معمولی تحریک کی ضرورت نہ تھی، مگر اب جبکہ بلا وجہ اور قطعاً غیر معقول وجوہ کی بنا پر حکومت نے سالہائے ماسبق کے خلاف حج کو ملتوی کرنے کا مشورہ دیا اور اس کو روکنے کی عملی کوشش بھی کی، اگرچہ وہ خفیہ طریقوں تک محدود رہی، تو کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ کوئی شخص حالت ہوش و حواس میں اس غیر ”معمولی“ اور ”سالہائے ماسبق کے خلاف“ تحریک کو قابل اعتراض قرار دے سکتا ہے جو اس کے مقابلہ میں کی گئی ہے۔

رابغ پر امیر علی کی کارروائی کے بعد حکومت سے حجاج کی حفاظت کا جو مطالبہ کیا گیا تھا، اس کے معنی سمجھنے میں بھی عام طور پر غلطی کی گئی ہے اور آپ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہم اس سے پہلے بھی اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں اور اب بھی صاف طور پر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا شوکت علی صاحب، جناب امیر شریعت صوبہ بہار اور دیگر بزرگان ملت کی طرف سے جس حفاظت کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ صرف بحری راستہ کی حفاظت تھی اور ظاہر ہے کہ اس کا مطالبہ آج کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ برطانوی تسلط کی ابتداء سے وہ ہمارا حق اور حکومت کا فرض رہا ہے اور جب تک یہ حکومت قائم ہے، اس وقت تک رہے گا۔ رہا خشکی کی حفاظت کا سوال، سو اس کے متعلق ہم علی الاعلان کہتے ہیں کہ مولانا شوکت علی اور مولانا کفایت اللہ تو کیا کوئی معمولی مسلمان

بھی جس میں ذرہ برابر بھی نور ایمان موجود ہے، کبھی سرزمین حجاز پر حکومت سے اپنی حفاظت کا مطالبہ نہیں کرسکتا اور خدا مسلمانوں کو اس وقت سے بچائے جبکہ وہ ایمانی غیرت سے عاری ہوکر اس قسم کا مطالبہ کریں۔ شریف حسین کے زمانہ میں ہندوستانی حاجیوں پر جیسی کچھ تباہیاں نازل ہوئی ہیں، ان سے ایک دنیا واقف ہے۔ ان سے مسلمانان ہند کے دل جس قدر دکھے ہیں اس کا اندزہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آج عامتہ المسلمین شریف اور اس کے خاندان کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتے۔ اگر اس زمانہ میں کوئی مقتدر اسلامی حکومت موجود ہوتی، تو شاید اب تک مسلمان ہزارہا مرتبہ اس سے التجا کرچکے ہوتے کہ شریف کو حجاز سے نکال کر باہر کرے، مگر باوجود اس کے مسلمانوں نے کبھی حکومت سے اپنی حفاظت کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ ان کی ساری جدوجہد اسی راہ میں صرف ہوئی کہ حجاز میں کسی قسم کا برطانوی اثر قائم نہ ہونے پائے پھر جبکہ مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ رویہ رہا ہے، تو کیا کوئی عقلمند آدمی یہ تصور کرسکتا ہے کہ آج وہ شوق زیارت حج میں دیوانے ہوکر عین اس مقصد کو مجروح کرلیں گے، جو خود حج کا مدعائے حقیقی ہے۔

آپ نے اپنے بھائی شوکت علی صاحب پر یہ کہکر سخت ظلم کیا ہے کہ وہ حکومت برطانیہ سے ہاشمی گورنمنٹ کے خلاف اعلان جنگ کرانے کے خواہشمند ہیں اور اس سے زیادہ افسوسناک غلطی یہ کی ہے کہ ان کے پیرو مرشد مولانا عبدالباری صاحب کے تار سے ان کے مقصد کو متعارض قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب نے سر محمد حبیب اللہ کو جو تار دیا ہے اس میں مسلمانان ہند کے جذبات کی بالکل سچی ترجمانی کی ہے کہ کوئی مسلمان اس کے ایک لفظ سے بھی اختلاف نہیں کرسکتا اور نہ صرف مولانا شوکت علی، بلکہ ہر سچے مسلمان کی دلی خواہش یہ ہے کہ امیر علی اور ابن سعود کی جنگ میں برطانیہ اور کوئی دوسری غیر مسلم طاقت ہرگز ہرگز حصہ نہ لے۔ اگرچہ اب تو خدا کے فضل وکرم سے حجاج رابغ پر مع الخیر اتر گئے ہیں اور سمندر پر کوئی خطرہ باقی نہیں رہا، لیکن ہم صاف طور پر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ اگر حجاج کے جہاز رابغ نہ پہنچ سکتے، تو ہم ان کے واپس آجانے کو اس کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ بہتر سمجھتے کہ حکومت امیر علی سے لڑکر اور جدہ پر اپنا اثر قائم کرکے انہیں رابغ پہنچاتی۔

آپ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک اگر مسلمان حکومت

سے درخواست کریں، تو وہ علی کے خلاف جنگ بھی چھیڑ سکتی ہے، یہ ایک بڑی طویل بحث ہے جس میں ہم اس وقت نہیں پڑنا چاہتے، لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ محض آپ کا حسن عقیدت ہے جس کی بدولت آپ نے حکومت سے یہ توقع قائم کرلی ہے ورنہ اگر دولت برطانیہ کے دل میں ہندوستانیوں کی اتنی عزت و وقعت ہوتی، تو شاید آج ہندوستان سے اس کے تعلقات اس قدر خراب نہ ہوتے اور کم از کم ان ذلتوں سے ہندوستانیوں کو دوچار نہ ہونا پڑتا جو کینیا، جنوبی افریقہ اور فجی وغیرہ میں انہیں محض برطانیہ کے تغافل کی بدولت برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ حکومت اپنی استعماری اغراض کی خاطر سب کچھ کرسکتی ہے اور کرتی ہے، مگر یہ توقع کرنا کہ وہ ہندوستانیوں کی خاطر اپنی قوت کو صرف کریگی، حد درجہ سادہ لوحی اور برطانوی فطرت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

آخر میں ہم اپنے محترم دوست کی خدمت میں اس سادگی پر دلی شکریہ عرض کرتے ہیں کہ وہ ہر اس معقول اور موصل الی المقصود تدبیر پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں، جو علمائے کرام اور دیگر صائب الرائے مسلمان اس بارے میں مناسب خیال کرتے ہوں۔ اگر ان میں صحیح طور پر اس قسم کی کوئی آمادگی پیدا ہو گئی ہے، تو امید ہے کہ وہ آئندہ بھی باقی رہے گی اور وقت پر کام آئے گی۔

* مسلمانوں کو ایک عجیب مشورہ

ایک ہندو بزرگ ٹہل رام گردھاری داس ناگدیوی اسٹریٹ بمبئی سے ہمیں تار دیتے ہیں کہ

> ”بقر عید اور سورہ بقر گائے کے نام ہیں جنہیں آپ رات دن پڑھتے ہیں۔ سورہ بقرہ کا ذکر قرآن میں ہے۔ بس اب بقر عید کا تیوہار سب ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی اس طرح منائیں کہ گائیوں کو چارہ دیں ان کی دموں کو سر آنکھوں سے لگائیں، ان کا طواف کریں اود ان کو ہار پہنا کر بازاروں میں جلوس نکالیں۔ اگر آپ حضرت آدم کی ماں یعنی گائے کو قربان کریں گے اور خود اس کا گوشت کھائیں گے یا دوسروں کو ایسا کرنے سے منع نہ کریں گے، تو آپ کو اس کا بدلہ دینا ہوگا“۔

اس تار سے نتھل رام صاحب کے ان دلی جذبات و حسیات کا ظہور ہوتا ہے، جنہیں وہ اپنے مذہب کی خاطر دوسرے مذاہب کے اشخاص پر بدترین صورت میں مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ صرف دو باتیں کہنا چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ سورہ بقرہ کا نام سورہ بقرہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں گائے کے ذبح کئے جانے کا ذکر ہوا ہے اور بقرعید کو بقرعید اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں گائے کی قربانی کی جاتی ہے۔ مسلمان قربانی کو عبادت سمجھتے ہیں اور جو شخص کہ گایوں کی قربانی کو عبادت سمجھتا ہو وہ ان کو ہار پہنا کر جلوس نہیں نکال سکتا اور ان کا طواف نہیں کر سکتا اور ان کی تعظیم کے خیال سے قربانی بھی ترک نہیں کر سکتا، کیونکہ ان صورتوں میں وہ اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

نتھل رام صاحب بجائے اس تجویز کے اگر سیدھی طرح یوں ہی کہہ دیتے کہ تمام مسلمان جنیو پہن کر اور چوٹی رکھ کر ہندو قوم میں داخل ہو کر گائے کی عبادت کریں، تو شاید اس سے زیادہ موزوں ہوتا کہ وہ مسلمانوں سے مسلمان رہتے ہوئے گائے کی دم آنکھوں سے لگانے، اس کا طواف کرنے اور جلوس نکالنے کی استدعا کریں۔

رہی ان کی یہ دھمکی کہ اگر ہم نے ان کی تجویز پر عمل نہ کیا اور گائے کی قربانی کی اور اس کا گوشت کھایا اور دوسروں کو بھی منع نہ کیا تو ہم کو اس کا بدلہ دینا ہوگا۔ تو اصولاً تو مسلمان اپنے مذہبی افعال کی بجا آوری اور اس کی پاداش میں تمام برے نتائج کی برداشت کے لئے تیار ہیں، لیکن اگر نتھل رام صاحب اس بدلے کو ذرا وضاحت سے بیان کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا، اس لئے کہ بدلے کی نوعیت معلوم ہونے پر اس کے لئے تیاری کا طریقہ بھی سمجھ میں آجاتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ نتھل رام صاحب کون بزرگ ہیں۔ اس لئے سردست ہندو قوم کے ذمہ دار اسلوب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ نتھل رام صاحب اور ان کی اس تاربازی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

□ ترک قربانی کی تجویز

{ ۲ر جولائی ۱۹۲۵ء }

آج کل معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین بمبئی کی زرخیزی حماقت کے پھل پیدا کرنے میں بہت زیادہ مستعدی سے کام لے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم ٹہل رام صاحب کی ایک دلچسپ تجویز سے لطف اٹھا کر فارغ ہوئے تھے کہ اب ایک اور بزرگ مسٹر ایم ایچ اصفہانی ہمیں دعوت دے رہے ہیں، جو یقیناً اس بات کے مستحق ہیں کہ حماقت پیشہ دنیا ان کو اپنا سردار تسلیم کرلے۔ آپ نے ٹائمز آف انڈیا میں ایک طویل مضمون شائع کرایا ہے جس میں بقرعید کو باعث فساد اور ذریعہ نفاق قرار دے کر اپنا یہ تجزیہ بیان کیا ہے کہ عالم اسلام میں کہیں گائے کی قربانی نہیں ہوتی اور اپنی تاریخی معلومات کا ثبوت اس طرح دیا ہے کہ قرون اولیٰ میں تو لوگ دنبوں اور بکریوں کے ریوڑوں سے جانوروں کو یونہی پکڑ لیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس وقت قربانی میں کوئی اقتصادی نقصان نہ ہوتا تھا، مگر اب تو جانور خریدنے پڑتے ہیں۔ اس لیے اب قربانی ایک نقصان دہ چیز ہے۔ ان لغویات سے استدلال کرنے کے بعد آخر میں آپ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ قربانی کرنے کی بجائے ان جانوروں کی قیمت، جنہیں قربان کرنا ہو، ایک مشترک فنڈ میں جمع کردی جایا کرے جسے ہر سال کسی ضروری اسلامی کام میں صرف کیا جائے۔

یہ خیالات اس قدر لچر اور پوچ ہیں کہ ان پر کسی طرح سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہی نہیں جا سکتا، لیکن ہم ان بزرگ سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ مذہب کے بجائے اپنی حماقت کا تختہ مشق ریاضی۔ اقتصادیات۔ کیمیا فلسفہ وغیرہ کو بنائیں تو کوئی نیا فارمولہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

* حکومت کی طامعانہ پالیسی

ہندوستان نے سالہاسال کی سخت جدوجہد کے بعد اب حکومت کو اس حد تک تو ہموار کرلیا ہے کہ وہ ملکی صنعتوں کی حفاظت پر زیادہ ناک بھوں نہیں چڑھاتی، مگر اب بھی یہ حال ہے کہ جب کبھی اسے کسی صنعت کی حفاظت پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اس کی برآمدات پر ٹیکس لگانے کی سفارش کرتی ہے تاکہ اسے کچھ رقم حاصل ہو——— حال

میں ہگلی انک کمپنی نے ٹیرف بورڈ سے درخواست کی تھی کہ طباعتی روشنائی کی صنعت کو غیر ملکی مقابلہ سے محفوظ رکھنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کے جواب میں مجلس مذکور نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ وہ غیر ملکی روشنائی کی برآمد پر ۵ فی صد محصول بڑھا دے۔ ٹیرف بورڈ نے بہ ظاہر اس سفارش سے ہندوستان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی ہے، مگر درحقیقت یہ اس کی طامعانہ پالیسی پر دلالت کرتی ہے۔ اگر اس کی رائے میں روشنائی کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ضروری تھا، تو وہ بڑی آسانی سے ان تمام اشیا کی درآمد پر محصول معاف کرنے کی سفارش کر سکتا تھا جو اس صنعت میں کام آتی ہیں، لیکن اس صورت میں کچھ حکومت کے خزانہ کو ایثار کرنا پڑتا، اس لیے اس نے دوسری صورت اختیار کی اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ جب تک ملک میں روشنائی کی پیداوار کافی ترقی نہ کر جائے، اس وقت تک غیر ملکی روشنائی کی درآمد پر محصول بڑھانا دراصل اشاعت علم کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا ہم معنی ہے۔

ہماری رائے میں ملک کے تمام مطابع کو ٹیرف بورڈ کی اس بیہودیت پر اظہار احتجاج کرنا چاہیے اور حکومت پر زور ڈالنا چاہیے کہ وہ روشنائی کی درآمد پر محصول عائد کرنے کی بجائے اس کے مواد پر محصول معاف کرنے کی پالیسی اختیار کرے۔

* وفد ہاشمی کا ورود

امیر علی کی جانب سے جس وفد کی آمد کا شہرہ تھا، وہ آخر کار ۲۵ر جون کو ساحل بمبئی پر پہنچ گیا اور شاید ایسے وقت پہنچا جو ہندوستان آنے کے لیے سب سے زیادہ برا وقت تھا۔ اگرچہ ہم ذاتی تعصبات سے بالکل پاک ہیں اور الحمدللہ قومی مسائل میں بھی تنگ نظری سے ہمارا مسلک بالکل جدا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ عامتہ المسلمین کے دلوں میں حکومت جدہ کی تازہ حرکات سے سخت نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں اور خاندان شریفی کی گذشتہ غدارانہ کارروائیوں پر سفر حج کے راستہ میں مشکلات حائل کرنے کی ناپاک کوششوں نے آگ پر تیل کا کام دیا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ وفد ایک خاص جماعت کے سوا جو پہلے ہی سے اس کے اغراض کی حمایت کر رہی ہے، عام

مسلمانوں میں کوئی مقبولیت حاصل نہ کر سکے گا۔ تاہم جمیعت العلماء کی جانب سے ہم اس وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے یقین دلاتے ہیں کہ تمام اخلاقی مسائل میں اس کے ساتھ نہایت فراخدلی کے ساتھ مذاکرہ کیا جائے گا اور اگر اسلامی مفاد کو پیش نظر رکھ کر اس سے کسی نقطہ پر اتفاق کرنا ممکن ہوا' تو اس میں قطعاً کوئی دریغ نہ کیا جائے گا۔

لیکن بمبئی میں معاصر "خلافت" کے نمائندے سے وفد مذکور نے جو گفتگو کی ہے' اس کو غور سے دیکھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام بنیادی مسائل میں اس کا نقطہ نظر ہم سے مختلف ہے اور یہ جیسا کہ ہمیں پہلے ہی سے یقین تھا' گذشتہ انقلابات نے اس کے خیالات میں کوئی اصلاح کرنے کی بجائے اسے اپنی غلطیوں پر اور زیادہ جما دیا ہے۔ خاندان شریفی پر اب تک اس کا اعتقاد باقی ہے' امیر علی کی بادشاہی کے لیے وہ اب بھی پہلے کی طرح مصر ہیں' حجاز کو جمہوریت کا حق دینے کے لیے وہ اب بھی اپنے انکار پر قائم ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے دماغ میں اب تک یہ ہوا بھری ہوئی ہے کہ مسلمانان عالم کو حجاز کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان خیالات کو نہ صرف ہندوستان میں' بلکہ تمام عالم اسلامی میں کوئی صاحب نظر مسلمان پسند نہیں کرتا اور جب تک حکومت جدہ کے ارباب حل و عقد ان میں اصلاح نہ کریں گے' ان سے مسلمانوں کی کسی طرح بھی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ اس باب میں ہمارا مسلک بالکل صاف اور واضح ہے۔ خاندان شریفی اور اس کے حامیوں کی طرح ہم اپنی مادی اغراض کے حصول کی کوشش نہیں کر رہے ہیں اور نہ ہمارا مطمح نظر کسی خود غرضی پر موقوف ہے۔ ہماری ساری جدوجہد خالصتہً للہ ہے اور ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں' احکام الٰہی کے مطابق صرف حرم پاک کی تطہیر اور ارض مقدس کی حفاظت کے لیے کر رہے ہیں۔ پس ہم دنیا کی کسی قوت کو خوش کرنے یا اس سے صلح کرنے کے لیے اپنے مسلک میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے البتہ اگر کسی کو ہم سے صلح کرنی ہو' تو وہ اپنے خیالات کو ہمارے مطابق بنائے اور اپنے رویہ میں اصلاح کرے۔

ابھی تک ارکان وفد نے اپنے اصلی اغراض و مقاصد کو پوری طرح وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے' لیکن یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ حکومت جدہ کے لیے مسلمانان ہند کی تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارا یہ قیاس صحیح ہے' تو ہمیں صفائی کے

ساتھ ان سے یہ کہہ دینے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ مسلمانان ہند کو نہ حکومت جدہ سے کوئی بغض ہے اور نہ حکومت نجد سے کوئی خاص محبت۔ وہ اشخاص کو نہیں دیکھتے، بلکہ صرف اعمال پر نظر رکھتے ہیں اور انہی سے ہر ایک کی قدر جانچتے ہیں۔ انہوں نے اب تک حکومت جدہ کے خلاف جو کچھ اظہار نفرت کیا ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ اس کا رویہ اسلامی مفاد کے بالکل خلاف ہے اور حکومت نجد کی جو کچھ تائید کی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اب تک اس کا کوئی فعل مفاد اسلامی کے خلاف ان کے علم میں نہیں آیا ہے۔ پس ان کی تائید ایسے لوگوں کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جو مذہب کے احترام کو بالکل نظر انداز کر کے حاجیوں کو راستہ میں روکنے اور ان کا مال لوٹ لینے کی دھمکی دیتے ہوں اور اگر کوئی حکومت ایسی حرکات کرنے کے بعد بھی یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ اس کی حمایت کے لیے آمادہ ہو جائیں گے، تو وہ یقیناً سخت غلطی پر ہیں۔

اصل بنائے کشیدگی

{۱۰ر جولائی ۱۹۲۵ء}

ان دنوں ہماری فضا فسادات سے پر ہے سطحی النظر لوگ اسے محض چند فروعی مسائل پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی بنا محض مسلمانوں کی یہ ضد تھی کہ وہ پہاڑی کے راستہ کو گائے کے لیے ضرور استعمال کریں گے اور کسی کی رائے ہے کہ یہ صرف ہندوؤں کی اس ہٹ پر مبنی تھی کہ وہ کسی طرح اس طرف سے گائے نکلنا گوارا نہیں کر سکتے، لیکن جیسا کہ ہم بار بار اس سے پہلے کہہ چکے ہیں۔ یہ اصل بنائے کشیدگی نہیں، بلکہ محض اس کے اظہار کا ایک مضحکہ انگیز بہانہ ہے، جس طرح کسی جگہ پھوڑے کا ہو جانا محض جلد کی خرابی پر موقوف نہیں، بلکہ خون کی خرابی پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح پہاڑی دھیرج کا معاملہ بھی صرف ایک معمولی نزاع کا ہم معنی نہیں، بلکہ ایک اور مواد فاسد کا پتہ دیتا ہے جو ہمارے دلوں میں اچھی طرح پک چکا ہے اور ہم صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ مواد خود نہیں پکا بلکہ کسی گہری مصلحت کی بنا پر پکایا گیا ہے۔ اس مواد فاسد کو "لطیف مذہبی جذبات" اور "نازک دینی حسیات" کا نام دے کر دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن فی الحقیقت یہ وہی ناروا داری، عدم تحمل اور شدید تنگ

نظری ہے جو مذہب کی اسپرٹ پر شیطانی اسپرٹ کے غالب آجانے سے ہر شخص میں پیدا ہو جایا کرتی ہے اور یہ دراصل اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک مذہب کے پیرو اپنے مذہبی عقائد کا دوسروں سے جبراً احترام کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسروں کے مذہبی واجبات کی تعمیل ایک آن نہیں دیکھ سکتے۔ یہ مذہبیت کا غلط احساس تمام نزاعات کی بنیاد ہے اور جب تک اسے پوری قوت سے فنا نہ کردیا جائے اس وقت تک دو مختلف العقیدہ قوموں کا اپنے مذہبوں پر قائم رہتے ہوئے ایک جگہ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرنا قطعاً محال ہے۔

ایک راستہ سے گائے نکالنے کے سوال کو اس قدر اہم بنا دینا کہ اس کے لیے حکومت کی آستانہ بوسی، اپنے ہمسایوں کے خلاف شدید زہر افشانی، خون خرابے کے لیے پوری آمادگی اور سازش، خوشامد، جنگ، ہجرت، ہڑتال غرض کسی چیز سے دریغ نہ کیا جائے اور شہر کے امن کو اس حد تک خطرے میں مبتلا کر دیا جائے کہ اس کو محفوظ رکھنے کے لیے حکومت کی پوری قوت کا مظاہرہ کیے بغیر کوئی چارہ باقی نہ رہے، ایسی افسوسناک تنگ نظری کا ثبوت ہے کہ کوئی معقول آدمی اسے ایک لمحہ کے لیے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم امن و صلح کی خاطر اس قسم کے غیر معقول جذبات کی پاسداری کو بھی نزاکت وقت کا لحاظ کرکے ضروری قرار دیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس میں ذرہ برابر بھی عقل و فہم موجود ہے، ایسے غیرمذہبی جذبات کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہے جنہیں بات بات پر ٹھیس لگ جاتی ہو اور جن کی بنا پر ایک قوم دوسری ہمسایہ قوموں کے مذہبی اعمال میں مزاحمت کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہو۔ ایسے نازک اور اشتعال پذیر جذبات کی نہ کسی مذہب نے اجازت دی ہے اور نہ کوئی اخلاقی قانون انہیں پسند کرسکتا ہے۔ ہندوؤں کے دل میں اگر گائے کی عظمت و تقدس موجود ہے، تو کوئی شخص انہیں یہ عقیدہ بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتا، مگر یہ حق انہیں کیونکر پہنچتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے ان جذبات کے احترام پر مجبور کریں؟ وہ اگر گائے کو قربانی کے لیے لے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے، تو وہ اس سے احتراز کرنے میں پوری طرح آزاد ہیں اور کوئی شخص انہیں یہ حالت دیکھنے پر مجبور نہیں کرسکتا، مگر یہ حق انہیں کس اخلاقی قانون سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیرؤوں کو اس فعل سے جبراً باز رکھیں؟ اس قسم کے حقوق کو اگر اصولاً تسلیم کرلیا جائے، تو ہم سمجھتے ہیں کہ نہ کوئی ہندو آزادی

کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکتا ہے اور نہ کوئی مسلمان۔ آج ایک مسلمان اذان دیتا ہے اور ایک ہندو اس پر لٹھ لے کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ اللہ اور محمدؐ (روحی فداہ) کا نام سن کر میرے جذبات کو سخت صدمہ پہنچتا ہے لہٰذا اسے بند کرو، کل ایک ہندو سنکھ بجاتا ہے اور اس پر ایک مسلمان بگڑ بیٹھتا ہے کہ اس کریہہ آواز سے میرے دل کو چوٹ لگتی ہے، لہٰذا اسے فوراً روک دو۔ آج ایک راستہ سے مسلمان گائے لے کر جاتے ہیں تو ہندو اس پر برہم ہو جاتے ہیں کہ یہ منظر ہم سے نہیں دیکھا جاتا اور کل ایک شاہراہ سے ہندو اپنا کوئی مذہبی جلوس لے کر نکلتے ہیں تو اس پر مسلمان آمادہ مزاحمت ہو جاتے ہیں کہ یہ مشرکانہ رسوم ہمارے ہاں سخت ناجائز ہیں، اس لیے ہمارے سامنے سے انہیں لے کر نہ گزرو۔ کوئی بتائے کہ اگر دو ہمسایہ قوموں کا یہی آئین و دستور ہو، تو کتنے لمحوں کے لیے وہ ایک جگہ رہ سکتی ہیں اور قومیں تو قومیں دو مختلف العقیدہ آدمی بھی ایسے نازک مذہبی جذبات کو لے کر ایک ساتھ بسر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

✱ ہندو سبھا کی پوزیشن

اس سلسلہ میں تمام مناقشات کی ذمہ داری عوام کی جاہلانہ رسوم و رواج پرستی پر ہی نہیں بلکہ خواص کی جاہ طلبی اور حرص اقتدار پر بھی عائد ہوتی ہے بالفاظ دیگر یہ عوام کی جہالت نہیں، بلکہ خواص کی سیاست ہے۔ اگر عوام کے جذبات بھی ایسے ہی نازک ہوتے، تو شاید ہندو اور مسلمان مدتوں تک امن پسند ہمسایہ بن کر نہیں رہ سکتے تھے، مگر ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی متعصب ہو یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جو امور آج نہایت شدید مناقشات کے شعلۂ جوالہ کا موجب بنے ہوئے ہیں، ان پر اب سے پہلے کبھی کوئی جھگڑا ہونا درکنار، کسی قسم کی معمولی کشیدگی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پس ان سب باتوں کی ذمہ داری حقیقتہ” ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے، جو اپنی تقریروں اور تحریروں سے عوام کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ تمہارے دھارمک جذبات نہایت لطیف و نازک ہیں اور ان کے خلاف ادنیٰ سی حرکت ہونے پر بھی انہیں ٹھیس لگ جانا نہایت ضروری ہے۔

بقرعید سے پہلے ان لوگوں نے جس طریقے سے دہلی کے ہندوؤں کو بھڑکا کر پچھلے سال کے واقعات دہرانے کی کوشش کی تھی، ان سے ہم اچھی طرح واقف تھے، لیکن

باوجود اس کے جب ذمہ دار مسلمانوں کے سمجھانے پر انہوں نے اپنے رویہ میں ایک مصالحانہ، مگر سطحی تغیر پیدا کیا تو ہم نے اسی کو غنیمت سمجھ کر مسلمانوں کو ان کے ساتھ فیاضی و عالی حوصلگی کا سلوک کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر افسوس ہے کہ انجمن اسلامیہ کی طرف سے ہندو سبھا کی اپیل مسترد کردئے جانے کے بعد ہندو اخبارات اور لیڈروں نے ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ اس سے ہماری اس اپیل کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی اور اب ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مسلمانان دہلی اس کو مسترد کردینے میں کسی طرح بھی ملامت کے مستحق نہیں ہیں۔ آج ہندو اخبارات یہ کہہ کہہ کر مسلمانوں کو گالیاں دے رہے ہیں کہ انہوں نے اس اپیل کو بھی مسترد کردیا جو ان کی فیاضی و شرافت سے کی گئی تھی، مگر اس استرداد پر ان کا اس طرح کے سب و شتم کی بوچھاڑ کردینا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے یہ اپیل دراصل اپیل کی اسپرٹ میں نہیں کی تھی، بلکہ محض حصول غرض کے ایک حیلہ کے طور پر کی تھی۔ ان کی گالیوں کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ دراصل ایک رعایت طلب نہیں کر رہے تھے، بلکہ ایک حق مانگ رہے تھے اور اس لحاظ سے ان کی اپیل وہ اپیل نہیں تھی جو ایک فیاض قوت سے کی جاتی ہے، بلکہ دراصل وہ اپیل تھی جو ایک ڈاکو سے کی جاتی ہے۔ وہ مسلمانوں کا حق تسلیم کرکے ان سے دوستانہ مراعات کے طالب نہیں تھے، بلکہ انہیں غاصب سمجھ کر محض اس لیے اپنا "حق" مانگ رہے تھے کہ اسے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی، تو وہ اپنی اپیل مسترد ہونے پر سب و شتم کے بجائے صبر و شکر سے کام لیتے، کیونکہ گالم گلوچ اور مقاطعہ رعایت نہ کرنے کے جواب میں نہیں، بلکہ صرف حق نہ دینے ہی کے جواب میں ہوا کرتا ہے۔ پس اگر ایسی حالت میں مسلمانان دہلی ہندو سبھا کی اپیل کو منظور کرلیتے، تو یہ ان کی انتہائی رواداری و عالی حوصلگی ہوتی ورنہ وہ کسی حیثیت سے بھی اخلاقاً اس پر مجبور نہیں تھے۔

☐ امیر علی کی زود پشیمانی

[۱۴ر جولائی ۱۹۲۵ء]

حج کے معاملہ میں امیر علی نے جتنی پلٹنیاں کھائی ہیں، انہیں دیکھ کر دنیا حیران

ہوئی جاتی ہے۔ ابھی کچھ مدت تک تو یہ کیفیت تھی کہ شریف صاحب اپنے حربی حقوق کی حفاظت کے لیے شہور حرام کی عزت اور فریضہ حج کے احترام کو بھی ٹھکرانے کے لیے تیار تھے اور صاف طور پر نوٹس دے دیا تھا کہ ہم بندرگاہ رابغ پر کسی قسم کے سامان کی ایک بوری بھی نہیں اترنے دیں گے یا اب یہ کیفیت ہے کہ وہ تمام جنگی نزاکتیں ختم ہو گئیں، حاجیوں کے ورود سے جو خطرات تھے، وہ دور ہو گئے۔ وہی خطوط حرب جن سے شوال و ذیقعد کے مہینوں میں گزرنا بالکل محال تھا، اب ذی الحجہ میں قابل گزر بن گئے ہیں اور نہ صرف یہ کہ برطانوی قونصل کی رپورٹ کے مطابق دو سو پچاس حاجیوں کو جدہ کے راستہ پوری آزادی کے ساتھ مکہ معظمہ جانے کی اجازت دے دی گئی، بلکہ اب طاہر الدباغ صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ تمام حاجیوں کو جدہ سے واپس آنے کی دعوت بھی دے دی گئی ہے۔

ہم امیر علی کے ساتھ بے جا بدگمانی نہیں کرنا چاہتے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا یہ تغیر حسن نیت پر مبنی ہو اور وہ آخر وقت میں اپنی پوزیشن پر غور کر کے پچھلی غلطیوں کی تلافی پر آمادہ ہو گئے ہوں، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو انتہائی حد تک ناراض کرنے کے بعد اگر اب شریف صاحب کے دل میں انہیں راضی کرنے کی کوئی حقیقی خواہش بھی پیدا ہوئی ہے، تو وہ "بعد از خرابی بصرہ خواجہ بیدار شد" کی مصداق ہے اور یقیناً اس قدر بعد از وقت ہے کہ اب اس سے عام قلوب میں متعدد قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ امیر علی کے لیے تنازل کا بہترین وقت وہ تھا جب شہور حرام کی عزت اور فریضہ حج کے احترام کا واسطہ دے کر مجلس خلافت نے ان سے جدہ کا راستہ کھول دینے کی استدعا کی تھی پھر اگر اسے بھی انہوں نے بصیرت کی کمی کے باعث کھو دیا تھا، تو وہ کم از کم سفر حج شروع ہو جانے کے بعد رابغ کے محاصرہ کا اعلان نہ کرتے اور یہ نوٹس نہ دیتے کہ ہم ساحل حجاز پر کوئی سامان نہ اتارنے دیں گے۔ ان کارروائیوں نے ان کو تمام مسلمانوں کی نگاہوں میں مبغوض بنا دیا ہے اور اب ان کے بعد یہ جدید تغیر عام لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا کر سکتا ہے کہ جب وہ حج کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور ان کا حریف اس معاملہ میں بھی ان سے بازی لے گیا، تو انہوں نے کم از کم وہی مالی فوائد حاصل کر لینا مناسب سمجھا جو حاجیوں کے گذرنے سے جدہ کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

* عازمین حج کی شکایات

حجاج کے ساتھ بندرگاہوں میں جو بدسلوکیاں کی جاتی ہیں ان سے تقریباً ہر وہ شخص واقف ہے جس نے حج کیا ہے یا کبھی خدمت حجاج میں حصہ لیا ہے۔ جس وقت سے ایک مسلمان حج کی نیت کرکے اپنا گھر چھوڑتا ہے' اسی وقت سے اس کے ساتھ ایسے توہین آمیز اور تکلیف دہ برتاؤ کا آغاز ہو جاتا ہے جس سے ایک شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ نعوذ باللہ شاید یہ شخص کوئی بہت ہی برا کام کرنے جا رہا ہے جس میں اس کی ہمت شکنی کرنا اخلاقاً ضروری سمجھا گیا ہے۔ ہم نے خود بمبئی میں "بھپارہ" کا منظر دیکھا ہے جہاں سخت گرمی کے موسم میں عین دوپہر کے وقت غریب حاجی طبی معائینہ کے لیے ایک ٹین کے بند سائبان میں بیٹھے ہوئے تھے' ان کے لیے کوئی فرش نہ تھا' ہر قسم کے معزز اور غیر معزز آدمیوں کو زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ ان کے لیے اس شہر میں جہاں معمولی سے معمولی سرکاری دفاتر کے لیے بھی بجلی کے پنکھے لگے ہوئے ہیں' گرمی کی شدت سے بچنے کا کوئی انتظام نہ تھا' نہایت توہین آمیز طریقہ سے ان کا معائنہ کرکے بلا امتیاز زن و مرد ان کے بدن پر مہریں لگائی جا رہی تھیں اور اس کے بعد اسی تپتی ہوئی دوپہر میں انہیں اپنا اسباب لادے ہوئے ڈیڑھ دو میل دور الگزنڈرا ڈاک پر جانا پڑتا تھا۔ اس طرز عمل کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں سمجھے جا سکتے کہ منتظمین حکومت اپنے نزدیک حاجیوں کو نہایت ذلیل نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان سے انسانوں کا سا سلوک کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

انہی بدسلوکیوں کی طرف مولانا الحاج ابوالمعارف محمد عرفان صاحب نے اپنے ۲۵ر ذی قعدہ کے گرامی نامہ میں اشارہ کیا تھا جو ۱۰ر ذی الحجہ کے "جمعیتہ" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مولانا فرماتے ہیں:۔

> "قرنطینہ میں عازمین حج کو جرائم پیشہ ڈاکوں' چوروں اور اخلاقی مجرموں کی طرح زمین پر قطار در قطار دو رویہ بٹھا دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر آکر ان کا طبی معائنہ کرکے ان کی دونوں کلائیوں پر مہریں لگوا دیتا ہے۔ یہی طرز عمل اور سلوک ہم لوگوں کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔ مولانا شفیع داؤدی بھی باوجودیکہ

وہ لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک معزز رکن ہیں، ہمارے ساتھ زمین پر بیٹھے"۔

ہمیں مسرت ہے کہ مسٹر محمد یعقوب صاحب ممبر اسمبلی نے اس باب میں اپنے اسلامی فرض کو محسوس فرمایا ہے اور حکومت کو اس ناروا طرز عمل کی طرف متوجہ کرنے کے لئے چند سوالات کا نوٹس دیا ہے جو اسی اشاعت میں کسی اور جگہ مندرج ہیں۔

* محکمہ حفاظت حج کے عمال

لیکن اس سلسلہ میں ہم انتظام حج کی ایک اور کمزوری کی جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں جسے آنریبل ممبر نے نظرانداز کردیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت حفاظت حج کے محکمہ میں عموماً ایسے لوگوں کو مقرر کرتی ہے جو مذہبیت سے بالکل عاری اور زیادہ تر محکمہ پولیس یا سی۔ آئی۔ ڈی کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالمعارف نے اپنے اسی مکتوب گرامی میں جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے، آگے چل کر بندر کراچی کے محافظ حجاج خان صاحب عبدالقادر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ذمہ دار پوزیشن پر جو شخص فائز کیا گیا ہے، وہ مذہب اسلام کے مراسم و روایات سے یکسر جاہل، فریضہ حج کے لوازم و متعلقات سے بالکل ناواقف اور فرنگیت میں بالکل ڈوبا ہوا ہے۔ مولانا نے صاف لکھا ہے کہ ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک کارروائی سے یہ بات ٹپکی پڑتی تھی کہ وہ حج کے متعلق سرکاری قوانین کے معنی حجاج کے راستہ میں ناقابل برداشت مشکلات حائل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے۔ مولانا اپنے ایک اور گرامی نامہ میں جو رابغ سے آیا ہے اسی محکمہ کے ایک دوسرے بزرگ مسٹر یسین خان کا ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیر الحجاج صاحب حاجیوں کی خدمت و رہنمائی کرنے کی بجائے کسی دریائی تفریح کے لئے عدن سے "اکبر" پر سوار ہوئے تھے اور انہیں حاجیوں کی سود و بہبود، ان کی ضروریات و تکالیف اور اپنے دوسرے فرائض سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ ہم حیران ہیں کہ حفاظت حج کے محکمہ سے ان لوگوں کو کیا تعلق ہے اور آخر حکومت ایسے مناصب پر لوگوں کو مقرر کرتے وقت کسی موزونیت کو بھی پیش نظر رکھتی ہے یا نہیں؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، محافظ حجاج کے فرائض انجام دینے کے لئے سوٹ بوٹ، فرنگیت اور حاکمانہ نخوت کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے اور اگر اس

عہدہ کے لئے صرف انہی چیزوں کو معیار قابلیت سمجھا جاتا ہے، تو یہ یقیناً حکومت کی انتہائی خوش فہمی ہے، کیا ہم امید کریں کہ حکومت محکمہ حفاظت حج کی اصلاح پر بھی مناسب توجہ دے گی؟

☐ حاجیوں کے لئے بندرگاہ کلکتہ کا افتتاح

{ ۱۸ر جولائی ۱۹۲۵ء }

حکومت نے عازمین حج کے لئے کلکتہ کی بندرگاہ کھول کر ایک بڑی ضرورت کو پورا کردیا ہے۔ صوبہ بنگال، بہار اور آسام کے حاجیوں کو بمبئی اور کراچی جانے میں سخت تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں اور یہ بات بالکل نامناسب معلوم ہوتی تھی کہ جب ان کے قریب ایک بندرگاہ موجود ہے، تو وہ کیوں خواہ مخواہ ایک دوردراز کا سفر کرکے دوسری بندرگاہ تک جانے پر مجبور کئے جائیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس سال اگر اس غلطی کا ازالہ نہ کیاجاتا، تواندیشہ تھا کہ لوگوں کی تکلیفیں پہلے سے بہت زیادہ بڑھ جاتیں، کیونکہ کئی سال کے بعد حجاز میں امن و امان قائم ہوا ہے۔ عہد شریفی کے مظالم سے جو ہیبت دلوں پر بیٹھ گئی تھی، وہ دور ہوگئی ہے اور عام اسلامی پبلک میں فریضہ حج ادا کرنے کا شوق کثرت سے پیدا ہورہا ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ اس مرتبہ حاجیوں کی تعداد سالہائے گزشتہ سے بہت زیادہ ہوگی، اس لئے ہمیں مسرت ہے کہ حکومت نے بروقت اس ضرورت کو محسوس کرکے اسے پورا کردیا۔

مگر ہمارے نزدیک چند اور باتیں بھی ہیں جن کی طرف حکومت کو توجہ کرنی چاہئے۔ اس کا کام محض راستہ کھول دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ حاجیوں کی دیگر مشکلات کو دور کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً چھوٹے بچوں کا کرایہ پورا لیاجاتا ہے، حالانکہ وزن، پھیلاؤ اور متعلقات و لوازم ہر اعتبار سے ایک بچہ بھی اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے پورے آدمی کے برابر کرایہ نہ لیا جائے، بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کا کرایہ معاف ہی کردیا جائے، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو، توکم از کم ان کا نصف کرایہ ہونا چاہئے۔ اسی طرح ایک دوسری شکایت یہ ہے کہ جہازوں کا کرایہ ایام جنگ سے بھی زیادہ ہے۔ کلکتہ سے جدہ تک درجہ ادنیٰ کا کرایہ آمدورفت ۲۵۰ روپے مقرر کیاگیا ہے جو یقیناً زائد

ہے پھر کلکتہ اور بمبئی کے درمیان کرایہ کا فرق بھی ضرورت سے زیادہ رکھا گیا ہے جو شخص ۵۵ روپے زیادہ دے کر کلکتہ سے جہاز پر جائے وہ پچیس تیس روپے زیادہ خرچ کر کے بمبئی سے سوار ہونے میں زیادہ کفایت سمجھے گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ جہازوں میں گنجائش سے زیادہ مسافر بھر لئے جاتے ہیں جس سے علاوہ جگہ کی تنگی اور تکلیف کے حفظان صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ اس باب میں حکومت کو کمپنیوں کی نگرانی کرنی چاہیے تاکہ وہ حد سے زیادہ طمع نہ کرنے پائیں۔ قرنطینہ کی مدت میں بھی تخفیف کی ضرورت ہے۔ اگرچہ قرنطینہ کا طریقہ ہی نہایت نفرت انگیز اور قابل اعتراض ہے' لیکن اگر حکومت کو ہندوستان کے نیم وحشیوں پر یہ قید لگانے کی ایسی ہی کچھ ضرورت محسوس ہوتی ہے' تو اس کے لئے ۵ دن کی مدت بہت زیادہ اور سخت تکلیف دہ ہے۔ گزشتہ ایام میں ایک دن مقرر تھا وہی اب بھی کردیا جائے' تو کم از کم قابل برداشت ہوجائیگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جہاز میں عورتوں اور مردوں کے حصے الگ کردیئے جائیں۔ شرعی حیثیت سے مسلمان عورتیں غیر محرم مردوں سے پردہ کرنے پر مجبور ہیں اور ایسی حالت میں جبکہ ہر طرف مرد ہی مرد ہوں' ان کے لئے پردہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا' لیٹنا' سونا اور ضروریات پوری کرنا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔ مردوں کے ساتھ مخلوط رہ کر بے پردہ عورتوں کے لئے بھی تاوقتیکہ وہ بالکل بے حیا نہ ہوں' سفر کرنا تکلیف دہ ہے' کیونکہ کچھ دیر کے لئے مردوں کے سامنے بے نقاب ہو کر بیٹھ جانا اور چیز ہے اور رات دن ان کے ساتھ رہ کر بے تکلف لیٹنا' بیٹھنا اور چیز ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کی اس تکلیف کو دور کرنے کا انتظام کرے۔

ہمیں مسرت ہے کہ کلکتہ خلافت کمیٹی نے اپنے شہر کی بندرگاہ کا افتتاح ہوتے ہی حجاج کی آسائش کا انتظام شروع کردیا ہے۔ اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ ایک اشتہار درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجیوں کو اسٹیشن پر اتارنے' انہیں آرام دہ مسافر خانوں میں بلا معاوضہ ٹھہرانے' اور پردہ نشین عورتوں کے لئے پردہ دار مقامات مہیا کرنے اور انہیں جہازوں پر آرام کے ساتھ سوار کرانے کا پورا انتظام ہے۔ اس کام کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جو انہیں ہر قسم کی پریشانیوں سے محفوظ رکھے گی۔ انکی خدمات کے لئے اس کے سیکرٹری جناب محمد محسن خان صاحب کی محنت قابل تعریف ہے۔

* مسودہ دولت متحدہ ہند

مسز بسنٹ نے کامن ویلتھ آف انڈیا بل (مسودہ دولت متحدہ ہند) کے نام سے ہندوستان کے آئندہ سوراج کا جو نظام حکومت مرتب کیا تھا' اسے حال میں چالیس بیالیس ہندوستانی لیڈروں نے ایک طویل محضرنامہ کے ساتھ حکومت ہند کی توجہ کے لئے پیش کیا ہے اور اب مسز بسنٹ اس زبردست تائید سے اپنی پوزیشن کو مضبوط کر کے انگلستان تشریف لے گئی ہیں۔ اگرچہ اس محضرنامے میں ہندوستان کے قومی مطالبات کی نہایت صحیح ترجمانی کی گئی ہے اور حکومت برطانیہ کو صرف اسی بات پر ملامت نہیں کی گئی ہے کہ وہ ہندوستان کو آزادی دینے کی طرف اقدام کرنے کی بجائے انگریز نوجوانوں سے عمر بھر کی روٹیوں کا وعدہ کر کے اس کی غلامی کی زنجیریں مضبوط کر رہی ہے' بلکہ اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ اسے ہندوستانی مفاد کی حفاظت میں قطعاً ناکامی ہوئی ہے اور اگر باعزت طور پر مساوات کے روابط کو قائم نہ کیا گیا' تو ہندوستان سے اس کا تعلق ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جانے کا اندیشہ ہے' مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جس جماعت نے اس محضرنامہ پر دستخط کئے ہیں' وہ کسی حیثیت سے بھی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں کہ چند معروف شخصیتوں کے سوا اس میں جتنے لوگ ہیں' سب غیر موزوں اور غیر مقبول ہیں' بلکہ ہندوستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں میں سے کسی کے بھی ذمہ دار لیڈروں نے اس پر دستخط نہیں کئے ہیں۔ کانگریس کے چند ممبر اس میں شریک ہیں' مگر خود صدر یعنی گاندھی جی اس سے الگ ہیں۔ سوراج پارٹی کے بھی چند ارکان نے دستخط کئے ہیں' مگر اس کے صدر و سیکرٹری اس میں شامل نہیں ہیں۔ انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بھی بعض ممبروں نے اس میں شرکت کی ہے' مگر اس کے صدر مسٹر جناح نے نہ صرف دستخط کرنے سے انکار کر دیا' بلکہ اعلانیہ اس سے اظہار اختلاف کیا۔ اس کے علاوہ اس میں مسلمانوں کی نمائندگی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ مولانا محمد علی' مولانا ابوالکلام' ڈاکٹر کچلو' حکیم اجمل خاں' ڈاکٹر انصاری کسی نے بھی اس پر دستخط نہیں کئے ہیں' حالانکہ ملکی سوراج کے مطالبہ میں ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ شریک بھی ہو جائے تو اس طرح بھی اسے پورے ملک کا مطالبہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس مسودہ آئین کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے قومی

مطالبات کو تقریباً بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے پوری اسکیم میں قلیل التعداد جماعتوں کے حقوق کی حفاظت کا کہیں ذکر نہیں ہے اور غالباً یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اقلیتیں بالکل مطمئن ہیں یا یہ کہ ان کے کوئی حقوق ہی نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مسز بسنٹ نے اس قدر خودرائی سے کام لے کر کوئی عقلمندی نہیں کی ہے اور اس کا لازی نتیجہ ان کی ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا۔

* اتحاد اسلامی کی بے نظیر قوت

ریفیوں نے ہسپانیہ و فرانس جیسی عظیم الشان قوتوں کو منہ کے بل گرا کر جس حیرت انگیز فوجی تفوق کا ثبوت دیا ہے، اس پر آج تمام دنیا انگشت بدندان ہے، مگر یہ حقیقت ابھی تک اس سے پوشیدہ ہے کہ ان معجزنما فتوحات میں **ریفیوں** کی طبعی شجاعت، جسمانی قوت اور حربی فراست سے زیادہ اسلام کی زبردست اعجازی قوت کار فرما ہے۔ واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر **ریفیوں** کی مدد پر اسلام نہ ہوتا، تو وہ اپنی غیر معمولی شجاعت و بسالت کے باوجود ایسی زبردست سلطنتوں کو شکست دینے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتے۔ ان کی کامیابی کا اصل راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ تمام شمالی افریقہ اسلامیت کے رشتہ سے ان کا حامی و مددگار ہے اور جب سے فرانس نے ان سے جنگ چھیڑی ہے، مراکش کے اکثر قبائل نے ان کی حمایت پر علم بغاوت بلند کردیا ہے اور جو قبائل تلوار کے ڈر سے اس کا ساتھ دے رہے ہیں، وہ بھی دل سے ریفیوں کے ہمدرد ہیں۔ حال میں ایک یورپین اخبار نے اپنے نامہ نگار کے حوالہ سے غازی عبدالکریم کا وہ دعوت نامۂ جہاد شائع کیا ہے، جس پر مراکش میں فرانس کے خلاف اندرونی بغاوت برپا ہوگئی ہے۔ اس کے سادہ اور مؤثر الفاظ قابل غور ہیں۔

> ”بھائیو! ہم اور تم مذہب و وطن دونوں حیثیتوں سے بھائی بھائی ہیں۔ اب تک دشمن نے ہم کو الگ الگ بانٹ رکھا تھا، مگر اب ہم متحد ہونا چاہتے ہیں۔ اور اگر خدا نے چاہا، تو ضرور ہو کر رہیں گے۔ تمہیں چاہیے کہ جس طرح بھی ہوسکے، دشمنوں کو اس ملک سے نکال باہر کرو اور اپنے آپ کو ان کی تفرقہ اندازی کا شکار نہ بننے دو۔ ہم تمہارے دینی و قومی بھائی ہیں اور دشمن تمہارا

کوئی بھی نہیں ہے۔ اس کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے عجلت اور بہادری کے ساتھ جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اشتہار کا یہ اثر ہے کہ مراکش کے قبائل جوق در جوق امیر عبدالکریم کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں اوراگران کے ذوق جہاد کا یہی حال رہا' تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ عنقریب سارا مراکش فرانس کی غلامی سے آزاد ہونے والا ہے"۔

ایک طرف مشرق اقصیٰ کی یہ نوخیز اسلامی قوت اس شان سے ابھر رہی ہے اور دوسری طرف وہ سنوسی تحریک جو یورپ کے استعماری اقدامات کے ابتدائی دور میں اس کے مقابلہ کے لئے امیر عبدالقادر الجزائری کی مجاہدانہ سرفروشیوں کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ تمام شمالی و وسطی افریقہ کو ایک فیصلہ کن مقابلہ کے لئے تیار کر رہی ہے۔ طرابلس' تیونس' الجزائر اور مراکش سب کے سب ایک اندرونی آگ سے بھڑک رہے ہیں اور کیا عجب کہ ان سب کے اتحاد سے غازی عبدالکریم کا وہ معنی خیز جملہ ایک تاریخی صداقت بن کر رہے جو انہوں نے ایک یورپین نامہ نگار سے کہا تھا کہ:۔

"میں اپنی حدود مملکت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی سلطنتیں اپنی ابتداء میں اتنی ہی حقیر تھیں جتنی میری سلطنت ہے"۔

* مولانا محمد علی کی علالت

۱۴ر جولائی کے ہمدرد میں "مولانا محمد علی کی صحت" کے عنوان سے مولانا شوکت علی کا ایک مضمون پڑھ کر ہمیں سخت رنج ہوا۔ اگرچہ اب مولانا کی حالت درست ہو گئی ہے' مگر اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درستی اس وقت تک بالکل عارضی ہے جب تک ان پر موجودہ ناقابل برداشت ذمہ داریوں کا بار ہلکا نہیں ہوتا۔ مولانا کی حساس طبیعت کے لئے ہندوستان کی موجودہ افسوسناک حالت ہی کچھ کم باعث تکلیف نہیں کہ اس پر کامریڈ" اور ہمدرد کا زبردست بوجھ بھی ان کی تنہا ذات پر پڑ جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اکثر اوقات مولانا کو اپنے خون حیات سے کامریڈ کی آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ بی اماں کی بیماری کے زمانہ میں انہوں نے عین ان کے انتقال کے وقت تک کامریڈ مرتب کیا' رمضان کے مہینہ میں قیام اللیل اور روزے رکھنے کے ساتھ رات رات بھر بیٹھ کر کامریڈ کے لئے مضامین لکھے۔ گزشتہ بقر عید کے زمانہ میں انہوں نے مخالفوں کی زبردست کوششوں

کے باوجود عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان تھک کوششیں کیں اور پھر پورا اخبار بھی تنہا مرتب کیا۔ ایسی حالت میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ذیابیطس کا مریض کب تک اپنی صحت قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

مولانا شوکت علی نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے اپنے عزیز بھائی اور اسلامی ہند کے مایۂ ناز فرزند کی زندگی کے لئے جن خطرات کا اظہار کیا ہے، وہ ہمارے لئے بے حد رنج و الم کا باعث ہیں۔ اگر مسلمانوں نے خصوصاً اور تمام باشندگان ہند نے عموماً اس طرف جلد توجہ کر کے مولانا موصوف کی مشکلات کو کم نہ کیا، تو ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ایک نایاب گوہر کو کھو دیں گے جو انہیں بار بار میسر نہیں آسکتا اور موجودہ حالات میں ان مشکلات کو کم کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں "ہمدرد" و "کامریڈ" کی ترقی اشاعت کے لئے کوشش کریں۔

❑ انتقال پر ملال

[۲۲ر جولائی ۱۹۲۵ء]

ہمیں افسوس ہے کہ مولوی نور محمد صاحب جو ایک باکمال بزرگ تھے، ۱۵ر جولائی کو انتقال فرما گئے۔ وہ متعدد درسی رسائل کے مصنف و مؤلف تھے۔ لدھیانہ میں ۴۰ برس سے قرآن کا درس دیتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے وہاں کئی مدرسے جاری کرائے تھے جن میں کم سن طلباء کو بہت سہل طریقہ پر قرآن حکیم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس وقت ان کے مدرسہ ام المدارس میں ۵۰ طلباء قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایسے بزرگ کا انتقال ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

* سید حبیب کو سزا

ہمیں یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ پنجاب ہائیکورٹ نے اس نوٹ کی بنا پر جو ۳۰ر جون کے "سیاست" میں مسٹر جسٹس ظفر علی کے فیصلہ پر لکھا گیا تھا، جناب سید حبیب صاحب کو ایک ماہ قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی ہے۔ سید صاحب کی

جانب سے باقاعدہ اظہار اعتراف و ندامت اور طلب عفو کے باوجود اس قسم کی سزا دینا ممکن ہے کہ قانوناً جائز ثابت کیا جاسکتا ہو، مگر اخلاقاً ہر شخص اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہے کہ یہ فیصلہ بھی اسی پالیسی کے ماتحت ہے جو سرکاری افسروں کے اعمال پر نکتہ چینی کرنے والے اخبارنویسوں کی زبان بندی کرنے کے لئے حکومت نے اختیار کر رکھی ہے۔ "سیاست" کے جن الفاظ کو توہین آمیز قرار دیا گیا ہے، ان کے متعلق خود سید صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ وہ قابل اعتراض ہیں، لیکن ان الفاظ کو واپس لینے اور ان پر معافی مانگ لینے کے بعد اخلاقاً کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ جاتی، جو قابل اعتراض ہو اور اس کے بعد سزا دینا صرف ایک درشتی و خشونت ہے، جو اگر کسی طرح منصفانہ ثابت کی جاسکتی ہے، تو وہ صرف حاکمانہ رعب قائم کرنے کی مصلحت ہے۔ ہم معزز معاصر "ہمدرد" کی اس تجویز سے بالکل اتفاق کرتے ہیں کہ سید صاحب پر جو ایک ہزار کا جرمانہ عائد کیا گیا ہے اسے ادا کرنا مسلمانان دہلی کا اخلاقی فرض ہے۔

* ہنگامہ کلکتہ اور ہندو سبھا

اسی اشاعت میں ہنگامہ کلکتہ کی رپورٹ درج کی جاتی ہے جو ہمارے ایک نہایت معتبر نامہ نگار نے ہمیں بھیجی ہے۔ ہم اس داغ کو تازہ نہیں کرنا چاہتے اور نہ مسلمانوں کے دل میں کوئی انتقام کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہندوؤں کی جانب سے اس ظلم صریح پر اظہار ندامت کیا جاتا، تو شاید ہماری زبان پر اس واقعہ کا ذکر بھی نہ آتا، مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ برادران ہنود نہ صرف اس پر کسی ندامت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ ان کی طرف سے اس الزام کو دھونے اور اس کی ذمہ داری کا بار غریب مسلمانوں پر ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس لیے ہم اصل حقائق کو پبلک کے سامنے لانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

۱۷ر جولائی کے "تیج" میں ہندو سبھا کلکتہ کی جانب سے ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئی ہے اور اس میں نہایت بے باکی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ گاندھی جی کا بیان غلط ہے، انہوں نے نتیجہ پر پہنچنے میں جلد بازی کی ہے اور وہ بڑا بازار ہندو سبھا کے ڈیپوٹیشن سے وعدہ کر چکے ہیں کہ اگر صحیح واقعات مجھ پر ظاہر کر دیئے گئے، تو میں اپنے بیان کی تردید

کردوں گا۔ نیز ایک طویل من گھڑت داستان سے ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوؤں پر سارا قصور تھوپنا سراسر ظلم ہے اور اس جرم میں مسلمان بھی برابر کے شریک ہیں' کیونکہ انہوں نے جس جگہ گائے ذبح کی ہے' وہ بالکل ہندو بارکوں کے سامنے تھی' لیکن ہم نہایت صفائی کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندو سبھا نے اپنے بیان میں انتہائی افتراپردازی اور تلبیس سے کام لیا ہے۔ گاندھی جی' مولانا ابوالکلام اور مسٹر سین گپتا جیسے معتبر اور غیر جانبدار آدمیوں کے مقابلہ میں اس کی تحقیقات کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی اور جبکہ عین وقت پر کامل جانچ پڑتال کے بعد مسٹر گپتا اور مسٹر ٹیگریٹ نے گاندھی جی کے سامنے یہ متفقہ شہادت دی کہ قصور سراسر ہندوؤں تھا اور خود گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام نے موقع کا معائنہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندو کے مکانات کے سامنے گائے کا ذبح کیا جانا بالکل ایک فرضی افسانہ ہے' تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہندو سبھا کیونکر ان صریح بیانات کو غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز جسارت یہ ہے کہ ہندو سبھا نے بڑا بازار ڈیپوٹیشن کا بیان اس انداز میں کیا ہے کہ گویا اس نے گاندھی جی کو ایک حد تک معقول کردیا اور ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ اپنے بیان کی تردید کردیں گے' حالانکہ گاندھی جی نے ینگ انڈیا کی تازہ اشاعت میں جو مضمون ہنگامہ خضرپور کے متعلق لکھا ہے' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو وفد ان کے پاس گیا تھا' اس کا مقصد ان سے یہ شکایت کرنا تھا کہ انہوں نے ہندوؤں پر الزام رکھ کر مسلمانوں کی ہمت افزائی کی ہے اور اب اس سے جری ہو کر وہ ہمیں مارنے لگیں گے۔ اس سے نہ صرف اس ڈیپوٹیشن کی حقیقت معلوم ہوتی ہے' بلکہ یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان تمام کوششوں کا مقصد اعلان حق نہیں ہے' بلکہ ہندوؤں کے جرائم پر پانی پھیر کر مسلمانوں کو بدنام کرنا ہے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندو قوم کے ارباب بست و کشاد کی یہی ذہنیت تمام فسادات کی ذمہ دار ہے کیونکہ جب تک غنڈوں اور بدمعاشوں کی حرکات پر پانی پھیر کر ان کی سرکوبی نہ کی گئی تب تک ایسے فسادات کا سدباب نہ ہو سکے گا۔

یوم عاشوراء

{ ۲۹ر جولائی ۱۹۲۵ء }

عن ابی ہریرۃ ان رسول ﷺ قال فلان الصیام بعد شہر رمضان شہراللہ المحرم والفضل الصلوۃ بعد المکتوبہ صلوۃ الیل

"حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ! حضور رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ رمضان کے بعد باعتبار فضیلت ماہ محرم کے روزے ہیں اور نماز مفروضہ کے بعد تہجد کی نماز کا مرتبہ ہے"۔ (ترمذی، نسائی)

مسلم اور ابوداوٗد میں ہے کہ رسول خدا ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ فرض کے بعد کون سی نماز اور رمضان کے روزوں کے بعد کون سے روزے فضیلت میں زیادہ ہیں، تو حضور ﷺ نے تہجد کی نماز اور محرم کے روزے فرمائے۔ ترمذی میں جو روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

یارسول اللہ ﷺ ای شہر تا مرنی ان اصوم بعد شہر رمضان قال ان کنت صائما مابعد شہر رمضان شہر محرم قبل اللہ تعالیٰ فیہ یوم تلب فیہ ای قوم ویتوب فیہ علی قوم آخرین

"یعنی میں نے دریافت کیا کہ آپ مجھے رمضان کے بعد کون سے مہینے کے روزوں کا حکم فرماتے ہیں، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو روزے رکھنا چاہتا ہے تو وہ محرم کا مہینہ ہے اس پر خدا نے ایک قوم کی توبہ قبول کی تھی اور ایک اور قوم کی توبہ اسی دن قبول کرے گا"۔

شیخ حسن کاوی حمراوی اپنے رسالہ نفحات نبویہ فی فضائل عاشوریہ میں فرماتے ہیں۔

**وقد ورد فی فضل عاشورا آثار کثیرۃ منها انه تاب علی آدم و کان خلقه فیه
وفیه خلق العرش والکرسی و السموات و الارض و الشمس والقمر و
النجوم و الجنه وولد ابراهیم الخلیل فیه و کان نجاۃ من النار فیه و کان نجاۃ
موسی و من معه و اغرق فرعون و من معه فیه و فیه استقرت سفینة نوح
علی الجودی و اعطی فیه سلیمان الملک العظیم و اخراج یونس من بطن
الحوت و رد بصر یعقوب علیه و اخرج یوسف من الجب و کشف ضر ایوب
عنه و اول مطر نزل من السماء الی الارض کان یوم عاشوراء**

"یعنی عاشورۃ محرم کی فضیلت میں بہت سے آثار مروی ہیں۔ مثلاً اس دن حضرت آدم کی توبہ قبول ہوئی اور اسی دن وہ پیدا بھی ہوئے تھے۔ اسی دن عرش، کرسی، آسمان اور زمین، چاند، سورج اور تارے پیدا کئے گئے۔ اسی دن جنت پیدا کی گئی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اسی دن پیدا ہوئے اور اسی دن نمرود کی آگ سے نجات حاصل ہوئی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ و السلام اور ان کے حواری اسی دن فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئے اور فرعون معہ اپنے اعوان و انصار کے غرق کیا گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر اسی دن ٹھہری اور حضرت سلیمان کو ایک ملک عظیم کا اسی دن مالک بنایا گیا۔ حضرت یونس نے مچھلی کے بطن سے اس دن نجات پائی اور اسی دن حضرت یعقوب کی آنکھوں کا نور دوبارہ لوٹایا گیا۔ حضرت یوسف بھی اسی دن کنعان کے کنویں سے نکالے گئے تھے اور حضرت ایوب علیہ السلام نے اسی دن اپنے مہلک مرض سے شفا پائی۔ آسمان سے زمین پر پہلی بارش عاشورہ ہی کے روز ہوئی"۔

* دسویں تاریخ کا روزہ

رمضان کی فرضیت سے پہلے دسویں تاریخ کے روزہ کا خاص اہتمام تھا۔ رسول خدا ﷺ خود بھی روزہ رکھتے تھے اور صحابہ کو بھی اس دن روزہ کی ترغیب و تحریص دلاتے تھے، لیکن رمضان کی فرضیت کے بعد آپ نے تعاہد اور مبالغہ کو ترک کر دیا، بلکہ ہر شخص کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے اس دن کا روزہ رکھے اور چاہے ترک کر دے۔ مسلم شریف میں جابر بن سمرہ سے روایت ہے۔

كان رسول الله ﷺ يا مر بصيام يوم عاشوراء و يحثنا عليه و يتعا هدنا عنده فلما فرض رمضان لم يامر نا ولم ينهنا منه ولم يتعا هد

”یعنی حضور رسول خدا ﷺ صوم یوم عاشورہ کے متعلق ہم کو ترغیب دیتے تھے اور خاص طور پر روزے کا وعدہ کراتے تھے لیکن جب رمضان فرض ہو گیا، تو آپ نے نہ تو ہم کو منع کیا اور نہ امر کیا، بلکہ ترغیب و تعاہد کو ترک کر دیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

كان عاشورا يصام قبل رمضان فلما نزل رمضان كان من شاء صام و من شاء افطر

”رمضان کی فرضیت سے پیشتر یوم عاشوراء کا روزہ رکھا جاتا تھا، لیکن رمضان کی فرضیت کے بعد یہ روزہ اختیاری رہ گیا یعنی مستحب“۔

ایک اور روایت حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا سے منقول ہے۔

كانو ايصو مون عاشوراء قبل ان يفرض رمضان و كان يوما تسترفيه الكعبه قالت فلما فرض رمضان قال رسول ﷺ من شاء ان يصومه فليصمه و من شاء ان يتركه فليتركه

"یعنی رمضان کی فضیلت سے قبل عاشوراء کا روزہ سب لوگ رکھتے تھے اس دن کعبہ شریف پر پردہ ڈالا گیا تھا لیکن جب رمضان فرض ہو گیا، تو حضور ﷺ نے فرمایا جس کا جی چاہیے، وہ روزہ رکھے اور جو ترک کرنا چاہے، وہ ترک کر دے"۔

و فی روایۃ

عن ابن عمر ذکر عند النبی ﷺ یوم عاشوراء فقال ذاک یوم یصومہ اهل الجاهلیه فمن شاء صامه و من شاء ترکه

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے یوم عاشورہ کا ذکر کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ اس دن کا روزہ زمانہ جاہلیت میں رکھا جاتا تھا جس کا جی چاہے، رکھے اور جس کا جی چاہے، افطار کرے"۔

و عن ابی موسی رضی اللہ عنہ قال کان یوم عاشوراء یوم یعظمه الیهود و یتخذونه عیدا یقال رسول ﷺ

"حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہود عشرہ کے دن کی عظمت کرتے تھے اور اس دن کو انہوں نے عید بنا رکھا تھا۔ حضور رسول خدا ﷺ نے فرمایا یہود ایک دن کا روزہ رکھتے تھے ہم دو دن یعنی نانویں اور دسویں روز کا روزہ رکھیں گے"۔

ایک اور روایت میں بجائے یہود کے یہود خیبر کے متعلق یہی الفاظ ہیں اس میں عورتوں کو زیور سے آراستہ کرنے کا بھی ذکر ہے۔

بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے۔

قدم رسول اللہ ﷺ للمدینہ ورأی الیہود تصوم یوم عاشوراء فقال ما ھذا قالو یوم صالح انجی اللہ فیہ موسی و بنی اسرائیل من عدوھم فصامہ فقال انا احق بموسی منکم فصامہ وامر بصیامہ

"رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے یہود کو عاشورہ کا روزہ رکھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ یہ روزہ کیسا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اس دن موسیٰ اور بنی اسرائیل نے اپنے دشمن سے نجات پائی تھی، اس لیے حضرت موسیٰ نے روزہ رکھا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم سے زیادہ تو موسیٰ کے ہم حق دار ہیں۔ آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور روزہ کا حکم بھی دیا"۔

ابوداؤد میں اتنے الفاظ اور ہیں۔

فصامہ موسی شکرا نحن نصومہ تعظیمالہ

موسیٰ علیہ السلام نے اس میں شکریہ کا روزہ رکھا اور ہم اس دن میں تعظیماً روزہ رکھیں گے۔

ابن ابی شیبہ نے ابی ہریرۃ کا قول نقل کیا ہے۔

صوموا یوم عاشورا و ھو یوم کانت الانبیاء تصومہ فصوموا

عاشورا کے دن کا روزہ رکھو اس دن انبیاء سابقین روزہ رکھتے تھے، تم کو بھی روزہ رکھنا چاہیے۔

دیلمی اور بزار نے حضرت ابی ہریرہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما عاشورا عید من قبلکم فصوموا انتم

"یعنی یوم عاشورا تم سے پہلے گزرنے والوں کی عید تھی تم اس کا روزہ رکھو۔

ان النبی ﷺ قال صیام یوم عاشوراء انی احتسب
علی اللہ ان یکفر لسنتہ التی قبلہ

”حضور ﷺ نے فرمایا کہ عشرہ محرم کے روزہ کا ثواب خدا سے امید کی جاتی ہے کہ ایک سال گذشتہ کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے“۔

* تشبہ بالیہود کی مخالفت

فقط عشرہ محرم کے روزہ میں چونکہ یہود سے تشبہ کا اندیشہ تھا، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں آئندہ سال زندہ رہا، تو نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھوں گا تاکہ یہود کی مخالفت ہو جائے اور تشبہ بالیہود لازم نہ آئے، لیکن آئندہ سال محرم تک حضور ﷺ زندہ نہ رہے اور وصال ہو گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے۔

لئن بقیت الی قابل لا صومن التاسع

اگر میں آئندہ سال زندہ رہا، تو نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھوں گا

دوسری روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ نے روزہ رکھا اور اصحاب کو روزہ کا حکم دیا، تو بعض لوگوں نے کہا کہ یہود کے نزدیک اس دن کی بہت زیادہ عظمت ہے تو آپ نے فرمایا۔

فاذا کان العام المقبل انشاء اللہ صمت الیوم التاسع
فلم یات العام المقبل حتی توفی رسول ﷺ

”یعنی انشاء اللہ آئندہ سال نویں کا روزہ بھی رکھوں گا تاکہ یہود سے مخالفت ہو جائے، لیکن آئندہ محرم سے پیشتر حضور ﷺ کی وفات ہو گئی“۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک اور روایت میں مخالفت کی تصریح موجود ہے۔

ان عشنا خالفناهم و صمنا یوم التاسع

”اگر ہم زندہ رہے، تو یہود کی مخالفت کریں گے اور نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھیں گے“۔

بعض حضرات نے عدم تعمق کے باعث مخالفت کا انحصار صرف نو (۹) تاریخ کے روزہ کے ساتھ کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ مخالفت محض ایک دن کی زیادتی سے حاصل ہو سکتی ہے، خواہ نویں تاریخ سے کی جائے یا گیارہویں سے جیسا کہ امام احمد نے مرفوعاً حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے۔

صوموا یوم عاشورا و خالفوا الیہود و صوموا قبلہ یوما و بعدہ یوما

"یوم عاشورا کا روزہ رکھو اور اس دن کے ساتھ نویں یا گیارہویں کا روزہ ملا کر یہود کی مخالفت کرو۔

بیہقی نے بھی شعب الایمان میں اس مضمون کی روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

لئن بقیت امرت بصیام یوم قبلہ و یوم بعدہ

"اگر میں زندہ رہا، تو لوگوں کو نویں یا گیارہویں کے روزہ کا بھی امر کروں گا"

پس ان احادیث کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں محرم کے ساتھ نویں یا گیارہویں محرم کا روزہ رکھنے سے مقصد حاصل ہو جائے گا۔

* توسعہ علی العیال

روزے کے علاوہ اس دن اہل و عیال پر نفقہ کی وسعت کا بھی حکم ہے، جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً منقول ہے۔

من وسع علی عیالہ یوم عاشورا لم یزل فی وسعتہ سائر سنتہ

"یعنی جس شخص نے اپنے عیال کے لیے اس دن وسعت کی، تو تمام سال اس کے ہاں برکت رہے گی"۔

اگرچہ اس حدیث کے متعلق بعض محدثین نے کلام کیا ہے اور حافظ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس باب میں کسی حدیث کی روایت ہی سے انکار کر دیا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس روایت کے شواہد اس قدر ہیں کہ اگر سب کو جمع کیا جائے تو روایت حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، جو قابل احتجاج ہے (دلیل لینے کے قابل) چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن عراقی نے اس حدیث کو نقل کر کے اس امر کی تصریح کی ہے لیکن حسن علی

راوی ابن حبان اور بیہقی کے ظاہری کلام کا مفہوم یہ ہے کہ ان حدیث لتوسعۃ حسن علی روای غیر ابن حبان، ابن حبان کے علاوہ اور محدثین بھی اس روایت کے حسن ہونے کے قائل ہیں۔

صاحب نفحات فرماتے ہیں کہ اس باب میں سب سے زیادہ جید سند ابن عبدالبر کی ہے جو جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے۔

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من وسع علی نفسہ واھلہ یوم عاشوراء وسع اللہ علیہ سائر سنہ

اس حدیث کا مطلب بھی وہی ہے جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔ توسعہ اور صوم کے علاوہ اور کوئی چیز ثابت نہیں۔

یوم عاشوراء کے متعلق بعض اور باتیں بھی عوام میں مشہور ہیں لیکن ان کی کوئی اصل نہیں۔ مثلاً سرمہ لگانا، غسل کرنا، عیادت وغیرہ کرنا، زیارہ عالم، ناخن کتروانا، ہزار بار سورہ اخلاص پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں بے اصل، بلکہ موضوعات ہیں جن سے مسلمانوں کو پرہیز کرنا چاہیے۔

اسی سلسلہ میں علامہ خمرادی نے نفحات نبویہ میں آخر سال اور شروع سال کے لیے دو دعائیں نقل کی ہیں جن کو ہم ناظرین الجمعیۃ کے لیے نقل کرتے ہیں۔ ان دعاؤں کو علامہ جمال الدین نے اپنی تاریخ میں شیخ عمر بن قدامتہ المقدسی سے نقل کیا ہے۔ نیز اپنے مشائخ سے ان دعاؤں کے متعلق بہت سی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخ خاص طور پر وصیت کرتے ہیں کہ یہ دعائیں ضرور پڑھی جائیں۔

* شروع سال کی دعا

اللھم انت الابدی القدیم الاول وعلی فضلک العظیم وکریم جودک المعول وھذا عام جدید قد اقبل اسالک العصمۃ فیہ من الشیطن واولیائہ والعون علی ھذہ نفس الامارۃ بالسوء والاشتغال بما یقربنی الیک زلفی یا ذوالجلال والاکرام

جب شروع سال میں کوئی شخص اس دعا کو پڑھتا ہے' تو شیطان کہتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کا بقیہ حصہ مجھ سے محفوظ کر لیا ہے۔

* آخر سال کی دعا

اللھم ما عملت فی السنہ مما نھیتنی عنہ ولم اتب منہ وحملت فیھا علی بفضلک بعد قدرتک علی عقوبتی ودعوتنی الی التوبہ من جرائتی علی معصیتک فانی استغفر ک فاغفرلی وما عملت فیھا مما تر ضاہ وعدتنی علیہ الثواب فاسئلک ان تتقبلہ منی وتقطع رجائی منک یا کریم

اس دعا کو تین مرتبہ پڑھنا چاہیے۔ جو شخص اس دعا کو پڑھتا ہے' تو شیطان مایوسانہ لہجہ میں کہتا ہے کہ میری ایک سال کی محنت کو اس نے ایک گھڑی میں برباد کر دیا ہے۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس

*** ایک نیا مرزائی فتنہ** {۶ر اگست ۱۹۲۵ء}

آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں جمعیتہ علماء ہند اور علماء دیوبند جیسی علمی مذہبی جماعتیں شامل نہیں ہوئیں۔ اس کانفرنس میں چونکہ شرکت کا عنوان ہی مسلم پارٹیز تھا' اس لیے ہر شخص کو جو اس میں مدعو ہو' یہ کہنے کا حق ہو گا کہ داعیان کانفرنس نے اسے مسلمان سمجھا اس لیے دعوت دی۔ جمعیتہ علماء ہند اور علماء دیوبند کو یہ خطرہ ہوا کہ اس صورت میں ان کی شرکت کے غلط معنی لیے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ **جمعیتہ العلماء** ہند اور علماء دیوبند نے بھی احمدیوں' لاہوریوں اور قادیانیوں کے اسلام کا اعتراف کر لیا ورنہ وہ کیوں شریک ہوتے۔

اس خطرہ کو سید غلام بھیک صاحب نیرنگ اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ انہوں نے اپنی چٹھیوں میں اس کا جواب یوں دیا تھا کہ اس کانفرنس کی شرکت کسی فرقے کے اسلام کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے اس میں تو مشترکہ امور پر غور کر کے راہ عمل تجویز کرنا ہے' مگر یہ جواب اس وقت بھی معقول نہ تھا اور اب تو پیغام صلح لاہور مورخہ ۳۰ر ذی الحجہ ۴۳ھ نے جمعیتہ علماء ہند و دیوبند کے خطرہ کو حقیقت واقعیہ کا لباس دے دیا۔ پیغام صلح کے لیڈنگ آرٹیکل کا عنوان دیکھئے لکھا ہے:۔

علمائے دیوبند اور جمعیتہ علماء ہند کی ناکامی

پھر آگے لکھتے ہیں

"لیکن آج یہ عالم ہے کہ خدا کے فضل سے مسلمانوں کا ایک بڑا سنجیدہ اور فہمیدہ گروہ علماء کی ضد اور اصرار اور ان کی سخت ترین مخالفت کے باوجود خدا کے مامور کی اس جماعت کو مسلم پارٹیز میں شامل سمجھتا اور ان کے اسلام پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ انشاء اللہ وہ وقت بھی آئے گا جب ان علماء کو چارو ناچار متفقہ طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی جماعت فی الحقیقت اسلام کی سچی نمائندہ جماعت ہے"۔

اب ہم میر نیرنگ صاحب اور مولانا سر رحیم بخش صاحب اور ڈاکٹر کچلو صاحب و دیگر داعیان کانفرنس سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کے آرگن پیغام صلح لاہور کی یہ مسرت اور خوشی اور یہ بلند آہنگی کیا اس خطرہ کو حقیقت نہیں بناتی جو جمعیتہ علماء اور جماعت علماء دیوبند نے ظاہر کیا تھا۔

اور کیا انہوں نے آپ کی اس مداہنت سے یہ فائدہ نہیں اٹھایا کہ پیغام صلح کے ہزاروں ناظرین کے ذہن نشین کرا دیا کہ داعیان کانفرنس کا سنجیدہ و فہمیدہ گروہ احمدیوں کے متعلق یہ خیالات رکھتا ہے:۔

(ا) کہ یہ جماعت خدا کے مامور (بالفاظ دیگر نبی اور رسول) کی جماعت ہے۔

(۲) اور یہ کہ یہی جماعت اسلام کی سچی نمائندہ جماعت ہے۔

(۳) اور یہ کہ آپ لوگ علماء کی ضد اور اصرار اور سخت ترین مخالفت کے باوجود احمدیوں کو مسلمان سمجھتے اور ان کے اسلام پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

پیغام صلح نے اپنی جماعت کی شرکت سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اور ان کو نہایت فخر و مباہات کے طور پر مذکورہ بالا عبارت میں ظاہر کیا ہے' اگر یہ آپ لوگوں کے نزدیک صحیح و درست ہیں یعنی فی الحقیقت آپ مرزا غلام احمد کو خدا کا مامور اور احمدی و قادیانی جماعتوں کو خدا کے مامور کی جماعتیں سمجھتے ہیں اور آپ کے نزدیک یہی جماعتیں اسلام کی سچی نمائندہ جماعتیں ہیں اور یہ کہ آپ کے نزدیک وہ مسلمان ہیں اور آپ نے کانفرنس میں ان کو شریک کر کے ان کے اسلام پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے'

تو ہمیں آپ سے کچھ کہنا نہیں ہے' بلکہ صرف خدائے برتر کی بارگاہ میں یوں عرض پرداز ہونا ہے کہ **ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا اور ربنا افتح بيننا و بين قومنا بالحق وانت خير الفاتحين۔**

لیکن اگر ان کے یہ نتائج آپ کے نزدیک غلط ہیں' تو اس صورت میں ہماری عدم شرکت کے عذر کی معقولیت تو آپ پر واضح ہو گئی ہو گی نیز آپ کا مذہبی فرض ہے کہ ان نتائج کی تغلیط و تردید کر کے اپنی پوزیشن کو صاف کریں اور اس فریب کارانہ کارروائی سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچنے والا ہے' اس کا سدباب کریں۔

اگرچہ جماعت داعیان میں سے بعض حضرات کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام

ہندوستان کے علماء کے متفقہ فتویٰ کے خلاف لاہوری احمدیوں کو کافر نہیں کہتے جیسے مولانا محمد علی اور مولوی مظہرالدین صاحب اڈیٹر الامان کہ ان کی تصریحات اخباروں میں آچکی ہیں۔ اسی طرح بعض اور حضرات بھی ہوں گے، مگر یہ صاحب بھی مرزا غلام احمد کو خدا کا مامور نہیں سمجھتے اور لاہوریوں کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ یہی اسلام کی سچی نمائندہ جماعت ہے۔ ان کا فرض ہے کہ جو چیز ان کی جانب بحیثیت داعی ہونے کے خلاف واقع منسوب کی گئی ہے۔ اس کی تغلیط بیان کردیں۔

رہی پیغام صلح کی یہ خوشی کہ ارباب کانفرنس نے جمعیتہ علماء اور علماء دیوبند کی عدم شرکت کی پروا تک نہ کی اور نہ کانفرنس کو اس سے کوئی نقصان پہنچا، تو اس سے ہمیں کوئی رنج نہیں ہوا، کیونکہ جن لوگوں نے ہندوستان کے مسلم علمی و مذہبی حلقوں کی نمایندگی کی پروا نہ کی، انہوں نے خود اپنی معقولیت پسندی، علم دوستی اور مذہبی پابندی کی حقیقت واضح کردی ہے۔

پیغام صلح کا اور اس کے ہمنواؤں کا یہ خیال کہ جمعیتہ علماء ہند اور علماء دیوبند کی عدم شرکت سے کانفرنس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، ممکن ہے کہ ان کے مقصد کے لحاظ سے صحیح ہو، مگر پیغام صلح کے اسی مضمون سے کانفرنس کی جو قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے وہ ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہو جائے گی۔

پہلے پیغام صلح کے اقتباسات پڑھیئے۔

> ”ایک وہ وقت تھا کہ تمام مسلم دنیا چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور عالم سے لے کر جاہل تک کافر کا خطاب ہمیں دیتا اور ہم سے مقاطعہ کرنا ضروری سمجھتا تھا، لیکن آج یہ عالم ہے کہ خدا کے فضل سے مسلمانوں کا ایک بڑا سنجیدہ اور فہمیدہ گروہ علماء کی ضد اور اصرار اور ان کی سخت ترین مخالفت کے باوجود خدا کے مامور کی اس جماعت کو مسلم پارٹیز میں شامل سمجھتا اور ان کے اسلام پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے“۔
>
> ”تاہم ہماری جماعت کے نمائندوں نے یہی پسند کیا کہ کسی نہ کسی طرح کانفرنس کو ان کے پاک مقاصد میں کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔ (الی قولہ) اس خیال کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے سید غلام بھیک صاحب نیرنگ اور

ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کی خدمت میں یہ التجا کی کہ آپ ہماری وجہ سے تفرقہ کی خلیج کو نہ بڑھایئے (الی قولہ) ہمیں چلے جانے کی اجازت دیجئے اور علماء کرام کو آپ بلوا لیجئے، لیکن ہر دو اصحاب نے قطعاً اس بات کو ناپسند کیا اور یہ مناسب نہ سمجھا کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے وسیع مفہوم میں سے احمدیہ مسلم پارٹی (مسلمان فرقہ احمدیہ) کو خارج کر کے علیحدہ کر دیا جائے"۔

"ارباب کانفرنس نے ان علماء کی ان بار بار کی دھمکیوں اور احتجاج اور خود جماعت احمدیہ کی اس آمادگی کے باوجود کہ وہ کانفرنس سے علیحدہ ہونے کے لیے تیار ہیں، ہمارے نمائندوں کو شریک کر کے بقول مولوی حبیب الرحمٰن اس جماعت کے مسلمان ہونے کی رجسٹری کر دی اور بقول ناظم جمعیتہ العلماء ہند، ان کے اسلام کا سرٹیفکیٹ دے دیا اور جمعیتہ علماء ہند اور علماء دیوبند کی عدم شمولیت کی کوئی پروا تک نہ کی اور نہ کانفرنس کو اس سے کوئی نقصان پہنچا"۔

(مفصلہ بالا تینوں اقتباس پیغام صلح مورخہ ۲۰ ذی الحجہ ۴۳ھ (۷۳) سے لیے گئے ہیں)۔

"قوم کے دو قابل قدر اور نیک نہاد فرزند (مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی) اس کانفرنس کی اختیار کردہ راہ سے پرے ہی پرے رہے، بلکہ ان دونوں حضرات نے اس راہ پر گامزن ہونے والوں کو اب کھلا الٹی میٹم بھی دے دیا ہے کہ وہ بھی اب اپنی الگ پارٹی بنائیں گے"۔

"آج تک مولویوں پر الزام دیا جاتا تھا کہ وہ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرتے اور ذرا ذرا سی بات پر تکفیر کے درپے ہو جاتے ہیں۔ آج ان روشن خیال بزرگوں کو کیا کہا جائے گا"۔ الخ

(ہر دو اقتباس از پیغام صلح مورخہ ۴ر محرم ۴۴ھ، (۷۴)

ان تمام اقتباسات کو پڑھنے کے بعد ایک سمجھدار انسان جس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں ملک کی مسلم آل انڈیا جماعتوں میں سے دو مقتدر جماعتیں جمعیتہ علماء ہند اور خلافت کمیٹی بحیثیت نمایندگی شامل نہیں ہوئیں اور دونوں کے ذمہ دار کارکن اس کانفرنس میں کسی ذمہ داری کے لینے کے لئے تیار نہیں۔

اسی طرح مذہبی طبقہ میں سے مسلم علمی جماعت یعنی علماء دیوبند کی جماعت اس سے

علیحدہ رہی اس صورت میں ظاہر ہے کہ جمہور مسلمانان ہند کی رائے آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں کہاں تک شریک اور موافق ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کانفرنس میں بقول "پیغام صلح" میر غلام بھیک صاحب نیرنگ اور ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو نے تمام مسلم دنیا کے چھوٹے بڑوں اور عالموں اور جاہلوں کے متفقہ فیصلے کے خلاف لاہوری احمدیوں وقادیانی مرزائیوں کی تصدیق کی اور ان کے مقاطعہ کو توڑا اور بقول پیغام صلح مسلمانوں کا ایک سنجیدہ گروہ بھی ان کے ساتھ ہم خیال ہو گیا۔ اس تمام بیان کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے صرف یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس میر غلام بھیک صاحب نیرنگ' ڈاکٹر کچلو صاحب اور چند مغربی تعلیم یافتہ حضرات کی نمائندہ جماعت ہے۔ جو لاہوریوں اور قادنیوں (بلکہ بابیوں' اہل قرآن اور تمام ملحدوں اور زندیقوں) کے ساتھ رشتہ اخوت جوڑنے کو ہی اسلام کی حقیقی خدمت سمجھتے ہیں' لیکن جمہور اہل اسلام کے چھوٹے بڑے عالم جاہل اس کے خلاف ہیں۔

ارباب کانفرنس جس دھن میں تھے' اس کو پورا کرنے کی خاطر انہوں نے تمام مسلم دنیا کے عقیدہ سے چشم پوشی کی اور علماء کے احتجاج کی پروا نہیں کی۔ خلافت کمیٹی کے اختلاف کو خیال میں نہ لائے اور ایک جماعت قائم کرلی۔

اگر کامیابی اسی کا نام ہے کہ جمہور مسلمانان دنیا کے فیصلے کی پروا نہ کی جائے' ذمہ دار جماعتوں کی عدم شمولیت کو خیال میں نہ لایا جائے اور چند افراد اپنے منصوبے کو پورا کرلیں' تو بے شک کانفرنس پوری کامیاب ہو گئی۔

لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ یہ کامیابی مسلمانوں کی قومی بہبود کی کس طرح کفیل ہو سکتی ہے۔ میر غلام بھیک صاحب نیرنگ' ڈاکٹر سیف الدین کچلو دونوں بے حد مستعد جفاکش قومی کارکن ہیں' لیکن آل انڈیا تنظیم و تبلیغ وغیرہ میں ان دونوں بزرگوں کی تنہا مساعی کافی نہیں۔ آخر قوم کے سامنے جانا اور ان سے ہی کام لینا ہے' لیکن کیا ان کو اس کی امید ہے کہ ان کے اس رویہ کے بعد جو انہوں نے لاہوری احمدیوں' قادیانیوں اور دوسرے ملحدوں کے ساتھ برت کر اسلام کی توہین کی ہے' جمہور مسلمانان ہند ان کی مساعدت کریں گے اور ہاتھ بٹائیں گے اور ان کی تنظیمی یا تبلیغی خدمات پر ان کو مذہبی حیثیت سے اعتماد ہو گا۔

اگر ڈاکٹر کچلو صاحب نے امرتسر میں اپنے خیال کے مخالف علماء کے متعلق (جو لاہوری احمدیوں اور قادیانیوں کو کافر بتاتے تھے) یہ درافشانی فرمائی ہے جو پیغام صلح نے نقل کی ہے یعنی

> "تم دیکھنا کہ وہ وقت آتا ہے جب تم میں سے ایک ایک کو مسجدوں سے پکڑ کر باہر نکالا جائے گا تاکہ تمہیں مسلمانوں میں تفرقہ و انتشار پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے"۔

تو ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ ڈاکٹر صاحب آپ اسلامی تعلیمات کو مٹانے اور زندیقوں اور ملحدوں کو اسلام میں داخل کرنے کی انتہائی کوشش کرلیں، لیکن خدا نے اپنے مقدس دین کی حفاظت اپنے ذمے لی ہے۔ خدا اپنے دین کی حفاظت کرے گا۔ علماء کو تم مسجدوں سے باہر نکال دو گے، تو ان کے قائم مقام مسجدوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کرنے کے لئے کھڑے ہوجائیں گے اور خدا عوام مومنین کو تمہارے مقابلہ کے لئے کھڑا کردے گا۔ تمہاری کوشش خدائی حفاظت کے مقابلے میں کام نہ آئے گی۔ دین ہمیشہ صاف اور روشن رہے گا۔ الحاد و زندقہ کے دھبے اس کو خراب نہ کرسکیں گے۔ یہ ہمارا ایمان اور عقیدہ ہے جس کو کوئی قوت نہیں مٹا سکتی۔

اور اگر ڈاکٹر صاحب نے ایسے الفاظ استعمال نہیں فرمائے، بلکہ ان کے ذمے یہ افترائ ہے، تو ان کو صاف اعلان کردینا چاہیے تاکہ کسی بدظنی کا موقع لوگوں کو نہ ملے۔

ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ مرزائی خواہ لاہوری، احمدی ہوں یا قادیانی، جمہور علمائے اسلام کے نزدیک کافر ہیں۔ ہاں وہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور بہت سے اسلامی عقائد کو مانتے ہیں، اس لئے وہ عرفا مسلمان سمجھے جاسکتے ہیں یعنی غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلم مردم شماری میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ اس میں ہمیں کلام نہیں اور نہ کسی عقلمند کو ہو سکتا ہے۔

مگر ہم اسلامی جماعتوں میں (یعنی ان جماعتوں میں جنہیں ہم مسلمان سمجھتے ہیں) ان کو داخل نہیں کریں گے اور جب تک وہ مرزا غلام احمد کو نبی، مرسل، مامور، مجدد اور ملہم سمجھتے اور ان کی کفریات کی تصدیق کرتے ہیں اس وقت تک ہم ان کو کافر کہیں گے اور اسلام کی ضروریات میں ان کے ساتھ اشتراک عمل کے لئے تیار نہیں، لیکن چونکہ قانونی

مذہبی آزادی انہیں حاصل ہے، اس لئے ان کے ساتھ معاشرتی تعلق نہ رکھنے کے باوجود ان کے مقابل کسی قسم کی مزاحمت بھی نہیں کریں گے، لیکن واقعیت اور حقانیت کی تبلیغ اور ان کے اظہار کفر سے بھی باز نہیں رہ سکتے۔ آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں ہمارے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کا عنوان ہی مدعو شرکاء کے اسلام کے اعتراف کا ہم معنی تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم کو لاہوری احمدیوں، قادیانیوں سے یہ امید ہی نہیں کہ وہ اپنی غرض تبلیغ مرزائیت اور اپنے مقصد سے قطع نظر کرکے مسلمانوں کے عام قومی و سیاسی اغراض کے حق میں سچے دل سے شرکت عمل کے لئے تیار ہوں گے۔ گزشتہ میدان اتحاد میں ہم کافی تجربہ کرچکے ہیں، اس لئے ان کے اعتراف اسلام سے بھی قطع نظر کرلی جاتی۔ جب بھی ہم اپنے خیال کے بموجب شرکت کانفرنس کو ایک فعل عبث سے زیادہ اہمیت نہ دیتے۔

اور اگر آپ کے دل میں اسلامی جذبہ اور احساس موجود ہے، تو آپ بھی چند دنوں کے اشتراک عمل سے اسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔

فلنتظروا انا معکم منتظرون

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے تلبیس ودجل کا مرقع۔

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے سیکرٹری کا شائع کیا ہوا پوسٹر اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

پوسٹر کیا ہے مغالطہ اور تلبیس کا ایک مرقع ہے۔ دجل و مخادعت کی تصویر ہے۔ ہم اس کا مفصل جواب دینے سے پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ مختصر طور پر صرف ان غلط بیانیوں کو ظاہر کردیں جو اس پوسٹر میں کی گئی ہیں اور جس کا لازمی اثر پبلک کا دھوکا کھانا یا غلطی میں مبتلا ہوجانا ہے۔

* پہلی غلط بیانی

پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ پوسٹر کے عنوان میں یہ عبارت موٹے حرفوں میں لکھی گئی ہے۔ "آل مسلم پارٹیز کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے احمدیوں کی تکفیر"۔ اس عبارت کو پڑھنے والے اس غلطی میں مبتلا ہوجائیں گے کہ جمعیتہ العلماء ہند پہلے تو احمدیوں کو مسلمان سمجھتی تھی،

مگر صرف آل مسلم پارٹیز کانفرنس کو ناکام کرنے کے لئے اس نے احمدیوں کی تکفیر کی اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تکفیر مذہبی احکام کے ماتحت نہیں، بلکہ ضد و نفسانیت اور تحاسد و منافست کا نتیجہ ہے۔

سیکرٹری صاحب نے محض پبلک کو دھوکا دینے کے لیے یہ کارروائی کی ہے، ورنہ انہیں معلوم ہے کہ جمعیۃ العلماء نے آج تک احمدیوں (قادیانیوں یا لاہوری احمدیوں) کو مسلمان نہیں سمجھا اور آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے تصور سے بھی سالہا سال قبل ان دونوں جماعتوں کو دائرہ اسلام سے باہر سمجھتی رہی ہے اور اس کا اظہار بھی کر چکی ہے۔ علماء دیوبند اس موضوع پر مفصل و مدلل رسالے لکھ کر ہزاروں کی تعداد میں شائع کر چکے ہیں۔ پس ان کی تکفیر خالص احکام شرعیہ پر مبنی ہے نہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس کی ضد و منافست پر۔

اگر ضرورت ہوئی تو ہم سیکرٹری صاحب کو وہ تمام تحریریں اور رسالے بھی دکھادیں گے جو قادیانیوں لاہوریوں اور احمدیوں کی تکفیر میں علمائے اسلام نے مدتہائے دراز پہلے لکھے اور شائع کئے ہیں، لیکن سردست اس بات کے ثبوت میں کہ یہ تکفیر آل مسلم پارٹیز کانفرنس کو ناکام بنانے کی خاطر نہیں، بلکہ بہت پہلے کی ہے۔ ہم ان کی جماعت کے آرگن پیغام صلح لاہور۔ مورخہ ۳۰ر ذی الحجہ ۴۳ھ (۲۷) کے لیڈنگ آرٹیکل کی عبارت ہی پیش کئے دیتے ہیں۔

پیغام صلح کا لیڈنگ آرٹیکل، اس کے دوسرے کالم میں یہ عبارت پڑھیئے۔ اس کانفرنس سے قبل تمام مسلم دنیا کے چھوٹے سے بڑے تک اور عالم سے لے کر جاہل تک کافر کا خطاب ہمیں دینا اور ہم سے مقاطعہ کرنا ضروری سمجھتا تھا، لیکن آج یہ عالم ہے کہ خدا کے فضل سے مسلمانوں کا ایک بڑا سنجیدہ اور فہمیدہ گروہ علماء کی ضد اور اصرار اور ان کی سخت ترین مخالفت کے باوجود خدا کے مامور کی اس جماعت کو مسلم پارٹیز میں شامل سمجھتا اور ان کے اسلام پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد ہر سمجھدار انسان پر آپ کے اشتہار (پوسٹر زیر بحث) کے عنوان کی لغویت واضح ہو جائے گی، مگر ہم مزید وضاحت کے لئے یہ بھی بتادیں کہ اس عبارت میں اس کے کہنے والے نے کن کن باتوں کا صاف اور سچا اقرار کیا ہے۔

۱۔ اول یہ کہ ایک وقت میں تمام مسلم دنیا چھوٹے بڑے عالم جاہل تم کو (لاہوری احمدیوں کو) کافر سمجھتے تھے۔ گویا تمہارے اس اقرار کے بموجب تم تمام دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک اجماعی واتفاقی طور پر کافر تھے۔ اجماع و اتفاق بھی ایسا جس میں چھوٹے بڑے عالم و جاہل کی بھی کوئی تفریق نہ تھی۔ یعنی تمہارا کفر ایسا متفق علیہ مسئلہ تھا کہ شاید ہی اور کوئی مسئلہ ایسے پختہ جامع ہمہ گیر اجماع و اتفاق سے ثابت ہو۔

۲۔ آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے موقعہ پر علماء کی طرف سے تمہارے اسی اجماعی واتفاقی کفر کا اظہار کیا گیا ہے جو مدت پہلے سے موجود تھا۔ اس وقت علماء کی جانب سے تکفیر کی کارروائی کوئی نئی کارروائی نہ تھی۔ پس اس کو آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے ناکام بنانے کی علت قرار دینا جہالت ہے۔

اس عبارت میں خود اقرار کیا گیا ہے کہ علماء کی ضد اور اصرار کے باوجود، اور ظاہر ہے کہ ضد اور اصرار کا مفہوم اسی وقت ثابت ہوگا کہ تکفیر پہلے کی جاچکی ہو۔

۳۔ اس عبارت میں اس کا بھی اقرار ہے کہ علماء تو اسی اجماعی و اتفاقی مسئلہ پر قائم رہے جو تمہارے اقرار کے بموجب تمام مسلم دنیا کا متفقہ مسئلہ تھا، مگر ایک گروہ جو تمہارے الفاظ میں سنجیدہ و فہمیدہ تو ضرور ہے، مگر معلوم نہیں کہ اسلام کی تعلیمات میں سے اسے کس قدر حصہ ملا ہے، وہ تمہارے بارے میں اس اجماعی مسئلہ سے منحرف ہوگیا، تو اب عقلمند و منصف و دیندار لوگ خود ہی اندازہ کرلیں کہ آیا یہ سنجیدہ و فہمیدہ (یعنی مغربی تعلیم یافتہ) گروہ اس مذہبی مسئلہ میں حق پر ہے یا جماعت علماء اور تمام مسلم دنیا اور یہ کہ آیا مخالفت اجماع کا مجرم یہ گروہ ہے یا جماعت علماء۔

یہ گروہ جس کو آپ نے سنجیدہ و فہمیدہ تو کہا، مگر دینداری کے لحاظ سے اس کی حیثیت ظاہر نہیں فرمائی کہیں وہ حضور رسول کریم ﷺ کے اس ارشاد کا مصداق تو نہیں تھا۔

و يقال الرجل ما اعقله ما اظرفه وما اجلده
وما فى قلبه مثقال حبته من خردل من ايمان

(بخاری مسلم کذافی المشکوۃ)

* دوسری غلط بیانی

دوسری غلط بیانی یہ کی کہ جمعیتہ علماء ہند اور علماء دیوبند کو لکھا گیا کہ انہوں نے مرزا غلام احمد پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے نبوت کا دعوی کیا تھا اور پھر مرزا صاحب کی چند عبارتیں نقل کر کے یہ دکھایا ہے کہ وہ نبوت کے دعوے سے تبرا "اظہار بیزاری" کرتے ہیں۔

جواب:

واقعہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی تالیفات جس شخص نے دیکھی ہیں، وہ اس حقیقت پر پہنچ سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے مراتب متدرجہ میں اپنے دعووں میں بھی تدریجی ترقی کی ہے۔ ان کی قدیم تالیفات میں صرف الہام و مجددیت کا دعوی ہے۔ اس کے بعد نبی و رسول کے الفاظ اپنے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ اور جب علماء اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے اعتراضات ہوئے، تو انہوں نے یہ عبارتیں لکھیں جو سیکرٹری صاحب نے اس اشتہار میں نقل کی ہیں۔ ان عبارتوں میں انہوں نے دعوائے نبوت کا انکار کیا اور معجزات اور فرشتوں اور جنت و دوزخ پر ایمان کا اعلان کیا۔

اس کے بعد انہوں نے آگے ترقی کی اور کھلم کھلا نبوت کے مدعی بن بیٹھے اور نبوت بھی ایسی کہ جو اس کا منکر ہو یا متردد ہو، وہ کافر۔ مرزا صاحب کی تمام تصریحات مضامین قتل مرتد کے ضمن میں لکھی جا چکی ہیں۔ ناظرین الجمعیتہ کے گذشتہ نمبر ۲۸، ۲۹، ۳۰ کے پرچوں میں مضمون شریعت اسلام اور قتل مرتد کے نمبر ۱۳، ۱۴، ۱۵، ملاحظہ فرمائیں !! ان نمبروں کے ملاحظہ سے آپ کو اس اشتہار کی تلبیسانہ کارروائی کا پورا حال معلوم ہو جائے گا۔

* تیسری غلط بیانی

سیکرٹری صاحب پوسٹر میں لکھتے ہیں کہ ہم حیران ہیں کہ جمعیتہ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے جماعت احمدیہ کی شرکت کی وجہ سے آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے مقاطعہ کی تجویز کیوں پاس کر دی۔ پیشتر ازیں جمعیت کی یہی مجلس عاملہ بعض اسلامی کاموں میں جماعت احمدیہ سے امداد لے کر اور ان سے امداد کی درخواست کر کے عملاً شرکت کر چکی ہے اور عملاً انہیں مسلمان تسلیم کر چکی ہے۔

جواب:

یہ غلط بیانی ان پہلی غلط بیانیوں سے زیادہ افسوس ناک اور شرمناک ہے، کیونکہ اس میں جمعیتہ علماء ہند جیسی مقتدر ذمہ دار جماعت کی جمعیتہ عاملہ پر ایک افتراءاور اتہام لگایا گیا ہے اور ایسی دیدہ دلیری سے کام لیا گیا ہے کہ کاتب مضمون کے سوا کسی اور سمجھ دار شخص سے اس کی توقع ہی نہیں ہو سکتی۔

جمعیتہ علماء یا اس کی جمعیتہ عاملہ نے آج تک کسی احمدی قادیانی سے کوئی درخواست نہیں کی اور نہ ان سے کسی قسم کی مدد لی ہے۔ اگر ”پیغام صلح“ سچا ہے، تو بتائے کہ کب اور کس شخص کے ذریعہ سے جمعیتہ عاملہ نے احمدیوں سے درخواست امداد کی یا مدد لی ہے۔

پیغام صلح میں جمعیتہ علمائے میرٹھ کے ناظم کی ایک چٹھی نقل کی گئی ہے اگر وہ چٹھی واقعی ہے، تو اس کی ذمہ داری ضلع میرٹھ کے ناظم پر آتی ہے، نہ کہ جمعیتہ علمائے ہند یا اس کی جمعیتہ عاملہ پر۔

دوسری چٹھی مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیتہ علماء ہند کی نقل کی گئی ہے اس چٹھی کی حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ مولانا احمد سعید صاحب کی شخصی تحریر ہے۔ جمعیتہ علماء کی مرکزی جماعت یا جمعیتہ عاملہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں تحریروں کی بنا پر جو محض شخصی تحریریں ہیں، جمعیتہ علمائے ہند یا اس کی جمعیتہ عاملہ کی طرف کوئی امر منسوب کر دینا صراحتہ ”تلبیس و مخادعت ہے پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ جمعیتہ علماء میرٹھ یا مولانا احمد سعید صاحب کی چٹھیوں سے سیکرٹری صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ احمدیوں کو عملاً مسلمان تسلیم کر لیا گیا ہے، کہاں تک درست ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ عبدالحق صاحب احمدی لاہوری سنسکرت کے عالم ہیں۔ اس بنا پر جمعیتہ علماء میرٹھ نے ان کو آریوں سے مناظرہ کرنے کے لیے دعوت دی اور اسی جہت سے مولانا احمد سعید صاحب نے مولوی محمد علی لاہوری کو شیخ صاحب کی خدمات (تعلیم سنسکرت) کے لیے چٹھی لکھی۔ ان دونوں بزرگوں کا مطمح نظر صرف سنسکرت دانی تھی۔ ہم نے بسا اوقات آریوں کے مقابلہ میں سنیاسی پنڈتوں سے امداد لی ہے اور اب بھی ہم ایک دشمن کے مقابلہ میں دوسرے دشمن سے (جو باہم ایک دوسرے کے مقابلے میں

ہمارے کام آسکیں) امداد لینے میں متامل نہیں ہیں، لیکن وہ اسی صورت میں کہ وہ دشمن اپنی پوزیشن سے کوئی دھوکہ نہ دے رہا ہو اور اس امداد و استمداد سے اس کے اسلام کا اعتراف لازم نہ آتا ہو۔ مولانا مولوی احمد سعید صاحب یا مولانا مبارک حسین صاحب نے اگر شیخ عبدالحق صاحب کی سنسکرت دانی سے فائدہ اٹھانا چاہا، تو اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ ان دونوں بزرگوں نے ان کا یا ان کی جماعت کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیا۔ کیا اگر آج مسلمان کسی ہندو پنڈت سے سنسکرت پڑھنے لگیں، تو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کا سیکرٹری یہ کہنے لگے گا کہ ان سنسکرت پڑھنے والوں نے اس پنڈت کا اسلام تسلیم کر لیا اور کیا تمام ہندوستانی طالب علم جو انگریزی سکولوں، کالجوں اور یورپین یونیورسٹیوں میں غیر مسلم اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، سیکرٹری صاحب کے نزدیک ان سب نے اپنے استادوں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیا ہے۔

الحاصل جمعیتہ علماء ہند نے اول تو آج تک لاہوری یا قادیانی جماعت سے کوئی امداد نہیں لی اور اگر بالفرض کسی خاص فن کی مہارت کے لحاظ سے کسی شخص سے امداد بھی لی جاتی ہے تو یہ امداد اسلام کے اعتراف کے مترادف ہرگز ہرگز نہیں ہوتی۔

متھرا کے جلسہ کا تذکرہ اس لیے فضول ہے کہ اس میں بھی مولانا احمد سعید صاحب کی شرکت شخصی تھی۔ دوسرے انہیں اول سے یہ معلوم بھی نہ تھا کہ اس میں احمدی قادیانی شریک ہوں گے یا نہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک تبلیغی جلسہ تھا۔ اس کے شرکاء کے لیے عنوان انعقاد کی جہت سے کوئی سرٹیفکیٹ اسلام کا حاصل نہیں ہوتا تھا۔

مولوی مظہر الدین صاحب نے بے شک یہ اعلان کیا تھا کہ ان کے نزدیک جماعت احمدیہ لاہور مسلمان ہے اور یہ کہ وہ ان کی بیرونی تبلیغی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، مگر یہ مظہر الدین صاحب کی ذاتی رائے تھی۔ آپ نے ان کو دیوبندی لکھ کر، اگر یہ ثابت کرنا چاہا ہے، کہ علماء دیوبند بھی آپ کے اسلام کا اقرار کر چکے ہیں، تو یہ غلط ہے۔ ایک مولوی مظہر الدین صاحب کے مسلمان سمجھنے سے آپ علماء دیوبند کے نزدیک مسلمان نہیں ہو سکتے، بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ جن جن سنجیدہ و فہمیدہ حضرات نے آپ کو مسلمان سمجھا ہے تو ان چند کے علاوہ باقی سب کے سب بھی آپ کو مسلمان نہیں سمجھتے اور اگر وہ سو بھی مل کر آپ کو مسلمان سمجھنے لگیں، جب بھی ان کا یہ فیصلہ مذہب کی

ناواقفیت پر ہوگا اور اسلامی دنیا آپ کو مسلمان نہ سمجھنے لگے گی۔

رہا مولوی احمد سعید صاحب کا متھرا کانفرنس میں سکوت، تو یہ جو جناب کی خوش فہمی ہے کہ آپ اس سکوت کو مولوی مظہرالدین صاحب کی تائید خیال کرتے ہیں۔ اگر آپ کی یہی خواہش ہے کہ ایک ایسے جلسے میں جہاں سینکڑوں ہندو موجود ہوں آپ کی کوئی رو رعایت نہ کی جائے اور نہ جو سوسائٹی آپ کو مدعو کرے اس کی بے عزتی اور بدنامی کا خیال کیا جائے، بلکہ ہر ایسے موقع پر آپ کے کفر کا اعلان کیا جائے، تو آپ اطمینان رکھئے انشاء اللہ آئندہ اس کا خیال رکھا جائے گا۔

* چوتھی غلط بیانی

سیکرٹری صاحب فرماتے ہیں کہ بات اصل یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا خیال ہے، جمعیۃ علماء ہند کے یہ سوالات اور عدم شرکت کی حقیقی وجوہ وہ نہیں جو ظاہر کی گئی ہیں، بلکہ اصلی وجوہ کچھ اور ہیں جن کا حقیقی مقصد تو مسلم پارٹیز کانفرنس کو ناکام کرنا ہے۔ یہ لوگ دراصل کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ مقدس مقصد جو اس کانفرنس نے اپنے پیش نظر رکھا ہے، کسی طرح بار آور ہو سکے اور نہ اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی قیادت ان کے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کے قبضہ میں چلی جائے۔

جواب:

اس عبارت میں جس بدگمانی سے کام لیا گیا ہے، وہ سوائے ماتم کے اور کچھ نہیں اور اسی کے ضمن میں اس بات کا اقرار بھی کر لیا گیا ہے کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کا مقصد مسلمانوں کی قیادت عامہ کو حاصل کرنا اور جمعیۃ خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی قیادت نکال کر ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں دینا تھا، جس کی حقیقت کے اجزاء ترکیبیہ زندقہ و الحاد کے جراثیم ہیں۔

جمعیۃ العلماء ہند کے کارکنوں نے، تو تصریح کر دی تھی کہ مسلمانوں کی قومی بہبودی کے لیے کانفرنس جو تجاویز منظور کرے گی، ان میں حدود شریعت کے اندر رہ کر عملی شرکت کرنے میں ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اس تصریح کو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے آرگن پیغام صلح نے بھی جمعیت کی کشادہ دلی پر محمول کیا اور علی برادران کی

مزاحمت کی شکایت کے مقابلہ میں جمعیتہ کی صاف دلی کے ثبوت میں اس تصریح کو پیش کیا۔

پیغام صلح کی عبارت یہ ہے "جوش و سرگرمی کے ساتھ تمام اسلامی ہند نے اس کانفرنس کی تجویز کا خیر مقدم کیا تھا، یہاں تک کہ جمعیتہ العلماء ہند اور علماء دیوبند نے بھی کانفرنس میں شریک نہ ہونے کے باوجود یہ صاف طور پر لکھ دیا تھا کہ شرعی حدود کے اندر وہ اس کے احکام کی تعمیل کے لیے تیار ہیں۔ (پیغام صلح مورخہ ۴ محرم ۴۴ھ - (۷۴)

پیغام صلح کی اس تحریر کے بعد سیکرٹری صاحب کے بیان اور ان کے پوسٹر کی لغویات ظاہر کرنے کے لیے مزید صراحت کی ضرورت نہیں۔

* پانچویں غلط بیانی

اسی لیے بار بار اشتہار بازی کے ذریعہ سے لوگوں کو بد ظن کرنے اور کانفرنس میں شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر فی الحقیقت ان لوگوں کے پیش نظر اسلام کی بہبودی کا سوال ہوتا، تو کم از کم اشتہار بازی سے کام نہ لیتے، جب وہ خود یہ کہہ چکے ہیں کہ کانفرنس کے فیصلہ کردہ امور پر شرعی حدود کے اندر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں، تو پھر اس اشتہار بازی سے کیا حاصل"۔

جواب:

اس عبارت کا صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ جمعیتہ علماء اور علماء دیوبند کے ذمے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے سیکرٹری یہ تہمت لگاتے ہیں کہ ان لوگوں نے آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے خلاف اشتہار بازی کی۔

اس کا حقیقی جواب صرف لعنت اللہ علی الکاذبین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جمعیتہ علماء کی مجلس عاملہ نے ۲۰ر مئی کو یہ قرارداد منظور کی تھی کہ اگر آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں قادیانی لاہوری احمدی مدعو ہوں، تو جمعیتہ کی جانب سے کوئی نمائندہ شریک نہ ہو اور چونکہ حقیقی مقصد اس تجویز کا صرف یہ تھا کہ جمعیتہ علماء کی پوزیشن کو اس مغالطہ سے بچایا جائے جو ممکن ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کی شرکت کانفرنس سے پیدا ہو جائے کہ جمعیتہ العلماء ہند کے نزدیک لاہوری احمدی اور قادیانی احمدی مسلمان ہیں، اس لیے

نہ اس تجویز کی اشاعت کی گئی اور نہ داعیان کانفرنس کے پاس بھیجنے میں ان کی دعوت پر سبقت کی گئی۔

یعنی ہم نے اس خیال سے کہ ممکن ہے داعیان کانفرنس جمعیۃ العلماء ہند کی شرکت کو ضروری نہ سمجھیں اور اس کو دعوت ہی نہ دیں' اس لیے قبل دعوت کے اس تجویز کو بھیجنا دعوت کے لیے ایک قسم کی حسن طلب ہوگی تجویز کی نقل داعیان کو بھی نہ بھیجی۔ جس وقت ۲۲؍جون کو کانفرنس کی طرف سے دعوت کے خطوط پہنچے اور پھر ہمارے استفسار پر غلام بھیک صاحب نیرنگ نے مدعو جماعتوں کی فہرست بھیجی تو اس کو دیکھنے اور اس پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ ان کو نہایت صفائی کے ساتھ اس تجویز کی اطلاع اور اپنی مجبوری ظاہر کردی جائے اور اسی کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح کردی جائے کہ ہمارا مقصد کانفرنس کی راہ میں کوئی روڑا اٹکانا اور مزاحمت کرنا نہیں ہے' اگرچہ ہم شرکت سے مجبور ہیں' تاہم اس کا اظہار کردینا چاہتے ہیں کہ دائرہ شریعت کے اندر رہ کر کانفرنس کی منظور کردہ تجاویز پر عمل کرنے میں شریک ہونے کے لیے ہم ہروقت تیار رہیں گے۔

ہم نے اس وقت بھی اس تجویز کا اعلان مناسب نہ سمجھا اور باوجود یکہ اخبار الجمعیۃ کے کالم ہمارے لیے کھلے تھے' ہم نے اس کو درج اخبار نہیں کیا۔

اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہماری حسن نیت اور عدم مزاحمت کے لیے ہو سکتی ہے۔ ادھر یہ ہوا کہ امرتسر سے بعض احباب نے دریافت کیا کہ جمعیۃ علماء نے کانفرنس میں نمائندگی کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا اور داعیان کانفرنس کو کیا جواب دیا۔ ہم نے ان احباب کو ان کی واقفیت کے لیے ان چٹھیوں کی نقل ضرور بھیج دی جو میر نیرنگ صاحب کو بھیجی تھی کہ ان احباب میں سے بعض حضرات نے بطور خود ان چٹھیوں کو شائع کر دیا۔ ہمارا ان کی اشاعت کے ساتھ فرمائش کا کوئی اشارہ یا ادنی سا تعلق بھی نہیں ہے۔

پس سکرٹری صاحب کا یہ الزام کہ ہم نے اشتہار بازی کی ہے یا کوئی افترا اور اتہام کی مہم چلائی سراسر مداہنت اور مخادعت پر مبنی ہے

اور ہمیں افسوس ہے کہ اڈیٹر صاحب بھی الزام میں انجمن احمدیہ کے سکرٹری کی ہم نوائی کرنے لگے۔

ان لوگوں سے صرف اس قدر گذارش ہے کہ وہ جو احمدیوں، لاہوریوں یا قادیانیوں کو مسلمان سمجھتے ہیں اور تمام علماء ہندوستان کے خلاف نئی راہ اختیار کرتے ہیں تو اس کا تو انہیں اختیار ہے، لیکن واقعات میں اس قدر خلاف بیانی اور افترا اور اتہام سے کام لینا، تو کسی سمجھ دار آدمی کا کام ہی نہ ہونا چاہیے، چہ جائے کہ صحافت کی ذمہ داری بھی سر پر ہو۔ آخر میں ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں شریک نہ ہونے کے متعلق ہماری پوزیشن نہایت صاف اور واضح ہے، جو ہماری اس خط و کتابت سے اچھی طرح روشن ہے، جو میر نیرنگ صاحب کے ساتھ ہوئی ہے اور جو الجمعیتہ کی اشاعت سابقہ میں درج ہوئی ہے اور اس میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ ہمیں عام قومی بہبودی کی تجاویز میں شرکت عمل کرنے سے کسی وقت بھی انکار نہیں ہوا، مگر ہم خدا کی مقدس امانت اور "اسلام" کی حفاظت کو بھی اپنے لئے اہم فریضہ سمجھتے ہیں اور انشاء اللہ سمجھتے رہیں گے۔

* مولانا شوکت علی کو مبارک باد

اس کے ساتھ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مولانا شوکت علی کو ان کی شجاعت و شہامت، عزم و ثبات اور عالی ظرفی پر داد دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت ایک بہادر جنرل کی طرح مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے سب سے بڑے قلعہ میں بیٹھ کر اس دلیری اور بیدار مغزی کے ساتھ مصالح اسلامی کی حفاظت کر رہے ہیں کہ ہر انصاف پسند شخص کو اس کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں فتنہ افتراق کے تین مرکز قائم ہو گئے ہیں جن میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان پوری مستعدی کے ساتھ فرائض دفاع انجام دے رہے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ ان تینوں مرکزوں میں سب سے بڑا مرکز بمبئی ہے جہاں اس طلسم خانہ باطل کا اصلی تماشہ گر خاموشی کے ساتھ بیٹھا ہوا تمام پتلیوں کو حرکت دے رہا ہے اور اسے ایسے دنی الطبع اور کمینہ صفت مدد گار ہاتھ آگئے ہیں جن میں انسانی شرافت اور اسلامی اخلاق کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ایسی جگہ بیٹھ کر ضبط نفس اور عزیمت سے ہر فتنہ کا مقابلہ کرنا مولانا موصوف ہی کا کام ہے اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس جنگ میں مولانا شوکت علی نے جن قائدانہ صفات کا

اظہار کیا ہے، وہ ایسی اعلیٰ صفات ہیں کہ اگر ہم کوئی آزاد قوم ہوتے، تو یقیناً ہمارا یہ جنرل فاتح عالم ہوتا۔

✱ حرمت حجاز کے لیے ایک شدید خطرہ

عقبہ اور معان پر برطانوی احتلال کی اہمیت کو ہم اس سے پہلے اپنے ایک نوٹ میں ظاہر کر چکے ہیں، لیکن یہ ایک ایسا داغ ہے جس کا صرف ایک ہی مرتبہ ماتم کر لینا کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے بار بار تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آج ہم قارئین کرام کے سامنے حجاز اور اس جدید احتلال کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حرمت حجاز پر یہ کتنا شدید حملہ کیا گیا ہے۔ عقبہ اور معان کے علاوہ جو مقامات اس جدید ملت فروشی کے ذریعہ برطانیہ کے زیر اقتدار آئے ہیں، وہ تبوک، مدائن صالح، شوبک اور وادی موسیٰ ہیں۔ مدائن صالح مدینہ منورہ سے بمشکل چند منزل دور ہے اور اس پر قبضہ ہو جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ مدینہ منورہ ہر وقت برطانوی توپوں کی زد میں ہے۔ اس کے علاوہ حجاز ریلوے کا بھی ایک بہت بڑا سلسلہ اس طریقہ سے برطانوی قبضہ میں آگیا ہے، کیونکہ اب مدائن صالح سے بصریٰ تک یہ ریل انگریزی علاقہ میں آگئی ہے اور حجاز کا قبضہ صرف مدینہ سے مدائن صالح تک رہ گیا ہے۔ اب اس کے بعد غالباً برطانیہ کا دوسرا قدم یہ ہوگا کہ وہ فالوجہ، مویلح اور العلاء کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لے گا اور پھر تقریباً ارض حجاز کے نصف حصہ پر اجنبی تسلط قائم ہو جائے گا۔

✱ عقبہ کی سیاسی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ عقبہ جسے آج نہایت بے حیائی کے ساتھ فلسطین و شرق اردن کا ایک حصہ قرار دیا جا رہا ہے، تمام جغرافیائی و سیاسی حیثیات سے حجاز کا ایک جزو لاینفک ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اس مقدس ملک کا ایک جغرافیائی حصہ ہونے کی حیثیت سے محترم ہے، بلکہ دراصل اسے حجاز کے دفاع سے ایک خاص تعلق ہے اور کسی طرح بھی اس پر برطانوی انتداب کا قیام قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مرحوم سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں ایک مرتبہ ولایت شام نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ عقبہ کو اس سے ملحق کر دیا جائے،

کیونکہ یہ صوبہ ان سے قریب ہے اور معان متصرفیہ (کمشنری) کرک کا ایک حصہ ہے جو شام میں شامل ہے، لیکن اسے باب عالی نے قطعاً نامنظور کر دیا اور اس کے جواب میں لکھا کہ عقبہ کو حجاز کے ساتھ جو حربی و سیاسی تعلق ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے حجاز ہی کے ساتھ ملحق رکھا جائے۔ خصوصاً اس بنا پر کہ اگر اسے حجاز سے الگ کیا گیا، تو وہاں بھی غیر ملکیوں کو وہ حقوق دینے پڑیں گے جو حجاز کے سوا تمام ممالک عثمانی میں ان کو حاصل ہیں۔

یہی اہمیت تھی جس کی بنا پر برطانیہ مدتوں سے عقبہ اور اس کے ملحقہ علاقوں پر تاک لگائے بیٹھا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں دولت عثمانیہ مرحومہ سے قلعہ "طابہ" کے متعلق برطانیہ کا جو جھگڑا ہوا تھا اور جس پر سر ایڈورڈ گرے نے باب عالی کو دس دن کا الٹی میٹم تک دے دیا تھا، اس کی بنا یہی عقبہ تھا، کیونکہ محض طابہ کی معمولی چوکی ایسی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی جس پر دولت معظمہ برطانیہ جنگ مول لینے پر تیار ہو جاتی۔ جنگ عظیم کے بعد جب برطانیہ کی تربیت کے ماتحت حکومت حجاز قائم ہوئی، تو اس کے لیے عقبہ و ملحقات عقبہ کو اپنے یا حجاز کے ماتحت رکھنا یکساں تھا، اس لیے اس نے اس کے الحاق کی کوئی کوشش نہیں کی، مگر جب اس نے ایک تیسری قوت کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا کہ ارض مقدس میں وہ حسین و آل حسین کی طرح اس کی آلہ کار بن کر نہیں رہے گی، تو اس نے حجاز کا تمام وہ علاقہ براہ راست اپنی حکم برداری کے ماتحت لے لینے کا فیصلہ کر لیا جو اس کے لیے کوئی سیاسی و حربی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے خاندان شریفی کو ایک اور چکمہ دے کر مدینہ منورہ کے عین دروازے تک اپنے اقتدار کے حدود وسیع کر لیے ہیں اور حجاز ریلوے کے سب سے زیادہ اہم حصہ پر بغیر کسی حق کے قابض ہو گیا ہے۔

* حکومت حجاز کی مجرمانہ بددیانتی

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ حکومت حجاز اپنے خدا، اپنے دین مقدس اور اپنے وطن عزیز کے ساتھ اتنی بڑی غداری کرنے کے بعد بھی عالم اسلامی سے حمایت کی توقع کر رہی ہے اور اس مجرمانہ بددیانتی کے لیے اپنے آپ کو معذور ثابت کرنا چاہتی

ہے۔ عقبہ اور معان کے مسئلہ پر جب ہم نے وفد حجازی کے ایک سرگرم رکن سے سختی کے ساتھ باز پرس کی، تو اس نے یہ کہہ کر ہمیں مطمئن کر دینا چاہا کہ حکومت حجاز کبھی اس احتلال کو تسلیم نہیں کرے گی اور اس نے کسی سمجھوتہ کے ماتحت اس کو قبول نہیں کیا ہے، مگر ہمارے نزدیک اس عذر کی حقیقت ان عذرات لنگ یعنی اعذار باردہ سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو اب تک نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کئے جاتے رہے ہیں، ورنہ اگر فی الحقیقت برطانیہ اور حکومت حجاز کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہے اور اس احتلال میں حکومت حجاز کی مرضی شامل نہیں ہے، تو کیا وجہ ہے کہ حکومت حجاز نے اپنی سیادت و حرمت پر اتنے شدید حملہ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیا اور اس پر ادنیٰ سا احتجاج بھی نہیں کیا؟ دنیا کی مستقل حکومتیں خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہوں اور کیسی ہی کمزور ہوں، اپنے ایک چپہ بھر علاقہ پر بھی پوری مزاحمت کئے بغیر کسی دوسری سلطنت کا قبضہ قبول نہیں کرتیں، مگر آج سیاست بین الاقوامی کی تاریخ پر ہم یہ پہلا واقعہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک حکومت دوسری مدعی استقلال حکومت کے ایک نہیں متعدد علاقے "بغیر کسی سمجھوتہ کے" ہضم کر لیتی ہے اور وہ اس پر ناک بھوں تک نہیں چڑھاتی۔

پھر یہی نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت شرق اردن کا وزیراعظم رضا پاشا الرکابی معان کے بھرے جلسے میں کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ "چند غیر معمولی حالات کی وجہ سے جلالۃ الملک علی المعظم نے عالم عربی کے اس عزیز و محبوب علاقہ پر امارت شرق اردن کا جھنڈا بلند کرنا قبول کر لیا ہے"۔ (فلسطین) مگر اس پر جدہ کے جلالۃ الملک صاحب کوئی تردیدی اعلان نہیں کرتے، امیر عبداللہ والی شرق اردن عقبہ و معان کے الحاق کا فرمان جاری کرتے ہوئے صاف کہتا ہے کہ "ہماری حکومت سے عقبہ و معان کے الحاق پر صاحب جلالۃ ہاشمیہ ملک علی المعظم کے استحسان کو دیکھتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ اس جدید تغیر کا اعلان کر دیا جائے" (الشوریٰ)، مگر اس پر صاحب جلالۃ ہاشمیہ صاحب کو کسی اعلان برأت کی جرأت نہیں ہوتی۔ پارلیمنٹ میں مسٹر آرمبی گور کھڑے ہو کر علانیہ کہتے ہیں کہ عقبہ و معان پر برطانیہ کا قبضہ امیر علی کی مرضی کے بغیر نہیں ہوا، مگر امیر علی صاحب کو اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اس بیان کی تردید میں ایک لفظ بھی زبان سے نکال دیں۔

ہم حیران ہیں کہ اگر یہ سب باتیں ان کی طرف بالکل غلط منسوب کی جا رہی ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ آج اس زبردست حکومت کے سردار سے معمولی قوت گویائی بھی سلب ہو گئی ہے جو ابن سعود سے آہنی ہاتھ سے نمٹنے کی دعویدار تھی اور جو جرف سے اقصائے جنوب تک اور ساحل بحر احمر سے اقصائے مشرق تک ارض حجاز کے قدم قدم پر " اس کی مخلصانہ تجاویز کا جواب "توپوں کے دہانوں اور سنگینوں کی نوکوں سے" دینے والی تھی۔

* وفد حجاز کے اعذار باردہ کی حقیقت

لیکن ان سلبی دلائل کے علاوہ ہمارے پاس متعدد ایجابی دلائل بھی ایسے ہیں جن سے وفد حجاز اور حکومت حجاز کے اعذار باردہ کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ امیر علی اور اس کے ایجنٹ اس حقیقت کے چہرہ پر نقاب ڈالنا چاہتے ہیں کہ جنگ کی بازی ہار جانے کے اندیشہ سے اس نے اپنے تاج و تخت کی حفاظت کے عوض سرزمین حجاز کے مقدس قطعات کو خود فروخت کر دیا ہے، مگر آثار و شواہد کی گواہی سے اس نقاب کی پردہ پوشی ایک چلمن سے بھی زیادہ کمزور ہو گئی ہے۔

اس سے پہلے ہم بعض عربی جرائد کے بیانات انہی کالموں میں درج کر چکے ہیں۔ اب مصر کے مشہور اخبار "السیاستہ" نے چند مزید حقائق کا انکشاف کیا ہے، چنانچہ اپنے ایک مقالہ میں "الموقف فی الحجاز الیوم" کے عنوان سے لکھتا ہے:-

> "ملک امیر علی کی پوزیشن کچھ مدت سے بہت زیادہ نازک ہو گئی تھی، آخر وہ انگلستان سے الحاح وزاری کے ساتھ حمایت و مداخلت کی درخواست کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور اس نے حجاز سے وہابیوں کو نکال دینے کے لیے اس سے مدد لینا قبول کر لیا اگر انگلستان اس وقت مداخلت نہ کرتا، تو اس کا لازمی نتیجہ جدہ کا سقوط تھا، کیونکہ حجازی لشکر کی حالت نہایت خراب تھی۔ اس لشکر کا بڑا حصہ غیر حجازی ہے جو کرایہ پر بلایا گیا ہے۔ ان لوگوں نے فوجی خدمت چھوڑ کر اپنے اپنے وطن جانا شروع کر دیا تھا، کیونکہ انہیں ۵ مہینے سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ ملک علی نے ان سے ۲۰ دن کی مہلت طلب کی اور اس امید پر ان سے تمام بقایا تنخواہیں ادا کر دینے کا وعدہ کر لیا کہ شاید اس عرصہ میں انگلستان اس

کی مدد پر آمادہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر انگلستان نے اس کی مدد نہیں کی‘ تو پھر وہ اپنے لشکریوں کو آزاد چھوڑ دے گا“۔

اس بیان کو اگر فلسطین اور الاہرام کے بیانات سے ملا کر پڑھا جائے‘ تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ حکومت حجاز اٹلی کے در دولت سے مایوس ہونے کے بعد آخر ڈاؤننگ اسٹریٹ سے کامیاب و بامراد واپس آئی اور اس طرح حجاز کی عزت کا سودا خوب سستے داموں ہو گیا۔ **فیاللعجب و یاللعلر!**

❑ ہنگامہ پانی پت

{ ۱۸ر اگست ۱۹۲۵ء }

پانی پت کے جھگڑے نے کم از کم اتنا فائدہ ضرور پہنچایا ہے کہ اس سے برادران ہنود کی سازشی اور تنظیمی قابلیتوں کا بہت کافی تجربہ ہو گیا۔ اب تک ہندوستان میں جتنے فساد ہوئے ہیں‘ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کسی پہلے سے سوچے ہوئے پروگرام اور پہلے سے کئے ہوئے انتظام کے ماتحت برپا ہوئے‘ مگر پانی پت کا جھگڑا ان سب سے بڑھا ہوا ہے۔ گذشتہ بقرعید کے موقع پر صوفی اقبال احمد صاحب نے پانی پت کے ہندوؤں کو دوستی و مصالحت کا پیام دیا تھا‘ تو اسے ہندو لیڈروں نے سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ بادی النظر میں لوگ یہ سمجھ کر کہ یہ محض ان کی جھگڑالو طبیعت کا نتیجہ ہے‘ مگر اب اس کی حقیقت معلوم ہو گئی کہ مسلمانوں کو ایک دیر پا سبق دینے کے لیے وہ ایک گہری سازش میں مشغول تھے اور اسی کے بل پر انہوں نے مصالحت کی تجویز کو ٹھکرا دیا تھا۔ ایک طرف آس پاس کے تمام دیہات میں مسلمانوں کے خلاف بغض و نفاق کی آگ بھڑکائی گئی‘ دوسری طرف جاٹوں کو محرم کے موقع پر پانی پت آنے کی دعوت دی گئی اور اس کے لیے جمنا اشنان کا بہانہ تراش لیا گیا‘ تیسری طرف شہر میں ان کے قیام و طعام اور وقت پر انہیں چھپانے اور ان کی ضمانتیں دینے کا پورا انتظام کر لیا گیا اور اس گہری سازش سے برپا کئے ہوئے فساد پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑے بڑے ہندو لیڈروں کا بھی ایک دستہ تیار کر لیا گیا کہ بعد میں وہ فوراً موقع پر پہنچیں اور تابڑ توڑ بیانات شائع کر کے اپنی قوم کے تاریک جرائم کا چہرہ غازہ کذب و فریب سے تابناک بنا کر پیش کریں۔ اس قسم کی سازشیں عموماً ایسے موقع پر کی

جاتی ہیں جبکہ یا تو حکام میں اکثریت ہندوؤں کی ہو اور قوت سے حقائق کو چھپایا جا سکتا ہو، یا پھر تمام مقامی حکام مسلمان ہوں تاکہ سارا الزام ان کے سر تھوپ دیا جائے۔ دوسری صورت میں بیک کرشمہ دو کار کی حکمت بھی پوشیدہ ہے کہ ایک ہی وقت میں مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچایا جا سکتا ہے اور مسلمان حکام کو مطعون کرکے انہیں انتظام حکومت کے ناقابل بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

* فقیر کی قبر کا معاملہ

قارئین کرام کو یاد ہوگا ہم نے مسٹر داس کے انتقال کے بعد شہر کلکتہ کے ارباب بست و کشاد کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ وہ اگر مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ نہیں کر سکتے، تو کم از کم اپنے متوفی لیڈر کی اس دلی خواہش کا احترام کریں جسے انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے نہایت شدومد کے ساتھ ظاہر کیا تھا اور اس طرح نیو مارکیٹ کی قبر کا معاملہ ختم کر دیں۔ یہ اس قضیہ کو بدانجامی سے بچا لینے کی بہترین صورت تھی، مگر افسوس ہے کہ اس عاقبت اندیشانہ مشورہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ فقیر کی قبر کا معاملہ اس خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، جہاں کلکتہ کے امن کو ایک شدید صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ۱۴؍ اگست کو کارپوریشن میں جو جلسہ ہوا ہے اس کی کارروائی اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور یورپین کونسلروں نے قبر کو کھود کر لاش کو نکال دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور اس معاملہ میں ان کی رائے اس قدر سخت تھی کہ وہ مسلمان ممبروں کی طرف سے کسی معتدل تجویز کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اس موقع پر مسٹر سین گپتا نے جو رویہ اختیار کیا ہے، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود ان کی ذاتی رائے کا نتیجہ تھا یا وہ ایوان کی عام رائے سے مرعوب ہو گئے تھے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی مسلمانوں کے نقطہ نظر کو پیش کرنے کا کوئی موقعہ نہیں دیا اور اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ اٹھ کر ایوان بلدیہ سے چلے جائیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسٹر ایس سی بوس کی ترمیم منظور ہو چکی ہے جس میں مسلمانوں کو اس غرض کے لیے دو مہینہ کی مہلت دی گئی ہے کہ وہ خود اپنی غلطی کو محسوس

کر کے فقیر کی لاش کو منتقل کر دیں اور بصورت عدم تعمیل سفارش کی گئی ہے کہ ایگزیکٹو آفیسر کو یہ فرض انجام دینے کے لیے پوری آسانی بہم پہنچائی جائے۔ ایسی حالت میں ہم مسلمانان کلکتہ کو صرف یہی مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اس دو مہینہ کی مہلت میں کارپوریشن کو راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کریں اور اگر وہ افہام و تفہیم کی کسی قوت سے متاثر نہ ہوں تو پھر صبر و سکون کے ساتھ اس جبر کو برداشت کریں جو ایک مسلمان کی قبر اکھاڑ کر ان کے جذبات پر کیا جائے گا۔

تاہم کلکتہ کے ذمہ دار مسلمان لیڈروں کا یہ فرض ہے کہ وہ کارپوریشن کو بھی اس فعل کے خطرناک نتائج سے آگاہ کر دیں۔ انہیں یہ بات صاف صاف کہہ دینی چاہئے کہ اگرچہ ہر عقلمند مسلمان ایسے نازک مواقع پر اپنی قوم کو صبر و سکون ہی کی تعلیم دے گا، لیکن کسی قوم میں بھی جاہل عوام عاقبت اندیشی کے جوہر سے آراستہ نہیں ہوتے اور ایسی حالت میں قوی اندیشہ ہے کہ ہم عوام کو قابو میں نہ رکھ سکیں گے۔ پس اگر کارپوریشن کلکتہ کی نام نہاد "عزت" کو کلکتہ کے امن سے زیادہ اہم سمجھتی ہے تو پھر ہرچہ بادا باد ورنہ بدمزگی سے بچنے کے لئے مصالحت کی کوئی راہ نکالے؟

* ہندو لیڈروں کے گمراہ کن بیانات

پانی پت کے واقعات تو دوہرانے کی یہاں ضرورت نہیں، کیونکہ تمام حالات الجمعیۃ کی گزشتہ اشاعتوں میں درج کئے جا چکے ہیں، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ان سطور میں ہندو لیڈروں کی ان غلط بیانیوں پر ایک مختصر سی تنقید کریں جن سے صداقت کے روشن چہرہ پر نقاب ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم "مظالم" کے ان واقعات کا تجزیہ کریں گے جن کا وقوع پذیر ہونا مسلمانوں کے کردار کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد ان لوگوں کا دفاع نہیں ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے دفاع کے لئے وہ خود کافی مضبوط ہیں، البتہ ہم فساد کی ذمہ داری سے متعلق ان حقائق کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں چھپا کر ہندوؤں کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہندوؤں کا بیان ہے کہ انہوں نے جاٹوں کو محرم کے موقع پر پانی پت آنے کی دعوت نہیں دی، بلکہ وہ خود جمنا اشنان کے لئے پانی پت آئے تھے، کیونکہ نہان کے گھاٹ

تک جانے والا راستہ وہیں سے ہو کر گزرتا ہے، لیکن یہ عذر صرف اسی وقت صحیح ہو سکتا تھا جبکہ پانی پت میں صرف مغربی دیہات کے جاٹ پائے جاتے ہیں جو جمنا جانے کے لئے وہاں سے گزرنے پر مجبور تھے۔ برخلاف اس کے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں جنوبی دیہات کے آدمی بھی موجود تھے جو پانی پت کے مقابلہ میں جمنا سے زیادہ قریب تھے اور شمالی دیہات کے آدمی بھی گرفتار ہوئے جنہیں گھاٹ جانے کے لئے پانی پت آنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جاٹوں کے اس عظیم اجتماع کا مقصد فساد برپا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر نارنگ کا یہ استدلال نہایت لغو ہے کہ بارش کے زمانہ میں دیہاتی راستوں کے ناقابل گزر ہو جانے کے باعث ان دیہاتوں کے لوگ بھی پانی پت کی شاہراہ اختیار کرنے پر مجبور تھے اور نہان کے موقع پر انہیں سامان وغیرہ بھی خریدنے کی ضرورت تھی۔ اس وکیلانہ استدلال کی حقیقت اس وقت خود بخود کھل جائے گی جب عدالتی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو جائے گا کہ اس سے پہلے کبھی ان وجوہ کے باعث جلال پور، نیمڑی، اوبرا کھیڑی کورالا اور چھاج پور وغیرہ دیہات کے جاٹوں کا اجتماع پانی پت میں نہیں ہوا ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ اگر ہندوؤں نے ان کو دعوت نہیں دی تھی، تو کیا وجہ تھی کہ راستہ کے اسٹیشنوں پر ان کا استقبال کیا گیا۔ انہیں گھروں میں ٹھہرایا گیا، ان کی مٹھائی اور ٹھنڈے پانی سے تواضع کی گئی، انتشار کے وقت ان کے لئے دروازے کھول دیئے گئے اور جب وہ گرفتار ہوئے، تو ہندوؤں نے نہایت مستعدی کے ساتھ ان سب کی ضمانتیں دے کر چھڑا لیا۔ اگر یہ محض انسانی اخوت یا مذہبی ہمدردی تھی تو ایسے جذبات عالیہ کا کبھی اس سے پہلے کیوں نہ اظہار ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جاٹوں کو منتشر ہو جانے اور راستہ صاف کر دینے کے لئے کوئی حکم نہیں دیا گیا اور مسٹر لطیفی نے بغیر کسی ابتدائی نوٹس کے ان پر دفعتہ "حملہ کر دیا" حالانکہ اگر جاٹوں کو ایسا کوئی حکم دیا جاتا، تو وہ ضرور منتشر ہو جاتے، مگر جن لوگوں نے یہ عذر پیش کیا ہے، انہوں نے اس حقیقت کی کوئی تردید نہیں کی کہ جاٹوں کے مجمع نے تین گھنٹہ تک جلوس کو روکے رکھا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان کو ملائمت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی، تو ان پر حملہ کر دیا اور افسروں سمیت پولیس کے

کئی آدمی زخمی ہوئے۔ اگر یہ واقعات صحیح نہیں ہیں، تو دلائل کے ساتھ ان کی تردید کی جائے اور اگر صحیح ہیں، تو ان سے جاٹوں کے اجتماع کا مقصد، موقع کی نزاکت اور مسٹر لطیفی کے بلا اطلاع حملہ کردینے کی مصلحت سب کچھ عیاں ہوجاتا ہے۔ ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنگجو جاٹوں کے ایسے کثیر مجمع کے سامنے اپنی چھوٹی سی جمعیت کو لئے ہوئے اگر مسٹر لطیفی اتمام حجت کی خاطر تھوڑی سی دیر بھی لگاتے، تو ان کی ہوا بگڑ جاتی اور مجمع یہ سمجھ کر کہ ڈپٹی کمشنر کمزور ہے، فوراً حملہ کردیتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمانان پانی پت بھی جنگ میں شریک ہوجاتے اور ہزارہا آدمیوں کا خون ہوتا۔

سوامی شردھانند کا یہ عذر کہ اگر جاٹوں کا مقصد لڑنا ہوتا، تو وہ تین گھنٹہ تک کیوں رکے رہتے بالکل باطل ہے۔ جاٹوں کا مقصد تو اسی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے مسٹر گل نواز خان اور سردار ہرکشن سنگھ پر حملہ کیا، البتہ ان کا اتنی دیر تک رکے رہنا محض انہی دونوں حکام کی خوش تدبیری کا نتیجہ ہے جنہوں نے خود اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے آنے تک جاٹوں کو روکے رکھا اور شہر کے امن کو بچالیا۔

ان تمام حقائق کی موجودگی میں جب ہم ہندو لیڈروں کو اپنی قوم کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو ہمیں بے اختیار ان کی بے باکی و جسارت کی داد دینی پڑتی ہے۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس اور جماعت علماء

{ یکم صفر المظفر ۱۳۴۴ ہجری - ۲۲ر اگست ۱۹۲۵ء }

جب سے آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں احمدی جماعت کی شرکت اور اس سے علمائے امت کے مقاطعہ کی بحث چھڑی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے نہ صرف نفس مسئلہ کو، بلکہ اس کے بعید ترین متعلقات تک کو چھوڑ کر، محض علماء کی ذات پر حملے شروع کر دیئے ہیں اور انہیں من حیث الجماعت ایسے رکیک انداز میں مطعون کیا جا رہا ہے کہ علماء تو درکنار شاید سفہاء و اراذل کو بھی شریف لوگ اس طرح مطعون نہیں کرتے۔ کوئی انہیں تنگ خیال، کوتاہ بین اور تنگ نظر کا خطاب دیتا ہے کوئی انہیں خود غرض، جاہ طلب اور اپنے حلوے مانڈے کی خیر منانے والا قرار دیتا ہے کوئی کہتا ہے کہ یہ ملانے سیاست کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لئے انہیں سیاسی میدان سے نکال دینا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس جماعت نے ہمیشہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں اور اب بھی اٹکا رہی ہے، لہٰذا اس روک کو اپنے راستے سے فوراً ہٹا دینا چاہیے۔ کوئی انہیں دھمکی دیتا ہے کہ عنقریب ہندوستان میں بھی تمہارا وہی حشر ہونے والا ہے جو ترکی میں ہو چکا ہے۔ غرض ایک طوفان ہے جو بعض مدعیان اصلاح نے ملک میں برپا کر رکھا ہے اور اس سب شور و غوغا کی وجہ صرف یہ ہے کہ علماء کی جماعت نے ان کی رائے اور مرضی کے مطابق عمل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

ہم حیران ہیں کہ آخر اس سب دشنام کے طوفان کو کون سی اخلاقی دلیل سے صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر علماء کی جماعت مجوزہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے راستہ میں کوئی عملی رکاوٹ پیدا کرتی، اگر اس کی طرف سے کوئی اعلان شائع کیا جاتا کہ کوئی مسلمان اس میں شریک نہ ہو، اگر وہ جگہ جگہ اس کے خلاف پروپیگنڈا کرتی پھرتی اور اگر اس کی جانب سے کوئی واقعی مزاحمت عمل میں آتی تو بے شک کانفرنس کو اس پر اعتراض کرنے کا حق حاصل تھا، لیکن اب تک اس کے خلاف اس قسم کا کوئی الزام ثابت نہیں کیا گیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایسا کوئی الزام ثابت کیا بھی نہیں جا سکتا۔ اس نے اگر کچھ کیا ہے، تو وہ صرف یہ کہ جب اسے کانفرنس میں احمدی جماعت کی شرکت کا علم ہو گیا تو اس نے خود اس میں شرکت سے احتراز کیا اور یہ ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ اگر بفرض محال اس عدم

شرکت کے لئے اس کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی تب بھی اسے یہ حق حاصل تھا کہ کسی مجلس میں شریک ہو یا نہ ہو اس کے لئے اس سے دلائل پوچھے جاسکتے ہیں، مباحثہ کیاجاسکتا ہے، شرعی یا عقلی حیثیت سے اعتراضات کئے جاسکتے ہیں، مگر جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، کسی معقول وجہ کے بغیر لعن وطعن کی بوچھاڑ نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر کوئی جماعت محض اس بنا پر رکیک الزامات اور مہذب گالیوں کی ہدف بنائی جاسکتی ہو کہ وہ آپ کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتی، تو یقیناً اس کو بھی بدرجہ مساوی یہ حق پہنچتا ہے کہ اسی جرم کی بنا پر آپ کو طعن وملامت کا مورد بنائے اور اس طرح باہمی شماتت کا ایسا سلسلہ جاری ہوجاتا ہے کہ کبھی ختم ہی نہیں ہوسکتا پھر اگر دنیا میں اختلافی مسائل پر بحث و تمحیص کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ جائے، تو کوئی ہمیں بتلائے کہ کیا اس طریقہ سے کوئی معمولی سے معمولی مسئلہ بھی طے ہوسکتا ہے؟

اس معاملہ کا ایک اور بھی پہلو ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کل تک یہی علماء تھے جن کی تعریف میں زبانیں خشک ہوئی جاتی تھیں۔ انہی کے فیصلوں کو واجب التعمیل سمجھا جاتا تھا۔ انہی کے فتوؤں کو استناد کا درجہ دیا گیا تھا اور آج وہی علماء ہیں جن کو مورد لعن وطعن بنایا جارہا ہے اور انہی کو مطعون کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ اس انقلاب حال کی خواہ کوئی توجیہ کی جائے، مگر ہم تو اس کا مطلب صرف یہی سمجھتے ہیں کہ نہ پہلے علماء کی دل سے قدردانی تھی اور نہ اب انہیں عزت و توقیر کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ ان کی تعریض و تحقیر میں کوئی ایسا ہی جذبہ کارفرما ہے۔ جو لوگ اس وقت اصلاح امت کا علم لے کر کھڑے ہوئے ہیں، ان کے پاس حق کا معیار صرف ان کی اپنی رائے ہے اور اسی پر وہ ہر چیز کو پرکھتے ہیں۔ خواہ وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ کل تک وہ علماء کی پیروی کرتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ شریعت حقہ کے علمبردار اور ملت حنیفی کے دینی پیشوا ہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ ان کا فتوی ان کی رائے کے عین مطابق تھا، لیکن آج جبکہ وہی علماء اپنے مذہبی اجتہاد کی بناپر ان کی رائے کے خلاف عمل کررہے ہیں، تو خواہ وہ اپنے عمل کی تائید میں سنت رسول ﷺ کو پیش کریں، یا سلف صالح کے اسوۂ حسنہ کو، ان کی کوئی دلیل قابل قبول نہیں ہے اور انہیں ان مدعیان اصلاح امت کے دربار سے اگر کوئی خطاب مل سکتا ہے، تو وہ صرف جاہل، تنگ نظر، خود

غرض اور مطلب پرست کا خطاب ہے۔

خدارا ہمیں بتاؤ کہ اس سے زیادہ تنگ نظری بھی اور کوئی ہو سکتی ہے؟ تم علماء کو الزام دیتے ہو کہ وہ تنگ نظر ہیں‘ مگر خود تمہارا اپنا یہ حال ہے کہ اپنی رائے اور خیال کے دائرے سے باہر کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے۔ تم اپنے زعم میں یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ تمہارے افکار و آراء سے اختلاف کر ہی نہیں سکتا اور جب کبھی کسی کا عمل تمہاری رائے کے خلاف ہوگا‘ تو ضرور اس میں غرض پرستی و بددیانتی شامل ہوگی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اسی چیز کا نام وسعت نظر ہے‘ تو تنگ نظری آخر کس چیز کو کہتے ہیں؟

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سب و شتم کے طوفان سے علماء کی جماعت ہرگز تنگ دل نہیں ہے۔ عوام کا رد و قبول اس کے اعمال پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اس کے سامنے صرف ایک منہاج نبوت ہے جس پر اسے ہر صورت میں گامزن ہونا ہے‘ اب اس میں اگر کوئی اس کی تائید کرتا ہے‘ تو خود اپنی بھلائی کے لئے کرتا ہے اور اگر نہیں کرتا‘ تو اس سے علماء کی حق پرستی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ عوام کے میلان طبیعت کی پابندی صرف وہی علماء سو کرسکتے ہیں جنہیں اپنے اقتدار اور فوائد و منافع کے آگے شریعت کے مصالح اور اپنی قائدانہ مسئولیت کی کوئی پروا نہ ہو‘ ورنہ جو علمائے حق ہیں‘ ان کا تو کام ہی یہ ہے کہ خواہ حکومت سدراہ ہو‘ یا عام لوگ خلاف ہوں‘ وہ ہر صورت میں حق کا اعلان کریں اور ہمیشہ وہی راہ اختیار کریں جو انہیں اپنے علم کی روشنی میں احکام شرعیہ اور امت کے دینی مصالح کے مطابق نظر آئے۔ تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ہر زمانہ میں آپ کو علمائے حق اور علمائے سوء کا یہ فرق نمایاں نظر آئے گا۔ علمائے حق نے ہمیشہ حکومتوں کے ظالمانہ استبداد اور عوام کے مبتدعانہ داعیات کے خلاف جہاد کیا اور اس میں ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کیں‘ لیکن علمائے سوء نے ہمیشہ عافیت پسندی اور مطلب پرستی سے کام لیا۔ جب کبھی حکومت نے ان سے مذہبی فتنوں اور دینی مفاسد کی اشاعت میں مدد چاہی‘ تو انہوں نے اپنے فائدے کے لئے اس کا ساتھ دیا اور جب عوام میں شہرت و اقتدار حاصل کرنے کے لئے ضرورت ہوئی‘ تو انہوں نے بے تکلف ہر بدعت اور ہر ضلالت کی حمایت کی۔ خدا کا شکر ہے کہ جمعیت علماء ہند اور جماعت دیوبند‘ ایسے

فتنہ پرور علماء سوء میں سے نہیں ہے۔ اس نے حکومت کے خلاف دین و ملت کی حمایت کرکے ثابت کردیا ہے کہ وہ حق کی خاطر ہر قسم کے مصائب جھیلنے کی جرأت رکھتی ہے اور اب انشاء اللہ وہ افرنجیت اور ملحدانہ آزادی کے اس عام طوفان کا مقابلہ کرکے بھی اپنی شریعت پرستی کا ثبوت دے دے گی جو مغربیت کے اثر سے اسلامی ہند میں برپا ہو رہا ہے۔

پس اگر فی الحقیقت آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے حامی محض دین و ملت کی مصلحت کے لئے علماء پر اعتراض کر رہے ہیں، تو ان کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ طعن و تشنیع کا انداز چھوڑ کر معقولیت کے ساتھ اس امر کی تحقیق کریں کہ آیا مسلم پارٹیز کانفرنس میں احمدی جماعت کو دعوت دینے سے واقعی کسی دینی فتنہ کا فتح باب ہوتا ہے یا نہیں اور یا تو علماء کو مطمئن کرکے اپنا ہم آہنگ بنالیں یا خود اپنا اطمینان کرکے اپنے عمل میں اصلاح کرلیں، لیکن اگر یہ سب شور و غوغا محض سیاسی یا جماعتی مصالح کی خاطر ہے، تو ہم صاف کہہ دیتے ہیں کہ علمائے حق پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا اور کوئی دھمکی خواہ وہ کیسی ہی ہولناک ہو، انہیں اس راہ سے نہیں ہٹاسکتی جسے وہ منہاج نبوت اور احکام شریعت کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔

✱ ریف اور فرانس

ریف کی خبریں آج کل جس انداز سے آرہی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شوریدہ سطح کی تہہ میں درحقیقت کوئی خاص ہنگامہ برپا ہے جس کو چھپانے کے لئے یہ گدلے پانی کا طوفان اٹھایا جا رہا ہے۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی فوجیں اگر ایک قدم بھی آگے بڑھ جاتی ہیں، تو اس کو عظیم الشان فتوحات کے ذیل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف عبدالکریم کے خلاف سخت شکائتیں کی جارہی ہیں کہ وہ کسی طرح صلح کے لئے تیار نہیں ہوتے اور تیسری طرف ان لچر اور پوچ شرائط کو نہایت معقول اور مصالحانہ قرار دیا جا رہا ہے جسے ایک مجاہد فی سبیل اللہ تو درکنار ایک مفتوح بھی مشکل سے قبول کرسکتا ہے۔ ان تمام باتوں سے فرانس یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنی قوت سے ریف کو بالکل تباہ کرسکتا ہے، لیکن باوجود اس کے محض انسانی ہمدردی کے خیال سے وہ ریف کے ساتھ ایسی نرم شرائط پر صلح کرنے کے لئے تیار ہے،

مگر دراصل اس کا مطلب ہر حقیقت شناس آدمی بھی سمجھتا ہے کہ وہ **ریفیوں** کے مجاہدانہ اقدامات سے عاجز آچکا ہے اور چاہتا ہے کہ غازی عبدالکریم کسی طرح ایسی شرائط پر اس سے صلح کرلیں کہ اس خطرناک جنگ سے اس کا پیچھا بھی چھٹ جائے اور اس کے وقار کو بھی صدمہ نہ پہنچے۔

* فرانسیسی تدبر کا امتحان

اس وقت فرانس جس مشکل میں گرفتار ہے، وہ اس کے لئے نئی نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ ان قوموں کو پیش آتی رہی ہے، جن کے جہانگیرانہ پندار کو پہلی مرتبہ ٹھیس لگانے کے لئے کوئی حقیر سی قوم پیدا ہوجایا کرتی ہے۔ ایسے موقع پر ان قوموں کے تدبر کا خاص امتحان ہوتا ہے۔ اگر ان کے ارباب حل و عقد کچھ عقل کے جوہر سے متصف ہوتے ہیں، تو وہ حقائق کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھ لیتے ہیں اور موقع کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اسے سنبھالنے کے لئے فوراً اپنی بالادستی کے منصب رفیع سے نیچے اترتے ہیں، لیکن اگر ان کے اقتدار کے خاتمہ کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے، تو ان کی عقل خبط ہوجاتی ہے اور وہ اپنی سیادت کو قائم رکھنے کی احمقانہ خواہش پر اپنی عزت و وقار کو بھی قربان کردیتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں برطانیہ یہ امتحان دے چکا ہے اور اس میں اسے کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس نے افغانستان اور آئرلینڈ کو غلام بنا کر رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ جب دیکھا کہ اس میں کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے، تو عین وقت پر معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرکے عزت و حرمت کے ساتھ اسی حریت و استقلال کو قبول کرلیا ہے جسے وہ یقیناً بہت جلدی اس کی عزت کو صدمہ پہنچا کر حاصل کرلیتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فرانس ریف کے اس امتحان میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ اگر اس کے مدبرین کے پاس تھوڑی سی بھی عقل موجود ہے، تو وہ بہت جلدی ریف کی آزادی کو تسلیم کرلیں گے، ورنہ انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ کچھ عرصہ کے بعد انہیں نہ صرف نہایت ذلت کے ساتھ ریف ہی کی آزادی کو تسلیم کرنا پڑے گا، بلکہ شاید تمام شمالی افریقہ کی سیادت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ غازی عبدالکریم کے یہ الفاظ یقیناً بہت وزن رکھتے ہیں کہ "میں اس وقت تک ہرگز چین نہ لوں گا جب تک مراکش کی ایک ایک انچ زمین کو اجنبیوں سے خالی نہ کرالوں گا"۔

* فرانسیسی شرائط صلح کی حقیقت

فرانسیسی جن چالوں سے غازی عبدالکریم کو شکست دینا چاہتے ہیں وہ اب بہت پرانی ہو چکی ہیں۔ مشرقیوں نے ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اب ان اوچھے ہتھیاروں سے کام چلنا مشکل ہے۔ وہ اہل مراکش کو یہ دھوکہ دے کر اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں کہ ان کی ساری جدوجہد صرف سلطان مراکش کی سیادت قائم کرنے کے لئے ہے، بلکہ اب تو سیادت کی بجائے اس کاٹھ کے پتلے کو خلیفہ قرار دیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہم ابن عبدالکریم سے اس کی خلافت تسلیم کرانا چاہتے ہیں، مگر مراکش کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ سلطان مراکش کون ہے، اسکی خلافت و سیادت کی حقیقت کیا ہے اور فرانس کی جدوجہد دراصل کس مقصد کے لیے ہے۔ یہ دھوکہ کی ٹٹیاں اب سے چند برس پہلے تک تو ضرور کام دیتی تھیں، لیکن اب یورپین قوموں نے اس کو استعمال کرتے کرتے اس قدر جھرجھرا کردیا ہے کہ کوتاہ بیں سے کوتاہ بیں شخص بھی دیکھ لیتا ہے، ان کے پیچھے کیا چیز چھپائی گئی ہے پھر جبکہ یہ حقیقت کسی شخص سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مراکش کا اصلی خلیفہ فرانس کا صدر جمہوریہ ہے اور مولائی عبدالعزیز کی اطاعت دراصل فرانس کی اطاعت ہے، تو نہ معلوم فرانس کس بنا پر امید کرسکتا ہے کہ جو گردن آزادی کی راہ میں شہید ہونے کے لئے تیار ہے وہ ایک قوم کے آگے جھکنے پر آمادہ ہو جائے گی؟

* جنگجوئی کا الزام کس پر ہے؟

فرانسیسی وزیراعظم اور اخبارنویس ابن عبدالکریم کو بدنام کرنے کے لئے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کررہے ہیں کہ جنگ کی ساری ذمہ داری عبدالکریم پر ہے کیونکہ اسی نے جنگ چھیڑی تھی اور اب وہی صلح کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس شخص کے سامنے مجاہدہ ریف کی تاریخ مستحضر ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عبدالکریم نے آخر وقت تک فرانس کے ساتھ مصالحت کرنے کی کوشش کی اور مجبور ہو کر اس وقت جنگ چھیڑی تھی جب ان کے لئے اپنے قومی وقار کو بچانے کی کوئی اور صورت باقی نہ رہی تھی۔ حال ہی میں ۲۵ر ذیقعدہ ۱۳۴۳ ہجری کو غازی موصوف نے

فرانس کے ایوان مبعوثین کے نام جو کھلی چٹھی شائع کی ہے' اس میں غازی صاحب نے واضح کیا ہے کہ وہ تو باوقار شرائط پر صلح کے لئے تیار تھے لیکن مارشل لیوتی نے ان کو جنگ کی آگ میں کود پڑنے پر مجبور کیا۔ وہ ابتدا ہی سے یہ چاہتے تھے کہ تمام سلطنتوں سے تعلقات درست رکھیں اور خصوصیت کے ساتھ فرانس سے ان کا کوئی جھگڑا نہ پیدا ہو' لیکن جب انہوں نے مارشل لیوتی کا رویہ بدلتے ہوئے دیکھا' تو وہ خود ۴۳ھ میں فرانس تشریف لے گئے اور تمام واعیان مملکت سے ملے جن میں موسیو پوانکارے اور خود موسیو پان لیو بھی شامل تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مارشل لیوتی کو بھی متعدد خطوط لکھے کہ میں فرانس کی سیادت مراکش پر کوئی حملہ نہیں کرنا چاہتا' البتہ یہ اطمینان چاہتا ہوں کہ میرے حقوق پر کوئی دست درازی نہ کی جائے گی۔ ان تمام دوستانہ مراسلات کا جواب انکو کبھی دوستانہ انداز میں نہیں دیاگیا' بلکہ انہیں نہایت توہین آمیز طریقہ سے ٹھکرا دیاگیا پھر جب ۲۴ء کے اواخر میں غازی موصوف نے سنا کہ مارشل لیوتی بذات خود ورغہ اور صنہاجہ کی طرف آنا چاہتے ہیں' تو انہوں نے فوراً ان کے پاس ایک وفد بھیج کر دریافت کیا کہ جمہوریہ ریف کے حقوق پر اس صریح دست اندازی کا مدعا کیا ہے' لیکن ان کا وفد ابھی فاض ہی میں تھا کہ فرانسیسی فوجیں بڑھنی شروع ہوئیں اور انہوں نے الجایہ بنی زروال اور الزبی تک اندرون ریف کی سرحدوں کو پامال کردیا۔ اب انہیں یقین ہوچکا تھا کہ مارشل لیوتی جنگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا لیکن پھر بھی انہوں نے انتظار کیا اور آخر اس وقت ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہوگئے جب انہوں نے سرحدی قبائل کو بھڑکا کر اندرون ریف میں بڑھنے کے لئے راستہ صاف کرنے کی کوشش کی اور ان ریفی افواج پر توپوں اور ہوائی جہازوں سے گولہ باری شروع کردی جو متمرد اور سرکش قبیلہ بنی زروال کو تنبیہ کرنے کے لئے روانہ کی گئی تھیں۔

ان تمام باتوں کے بعد اگر فرانس غازی عبدالکریم کو جنگ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے' تو یہ صرف اس کی بے شرمانہ جسارت ہے' ورنہ کسی اخلاقی نقطہ نظر سے تو ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔

❑ بعض مسلمانوں کی دین فروشی

{ ۲۶ر اگست ۱۹۲۵ء }

غالباً چھ سات مہینہ کا عرصہ ہوا کہ دہلی کے بعض مسلمانوں نے حکومت سے ان مساجد کا معاوضہ حاصل کرلینے کی کوشش کی تھی جن پر امپریل سٹی کی توسیع کے سلسلہ میں وہ متصرف ہوگئی ہے یا ہونا چاہتی ہے۔ جب شہر کے غیور مسلمانوں نے ان پر بہت کچھ لعنت ملامت کی بوچھاڑ کی، تو وہ اپنے اس ناپاک ارادہ سے باز آگئے، لیکن اب پھر ہم نے کچھ اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ چند ملت فروشوں نے اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے درخواست دی ہے اور چاہتے ہیں کہ خانہ ہائے خدا کی مقدس زمین کے عوض روپیہ قبول کرکے ان پر حکومت کے قبضہ کو جائز تسلیم کرلیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو نجدیوں کے قبے توڑنے پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ان کی حمیت میں موالد و قبب کے انہدام کی خبر سن کر ایسا جوش آجاتا ہے کہ ابن سعود اور اس کے اخوان کو مغلظ گالیاں تک دینے سے نہیں چوکتے۔ اگر ان کے اس جوش میں کوئی حقیقی مذہبی روح شامل ہوتی، تو شاید وہ اتنے بڑے گناہ کے مرتکب نہ ہوتے جسے خدا نے ایک جگہ نہیں، بلکہ متعدد مقامات پر ظلم سے تعبیر کیا ہے، لیکن اب جبکہ ہم انہیں صریحاً تخریب مساجد کے فعل میں شریک ہوتے دیکھ رہے ہیں، تو مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس سنیت کے جوش میں دراصل کوئی دوسری ہی چیز کام کر رہی ہے جس کو ایمان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ہم کوشش کر رہے ہیں کہ واقعات کی کامل تحقیق کرکے ان ننگ اسلام شخصیتوں کا پتہ چلائیں جنہوں نے اس جرم کا بے شرمانہ ارتکاب کیا ہے۔ اگر ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگئے، تو انشاء اللہ تمام واقعات شہر کی اسلامی پبلک کے سامنے پیش کردیں گے اور پھر خود مسلمانوں ہی کی حمیت دینی یہ فیصلہ کرے گی کہ ان لوگوں سے کس قسم کا سلوک کیا جانا چاہیے۔

* لارڈ ریڈنگ کی تقریر

جس وقت لارڈ ریڈنگ کو انگلستان کی دعوت دی گئی تھی، تو عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے لیے کوئی خاص انقلاب انگیز مستقبل پردہ غیب میں چھپا ہوا ہے جسے

بے نقاب کرنے کے لیے انگلستان کے مدبر اپنے کارکن ایجنٹ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی بھولی بھالی مخلوق جو برطانیہ کے خوان کرم سے کچھ مل جانے کی ہمیشہ امید کرتی رہتی ہے‘ اس آنے والے انقلاب کے انتظار میں گن گن کر گھڑیاں کاٹنے لگی۔ اس نے وہائٹ ہال کی سرگوشیوں کو بے تابی کی نگاہوں سے دیکھا اور اس وعدے نے ہربار اس کی امیدوں کو دوبالا کر دیا کہ گفتگو کا نتیجہ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس نے ریوٹر کے برقی پیغامات میں انگریزی اخبارات کی افواہوں کو بڑے شوق کی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا یقین بڑھتا رہا کہ ضرور ہی اس کی قسمت کا کوئی اہم فیصلہ کیا جا رہا ہے اس نے لارڈ برکن ہیڈ کی یاس انگیز اور توہین آمیز تقریر پڑھی اور اس پر بھی اس کی توقعات میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ لارڈ ریڈنگ واپس ہو کر اسمبلی میں ایک اہم اعلان کریں گے۔ اس لیے وہ وزیر ہند کی تقریر سے مایوس نہیں ہوئی اور بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگی کہ دیکھئے آسمان شملہ سے کونسا مائدہ بذل و اکرام اس کے لیے اترتا ہے۔ یہ امیدوں بھری بے تابی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ جب کونسل چیمبر میں لارڈ ریڈنگ تقریر کرنے کھڑے ہوئے‘ تو ہم نے سنا ہے کہ بہت سے لبریز تمنا دل دھڑکن کی شدت سے بانسوں اچھلنے لگے اور اکثر حضرات اپنے کانوں کو ان کے متحرک لبوں سے قریب تر لے جانے کے لیے میزوں پر جھک گئے‘ لیکن وہ محبوبانہ ادا جو چار پانچ مہینہ سے ان کے ساتھ برتی جا رہی تھی‘ فیصلہ کی ان آخری گھڑیوں میں بھی استعمال کی گئی اور گھنٹہ بھر تک وائسرائے بہادر نے تعزیت تہنیت‘ صنعت‘ زراعت‘ کرنسی اور ملازمتوں کے کمیشن وغیرہ جزئی مسائل کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے رہنے اور ان کے دلوں کو اچھی طرح تڑپا لینے کے بعد ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا اور کہیں اس وقت جا کر ہمارے بدنصیب ملک کی بھولی بھالی مخلوق کو یہ معنی متحقق ہوئے کہ جس چیز کے لیے وہ پانچ مہینہ سے بے تاب تھے‘ اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے لارڈ ریڈنگ سے وہائٹ ہال میں جن امور پر مشورہ کیا گیا ہے‘ وہ ہندوستان کی اصلاحات میں توسیع کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور ان سرگوشیوں سے یہ امید ہی غلط قائم کی گئی تھی کہ ان کے بطن میں کوئی جنین اصلاح پرورش پا رہا ہے‘ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان کے سفر کا مقصد یہی تھا‘ تو لارڈ

لارڈ برکن ہیڈ اور اب لارڈ ریڈنگ کی تقریروں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کا ہزارہا روپیہ صرف کرکے لارڈ ریڈنگ کو صرف یہ اعلان کرنے کے لیے بلایا گیا تھا کہ ہندوستان کو موجودہ غلامی کی لعنت سے نجات نہیں مل سکتی۔ انگلستان کی تمام جماعتیں ہندوستان کو غلام رکھنے پر متفق ہیں اور اگر بھلا چاہتے ہو، تو آزادی کی جدوجہد کرنے کی بجائے ہماری کاسہ لیسی کرو۔

مدتوں تک انتظار کرنے کے بعد اس فیصلہ کا اعلان ممکن ہے کہ ہمارے ابنائے وطن کے لئے خلاف توقع ہو، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ برطانیہ کی پرانی چالیں ہیں۔

* قضیہ موصل

موصل کے متعلق برطانیہ اور ترکی کے دعوائے استحقاق کی یہ حیثیت پیش کی گئی ہے کہ شاید ہماری حکومتیں برطانیہ کے تحقیقاتی کمیشنوں کی رپورٹوں کی صنعت اہمال میں اسکی ہمسری کا دعوی نہیں کرسکتیں۔ اس نے ایک ہی وقت میں دونوں پارٹیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ صراحت کے ساتھ برطانیہ ہی کا حق تسلیم کیا ہے اور نہ ترکی کا۔ ایسی حالت میں مجلس اقوام کی پوزیشن بھی ظاہر ہے اور پہلے سے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ اس کا فیصلہ بھی قضیہ موصل کی موجودہ الجھن کو کچھ کم نہ کرسکے گا۔ اگرچہ ترکی حکومت اسے ایک واضح فیصلہ کرنے پر مجبور کررہی ہے اور اس نے اپنے نمائندوں کو یہ تاکید کرکے بھیجا ہے کہ مجلس کو ترکی نقطہ نظر سے بحث کرنے پر مجبور کرو، لیکن ایسے معاملات میں جن کے دونوں فریق قوی اور مضبوط ہوں، بین الاقوامی ثالثی نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔

پس اب یہ امر یقینی ہے کہ کفن وزدان یورپ کی کونسل میں مزید چند روز تک معرض بحث و نظر رہنے کے بعد یہ مسئلہ عنقریب میدان کی عدالت میں قاضیٔ شمشیر کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ ترکی اور برطانیہ دونوں اس تیز زبان پنچ پر اپنا معاملہ چھوڑنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوہ بلقان کی وہ آتش فشانیاں جو ایک عرصہ تک یورپ میں تباہ کاری کی خدمت انجام دے چکی ہیں، کردستان کی پہاڑیوں کو منتقل ہونے والی ہیں جن کے دامن میں روغن نفت "پیٹرول" کا اشتعال پذیر مادہ بھرا

ہوا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ برطانی مدبرین نے ان خطرات کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے یا نہیں جو پیٹرول کے اس آتش گیر خزانہ میں چنگاری ڈالنے سے پیدا ہوں گے، لیکن ان کا یہ انداز کہ مصر سے لے کر عرب اور ہندوستان تک وہ اپنی وسیع سلطنت میں بے چینی و اضطراب کے مادوں کو پرورش کر رہے ہیں، صاف بتلا رہا ہے کہ وہ ان خطرات سے قطعاً غافل ہیں۔

* مسئلہ حجاز

جمعیۃ العلماء ہند اور خلافت کمیٹی کے محترم نمائندوں کو حجاز سے واپس تشریف لائے کافی عرصہ گزر چکا ہے اور انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے ارض پاک کے جو کچھ حالات بیان کئے ہیں وہ سب بے کم و کاست مسلمانان ہند کے سامنے پیش کر دیے گئے ہیں، اگرچہ تفصیلات ابھی تک زیر ترتیب ہیں اور ان کے شائع ہونے میں ابھی دیر ہے، لیکن تقریباً تمام ضروری امور پبلک کے سامنے آچکے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے امید ہوتی تھی کہ شاید اب وہ اختلافات دور ہو جائیں گے جو صحیح حالات سے ناواقفیت اور ظنون و اوہام کی اشاعت کے باعث مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں پیدا ہو گئے تھے، مگر افسوس کہ یہ امید موہوم ثابت ہوئی اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اختلافات گھٹنے کی بجائے اس قدر خطرناک حد تک ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں کہ ان سے مسلمانوں میں ایک عظیم فتنہ دینی کے برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایسے نازک وقت میں جبکہ اسلام کے دشمنوں نے ہر طرف سے اس کو گھیر لیا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے تمام قوتوں کے اجتماع کی ضرورت ہے، ہمارے گھر میں آپس کی پھوٹ جس قدر افسوسناک ہے، ظاہر ہے، مگر یہ بات خواہ کتنی ہی افسوسناک ہو بہر حال اب وہ حقیقت اور ایک امر واقعہ ہے جس کا تدارک محض افسوس کرنے سے نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے تدبیر اور کوشش درکار ہے۔

اختلافی مسائل میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق ضروری ہوتی ہے وہ بنائے اختلاف ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ مسئلہ حجاز میں ہمارے موجودہ اختلافات کس بنیاد پر قائم ہیں۔ اگر وہ ذاتی اغراض، فریقانہ تعصب اور ہمارے باہمی تنافس پر مبنی ہیں، تو قطعاً

ناقابل التفات ہیں اور ارباب عزیمت پر فرض ہے کہ ان کو بالکل نظرانداز کرکے اپنے علم و عرفان کی روشنی میں جس راہ کو مناسب سمجھیں، اسے بے تکلف اختیار کرلیں، کیونکہ ہماری زندگیاں اغراض پرستی سے خواہ کتنی ہی ملوث ہو چکی ہوں، مگر کم از کم ارض حرم کو اس ناپاک تگ و دو کی آماجگاہ نہیں بنانا چاہیے، لیکن اگر یہ اختلافات محض خدا اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہیں اور ان میں نفسانیت کو کوئی دخل نہیں ہے، تو پھر یہ تمام شخصی نزاعات ختم ہو جانی چاہئیں اور ہمیں پوری ایمانداری کے ساتھ تمام مسائل پر غور کرکے انہیں سلجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس اصول کے مطابق ہم ان لوگوں سے قطعاً کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ جنہوں نے مسئلہ حجاز میں اپنی نفسانیت کو مطمئن کرنے کے لیے ایمان اور انصاف کو خیرباد کہہ کر اکاذیب و اباطیل کی اشاعت کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ ہمارا روئے سخن صرف ان مومنین صادقین کی طرف ہے جو ارض حرم کو محض ارض حرم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اپنے دلوں میں اس کی تطہیر و حفاظت کے سوا اور کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ ان کی توجہ کے لیے ہم اس صحبت میں چند امور پیش کرتے ہیں اور امیدوار ہیں کہ وہ ان پر خلوص قلب کے ساتھ غور فرمائیں گے۔

مستقبل حجاز کے متعلق ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ اس وقت ہمیں ہر قسم کی جانبدارانہ کوششوں کو ترک کرکے اس ماحول کے پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے جس میں مؤتمر اسلامی کا انعقاد ممکن ہو اور تمام دنیائے اسلام کے ارباب فکر جمع ہو کر اس سرزمین کے متعلق فیصلہ کرسکیں جو ہر مسلمان کے ساتھ یکساں تعلق رکھتی ہے، لیکن جہاں تک غور و فکر اور اظہار رائے کا تعلق ہے، اس معاملہ میں دیانت داری کے ساتھ بحث و تمحیص ہونی چاہیے اور جیسا کہ قاعدہ ہے رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے بحث و نظر کے تمام مدارج اس طرح طے ہونے چاہئیں کہ شخصیتوں اور ذاتی ملحوظات کو نظرانداز کرکے صرف دینی مصالح ہمارے پیش نظر رہیں۔ آزادی رائے کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے جس کی پابندی نہ کرنے میں تفریق امت کا اندیشہ ہے۔[1]

ابن سعود اور شریف حسین کے متعلق جو کچھ جانبدارانہ پروپیگنڈا ہو رہا ہے، وہ اصولاً غلط ہے اور اس کی مدد سے ہم کبھی کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ عربی قوم کی

فطرت کو دیکھتے ہوئے حجاز کے آیندہ انتظام کے لیے ایک وطنی حکومت سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ناگزیر ہو جائے' تو پھر ہمیں ان دونوں کے نسب اور مذہب کو نظرانداز کر کے صرف ان کی صلاحیت کو نہایت ایمانداری کے ساتھ جانچنا چاہیے' کیونکہ کسی حکومت کے انتظام میں نہ تو نسب کو کوئی عملی اعتبار حاصل ہو سکتا ہے اور نہ جزئیات عقائد کو۔ ایک شخص شریف النسب اور حنفی المذہب ہونے کے باوجود نالائق اور دین فروش ہو سکتا ہے اور ایک دوسرا شخص غیر ہاشمی اور غیر حنفی ہوتے ہوئے بھی مصالح اسلامی کے تحفظ اور خدمت دین کے لیے اہل ثابت ہو سکتا ہے۔ پس شخصیتوں کے موازنہ میں اگر کوئی چیز قابل اعتبار ہو سکتی ہے' تو وہ صرف ان کی سیرت اور صلاحیت ہے۔

اس بنیادی اصول کے مطابق جب ہم خاندان شریف اور ابن سعود پر نگاہ ڈالتے ہیں' تو ہمیں بعض لوگوں کے اس بیان میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی جو کہتے ہیں کہ ہمارے لئے دونوں یکساں ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جس طرح شریف حسین نے برطانیہ سے موالات کی' اسی طرح ابن سعود نے بھی کی جس طرح حسین نے برطانوی وزارت مستعمرات سے تنخواہ لی' اسی طرح ابن سعود نے بھی حکومت ہند سے وظائف حاصل کئے۔ پس جس طرح شریف حسین دین فروش ثابت ہوا' اسی طرح ابن سعود بھی ثابت ہو گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس قسم کا استدلال پیش کرنے والوں نے فلسفہ نفسیات کے ایک اہم پہلو کو نظرانداز کر دیا ہے اور اس لیے دونوں شخصیتوں کو جانچنے میں غلطی کر گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دو شخصوں سے ایک ہی قسم کے اعمال کا سرزد ہونا ہمیشہ ہم معنی ہوا کرتا ہے' لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ایک ہی فعل تھا جو امیر عبدالرحمٰن خاں سے بھی سرزد ہوا اور شاہان اودھ سے بھی' ایک ہی فعل تھا جو محمد علی پاشا خدیو مصر سے بھی سرزد ہوا اور اس کے پوتے اسماعیل پاشا سے بھی' ایک ہی فعل جس کا ارتکاب امیر امان اللہ خاں کر رہے ہیں اور وہی فعل ہے جو مصطفیٰ کمال پاشا سے سرزد ہو رہا ہے۔ پھر کیا ان سب حالات میں نتائج یکساں ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو آخر اس عظیم الشان فرق کی وجہ کیا ہے جو تاریخ کے صفحات میں ان کے درمیان نظر آ رہا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں صرف ان شخصیتوں کے کیریکٹر میں مل سکتا ہے' کیونکہ انسان کا کیریکٹر ہی اس کے تمام اعمال پر

حکمرانی کرتا ہے۔ امیر عبدالرحمٰن خاں ایک جفاکش سادہ مزاج اور فوجی آدمی تھے، اس لیے انہوں نے انگریزوں کی حمایت قبول کرکے اس کی آڑ میں ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھ دی جو ۴۰ سال کے اندر آزاد ہو گئی، لیکن شاہان اودھ عیش پرست اور آرام طلب تھے اور انہوں نے انگریزوں کی حمایت محض عافیت پسندی کی خاطر قبول کی تھی اس لیے وہ بہت جلدی اپنی سلطنت کھو بیٹھے۔ اسی طرح محمد علی پاشا ایک فوجی مدبر تھا اس لیے یورپ کی مدد حاصل کرکے اس نے ایک زبردست سلطنت قائم کر دی، لیکن اسماعیل پاشا ایک فضول خرچ او رعیاش بادشاہ تھا اس لیے اسی یورپین مدد سے اس نے مصر کو غلامی کی بیڑیاں پہنوادیں۔ یہی فرق امیر امان اللہ خان اور مصطفیٰ کمال پاشا میں بھی ہے کہ ایک نے اپنی مذہبیت کے باعث تجدد پروری سے اسلام کو تقویت پہنچائی اور دوسرا اپنی لادینیت کے باعث اسی تجدد پروری سے اسلام کی جڑ کھود رہا ہے۔

پس اسی طرح ابن سعود اور شریف حسین کے معاملہ میں بھی صرف وہی بات نہیں دیکھنی چاہیے کہ دونوں نے انگریزوں سے موالات کی، بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ موالات ان کی اصلیت پر کس حد تک اثر انداز ہوئی ہے اور اس کے لیے ہمیں دونوں کی سیرت پر نظر ڈالنی چاہے۔ شریف حسین اور اس کے خاندان کو جب ہم دیکھتے ہیں، تو وہ ہمیں نہایت طامع نام و نمود اور جاہ و حشمت کے بھوکے اور نہایت عیش پسند نظر آتے ہیں۔ ان کے دل میں بادشاہی کی اس عزت کا لالچ تھا، جو ان کی قدرت سے بالاتر تھی، اس لیے انہوں نے انگریزوں سے موالات کرکے اسلامی حکومت کے خلاف سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کیا اور حجاز، عراق اور شرق اردن کی نام نہاد پادشاہیاں لے کر عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے، لیکن یہ پادشاہیاں اتنی بے بنیاد ہیں کہ **جلالتہ الملک** اور ہز میجسٹی کے خطابات سے زیادہ ان کی کوئی عزت نہیں ہے اور ان کی قوت کا یہ عالم ہے کہ ابن سعود کے ایک معمولی حملہ سے حکومت ہاشمیہ کا قصر فلک بوس زمین پر آرہا اور حکومت برطانیہ کا ایک ادنی اشارہ امیر فیصل کو عراق سے بیک بنی دوگوش نکال دینے کے لیے کافی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ابن سعود کو دیکھئے ایک نہایت سادہ اور جفاکش آدمی ہے۔ گھوڑے کی پیٹھ اس کی مسند ہے، تلوار اس کی دائمی رفیق ہے، اپنے ملک کا بنا ہوا موٹا جھوٹا لباس پہنتا ہے۔ تکلفات اور تصنعات کو اس کے ہاں دخل نہیں۔ اس کے

دربار میں ان شاہی مراسم کا نام و نشان تک نہیں ہے، جو ہمارے ہاں کے غلام رئیسوں کے ہاں نظر آتا ہے۔ ایک فوجی سردار کی طرح اپنے تمام سپاہیوں کے برابر بیٹھتا ہے۔ اس کا معمولی سے معمولی سپاہی بھی اس کو عبدالعزیز کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے دل میں عظمتہ السلطان اور جلالتہ الملک کہلائے جانے کی کوئی خواہش نہیں ہے، بلکہ صاف کہتا ہے کہ میں اپنے لیے اس نام کو زیادہ پسند کرتا ہوں، جو میرے ماں باپ نے رکھ دیا ہے بہ نسبت اس نام کے، جو تم میرے لیے تجویز کرتے ہو۔ اس کے مقاصد رعایا کو دینی اور دنیوی تعلیم سے آراستہ کرنے کو اولیت حاصل ہے۔ اب حال یہ ہے کہ اس نے حجاز اور نجد کو عہد جاہلیت کی وحشت و بربریت سے نکال کر پکا مسلمان بنا دیا ہے اور آج نجد کی ۹۰ فی صد آبادی پڑھی لکھی ہے، حالانکہ بعض یورپین ممالک کو بھی تعلیم کا یہ تناسب حاصل نہیں ہے۔ اس کی قوت اور انتظامی قابلیت کا یہ حال ہے کہ حجاز کے جن بدوؤں کو دولت عثمانیہ جیسی زبردست فوجی طاقت مطیع نہ کر سکی تھی اور سالہا سال سے رشوتیں دے کر امن قائم کرنے کی کوشش کرتی تھی اور پھر بھی حاجیوں کے قافلے ان کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے، آج وہ چند مہینے کے عرصہ میں اس قدر نظم و آئین کے پابند ہو گئے ہیں کہ حج کے زمانہ میں ایک پیسہ رشوت لیے بغیر انہوں نے حاجیوں کو خیریت سے گزر جانے دیا اور کہیں ایک بدو نے بھی کسی حاجی سے ناجائز بخشش نہیں لی۔ سیاسیات میں اس قسم کے کیریکٹر کبھی مغلوب و محکوم نہیں ہو سکتے اور نہ کسی قسم کی طمع ان کو ڈپلومیسی کے جال میں پھانس سکتی ہے۔ تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں دکھائی جا سکتی کہ جس شخص کی اخلاقی خصوصیات اس قدر بلند پایہ ہوں اس نے کبھی نام و نمود اور بناوٹی جاہ و حشمت پر جان دی ہو یا سونے چاندی کی ٹھیکریوں پر اپنی قومی عزت کو قربان کر دیا ہو۔ پس اگر ابن سعود نے انگریزوں سے کوئی وظیفہ لیا یا کوئی معاہدہ کیا، تو یقیناً وہ وقتی ضروریات کے ماتحت محض اپنے ملک کے فائدے کے لیے تھا اور فائدہ اٹھانے کے بعد اب اس کا اثر بالکل زائل ہو گیا ہے۔

{۲۹ر اگست ۱۹۲۵ء}

اس کے بعد ابن سعود کے خلاف اگر کوئی دوسرا اعتراض ہو سکتا ہے، تو وہ تصلب فی

الدین کا اعتراض ہے۔ یہ تصلب اگر محض وہابی عقائد پر مبنی ہو' تو کوئی شک نہیں کہ بے حد قابل اعتراض ہے اور مسلمانوں کے مشترکہ قبلہ میں اس قسم کے فریقانہ تصلب کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے' لیکن ابن سعود کی تصریحات اس کی تردید کر رہی ہیں اور خود جمیعت العلماء ہند اور خلافت کمیٹی کے محترم نمائندوں نے بھی باوجود تحقیق کے اس میں ایسے کسی تصلب کا مشاہدہ نہیں کیا۔ وہ صرف وہابیت پر زور نہیں دیتا' بلکہ کہتا ہے کہ میں ہر اس چیز پر ایمان رکھتا ہوں جو قرآن' احادیث، صحابہ اور ائمہ اربعہ کے اجتہادات اور سلف صالحین کے اعمال سے ثابت ہو۔ اس کے سوا اگر کوئی اور چیز میرے سامنے پیش کی جائے گی' تو میں اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ بات بعض حضرات کے نزدیک قابل اعتراض ہو' لیکن ہم تو یقین رکھتے ہیں کہ یہی عین اسلام ہے اور اگر ابن سعود اس میں شدت اور سختی کرتا ہے' تو یہ وہی شدت ہے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے برتی تھی اور اس پر صرف وہی شخص اعتراض کر سکتا ہے جو خود دین کے بندھن ہی کو ایک وبال سمجھتا ہو۔ ارض حرم میں تمام فرقوں کی آزادی ایک نہایت مبارک خیال ہے اور بے شک ہر فرقہ اپنے عقائد و اعمال میں آزاد ہونا چاہیے' لیکن اس کے ساتھ یہ خیال رہے کہ ایک مسلمان صرف انہی فرقوں کی آزادی تسلیم کر سکتا ہے جو اسلامی فرقے ہیں اور اسلامی فرقے وہی ہو سکتے ہیں جو اپنے عقائد و اعمال کے لیے کوئی شرعی دلیل رکھتے ہیں' لیکن اگر کوئی فرقہ اپنے کسی عقیدہ یا عمل کے لیے کوئی شرعی دلیل نہ رکھتا ہو' نہ اس کے پاس اس کی تائید میں کوئی آیت قرآنی ہو' نہ کوئی حدیث صحیح ہو، نہ کوئی صحابہ کا عمل یا اجتہاد ہو' نہ تابعین و تبع تابعین کا کوئی فیصلہ ہو' نہ آئمہ اربعہ کا کوئی فتویٰ ہو اور نہ سلف صالحین کا کوئی قول یا عمل ہو تو کیونکر اسلامی عقیدہ یا عمل قرار دیا جا سکتا ہے اور کس طرح اسلام کے عین قلب میں اس کے اظہار و اعلان کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ پھر ان اعمال کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے جو نہ صرف یہ کہ اپنی تائید میں کوئی شرعی دلیل نہیں رکھتے' بلکہ جن کے خلاف ہر قسم کے شرعی دلائل موجود ہیں۔ کیا اسلامی شریعت میں ایسے اعمال کے لیے کوئی گنجائش تسلیم کی گئی ہے کیا اسلام کا مرکز ایسے اعمال سے پراگندہ کیا جا سکتا ہے اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً ہونا چاہیے' تو پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا تصلب کیونکر قابل اعتراض ہو سکتا ہے جو

احکام شریعت کے اجراء اور خلاف شریعت اعمال کے استیصال میں اختیار کیا جائے۔ ہم ہندوستان میں تو اجرائے احکام شریعت کے لیے عدم قدرت کا عذر پیش کرکے رخصت کی آڑ لیتے ہیں، لیکن حجاز میں اگر کوئی شخص صاحب قدرت پیدا ہوتا ہے اور اسی کام کا بیڑہ اٹھاتا ہے، تو تمام فرقوں کی آزادی عمل کا مسئلہ پیش کرکے اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ یہ بوالعجبی کم از کم ہماری سمجھ میں تو نہیں آسکتی۔

تاہم اصولاً ابن سعود کا یہ اسلامی تصلب خواہ کتنا ہی صحیح ہو، لیکن عملاً ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اس کے استعمال میں اس کو بالکل آزادانہ چھوڑ دینا چاہیے، بلکہ اس سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ موتمر اسلامی کے انعقاد تک تمام حالات کو بدستور رہنے دے اور اس کے بعد اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ انعقاد موتمر کے ساتھ ہی ایک بین الاسلامی مجلس علماء مقرر کردی جائے جس میں تمام اسلامی فرقوں کے نمائندہ علماء منتخب کئے جائیں اور وہ ارض پاک کی مستقل اسلامی کونسل ہو جس کے مشورہ کے بغیر ابن سعود کوئی اسلامی کام انجام نہ دے سکے۔

رہا قبوں کا معاملہ جس نے موجودہ ہندوستان میں خاص اہمیت حاصل کرلی ہے، اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ جس طرح بھی ہوسکے ہمیں اس کے خیالات اور عقائد کا پاس کرنا چاہیے، جو اس وقت ایک غالب جماعت کی حیثیت سے مکہ معظمہ پر قابض ہے اور جس پر ہم اخوت دینی کے دباؤ سے زیادہ اور کوئی دباؤ نہیں رکھتے، ان کی یہ خودرائی خواہ کتنی ہی قابل اعتراض ہو کہ انہوں نے دوسری جماعتوں کے جذبات کی ذرہ برابر پروا کئے بغیر محض اپنے مذہبی جوش کو مطمئن کرنے کے لیے قبوں کو ڈھادیا، لیکن اس پر ہمیں بالکل آپے سے باہر نہ ہوجانا چاہیے۔ اس مسئلہ کے حل کی بہترین صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے تو ہم ان قبوں کے متعلق ابن سعود سے پوری ضمانت لے لیں جو ابھی تک باقی ہیں اور اس کے بعد علماء کے مختلف فرقوں کی ایک مشترک کانفرنس منعقد کرکے قبوں کی شرعی حیثیت متعین کرلیں۔ اگر شرعاً ان کے جواز کا کوئی خفیف سا بھی پہلو نکلتا ہو، تو ہمیں ابن سعود سے سختی کے ساتھ مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ فوراً منہدم شدہ قبوں کو بنوادے۔ لیکن اگر وہ شرعاً صحیح نہ ثابت ہوں اور صرف عام مسلمانوں کے جذبات ہی ان کی تائید میں پائے جائیں، تو ان کے لیے مطالبہ کی سختی کی بجائے مصلحت وقت کی رعایت

کا پہلو اختیار کیا جائے اور ابن سعود کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ اگر تم اس قسم کے جزئی مسائل میں پھنس جاؤ گے' تو عام مسلمانوں کی ہمدردی کھو بیٹھو گے اور پھر تطہیر حرم کے اس فرض کو انجام دینا تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا جو بہرحال تمہارے اور ہر مسلمان کے مقدم ترین فرائض میں سے ہے' لہٰذا تمہیں سنتوں کے لیے فرضوں کو نہ چھوڑنا چاہیے اور ایک بڑے کام کو انجام دینے کے لیے چھوٹے چھوٹے کاموں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

اس صورت سے تو قبوں کا مسئلہ صلاحیت کے ساتھ طے ہو سکتا ہے' لیکن اگر اس پر گالیوں اور کوسنوں کا وہی سلسلہ جاری رکھا گیا جو ہمارے اخبارات اور مجالس کے ایک حصہ میں شروع ہو گیا ہے اور قبوں کی حمایت میں معقولیت کی بجائے نامعقولیت کا پہلو اختیار کیا گیا' تو اس مسئلہ کے طے ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی اور نتیجہ یہ ہو گا کہ نجدیوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقہ کے درمیان اس قسم کے اختلافات پیدا ہو جائیں گے جن سے اغیار کے سوا کسی کو کچھ فائدہ حاصل نہ ہو گا۔

آخر میں ہم تمام ہندوستان کے علماء اور ارباب فکر سے عرض کرتے ہیں کہ عرب میں اس وقت ایک شخص پیدا ہوا ہے جو اپنی قابلیتوں کے اعتبار سے جزیرہ عرب میں ہی نہیں' بلکہ تمام دنیائے اسلام میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر اس کی مذہبی حیثیت سے' جو ہمارے ایک طبقہ کے نزدیک قابل اعتراض ہے' قطع نظر کر لیا جائے' تو اس کی ذاتی خوبیاں اتنی بلند پایہ ہیں کہ تاریخ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت عالمگیرؒ کے بعد اس درجہ کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ ایسے شخص کو جزئیات مسائل میں پھنسا کر ہاتھ سے کھو دینا اسلام کے ساتھ کوئی خیر خواہی نہیں ہے۔ آپ کے سامنے قبوں کی تعمیر و تخریب سے بدرجہا زیادہ اہم سوال ایک اور ہے اور اس پر اسلام کی حیات و ممات کا انحصار ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ امت عربیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بیسیوں ذاتوں' فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے جو باہمی مناقشات کی بدولت مغربی استعمار کا شکار ہو رہے ہیں۔ جزیرۃ العرب' جو اسلامی مرکز ارضی ہے' ہر طرف سے نصاریٰ کے ہاتھوں میں گھر گیا ہے۔ بحرین اور کویت سے لے کر عقبہ تک تمام عربی سواحل پر یورپین قومیں مسلط ہیں اور مدینہ منورہ کے عین دروازوں تک برطانوی تسلط کے حدود پہنچ گئے ہیں اور اس سب

سے زیادہ ایک دوسری مصیبت یہ ہے کہ عربی قوم کی رہنمائی کے لیے مصر و شام کے وہ نوجوان کھڑے ہوئے ہیں جن کی ذہنیت کا قبلہ مکہ سے منتقل ہو کر آکسفورڈ اور کیمبرج چلا گیا ہے اور اگر ان کو عرب میں کام کرنے کا موقع حاصل ہو گیا، تو شاید نصف صدی کے اندر ہی اندر وہ عرب کو اسلام کا عرب نہیں عربی قومیت کا عرب بنادیں گے جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ان خطرات کا اگر کوئی مقابلہ کر سکتا ہے، تو وہ ابن سعود اور صرف ابن سعود ہے۔ اس وقت عرب میں اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو امت عربیہ کو ایک مرکز پر جمع کر کے مغربی استعمار کی بڑھتی ہوئی قوت کو روک سکے اور انانیت، الحاد اور فرنگیت کے اس سیلاب کی روک تھام کرسکے جو قاہرہ و بیروت کے چشمہ ہائے دہریت سے بہنا شروع ہو گیا ہے۔ پس اگر آپ کو عرب کی حرمت اور اس کا اسلام عزیز ہے، تو اس شخص کو جسے شاید خدا نے اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے، ہاتھ سے نہ کھوئیے اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر جو کسی حیثیت سے بھی شریعت کے اساسی و بنیادی مسائل نہیں ہیں۔ ضرورت سے زیادہ زور دے کر توہب اور تسنن کی وہ جنگ نہ چھیڑ دی جائے جس سے اسلامی قوتوں کے مزید انتشار کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ہم نے مانا کہ ہمارے ملک کے عوام انہی جزئیات کو بہت اہمیت دیتے ہیں نیز ہمارے پاس ایسی صلاحیتیں اور وسائل نہیں ہے کہ ہم اس محدود دائرہ سے نکل کر اسلام کے مہمات مسائل پر غور کر سکیں، لیکن ہمارے نزدیک عوام کے نیم مذہبی داعیات بھی صرف اسی صورت سے پورے ہو سکتے ہیں کہ ہم ابن سعود کو گالیاں اور دھمکیاں دینے کے بجائے اسے افہام و تفہیم کی قوت سے رواداری پر آمادہ کریں اور یہ بات اس کے ذہن نشین کریں کہ جس عظیم الشان مقصد کے لیے تم اٹھے ہو، اس کی تکمیل میں تم کو مسلمانان عالم کی مدد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک تم اختلافی مسائل میں رواداری اور غیر جانبداری کی پالیسی اختیار نہ کرو گے۔ اگر تمام ہندوستان ہم آواز ہو کر ابن سعود پر یہ اخلاقی دباؤ ڈالے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس سے متاثر نہ ہو، کیونکہ وہ مسلمانان ہند کی اخلاقی قوت کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس نے یہ بات محسوس کر لی ہے کہ تطہیر جزیرہ عرب میں وہ ان کی اخلاقی اعانت کا محتاج ہے، لیکن اگر ہم نے اس صلاحیت کے طریقے کو چھوڑ کر سب و شتم اور لعن وطعن کے ہتھیار

استعمال کرنے شروع کردیے' جن سے کام لینے میں ہمارے ملک کا ایک طبقہ خاص طور پر مشہور ہے' تو ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا نتیجہ شاید اس سے بھی زیادہ تلخ ہو جو شریف حسین کے زمانہ میں ظاہر ہو چکا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے ان خیالات پر تمام علماء وزعمائے ملت نہایت ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے

* ایک جگر خراش افواہ

مقالہ افتتاحیہ کے آخری الفاظ تحریر کیے جارہے تھے کہ دفعتہ" ریو ٹر کا یہ تار ہماری نظر سے گزرا کہ نجدیوں نے **مدینتہ الرسول** ﷺ پر حملہ شروع کر دیا ہے' گولہ باری کے صدمات سے مسجد نبوی کو سخت نقصان پہنچا ہے اور مسجد امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منہدم کردی گئی ہے۔ یہ ایسی الم انگیز خبر ہے کہ محض اس کے تصور ہی سے جگر پاش پاش ہو جاتا ہے اور دفعتہ" ہر مسلمان کے دل میں ان لوگوں کے متعلق نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں جن کی طرف ایسا ناپاک فعل منسوب کیا گیا ہے' لیکن ہمارے نزدیک اس پر یقین کرنے میں ہرگز جلدی نہ کرنی چاہیے۔ اول تو اس کا مخرج نہایت غیر معتبر ہے۔ ریوٹر کا تار اور وہ بھی فلسطین کے مرکز حکومت سے جیسا کچھ اسلامی معاملات میں قابل اعتماد ہو سکتا ہے' ظاہر ہے' دوسرے یہ کہ ہم اس خبر پر اس وقت تک اعتماد نہیں کر سکتے جب تک ہم یہ یقین نہ کرلیں کہ نجد کے وہابی قطعاً کافر ہیں کیونکہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان کا نور موجود ہو وہ رسول کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی عظمت و محبت سے خالی نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے حرم نبوی ؐ کی توہین تو درکنار' دل میں اس کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ پس جبکہ ہمارے پاس نجدیوں کے ایمان کا ثبوت موجود ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت و تکریم کو داخل ایمان سمجھتے ہیں' تو کیونکر ہمیں یقین آسکتا ہے کہ وہ حرم نبوی پر اس طرح حملہ آور ہوئے ہوں گے۔

یہ صرف ہمارے قیاسات ہی نہیں ہیں' بلکہ ہمارے پاس سلطان ابن سعود کا وہ صاف اور صریح اعلان بھی موجود ہے جس میں انہوں نے عہد واثق کیا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ!

> "یعنی ہمارے دشمنوں نے یہ خبر اڑا رکھی ہے کہ جب ہم مدینہ منورہ پر قابض ہوں گے، تو روضۂ رسول اللہ ﷺ کو منہدم کر دیں گے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، حالانکہ اس حرکت کا خطرہ بھی کسی مسلمان کے دل میں نہیں گزر سکتا اور اگر کوئی ایسا ارادہ کرے، تو میں اس کی حفاظت میں اپنی جان و مال و اولاد اور فوج سب کچھ فدا کردوں گا۔ میں خدا کے حرم مکہ اور رسول اللہ ﷺ کے حرم مدینہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتا، کیونکہ ایک کو رسول اللہ ﷺ نے حرم بنایا اور دوسرے کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے"۔

پھر یہی نہیں، بلکہ ابن سعود نے تو رسول اللہ ﷺ کے ہمسایوں تک کو داخل حرم قرار دیا ہے، چنانچہ وہ اپنے اعلان میں لکھتا ہے کہ مدینہ منورہ میں قتل و غارت اور لوٹ مار کسی طرح جائز نہیں ہے اور اس کے اسی شرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے صرف اس کے محاصرہ پر اکتفا کیا ہے اور شدید مالی نقصانات برداشت کر رہا ہوں، حالانکہ خدا کے فضل سے میں اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ ایک گھنٹہ کے اندر اسے فتح کر سکتا ہوں۔

اس خبر کو ہم کسی طرح قابل اعتبار تسلیم نہیں کر سکتے اور تمام مسلمانوں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اسے باور کرنے سے پہلے صحیح حالات کا انتظار کریں جو عنقریب منکشف ہونے والے ہیں۔

* چند زعمائے ملت کا اضطراب

ہمیں افسوس ہے کہ اس معاملہ میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب، حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مسٹر شیر حسین قدوائی اور مولانا حسرت موہانی نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مسلمان کا دل طبعاً ایسی خبر سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور نہ تڑپ اٹھے تو اس کا اسلام مشکوک ہے، لیکن انہوں نے اخبارات میں جو تار شائع کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زعیمانہ حیثیت کو بالکل فراموش کر گئے ہیں اور فرط غیظ و غضب میں انہوں نے اس بات کو بالکل محسوس نہیں کیا کہ ان جیسے بااثر بزرگوں کا عامۃ المسلمین کو ایسی اشتعال انگیز دعوت دینا کس قدر خطرناک نتائج پیدا

کر سکتا ہے۔ ان حضرات کا فرض تھا کہ اپنی زعیمانہ ذمہ داریوں کو محسوس کر کے صبر و ضبط سے کام لیتے اور کوئی ایسا اعلان عام شائع کرنے سے پہلے تمام ممکن ذرائع سے واقعات کی تحقیق و تفتیش کر لیتے، مگر فی الحقیقت یہ ثابت ہو جائے کہ ابن سعود کی فوج نے مدینہ طیبہ میں ان حرکات شنیعہ کا ارتکاب کیا ہے، تو ہندوستان کے طول و عرض میں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں مل سکتا جو اس ظلم کے مقابلہ پر کھڑا ہونا اپنا اولین فرض نہ سمجھتا ہو، لیکن جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، اگر تحقیق سے یہ خبر بالکل بے بنیاد ثابت ہوئی، تو ظاہر ہے کہ اس وقت تک اس نفیر عام کی بدولت ہندوستان میں جو کچھ جوش پھیلے گا اور اس جوش میں جو کچھ کارروائیاں کی جائیں گی وہ سب قطعاً ناجائز ہوں گی۔

عرب میں برطانیہ کی چالیں

{ ۲ر ستمبر ۱۹۲۵ء }

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ جریدہ الف باء کے حوالہ سے وہ تجاویز نقل کی گئی ہیں جو ابن سعود نے برطانیہ سے اور برطانیہ نے ابن سعود سے معاہدہ کرنے کے لئے پیش کی ہیں۔ اگرچہ ان تجاویز کا مصدر نہایت مشکوک ہے، کیونکہ جریدہ الف باء کا اڈیٹر شریف حسین کے خاص آدمیوں میں سے ہے، لیکن اگر انہیں صحیح فرض کرلیا جائے، تو ان سے آسانی کے ساتھ یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ابن سعود کو اپنی قوت پر کس حد تک اعتماد ہے۔ وہ عرب میں اپنے لئے کس حیثیت کا طالب ہے اور اپنی قوت سے کہاں تک فائدہ اٹھانے کی امید رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان سے برطانیہ کے ارادوں پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ابن سعود کی پہلی تجویز اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اب تک جدہ کو جس چیز نے بچائے رکھا ہے وہ برطانیہ کی حمایت ہے۔ دوسری تجاویز میں بعض باتیں اگرچہ مشکوک ہیں، مگر ان سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ابن سعود برطانیہ سے کوئی استادی و شاگردی کا تعلق قائم نہیں کرنا چاہتا، بلکہ استقلال کامل کا طالب ہے جس میں کوئی برطانوی اثر شامل نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے برطانیہ کی تجاویز اس حقیقت پر صاف روشنی ڈالتی ہیں کہ وہ ابن سعود اور امام یحییٰ کی قوت سے خائف ہے، کیونکہ وہی اس کی عربی پالیسی کی تکمیل میں حارج ہوسکتے ہیں اور اس لئے وہ ان کے اتحاد کو روکنا چاہتا ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ ابن سعود حجاز سے فارغ ہونے کے بعد عقبہ و معان پر ضرور حملہ کرے گا اور بحرین، کویت اور عراق وغیرہ عربی ممالک کی طرف بھی متوجہ ہوگا۔ چنانچہ اس آنے والے خطرہ سے بچنے کے لئے وہ ابن سعود سے عہد لینا چاہتا ہے کہ وہ عرب کی موجودہ حالت کو بدلنے کی کوشش نہ کرے گا۔

فی الحال ان شرائط پر کوئی مفصل اظہار رائے نہیں کیا جاسکتا، لیکن کم از کم یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر برطانیہ نے وہی شرائط ابن سعود کے سامنے پیش کی ہیں جن کا الف باء نے ذکر کیا ہے، تو ان میں سے ایک کو بھی ابن سعود قبول نہیں کرے گا، کیونکہ نہ تو وہ امام یحییٰ سے اتحاد توڑنے پر راضی ہوسکتا ہے نہ عیر کو اوریسی کے لئے خالی کرسکتا ہے اور نہ بلاد عرب کی مصلحت اندیشی کے حق سے دست بردار ہوسکتا ہے،

البتہ موجودہ حالات میں وہ عراق اور شرق اردن پر حملہ آور نہ ہونے کا وعدہ کر سکتا ہے، کیونکہ اس کے سامنے حجاز کی تنظیم جدید کا ایسا اہم مسئلہ درپیش ہے کہ وہ خود بھی برطانیہ جیسی قوت سے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھے گا۔

* مدینۃ الرسول ﷺ

الحمد للہ کہ قاہرہ اور بیت المقدس سے اس جگر پاش خبر کی تردید ہو گئی ہے، جو ریوٹر نے کسی خاص سازش کے ماتحت مسجد نبوی پر گولہ باری کے متعلق شائع کر دی تھی۔ قاہرہ میں شیخ ابراہیم بن احمد نجدی حکومت نجد کے سرکاری ایجنٹ ہیں۔ انہوں نے صراحت کے ساتھ ریوٹر کے بیان کی تردید کی ہے اور اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ صرف حجازی فوج پر گولہ باری کی گئی تھی، جو مدینۃ الرسول ﷺ کی آبادی سے بہت دور پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فلسطین کی مجلس اسلامی میں علی کا تار بھی ان کی تائید پر موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینۃ الرسول اور روضۃ النبی ﷺ پر کوئی گولہ باری نہیں کی گئی اور مسجد کو نہیں، بلکہ جناب سید الشہداء کے مزار پر جو قبہ ہے، اس کو نقصان پہنچا ہے۔ اگر بفرض محال شیخ ابراہیم کے تار کو ساقط الاعتبار قرار دیا جائے کہ وہ نجدی ایجنٹ ہیں، تو کم از کم مجلس اسلامی کے بیان کو کسی طرح بھی غیر معتبر نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ شریف حسین اور اس کے خاندان کی حامی ہے۔ سب سے پہلے جس جماعت نے شریف کی خلافت تسلیم کی تھی مجلس اسلامی ہی ہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی سے وہ اسی شریف پرستی کی بنا پر اختلاف رکھتی ہے اور آل شریف کے ساتھ اس کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں جب امیر فیصل یورپ جاتے ہوئے یافہ پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پر اس کے صدر امین آفندی الحسینی استقبال کے لئے موجود تھے اور موسی کاظم پاشا الحسینی اور سید محمد مراد مفتی حیفا جیسے مقتدر ارکان ان کے ساتھ تھے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے اس خبر کی تردید کسی صورت میں بھی نجدیوں کی بے جا حمایت نہیں کہی جا سکتی اور لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ریوٹر کا تار حقیقت میں غلط تھا۔

ہم تو اشاعت گزشتہ ہی میں عرض کر چکے تھے کہ اس خبر کی صحت کا کوئی امکان نہیں ہے، کیونکہ جب تک کوئی شخص کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ" کا قائل ہو

اور یہ ایمان رکھتا ہو کہ **ومن اظلم ممن منع مساجداللہ ان یذکر فیہا اسمہ و سعی فی خرابہا** خدا کا کلام ہے، وہ کبھی روضۃ النبی کی توہین کرنا یا مسجد نبوی کو ڈھانا کیا معنی، اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، لیکن ہم نے ان لوگوں کی طرح جو فوراً ریوٹر کے بیان پر ایمان لے آئے، یہ غلطی کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ محض اپنے قیاس پر اس کی کھلی تکذیب کرتے۔ اس لئے ہم نے مسلمانوں کو صرف یہی مشورہ دینے پر قناعت کی کہ انہیں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کرلینی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے اس حسن ظن کو سچا ثابت کردیا جو ہم ارشاد نبوی کے مطابق مسلمانان نجد کے ساتھ رکھتے تھے اور آج اپنی خوش نصیبی سے ہم تمام مسلمانوں کو یہ بشارت عظمیٰ سنانے کے قابل ہیں کہ جس افترااور بہتان کی قوت سے ریوٹر نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی، اس کا تار و پود بکھر گیا۔ **جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔**

اب ذرا ان لوگوں کی پوزیشن پر نظر ڈالیے، جنہوں نے ریوٹر جیسے امام الائمہ کذابین کی روایت سنتے ہی صدقت یا مخبرالصادق کی صدا بلند کرنی شروع کردی اور اسے تحقیق کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کئے بغیر نہایت زور شور کے ساتھ نہ صرف ابن سعود، بلکہ خود ہندوستان کے بھی تمام مخلص خادمان ملت کے خلاف سب وشتم کا ایک معرکہ جہاد گرم کردیا۔ اگر ان میں سے ان چند مقدس و محترم ہستیوں کو نکال دیا جائے، جن پر ہم کسی صورت میں بھی نفسانیت کا شبہ نہیں کرسکتے ہیں۔ تو ہمیں یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے کہ اس جماعت کا ایک بہت بڑا حصہ احترام **مدینۃ الرسول** ﷺ، محبت سیدالانام اور تحفظ اماکن متبرکہ کے پاک جذبات سے عاری تھا اور اس کی ساری تگ ودو صرف یہ معنی رکھتی تھی کہ اس نے مدینہ پر گولہ باری کی خبر کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے شریفی و دباغی پروپگنڈا کا آغاز کر دیا۔ اسے اگر بدگمانی نہ قرار دیا جائے، تو یہ بات بھی اقرب الی القیاس معلوم ہوتی ہے کہ شاید یہ کسی سازش کا نتیجہ ہو جو ہندوستان میں باغی مشن کو تقویت پہنچانے کے لئے امیر عبداللہ اور ریوٹر کے نامہ نگار قدس نے یروشلم میں بیٹھے بیٹھے کی ہو۔ حقیقت کا علم تو خدا ہی کو ہوسکتا ہے، لیکن ہندوستان میں سید طاہر الدباغ کی کوششیں، مختلف شہروں میں ان کے ایجنٹوں کی سرگرمیاں، قبہ ایجی ٹیشن پر

نہایت دریادلی کے ساتھ زرپاشیاں اور مدینہ منورہ کی خبر آتے ہی بیک وقت بمبئی' بدایوں' بریلی' لکھنؤ اور لاہور میں ایک ہی قسم کا شور بلند ہونا' اس حقیقت مستتر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دراصل ہندوستان میں کوئی سازش کی جارہی ہے' جس کا مقصد اسلام کو کچھ فائدہ پہنچانا نہیں' بلکہ مسلمانوں میں ایک فتنہ کھڑا کردینا ہے۔

اس سلسلہ میں جو چیز ہر قلب مومن کو سب سے زیادہ تکلیف دینے والی ہے' وہ بعض ملت فروشوں کی یہ حرکت ہے کہ انہوں نے غیرت ایمانی کو بالکل خیرباد کہ کر اس سلطنت سے **مدینتہ الرسول** ﷺ کی حفاظت کے لئے درخواست کی ہے جو صرف غیر مسلم ہی نہیں ہے' بلکہ دنیائے اسلام کی عزت کو مٹانے والی سلطنتوں میں سب پر سبقت لے گئی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ آخر ان لوگوں نے کیا سمجھ کر برطانیہ کو حفاظت مدینہ منورہ کی دعوت دی ہے۔ کیا وہ اپنی اس حرکت سے اللہ تعالیٰ کی کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں جس نے صراحتہ **انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا** کا حکم دیا ہے کیا وہ اس طریقہ سے اس پاک اور برگزیدہ ہستی کی کوئی خدمت کرنا چاہتے ہیں جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں تاکید فرمائی تھی کہ اخرجوا الیہود والنصاری من جزیرۃ العرب کیا وہ ملت حنیفی کے ان دشمنوں سے مرکز اسلام کی حفاظت کرانا چاہتے ہیں' جنہوں نے اپنے سیاسی مصالح پر اسلام کو بھینٹ چڑھانے میں کبھی تامل نہیں؟ کیا وہ ان لوگوں سے عرب کے قبوں اور مزارات کے تحفظ کی امید رکھتے ہیں جو معمولی سڑکوں تک کی تعمیر و توسیع کے لئے بزرگان اسلام کی قبروں کو ڈھا دینا اور مسجد کو منہدم کردینا جائز سمجھتے ہیں؛ ممکن ہے کہ ان کا ایمان ان کے لئے ان سب حرکات کو جائز کردیتا ہو۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ اس طریقہ سے اسلام کی جڑ کھودنا چاہتے ہیں اور دراصل اسلام کی نہیں' بلکہ اس کے ان دشمنوں کی خدمت کررہے ہیں' جن کے دل میں آج بھی اس سے بدلہ لینے کا وہی جذبہ مشتعل ہے' جو قرون متوسط کے صلیبی مجاہدین کے دلوں میں شعلہ زن تھا۔

اللہ اکبر! آج مسلمانوں کی بدبختی اور اسلام سے برگشتگی اس حد کو پہنچی ہے کہ جس چیز سے اسلام کو سب سے زیادہ نفرت ہے' وہ اسے خود اسی کے حق میں اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کی خودداری کا تو یہ حال کہ وہ اپنے ایک کم ترین پیرو کو بھی کفار کے

آگے سرنگوں نہیں دیکھنا چاہتا اور مسلمانوں کی ذلت کا یہ عالم کہ وہ خود اسلام ہی کو مسیحیت کے آستانہ پر لیجا رہے ہیں تاکہ وہ اس کے حال پر رحم کھاکر اس پیکر صدق و عزیمت کے روضہ اطہر کو بچالے، جو کائنات ارضی کی تمام دولتوں کے لالچ اور دنیا کی تمام امکانی مصیبتوں اور تکلیفوں کے خوف سے بھی کفر کی چوکھٹ پر سر رکھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ غیرت ایمانی کے فقدان کا یہ وہ آخری درجہ ہے، جہاں پہنچ کر اسلام صرف زبانی اقرار اور اوپری رکوع و سجود کا نام رہ جاتا ہے، ورنہ اسلام ہرگز اس چیز کا نام نہیں ہے کہ ہماری پیشانی قبلہ کی طرف جھکی ہوئی ہو اور دل قبلہ کفر کے آگے سجدے پر سجدے کر رہا ہو۔ اگر ان مسلمانوں نے اپنے لئے کوئی اور شریعت بنالی ہو، تو اس کی ہمیں خبر نہیں، لیکن اگر وہ اسی شریعت کی پیروی کے مدعی ہیں جو عرب کے داعی برحق پر نازل ہوئی تھی تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس طاغوت پرستی کو برداشت نہیں کرسکتی کہ ہم یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب پر قبضہ کرنے کی دعوت دیں اور مسلمانوں کے کسی فرقہ کی زیادتیوں سے خواہ وہ کتنی ہی شدید ہوں، بچانے کے لئے ارض حرم کو کفار کے تسلط میں دینے کی کوشش کریں۔

یہ ہمیں معلوم ہے کہ برطانیہ اپنی سیاست میں ان لوگوں کے ارشاد و ہدایت سے بالکل آزاد ہے اور وہ ارض حجاز پر بلاواسطہ قبضہ کرکے اپنے لئے مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا، لیکن اگر ہندوستان میں ایسے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی جو ہندوستان ہی کی طرح حجاز میں بھی آزادی ضمیر، حریت فکر و عمل اور نظم و آئین کا دور دورہ دیکھنا چاہتی ہو، تو شاید وہ دن دور نہیں ہے جب خاکم بدہن حجاز بھی برطانیہ کی وزارت مستعمرات کے ماتحت ایک نیم خود مختار صوبہ ہوگا اور اس پر کسی برطانوی ریذیڈنٹ یا ہائی کمشنر کی نگرانی میں ایک ایسا عرب شیخ حکمران ہوگا، جو سلطان مسقط اور شیخ بحرین کی طرح برطانوی اغراض کا غلام ہوگا۔ ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ جو لوگ اسلام کے مرکز میں بھی اپنے معبودان باطل کو اس طرح مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے کیسے بہی خواہ ہیں اور مدینہ منورہ یا حرم پاک کے لئے ان کی یہ سطحی بے قراریاں اپنی تہ میں کس قسم کے اسلام کش جذبات رکھتی ہیں۔

* مخلصین امت کے لیے مسلک صحیح

ہمیں افسوس ہے کہ مدینہ منورہ کے متعلق اس بے بنیاد اور قبل از وقت ایجی ٹیشن میں بعض مخلص ہستیاں بھی شریک ہو گئی ہیں، جو درحقیقت عشق نبیؐ اور احترام روضۃ الرسولؐ کے جذبات کو آمادہ صبر و تحمل نہ کر سکی تھیں۔ انہوں نے ریوٹر کی خبر سنتے ہی اس محبت کے متوالے کی طرح اس پر فوراً یقین کر لیا، جس کی عقل پر محبت غالب آجاتی ہے اور اپنے محبوب کے متعلق ہر بری خبر کو سچ مان لیتا ہے۔ ہم نے ان پرجوش مسلمانوں کو اس وقت بھی صبر و شکیب کی دعوت دی تھی جب اس منحوس خبر کی تردید نہیں ہوئی تھی، مگر اس وقت ان کے وفور غضب کو دیکھ کر ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ کسی معقول تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے، لیکن اب کم از کم ایک معتبر ذریعہ سے اس کی تردید ہو جانے کے بعد تو ہمیں توقع ہوتی ہے کہ اگر انہیں موجودہ نازک حالات کی اصلاح کے لیے چند ضروری اور مفید باتوں کی طرف توجہ دلائی جائے، تو وہ ان سے بے اعتنائی نہ برتیں گے۔

ریوٹر کی اس تازہ دروغ بافی اور اس پر مسلمانان ہند کے ایک بڑے طبقہ میں ہیجان برپا ہو جانے سے کم از کم یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اس وقت کوئی قوت مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور ہندوستان میں اس نے اپنے اس کام کے لیے زمین کو اس حد تک تیار کر لیا ہے کہ اس میں نفاق و شقاق کا بیج آسانی سے بار آور ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے زعماؤ اکابر کو بہت سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ بھی اس نفاق انگیز پروپیگنڈا سے متاثر ہو جائیں گے اور ان کا پائے عقل و ثبات اتنا کمزور ہو گا کہ گمراہ کن نشر و اشاعت کے معمولی سے معمولی تھپیڑے بھی ان کو اس ہلاکت خیز دریا میں بہا لے جائیں گے، تو پھر کوئی قوت مسلمانوں کو مخالفین کی اغراض کا شکار بننے سے نہ بچا سکے گی۔ اس لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام زعماء و اکابر اس نازک موقع پر اپنے توازن دماغی کو درست رکھیں اور ذرا ذرا سی افواہوں پر عامی انسانوں کی طرح مشتعل ہو کر "کارامت" کو "تمام" کرنے کی بجائے ہر قسم کی غلط افواہوں کا سدباب کرنے کی کوشش کریں۔ اول تو انہیں کسی خبر کی اس وقت تک تصدیق نہ کرنی چاہیے جب تک وہ مصدر صحیح سے نکلی ہوئی نہ ہو پھر اگر وہ صحیح بھی ثابت ہو

جائے، تو اس پر فوراً بھڑک اٹھنے کی بجائے ان کی توجہ تمام ایسی تدابیر سوچنے اور ان پر عمل کرنے کی طرف منعطف ہو جانی چاہیے، جن سے شرو فتن کا سدباب ہو اور اصلی درد کا علاج ہو سکے۔

* ایک مفید تجویز

اس وقت ہم دو مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف نجدیوں کا انتہا پسندانہ تشدد اور تصلب ہے جس کے متعلق خود ابن سعود کو بھی اعتراف ہے کہ وہ اپنی قوم پر غیر معمولی اثر و اقتدار رکھنے کے باوجود اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف ہمارے ملک کے عوام کی جہالت اور جاہلانہ طبیعت کا یہ حال ہے کہ وہ ہر اس بدعت کو جو مذہب کا رنگ اختیار کر گئی ہے، عین مذہب سمجھنے لگے ہیں اور خود مذہب سے بھی زیادہ اس کی پاسداری کرتے ہیں جو لوگ ان دونوں انتہائی نقطوں میں سے کسی ایک کی طرف جائیں گے وہ یقیناً امت کے بہترین مصالح کو نقصان پہنچائیں گے، کیونکہ انہی انتہائی متضاد قوتوں کی ٹکر سے وہ شرارہ پیدا ہو گا جو مسلمانوں کے خرمن اتحاد و اتفاق کو تباہ کر دے گا، البتہ ان لوگوں کے لیے جو اصلاح کے طالب ہیں، ان دونوں کے درمیان ایک متوسط راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ہندوستان میں اس مبتدعانہ جہالت کے خلاف سخت جہاد کریں، جس کے باعث عوام غیر مشروع امور کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں اور دوسری طرف ابن سعود اور نجد کے با اثر علماء کو دین و ملت کے بہترین مصالح کا واسطہ دے کر مسلمانوں کے ان جذبات کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنے کی طرف مائل کریں گے جو ان کے نزدیک خواہ کتنے ہی خلاف شریعت ہوں، لیکن سیاسی حیثیت سے ان کا پاس کرنا ضروری ہے۔ اگر تمام ہندوستان کے علماء اور مقتدر رہنما متفق ہو کر اس اعتدلال کی روش پر قائم ہو جائیں، تو نجد اور اسلامی ہند کا سواد اعظم اپنے اپنے انتہائی نقطوں سے ہٹ کر ایک متوسط نقطہ پر متحد ہو سکتا ہے اور صرف اسی صورت سے امید کی جا سکتی ہے کہ یہ متحدہ قوت جزیرۃ العرب کو ان خطرات سے بچا لے گی، جو اسے دھمکی دے رہے ہیں۔

* مولوی مظہرالدین صاحب کا افسوس ناک رویہ

مولوی مظہرالدین صاحب نے کچھ دنوں سے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے واقف کار حضرات کوتواس کی اصل وجہ معلوم ہے، لیکن جن لوگوں کو حقیقت حال کی خبر نہیں، وہ ان کی تحریریں دیکھ کر حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہ نہایت افسوس ناک بات ہے کہ ایک مخلص بے غرض خادم مذہب و قوم (حضرت مولانا احمد سعید صاحب) کے متعلق لوگوں نے ایک غلط خیال پھیلایا ہے اس لیے ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خالی الذہن حضرات کو اس قدر بتادیں کہ مولوی مظہر الدین صاحب کو مولانا احمد سعید صاحب سے اس وجہ سے کاوش ہو گئی ہے کہ مولانا احمد سعید صاحب نے جماعت منتظمہ کی تجویز کے مطابق اخبار الجمعیتہ نکالا اور مولوی مظہر الدین صاحب یہ چاہتے تھے کہ اخبار نہ نکلے۔ پورے واقعات اس قدر دل خراش ہیں کہ آج تک ان کو پبلک میں لانا مناسب نہ سمجھا گیا تھا اور اب بھی ہم جب تک کہ سخت ضرورت پیش نہ آئے، انہیں شائع کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اصلی بات تو یہ تھی، مگر مولوی مظہرالدین صاحب نے اپنی تمام تر توجہ مولوی احمد سعید صاحب کی طرف متوجہ کر رکھی ہے اور طرح طرح کے الزام تراش کر "الامان" کی ہر اشاعت میں ایک نہ ایک نوٹ حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے خلاف لکھ دیتے ہیں۔

جو حضرات کہ ان حالات سے واقف ہیں اور مولانا مظہرالدین صاحب کی قدیمی عادت کا بھی ان کو علم ہے، ان کو کسی غلط فہمی کے پیش آنے کا خطرہ ہی نہیں، لیکن جن حضرات کے دل میں ان تحریرات کو لے کر کسی قسم کا وسوسہ پیدا ہو، وہ ہروقت ہر الزام کے متعلق پوری حقیقت دریافت کرکے اطمینان فرما سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ۷راگست کا الامان ہے۔ اس کے صفحہ ۲ کے چوتھے کالم کے آخری نوٹ میں مولانا مظہرالدین صاحب نے یہ عنوان لکھا ہے کہ:۔

> "مولوی احمد سعید صاحب اور تبلیغی کام کو تباہ کرنے کی سازش"۔ اس عنوان کو ناواقف لوگ دیکھ کر مولوی احمد سعید صاحب کی طرف سے کس قدر شدید بدظنی میں مبتلا ہو سکتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ صرف مولوی مظہر الدین صاحب کا ناواجب تخیل ہے، جس کو انہوں نے اس قدر شنیع

عنوان کے ماتحت لکھا ہے "پھر فرماتے ہیں کہ اب اس قدر پانی سر سے گزر گیا ہے کہ کوئی مسلمان مولوی احمد سعید صاحب واعظ دہلوی کی اندرونی خانہ سازیوں سے واقف ہو کر خاموش نہیں بیٹھ سکتا"۔

شاید مولوی مظہرالدین صاحب نے تمام مسلمانوں کو اپنے جیسا خود غرض سمجھ رکھا ہے، لیکن خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب کے اس نوٹ کو پڑھ کر کسی ایک مسلمان نے بھی آج ۲۰؍اگست تک آواز بلند نہیں کی اور نہ ایسے پادر ہوا تخیلات پر کوئی صحیح العقل مسلمان تو کیا صحیح العقل انسان بھی اس قسم کے شنیع افتراء کی بنیاد قائم کر سکتا ہے۔ مولوی مظہرالدین صاحب کو معلوم ہے کہ حضرت مولانا احمد سعید نے شعبہ تبلیغ کا کام دو سال سے جس طرح سرگرمی کے ساتھ انجام دیا ہے، اس کی نظیر آج ہندوستان میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں میں فتنہ ڈالنے تبلیغی و تنظیمی لائحہ عمل کو برباد کرنے کا کبھی خواب میں بھی خیال نہیں کیا۔ نہ کوئی اس قسم کی سازش ان کے وہم و گمان میں آئی، مگر خود غرضی کا خدا بھلا کرے جو جان بوجھ کر بھی اس قسم کے افترا پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اڈیٹر الامان نے اس سلسلے میں مولانا سے چار پانچ سوال بھی کئے ہیں جن کے جواب مولانا نے تحریر فرما دیئے ہیں۔ ہم آج کی اشاعت میں انہیں شائع کرتے ہیں۔

یہ جواب مولوی مظہرالدین صاحب کی خدمت میں بھی اس لیے بھجوا دیئے گئے ہیں کہ وہ ان کو الامان میں شائع فرما دیں تاکہ جیسے الامان کے ناظرین نے سوالات پڑھے ہیں ویسے ہی وہ جوابات بھی پڑھ لیں۔

☐ سیٹھ چھوٹانی کی گستاخی

{ ۶؍ ستمبر ۱۹۲۵ء }

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ مولانا شوکت علی صاحب کا وہ مضمون درج کیا گیا ہے، جو جناب ممدوح نے جامع مسجد بمبئی کے افسوسناک واقعہ کے متعلق خلافت میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ خبر ایسوسی ایٹڈ پریس اور ہندو اخبارات کے ذریعہ بھی ہم تک پہنچی تھی، لیکن اشاعت گذشتہ میں ہم نے اسے شائع کرنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ ہمیں اس میں مبالغہ

معلوم ہوتا تھا۔ وباغی و شریفی ایجنٹوں کی اخلاقی حالت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ہمیں ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس قدر کمینگی پر اتر آئیں گے، مگر افسوس ہے کہ مولانا شوکت علی کے بیان نے ان تمام باتوں کی تصدیق کردی اور اب ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ سیٹھ چھوٹانی نے ایسی سفلانہ حرکت کی ہے جس کی جرأت شاید بمبئی کا کوئی پیشہ ور بدمعاش بھی نہیں کرتا۔ اول تو خلافت کمیٹی کا سوا لاکھ سے زیادہ روپیہ کھا جانے کے بعد، اگر ان میں ذرہ برابر بھی احساس شرافت تھا تو انہیں پبلک میں آنے کی جرأت ہی نہیں ہونی چاہیے تھی، لیکن اگر وہ آئے بھی تھے اور ان کے دل میں ایک سچے مجاہد اسلام کی عزت کرنے والی ایمانی قوت نہیں تھی، تب بھی ان کو کم از کم مولانا شوکت علی کے اس احسان کا لحاظ کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے ان سیٹھ چھوٹانی کی اتنی بڑی قومی خیانت پر بھی عفو و درگذر کا طرز عمل اختیار کرکے کیا تھا پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ سیٹھ چھوٹانی نے صرف مولانا شوکت علی ہی کے ساتھ گستاخانہ رویہ اختیار کرنے پر قناعت نہیں کی، بلکہ ایک ایسے انسان کی طرح جس کے اندر انسانی شرافت اور اسلامی غیرت کا ذرہ برابر بھی احساس نہ ہو، انہوں نے بی اماں مرحومہ جیسی عفیفہ خاتون کو بھی گالیاں دیں جو نہ صرف ایک محترم خاتون کی حیثیت سے واجب التعظیم تھیں، بلکہ اب وہ ایک ایسے عالم میں ہیں جہاں کسی برے سے برے آدمی کو بھی برا کہنا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حرکت سے سیٹھ چھوٹانی نے اپنے آپ کو تمام اسلامی ہند کی لعنت و ملامت کا مستحق بنالیا ہے۔

* موپلوں کی جلاوطنی

گرمائی اجلاس میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ موپلوں کو انڈمان لے جاکر آباد کرنے کی پالیسی پر عمل کرنے سے پہلے ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو آب وہوا اور دیگر حیثیات سے موپلہ نوآبادی قائم کرنے کے لیے انڈمان کی مناسبت کا کافی جائزہ لے۔ اس پر آنریبل محمد عثمان صاحب نے حکومت کی جانب سے جواب دیا کہ جزیرہ انڈمان کی آب و ہوا خراب نہیں ہے اور موپلوں کے لیے اتنا ہی اچھا وطن بن سکتا ہے جتنا خود مالابار ہے۔

اگرچہ حکومت کی مخالفت کے باوجود کونسل میں اپّی صاحب کی تجویز پاس ہو گئی ہے، لیکن ہمارے خیال میں انہوں نے اپنی قوم کی وکالت بالکل غلط بنیادوں پر کی ہے۔ نو آبادی کی سکیم پر ہمارا اصل اعتراض یہ نہیں ہے کہ کالے پانی کی آب و ہوا خراب ہے یا وہاں جرائم پیشہ اقوام کے ساتھ رہنے سے موپلہ قوم کی اخلاقی و تمدنی حالت بگڑ جانے کا اندیشہ ہے، فروعی حیثیت سے بے شک ہم منجملہ دیگر اعتراضات کے ایک یہ اعتراض بھی پیش کرتے ہیں، لیکن اس پر ہمارا اصلی اعتراض یہ ہے کہ حکومت کو آخر انڈمان میں موپلہ نو آبادی قائم کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا ان کے لیے مالابار کی زمین تنگ ہو گئی ....؟ کیا انڈمان جا کر آباد ہونے میں ان کا کوئی مادی، اخلاقی یا روحانی فائدہ ہے؟ کیا وہ خود ہندوستان میں رہنے سے بیزار ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے، تو اس کا ثبوت پیش کیا جائے اور نہیں ہے تو صاف طور پر بتلایا جائے کہ حکومت کونسی شدید ضرورت کی بنا پر ایک ہندوستانی قوم کو اس کے وطنی حقوق سے محروم کر رہی ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو بالکل نظرانداز کئے دیتے ہیں کہ انڈمان کی آب و ہوا انسانوں کے رہنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اور اس سے بھی کوئی بحث نہیں کرتے کہ وہاں جانے سے موپلوں کی اخلاقی حالت پر کیا اثر پڑے گا۔ بفرض محال اگر وہ جزیرہ ہر حیثیت سے بہترین ہے، تب بھی یہ ایک اصولی اعتراض باقی رہ جاتا ہے کہ موپلوں کو وہاں لے جاکر آباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ پنجاب کی آب و ہوا حیدر آباد سے زیادہ اچھی ہے، تو کیوں نہ تمام صوبہ دکن کے باشندے وہاں منتقل ہو جائیں• بنگال کی زمین سندھ سے زیادہ زرخیز ہے، تو کیوں نہ سندھ کی ساری آبادی مشرقی ہندوستان چلی جائے۔ جنوبی ہند میں سیلاب بہت آنے لگے ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ وہاں کے سب باشندے راجپوتانہ لے جاکر نہ بسا دئے جائیں؟ اگر اسی قسم کے دلائل کسی قوم کے لیے مہاجرت کی اسکیم بنانے کے لیے کافی ہوں، تو شاید دنیا کی بہت سی قوموں کو اپنے آبائی وطنوں سے محروم ہونا پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت سے موپلہ مہاجرت کے دلائل پوچھنا ہی اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ موپلوں کا ہندوستان میں رہنا پسند نہیں کرتی اور انہیں یہاں سے نکال کر ایک ایسی جگہ لے جانا چاہتی ہے، جہاں ان کا مذہبی

جوش کسی طرح بھی اس کے سیاسی مصالح کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس سیاسی غرض پر وہ موپلوں کی پوری قوم کو بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار ہو گئی ہے اور انہیں انڈمان جیسے جزیرہ میں لے جا کر آباد کرنا چاہتی ہے جس کے متعلق آج خواہ کتنی ہی بلند آہنگی کے ساتھ خوشگواری آب و ہوا کا دعویٰ کیا جائے، لیکن اب سے چند ہی سال پہلے خود حکومت کا مقرر کیا ہوا کمیشن یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ انسانی بود و باش کے قابل نہیں ہے پھر جبکہ اس میں حکومت کی غرض بالکل ظاہر ہے اور یہ حقیقت بھی شک وشبہ سے بالکل پاک ہے کہ اس میں موپلہ قوم کی کامل تباہی مضمر ہے، تو بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں صاف طور پر حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنی اس سکیم سے باز آجائے اور اگر وہ برطانوی ہند میں موپلوں کے وجود کو کسی طرح برداشت ہی نہیں کر سکتی، تو انہیں حضور نظام کی مملکت خداداد میں منتقل کر دے۔

★ حامیان شریف کی باطل پرستی

قاہرہ، یروشلم اور شملہ سے بالاتفاق روضہ اطہر اور مسجد نبویؐ کے متعلق ریوٹر کے بیان کی تردید ہو جانے کے بعد بھی ایک جماعت اپنے اشتعال انگیز پروپیگنڈا میں مشغول ہے اور بعض لوگ تاروں میں، بعض جلوسوں میں، بعض قد آدم پوسٹروں اور بعض ماتمی جلوسوں میں اماکن مقدسہ کے متعلق ایسی مفتریانہ غلط بیانیاں کر رہے ہیں، جن کی قطعاً کوئی اصل نہیں ہے۔ اگر ان لوگوں کے دلوں میں حقیقتاً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس کے لیے کوئی تڑپ ہوتی، تو وہ یقیناً اس منحوس خبر کی تصدیق کی بجائے تکذیب کے لیے نہ بے چین ہوتے اور تین متواتر روایتوں سے اس کی تردید ہوتے ہی سجدہ شکر بجا لاتے، مگر افسوس کہ اس کے بالکل برخلاف وہ اس کی صحت پر برابر اصرار کر رہے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ روضہ اطہر کی حرمت کے نہیں، بلکہ نعوذ باللہ اہانت کے طالب ہیں اور خدا سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح وہ جگرپاش خبر سچی ثابت ہو جائے تاکہ امیر علی کی حمایت اور فتنہ افتراق کی اشاعت زیادہ آسانی کے ساتھ کی جا سکے۔ اس راز کو تو ہم اسی وقت سمجھ گئے تھے جو ریوٹر جیسی بدنام ایجنسی کے تار پر، جس کی خبروں کو اسلامی معاملات میں ہمیشہ ساقط الاعتبار سمجھا جاتا ہے، پورے جوش کے

ساتھ آمنا و صدقنا کہا گیا تھا اور تمام شریف پرست حلقوں نے ہم آواز ہو کر قومی اخبارات، قومی لیڈروں اور سلطان ابن سعود کے خلاف شور محشر برپا کردیا تھا۔ اس وقت ان لوگوں کا بناوٹی جوش صاف بتلا رہا تھا کہ وہ مدینہ طیبہ کے متعلق اس جھوٹی خبر کو صرف ایک تائید غیبی سمجھتے ہیں اور اسے اپنی ان بداندیشانہ کاروائیوں میں استعمال کرنا چاہتے ہیں جو وہ پہلے سے خلافت کمیٹی اور قوم کی اصلاح طلب جماعت کے خلاف کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ خیال اس وقت تو محض قیاس ہی قیاس تھا، لیکن اب خود ان ہی لوگوں نے اپنی وکالت سے اس کو ایک حقیقت صادقہ ثابت کردیا ہے۔

ریوٹر کے تار کی تائید میں ہماری قوم کے ماہر فتن وکلا نے جو سب سے بڑی دلیل پیش کی ہے، وہ یہ ہے کہ نجدیوں کے متعلق قبے توڑنے اور طائف میں قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کی خبریں بھی صحیح ہو چکی ہیں، حالانکہ یہی خلافت والے پہلے ان کو بھی جھٹلایا کرتے تھے اس استدلال کے صاف معنی یہ ہیں کہ مسجد نبویؐ پر گولہ باری کرنے کی خبر صرف اس لیے صحیح ہے کہ وہ نجدیوں کے متعلق ہے اور اسے "خلافت والوں" نے جھٹلایا ہے۔ اگر یہ بات بطور ایک اصول کے تسلیم کرلی جائے، تو آئندہ سے درایت و قواعد میں ایک اس قاعدہ کلیہ کا بھی اضافہ کر دینا پڑے گا کہ جس روایت کو "خلافت والے" جھٹلائیں یا جو واقعہ نجدیوں کی طرف منسوب کیا جائے، وہ بہرحال صحیح ہے، خواہ اس کی صحت کتنی ہی خلاف قیاس ہو، اس کا راوی کتنا ہی ساقط الاعتبار ہو اور اس کی کتنے ہی ذرائع سے تردید ہو جائے پھر اگر کوئی خلافت والا کہ اٹھے کہ خدا دو نہیں، بلکہ ایک ہے، تو اس اصول موضوعہ کی بنا پر کلیہ کے ماہرین قانون بین الاقوام یقیناً اس کی تکذیب کریں گے اور صاف اعلان کردیں گے کہ نعوذباللہ خدا ضرور دو ہیں کیونکہ "خلافت والے" اس کی دوئی کی تکذیب کرتے ہیں۔ کسی واقعہ کی صداقت کو جانچنے کا اس سے بہتر معیار اور کیا ہو سکتا ہے؟

مگر کیا ہم ان خردمندان بے خرد سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہی نجدیوں کے متعلق اور بھی تو بہت سی باتیں کہی گئی تھیں جن کی خلافت والوں نے تکذیب کی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ نجدیوں کا کلمہ دوسرا ہے، تم کہتے تھے کہ نجدیوں نے حجراسود کو توڑ کر پھینک دیا ہے، تم مشہور کرتے تھے کہ نجدی حجراسود کو بوسہ دینا بدعت اور اس کے مرتکب کو مستوجب

سزا سمجھتے ہیں، تمہارا قول تھا کہ نجدی آبِ زمزم سے استنجا کرتے ہیں اور تمہارا بیان تھا کہ نجدیوں نے مزارات و موالد پر نجاست خانے بنا دئے ہیں پھر کیا یہ سب باتیں سچی ثابت ہوئی ہیں؟ کیا تمہارے اس معیار صداقت پر تمہارے بیانات پورے اترے ہیں اور کیا صداقت کا آفتاب طلوع ہوتے ہی تمہارے ان بہتانوں کی تاریکی دور نہیں ہو گئی؟

حق و باطل کی تمیز کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ کبھی جھوٹی اور بے بنیاد باتیں نہیں گھڑتے اور جنہیں باطل کی حمایت کرنی ہوتی ہے، اپنے مقدمہ کو مضبوط بنانے کے لئے غلط قصے، جھوٹے واقعات اور من گھڑت فسانے بنا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ امتیاز اس وقت ہندوستان کی دو جماعتوں میں نمایاں نظر آ رہا ہے جو جماعت مسلمانوں کو افتراق کے فتنہ سے بچانا چاہتی ہے، وہ تمام واقعات کو صفائی کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کر دیتی ہے اور کسی بات پر اس وقت تک یقین نہیں کرتی جب تک معتبر ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہو جاتی، لیکن جس جماعت کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کرنا، ان میں فرقہ بندی کا تعصب پیدا کرنا اور ایک ایسی قوت کی کورانہ حمایت کرنا ہو جو اسلام کے مفاد اور مصالح کو بے اندازہ نقصان پہنچا چکی ہے اور اب تک پہنچا رہی ہے، وہ مسلمانوں کی رائے کو خراب کرنے اور انہیں باطل کا حامی بنانے کے لئے طرح طرح کی افتراپردازیاں کرتی ہے، جھوٹے تار بھیجتی ہے، بناوٹی پوسٹر شائع کرتی ہے، عام جلسوں میں لوگوں کو غلط واقعات سناتی ہے اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے کسی قسم کی کذب آفرینی سے دریغ نہیں کرتی۔

قضیہ نجد و حجاز کی ابتداء ہی سے جمعیتہ العلماء ہند اور خلافت کمیٹی نے اس میں ایک نہایت صاف اور واضح طریقہ اختیار کیا ہے جو کسی قسم کی تلبیس اور فریب سے آلودہ نہیں ہے۔ انہوں نے کسی فریق کی حمایت مصیبت کی بنا پر نہیں کی، ان کے سامنے صرف حرمین شریفین کا مفاد تھا جسے وہ اس مسئلہ کا بنیادی سوال سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اسی چیز کی حمایت کی جس کے متعلق انہیں ایمانداری کے ساتھ یقین تھا کہ وہ حرمین کی حرمت و صیانت کے لئے مفید ہے۔ اس قضیہ کی ابتداء سے آج تک ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی، جس سے ثابت کیا جا سکتا ہو کہ ان دونوں جماعتوں نے بددیانتی کے ساتھ تلبیس و دجل سے کام لیا ہے، واقعات کی صورت مسخ کی ہے یا کسی قوت کو

حجاز کی حرمت و صیانت کے لئے مضر سمجھتے ہوئے اس کی تائید کی ہے۔ شریف اور اس کی اولاد کے متعلق ان کی قطعی یہ رائے تھی کہ وہ حجاز میں امن قائم کرنے وہاں شعائراللہ کی حفاظت کرنے اور اسے اعدائے اسلام کی خطرناک ریشہ دوانیوں سے بچانے کے اہل نہیں ہیں‘ اس لئے انہوں نے ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ وہ ارض حرم میں ان کے وجود کو کبھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ دولت برطانیہ کے متعلق ان کو یقین کامل تھا کہ وہ عرب پر اپنا معنوی و مادی اقتدار قائم کرنا چاہتی ہے اور تمام امرائے عرب کو باہم لڑا کر اپنے نفوذ و اثر کے جال بچھا رہی ہے‘ اس لئے انہوں نے علی الاعلان اس کی مخالفت کی اور کبھی اس بات کو نہیں چھپایا کہ وہ ہر اس قوت کی مخالفت کریں گی جس پر انہیں برطانیہ سے ساز باز رکھنے کا ذرہ برابر بھی شبہ ہو گا۔ ابن سعود کے متعلق وہ حقیقی حالات سے جب تک بے خبر ہیں‘ انہوں نے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا‘ لیکن جوں جوں اس کی سیرت‘ اس کی پالیسی‘ اس کے اعمال‘ اس کی قابلیت اور اس کے بین الاقوامی تعلقات کے متعلق ان کو علم ہوتا گیا‘ وہ اس کے بارے میں اپنی رائے کا اعلان کرتی رہیں اور اس میں نہ انہوں نے کبھی نجدیوں کے متعلق کسی ایسی خبر کا یقین کیا‘ جس کی معتبر ذرائع سے تصدیق نہ ہو گئی ہو اور نہ کسی ایسی خبر کو مشہور کیا جو لوگوں کو ان کے معاملہ میں غلط رائے قائم کرنے کا موقع دیتی۔

برخلاف اس کے اس جماعت کے طرز عمل پر ایک نگاہ ڈالیے جو شریف حسین اور اس کی اولاد کی حمایت کر رہی ہے۔ اس نے ابتدا ہی سے جو طریقہ اختیار کیا ہے‘ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے خود اپنے مقدمہ کے کمزور ہونے کا یقین ہے‘ اس لیے وہ رائے عامہ کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے شریف حسین اور اس کی اولاد کے پچھلے سیاہ اعمال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی‘ حالانکہ تمام دنیائے اسلام ان سے واقف ہے اور ان پر بالاتفاق اظہار نفرت کر چکی ہے۔ اس نے نجدیوں کو کافر و زندیق اور دشمن اسلام مشہور کیا‘ حالانکہ فروعی اختلاف کے باوجود ان میں اور اہل سنت میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے اور خصوصاً وہ لوگ جو اس سال کے حج میں ان کا دینی شغف اور بیت اللہ سے ان کی والہانہ محبت دیکھ چکے ہیں‘ وہ ان کے کفر و زندیقیت کا تو شبہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس نے مشہور کیا کہ نجدی لوگ کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ لفظ محمد رسول اللہ

کے وصل کو کفر سمجھتے ہیں، حالانکہ جو لوگ حج میں ایک لاکھ نجدیوں کو دیکھ آئے ہیں وہ گواہ ہیں کہ یہ ان پر کھلا افتراء ہے اور اس بیان کی کوئی اصلیت نہیں ہے، اس نے مشہور کیا کہ نجدی تمام مسلمانوں کو کافر و مشرک اور ان کی جان و مال، عورتوں اور اولاد کو اپنے اوپر مباح سمجھتے ہیں، حالانکہ مکہ معظمہ میں حنفی و شافعی مسلمانوں کی آبادی کا ہر طرح محفوظ رہنا مسجد الحرام میں چاروں مصلوں کا بدستور قائم رہنا اور خود امام عبدالعزیز ابن سعود کا حنفی ہونا صریح ہے۔ غرض اول سے لیکر آخر تک دیکھ جائیے، قبتوں کو گرانے اور احکام شریعت کے اجرا میں تشدد کرنے کے سوا نجدیوں کے متعلق یہ جماعت جتنی باتیں مشہور کرتی ہے، وہ سب قطعاً جھوٹ ہیں اور انہیں صرف اس لئے گھڑا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی طرف سے بدظن کرکے شریف کا حامی بنایا جائے۔

پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ آپ ان عملی طریقوں میں بھی جنہیں وہ نشر و تبلیغ کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس بات کو نمایاں پائیں گے کہ وہ حق پرستوں کے مقابلہ میں باطل پرستوں کے طریق کار کو زیادہ قابل تقلید سمجھتے ہیں۔ وہ خفیہ ریشہ دوانیاں کرکے اور لوگوں کو جھوٹے سچے واقعات سنا کر گمراہ کرتے ہیں، ان کے ایجنٹ ملک میں دورے کرکے مقامی آدمیوں کو نشر اکاذیب و اباطیل کے لئے تیار کرتے ہیں، ان کے اشتہارات میں جھوٹے مضامین، ”سنسنی خیز“ سرخیاں اور اشتعال انگیز عبارتیں اس طرح لکھی ہوتی ہیں، جن پر یورپ کے پیشہ ور پروپیگنڈا کرنے والوں کی اشتہار بازی کا دھوکہ ہوتا ہے، وہ تحریک خلافت کے کارکنوں پر بددیانتی اور خیانت کے ایسے رکیک الزام عائد کرتے ہیں، جن سے ہر شریف آدمی کے دل میں خود انہی کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ جب وہ جلسوں میں جاتے ہیں، تو اپنے ساتھ مفسدوں اور بدمعاشوں کا ایک پورا جتھہ لگا رکھتے ہیں جس کا کام گالیاں دینا، شور مچانا، جلسوں کو درہم برہم کرنا اور قوم کے معزز خادموں کو ذلیل و بے حرمت کرنا ہوتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم ان لوگوں کی طرح تنگ نظری میں مبتلا نہیں ہیں جو اپنی رائے کے خلاف ہر خیال کو بددیانتی پر محمول کرتے ہیں اور ایمانداری کے ساتھ کسی اختلاف رائے کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے، لیکن برائے خدا کوئی ہمیں بتلائے کہ یہ افتراء پردازی، یہ کذب آفرینی، یہ فتنہ پروری اور یہ فساد انگیزی جو دماغی پروپیگنڈا کے سلسلہ

میں کی جارہی ہے' آخر کہاں کی ایمانداری ہے؟ اگر یہ لوگ حق کی حمایت کررہے ہیں یا جس چیز کے حامی ہیں' اسے حق سمجھتے ہیں' تو انہیں جھوٹ بولنے' حقائق کو مسخ کرنے اور دامن شرافت و اخلاق کو تار تار کرنے کی کیا ضرورت ہے' وہ صداقت و راست بازی کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کرسکتے ہیں اور یقیناً ہر حق پرست انسان ان کے ساتھ مذاکرہ و مباحثہ کرکے ان کا نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش کرے گا' لیکن اگر یہ کذب و افترا کا طوفان اسی طرح برپا رہا' تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے ان کو یا اسلام کو یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ ہوسکتا ہے۔ حق کبھی باطل کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور نہ اعلائے کلمتہ الحق کے لئے وہ ذرائع استعمال کئے جاسکتے ہیں جو صریحاً باطل پرستی پر مبنی ہوں۔

ہم تمام حامیان شریف یا مخالفان ابن سعود سے صاف طور پر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد نہ شریف کی مخالفت ہے اور نہ ابن سعود کی حمایت۔ ہم صرف حرمین شریفین کی حرمت' جزیرۃ العرب کی تقدیس و تطہیر اور اعدائے اسلام کی ریشہ دوانیوں سے مرکز اسلام کی حفاظت چاہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول میں جس قوت کو بھی ہم معین و مفید پائیں گے' اس کی حمایت کریں گے۔ اگر تم بھی اس مقصد سے متفق ہو' تو پھر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم اور تم مل کر اس کے لئے کوشش کرسکتے ہیں اور اگر ذرائع حصول میں اختلاف بھی ہو' تو وہ فروعی اختلاف ہوگا جس کا رفع کرنا یقیناً ممکن ہے' لیکن اگر تمہارا مقصد اس سے مختلف ہے' اگر تمہاری کوششیں عصبیت پر مبنی ہیں اور اگر تمہاری جدوجہد کی بنیاد عرب کی فلاح خواہی پر نہیں' بلکہ ابن سعود کی مخالفت یا شریف کی حمایت پر قائم ہے' تو ہمارا تم کو وہی جواب ہے جو نبی مکرمؐ (فداہ ابی وامی) نے مشرکین عرب کو دیا تھا کہ **لکم دینکم ولی دین**' البتہ اس کے بعد ایک چیز ہمارے اور تمہارے درمیان مابہ الاشتراک ہوسکتی ہے جو سخت سے سخت اختلافات کے باوجود متحارب فریقوں کو انسانیت کی سطح مرتفع سے گرنے نہیں دیتی۔ وہ چیز اخلاق و شرافت ہے۔ اس کو ملحوظ رکھ کر ہم سخت سے سخت ہنگامہ دارو گیر میں بھی اپنی انسانیت کو محفوظ رکھ سکتے ہیں اور اسی میں ہمارے لئے بہتری ہے' لیکن افسوس ہے کہ تم اس آخری چیز کو بھی چھوڑتے جارہے ہو۔ تم نے شریف آدمیوں کی ٹوپیاں اچھالنی شروع کردی ہیں' تم عزت والوں کے ننگ و ناموس پر حملے کررہے ہو' تم لاٹھی پونگے اور گالم گلوچ تک

سے دریغ نہیں کرتے اور گھروں سے سازشیں کر کر کے آتے ہو تاکہ خانہ ہائے خدا میں فساد برپا کرو اور مسلمانوں کے سرداروں سے مار پیٹ اور جوتی پیزار کے ساتھ پیش آؤ۔ یہ اختلاف و مخاصمت کا ذلیل ترین درجہ ہے اور ہم اعلان کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ حیوانیت کے اس اکھاڑے میں اترنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

☐ ہندو دھرم میں قربانی گاؤ

{۲۰ صفر المظفر ۱۳۴۴ھ - ۱۰ ستمبر ۱۹۲۵ء}

ہندوؤں میں گائے کی جو کچھ عظمت ہے، اس سے دنیا خوب واقف ہے۔ پہلے تو خیر دنیا کو اس کا صرف نظری علم ہی حاصل تھا، لیکن گزشتہ چند سال سے اسکی بدولت ہندوستان میں جو کچھ ہنگامے ہوئے ہیں اور جس طرح ہندوستان کا امن و امان اور اس کا سیاسی مستقبل اس مقدس جانور پر قربان کیا جارہا ہے، اس سے بہت کچھ عملی تجربہ بھی ہوگیا ہے اور اب عام طور پر نہ صرف جہلاء بلکہ علما اور مدبرین سیاست تک یہ سمجھتے ہیں کہ گائے کی عظمت و تقدیس ہندو مذہب کا کوئی بنیادی اصول ہے۔ خود ہندوؤں میں بھی اگر ان اختلافات کو دیکھا جائے جو ان کے مختلف مذہبی فرقوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیتے ہیں، تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ان کے ہاں صرف ایک گائے کا مسئلہ ایسا ہے جس پر سب متفق ہیں اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ صرف وہی ایک ایسا رابطہ ہے جو تمام ہندو فرقوں کو باہم مربوط کرکے ایک قوم بناتا ہے، مگر دنیا یہ سن کر یقیناً متعجب ہوگی کہ یہ عظمت و تقدیس، رسم و رواج اور وہمیات کے ان حیرت انگیز کرشموں میں سے ہے، جو لوگوں کی طبیعتوں میں راسخ ہو کر مذہب کے اصولوں کو بالکل بدل دیتے ہیں جس طرح عیسائیوں میں، باپ بیٹا روح القدس کا عقیدہ ان کے مذہب کے بالکل خلاف عین مذہب بن گیا اور رفتہ رفتہ اس کا اتنا اثر بڑھا کہ اب اس کے سوا مسیحیت کسی اور چیز کا نام ہی نہیں رہا۔ اسی طرح جیوہتیا سے پرہیز، قربانی سے احتراز، گوشت کھانے کو ناجائز سمجھنا اور گائے کے ذبح کرنے کو قطعاً حرام سمجھنا بھی ایک ایسا خیال ہے، جسکی دیدوں میں کوئی اصلیت نہیں ہے اور بعد میں ویدک تعلیمات کے بالکل خلاف یوگ دہرم کے اثر

سے ہندوؤں میں راسخ ہوگیا ہے۔

اس مسئلہ پر ہمارے پاس ایک کتاب آئی ہے جو ہندو دھرم میں یدنیہ کے عنوان سے پروفیسر معین الدین احمد صاحب نے تحریر فرمائی ہے اور ولسن کالج بمبئی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ جناب مصنف ہندوستان میں سنسکرت کے ایک بہت بڑے عالم ہیں اور بیس پچیس سال سے ہندوؤں کے مذہب' تاریخ اور ادب کا مطالعہ کررہے ہیں۔ انہوں نے مسئلہ گاؤ پر ہندو دھرم کے تمام لٹریچر کا نہایت عمیق مطالعہ کرنے کے بعد اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ہمارے سامنے ایک ایسی حقیقت کو بے نقاب کرکے رکھ دیا ہے جس سے خود ہم ہی نہیں' بلکہ ہندو قوم کے بڑے بڑے مذہبی علماء تک بے بہرہ ہیں۔ انہوں نے کہیں اپنے مظنونات اور قیاسات کو پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ خود ہندو دہرم کی مستند ترین کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ ہندوؤں کا مذہب قربانی کو فرض قرار دیتا ہے اور گائے کی قربانی اس کے نزدیک سب سے افضل قربانی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے "اہنسا پرمودھرما" کی حقیقت کو بھی واضح کیا ہے اور بڑے بڑے رشیوں اور اوتاروں کے اقوال سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ اہنسا اور یدنیہ (قربانی) میں کوئی تناقض نہیں ہے' بلکہ دونوں اپنے اپنے حدود میں فرضیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اس قابل قدر کتاب کے اکتشافات کو قارئین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس سے ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی مسائل میں خود حکم بن کر کوئی فتوی دیں' بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ جس مسئلہ کو اہمیت دے کر ہندوستان کی حیات و ممات کا دارومدار بنایا دیا گیا ہے' اس کی اصلیت کیا ہے۔

ویدوں میں یدنیہ (قربانی) دان (خیرات) اور تپسیا (ریاضت) تین چیزوں کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان تینوں چیزوں میں سب سے زیادہ اہم چیز یدنیہ ہے۔ اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اسے خدا کو پہچاننے کا ذریعہ' بلکہ عین خدا بنایا گیا ہے۔ بھاگوت گیتا میں لکھا ہے کہ "میں ہی یدنیہ خور ہوں۔ میں ہی سب کا مالک ہوں یعنی یدنیہ خود خدا ہے"۔ اسی طرح بھاگوت پران میں لکھا ہے کہ

"اے ایشور تو ہی یدنیہ ہے' تو ہی ہولی ہے --- اور تو ہی یدنیہ پشو (قربانی) کا جانور ہے"۔

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "اے ایشور تیری ماہیت کو ہم نہیں جان سکتے' لیکن ان تین

ویدوں کی پیدا کی ہوئی دھرم کی علامت، یدنیہ ہے جس کے اندر تو خود موجود ہے۔ ہم تجھے پہچانتے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ برہما نے یدنیہ کا حکم دیا ہے اور تمام مخلوقات کی ہستی کو یدنیہ پر منحصر بتلایا ہے جو شخص یدنیہ نہیں کرتا وہ بھاگوت گیتا اور شانتی پروہ کی رو سے دونوں جہانوں کی نعمتوں کو کھو بیٹھتا ہے اور سخت گنہگار ہوتا ہے۔

یدنیہ تمام گناہوں سے نجات پانے کا ذریعہ ہے، چنانچہ بھاگوت پران میں لکھا ہے کہ نارائن نے تمام دنیا کو قتل کر ڈالنے کے گناہ سے محض گھوڑے کی قربانی کر کے نجات حاصل کر لی ہے۔ اس کے علاوہ یدنیہ کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے تمام مرادیں پوری ہوتی ہیں اور بہشت ملتی ہے۔ برہما نے انسان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ یدنیہ کو پیدا کیا تھا اور پھر اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔ "لو یہ قربانی تمہاری سب مرادیں پوری کرنے والی ہے۔ یدنیہ کرو اور پھولو پھلو"۔ جو برہمن وید شاستر کے حکم کے مطابق قربانی کرتا ہے، اس کا درجہ بڑھ جاتا ہے اور وہ ذبیحہ کے ساتھ ساتھ بہشت پہنچتا ہے۔ اس معاملہ میں یجر وید نے اتنا غلو کیا ہے کہ وہ خود قربان گاہ ہی کو بہشت سمجھتی ہے۔ قربانی کئے بغیر بہشت ملنے کو ناممکن قرار دیتی ہے اور قربانی کے منکر کو خدا کا چور بتلاتی ہے۔

یہ احکام بالکل صاف اور صریح ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب اہنسا ہندو دہرم کا ایک بنیادی مسئلہ ہے، تو وہ یدنیہ کے ساتھ کیونکر جمع ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق ہندو دہرم کی تصریح یہ ہے کہ یہو لمبھو نے جانوروں کو یدنیہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے یدنیہ میں خون بہانا اہنسا کے خلاف نہیں ہے، بلکہ جو ہنسا پرمیشور کے حکم سے کی جائے، اسے ہنسا ہی کہنا غلطی ہے۔ اہنسا اور یدنیہ کے اس فرق کو پروفیسر صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> "جینیوں کے علاوہ اور لوگ جو حکم شدہ یدنیہ کو ناجائز اور ہنسا کے برابر جانتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ حلال کو حرام کہتے ہیں، ان کے نزدیک اپنی منکوحہ بیوی سے اولاد پیدا کرنا بھی کیوں ویسا ہی ناجائز نہ ہو جیسا کہ غیر عورت سے کیونکہ جس وید نے ہنسا (ایذا رسانی) کو منع کیا ہے، اسی وید نے یدنیہ کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح جس وید نے غیر عورت کو حرام ٹھہرایا ہے اسی نے منکوحہ بیوی کو حلال بتلایا ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ اگر حکم شدہ یدنیہ بری ہے، تو حکم شدہ بیوی بھی

ناجائز ہے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے قربانی تو ثابت ہو جاتی ہے، لیکن یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ ہندو دھرم نے قربانی کا گوشت کھانا بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق ہندوؤں کی معتبر مذہبی کتابوں کا فتویٰ یہ ہے کہ گوشت کھانا ہندو مذہب میں بالکل جائز ہے اور پاکیزہ و حلال کردہ گوشت روز مرہ کھانے سے بھی آدمی گنہگار نہیں ہوتا۔ یودھشٹر کے سوال پر بھیشم نے کہا تھا کہ "بیشک گوشت سے زیادہ اور کوئی چیز مزے دار نہیں" بیماروں زخمیوں، کمزوروں اور تھکے ماندوں کے لئے گوشت سے بڑھ کر کوئی چیز مقوی نہیں ہے۔ اگرچہ گوشت نہ کھانے میں بھی خوبیاں ہیں، مگر دھرم شاستر کی رو سے گوشت کھانا درست ہے اور یہ شرتی بھی ہم سنتے چلے آئے ہیں کہ قربانی کے لئے ہی سب جانور پیدا کئے گئے ہیں اور کھشتریوں کے متعلق تو خاص طور پر یہ حکم ہے کہ جو گوشت بہادری سے شکار میں ہاتھ لگے وہ کھشتری کا حق ہے"۔ رامائن میں اس دعوت کا ذکر موجود ہے، جو ویدوں کے مشہور عالم بردواج نے راجہ بھرت کی فوج کو دی تھی۔ اس کی کیفیت میں لکھا ہے کہ "ہر طرف سے صدائیں سنائی دیتی تھیں کہ اے پیاسو! سرا (شراب) پیو جتنی پی سکو۔ اے بھوکو! یہ قسم قسم کے پاکیزہ گوشت کھاؤ جتنے کھا سکو۔

یہاں تک تو صرف گوشت کھانے کا جواز ہی ثابت ہوتا ہے، لیکن آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ قربانی کا گوشت کھانا فرض قرار دیا گیا ہے اور اس سے پرہیز کرنے والے کو گنہگار بتایا ہے۔ چنانچہ ہندو دھرم کا مشہور مقنن منو لکھتا ہے کہ:

> "ویدکی حکم دی ہوئی قربانی کر کے جو کوئی قربانی کا گوشت نہ کھائے، وہ مرنے کے بعد اکیس بار جانور کی جون میں پیدا کیا جاتا ہے"۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منو کے عہد تک قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ان کا گوشت کھانا فرض سمجھا جاتا تھا اور ہندوؤں میں جیوہتیا سے پرہیز اور گوشت کھانے سے احتراز کا عقیدہ اس کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوا ہے جس کی مذہبا کوئی اصل نہیں ہے۔

* ہندو دھرم میں قربانی گاؤ

پچھلی صحبت کے مباحث میں اس حد تک تو ثابت ہو چکا کہ ویدک دھرم میں قربانی

ایک بڑی عبادت ہے اور ترک حیوانات کا اصول ویدوں کے مذہبی احکام میں شامل نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گائے کے متعلق ویدوں کی تعلیم کیا ہے۔

اس کے لیے سب سے پہلے گائے کی عظمت کا فلسفہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نوع بشری کے ابتدائی عہد میں جبکہ انسانی دماغ نے کافی ترقی نہیں کی تھی اور وہ خدا کی معرفت سے عاجز تھا' دنیا کی ہر وہ چیز قابل عبادت سمجھی جاتی تھی' جو بہت زیادہ مہیب ہوتی یا انسان سے زیادہ طاقتور ہوتی' یا اپنے اندر کوئی خاص عجوبگی رکھتی ہو' یا انسان اپنی زندگی کے لیے اس کا محتاج ہو۔ ان میں سے جو چیزیں مجسم ہوتی تھیں مثلاً دریا' درخت' پہاڑ' جانور وغیرہ' ان کی بلا واسطہ عبادت کی جاتی تھی اور جو مجسم نہ ہوتی تھیں مثلاً رات' روشنی اور برسات وغیرہ ان کے لیے دیوتا فرض کر لیے گئے تھے اور ان کے خیالی مجسمے یا مثیل بنا کر ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ اسی اصول کی بنا پر انسان نے گائے کی عبادت بھی کی' کیونکہ وہ زراعت میں اس کے لیے مفید تھی اور دودھ گھی وغیرہ ضروریات زندگی اس سے حاصل ہوتی تھیں۔ صرف ہندوستان ہی نہیں' بلکہ دنیا کی ہر زراعت پیشہ قوم نے جسے حصول رزق کے لیے گائے بیل سے کام لینا پڑا' اپنے عہد جاہلیت میں اس جانور کی عبادت کی ہے۔ چنانچہ مصر' بابل' ایران اور شام و فلسطین کے آثار قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ میں ان سب ملکوں کے معبودوں میں گائے اور بیل کو ایک خاص درجہ حاصل رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں بھی جو دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ہے' گائے کی بے حد عظمت ظاہر کی گئی ہے۔ اس کی نظروں میں گائیں تپسوی لوگوں سے بھی زیادہ بزرگ ہیں' کیونکہ پرمیشور پتا خود ان میں بستا ہے۔ اس نے گائیوں کو برہمالوک میں جگہ دی ہے۔ جس کے لیے بڑے بڑے رشی آرزوئیں کرتے ہیں اور اس کے دودھ دہی' گوبر' چمڑے' سینگ' سم' دم اور پیشاب ہر چیز کو انسان پر ایک احسان اور اس لیے متبرک قرار دیا گیا ہے' لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ گائیں انسان کے لیے حرام ہیں یا ان کو قربان کرنا اور ان کا گوشت کھانا گناہ ہے' بلکہ اس کے عین بر خلاف ویدوں کی تعلیمات اور ہندوؤں کے ائمہ دین کے عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ گائے کی قربانی سب سے افضل ہے اور اس کا گوشت ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہندوؤں کی مذہبی حکایات میں ایک واقعہ مذکور ہے۔ راجہ نہوشہ مہمانوں کی ضیافت میں بہت گائے بیل ذبح کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب اس نے نوشتو کے لیے گائے ذبح کرائی اور اتفاق سے کپیلا منی وہاں جا نکلا اور اس نے مذبوحہ گائے کو دیکھ کر کہا کہ "دیکھو وید کے کرتوت' یہ گائے وید کے حکم کے مطابق ذبح کی گئی ہے"۔ اس پر سیوم رشی نام ایک برہمن منی نے فوراً گائے میں حلول کرکے اس کی زبان سے جواب دیا کہ کیا وہ وید پر اعتراض کرتا ہے۔ وید کے ماہر علماء و صلحاء اس کے نقطہ نقطہ کو ماننے اور لفظ لفظ پر ایمان رکھتے ہیں۔ تجھ جیسے تارک الدنیا والدین خشک زاہد اور نا امید شخص کو وید سے کیا واسطہ اور تجھے نکتہ چینی کی کیا ضرورت؟ پھر اس نے کپیلا منی کو وید کا یہ حکم پڑھ کر سنایا کہ "بھیڑ' بکری' گائے' گھوڑا' پرند اور آبادی اور جنگل کی نباتات سب انسان کی خوراک ہیں" اور یہ کہ "جانور اور غلہ انسان کی روزمرہ کی خوراک ہیں اور سب کے سب یدنیہ کا مصالحہ ہیں" اور اس کے بعد وید کے حوالہ سے اس کو بتایا کہ آبادی کے جانوروں میں سے گائے' بکری' انسان' گھوڑا' بھیڑ' خچر' گدھا اور جنگل کے جانوروں میں سے شیر' چیتا' سور' بھینس' ہاتھی' ریچھ اور بندر' یہ چودہ جانور قربانی کے لیے منتخب کئے گئے ہیں۔

گائے کی قربانی ہندومت کی تعلیمات کے مطابق اس کے عہد زریں میں جائز سمجھی جاتی تھی اور یوگ دھرم کے ماننے والے اس پر جو اعتراض کرتے تھے' ان کو ویدوں کے محافظ علماء سختی کے ساتھ ٹھکرا دیتے تھے۔ صرف راجہ نہوشہ ہی نہیں' بلکہ ہمیں اس زمانہ کی تاریخوں میں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ مدھوپرکہ یعنی مہمانوں کی ضیافت میں جس پر قربانی کرنے والے کو ویدوں نے ناجی قرار دیا ہے' گائے اور بیل کا گوشت ایک لازمی جزو تھا اور ایسے موقع پر گائے ذبح کرنا مہمانوں کی عزت افزائی سمجھی جاتی تھی' اس لیے تمام بڑے بڑے راجہ اور رشی مدھوپرکہ کے ساتھ ذبیحہ گاؤ کا التزام کیا کرتے تھے۔ راجہ جنکہ نے شوک آچاریہ کی ضیافت میں گائے پیش کی' راجہ ارجن نے پولتی رشی کے حضور میں مدھوپرکہ مع گائے کے پیش کیا' یودھشٹر نے نارد رشی کو گائے کی ضیافت دی اور راجہ جراسندھا نے اپنے مہمانوں کو گائے کی دعوت دی' پرہلاد راجہ نے رشی سودھنوں کی خدمت میں ایک موٹی تازی گائے مدھوپرکہ کے ساتھ پیش کی' راجہ جنمے جیا نے دیاس مہاراج کو گائے کے ساتھ مدھوپرکہ پیش کیا۔ انتی دیو راجہ کے باورچی خانہ میں

روزانہ دو ہزار گائیں کٹتی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنی گائیں کاٹیں کہ ان کے خون سے ایک ندی بہ گئی جس کا نام چرمن وتی رکھا گیا اور وہ بے حد متبرک سمجھی گئی حتیٰ کہ اسے گنگا کا مرتبہ دیا گیا۔ کالی داس نے انہی قربانیوں کی وجہ سے انتی دیو کی بہت تعریف کی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ:

> ”تم بھی آگے بڑھنا اور انتی دیو کی اس بڑی نیک نامی کی عزت میں سر جھکا دینا جو گائے کی قربانی کرنے کی وجہ سے دینا میں پھیلی اور اب بھی بہتی ہوئی ندی پر من وتی کی صورت میں موجود ہے“۔

ان کھشتری راجاؤں کے علاوہ برہمنوں اور ہندوؤں کے مقدس بزرگوں نے بھی گائے کی قربانی کی ہے۔ والمیکی مہاراج کے آشرم میں **وششٹھ** مہاراج آن کر اترے اور والمیکی نے ان کی ضیافت میں گائے ذبح کی۔ اس پر ان کے ایک شاگرد ڈنڈانیہ نے اعتراض کیا، تو ایک دوسرے شاگرد سوگھانکی نے اس دھرم شاستر کا یہ حکم پڑھ کر سنایا کہ:

”معزز مہمان کے لیے مدھوپرکہ کے ساتھ جوان گائے کا گوشت ضرور ہونا چاہیے“۔

رامائن میں لکھا ہے کہ ”رام مہارج نے متواتر شومیدھ اور واجپی نامی قربانیاں کیں جن میں بہت دولت خرچ کی۔ ان کے علاوہ گشومہ اور گوسو (گائے کی قربانی) بھی کی اور اس میں بہت دولت لٹائی“ خود سری کرشن کے متعلق ثابت ہے کہ ایک مرتبہ ایک بیل نے ان پر حملہ کیا، تو انہوں نے اسے پچھاڑ کر اس کا سینگ نکال لیا اور اسی سے اس کو مار ڈالا۔

دیوتاؤں کو بھی گائے کا گوشت بہت پسند تھا۔ چنانچہ اندر اور اگنی ایک مرتبہ باز اور کبوتر بن کر دنیا میں اترے۔ زمین پر پہنچتے ہی باز کبوتر پر جھپٹا۔ کبوتر نے بھاگ کر رشیبی راجہ کی گود میں پناہ لی۔ باز نے اسے پکڑنا چاہا، مگر راجہ نے اسے منع کیا۔ باز نے کہا کہ جہاں پناہ، قدرت نے کبوتر ہی میرے لیے خوراک مقرر کی ہے، اس کو روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس پر راجہ نے کبوتر کی جان بچانے کے لیے اس کو جواب دیا کہ میں گائے یا بیل کا پلاؤ پکوا کر اور کچا گوشت بھی جہاں تو کہے تیرے لیے پہنچوا سکتا ہوں۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوا کہ گائے کا گوشت پکوانا جائز تھا، بلکہ یہ بھی ثابت ہوا کہ اندر نے اس کے لالچ میں اپنے مخالف اگنی کو چھوڑ دیا۔

وید پرست آریوں کے ہاں قربانی گاؤ کی اتنی عظمت تھی کہ وہ بڑے سے بڑے ثواب کے کام کو گائے کی قربانی سے تشبیہ دیتے تھے۔ انوپردہ میں لکھا ہے کہ:

> "جو کوئی آٹھویں دن خشکہ کھا کر ایک سال گذار دے اس کو گائے کی قربانی کے برابر ثواب ملتا ہے"۔

بودھشٹر نے ۔ بھیشمہ سے پوچھا کہ بزرگوں کے شرادھ (یعنی فاتحہ) میں کونسا کھانا ایسا ہے جس کا ثواب جاری رہتا ہے جواب میں اس نے بہت سے کھانوں اور گوشتوں کی تفصیل بتائی اور اس میں گائے کے گوشت کا ثواب ایک سال بتایا۔ منو نے بھی اپنی شاستر میں گئوماس کا ثواب ایک سال بتایا ہے۔ دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں گائے کے گوشت کی فضیلت منو کے اس قول سے معلوم ہوتی ہے:

> "گائے کے گوشت، دودھ اور دودھ کی تیار کی ہوئی چیزوں کا ثواب ایک برس رہتا ہے اور گوشتوں کی تفصیل یہ ہے۔ مچھلی دو ماہ، ہرن تین ماہ، مینڈھا چار ماہ، پرند پانچ ماہ، بکرا چھ ماہ، چیتل سات ماہ، اینہ ہرن آٹھ ماہ اور دہرن نو ماہ، سور اور بھینس دس ماہ، خرگوش اور کچھوا گیارہ ماہ، سرخ رنگ کا بکرا، مہاشلکہ مچھلی اور جنگلی غلان کا ثواب جاری رہتا ہے"۔

ایسے زبردست دلائل و شواہد کو پیش کرنے کے بعد لائق مصنف نے لکھا ہے کہ گائے کی قربانی ہندوؤں کی عبادات و فرائض میں ایسا اہم فریضہ ہے، تو کیا وجہ ہے کہ وید پر ایمان رکھنے والے تمام ہندوؤں نے اسے چھوڑ رکھا ہے اور اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کی تحقیق یہ ہے کہ جب تک وید پر عمل ور آمد کرنے والے کشتریوں کا دور دورہ رہا، قربانی کا فرض بڑے ذوق وشوق سے انجام دیا جاتا رہا اور کھلا منی کا سنیاس اس کی انتہائی مخالفت کرنے پر بھی اسے مٹا دینے میں کامیاب نہ ہو سکا، مگر جب دوار یگ کے آخری ایام میں سری کرشن نے وید پرستوں کو سنیاس سے روشناس کرایا اور کشتریوں کو یوگ کی تعلیم دی، تو اگرچہ اول اول ویدک دھرم کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا، لیکن بعد میں یوگ دھرم ویدک دھرم پر غالب آتا چلا گیا۔ ہندوؤں میں سے قربانی کی روح فنا ہوگئی اور یوگ کی خشکی، مایوسی، بے لطفی اور ترک و تجرید نے ہندو قوم کے دل کو کچھ ایسا سرد کر دیا کہ اس

میں گرمی عمل کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ یہ سردی راجہ یودھشٹر کے عہد سے شروع ہو گئی تھی جو دواپر یگ کے اخیر اور کل یگ کے آغاز میں حکمران تھا۔ ویدوں کا جو احترام اور قربانی کا جو ذوق راجہ دشرتھ کے دل میں نظر آتا ہے وہ یودھشٹر کے دل میں بالکل نظر نہیں آتا اور اس کے بعد آنے والے، تو اس سے قطعاً عاری نظر آتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں مصنف نے جو دلائل پیش کئے ہیں، وہ ہندوؤں کی مستند ترین مذہبی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور ان میں کہیں اپنے ذاتی خیالات اور بے دلیل قیاسات کو دخل نہیں دیا ہے۔ پس اگر تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر ان کا مطالعہ کیا جائے، تو ہر شخص آسانی کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ہندو مذہب میں قربانی کی کیا حیثیت ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے جناب مصنف نے اس کتاب کو کسی متعصبانہ نقطہ نظر سے نہیں لکھا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ گاؤ کشی کے مسئلہ میں برادران ہنود کے خلاف اس کتاب کو ایک کارگر ہتھیار کی حیثیت سے پیش کریں اور نہ ان کی کسی عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ گائے کی عظمت و تقدس کے متعلق ہندوؤں کے جذبات کا استخفاف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مدعا اگر کچھ ہے، تو وہ صرف یہ کہ ہندوؤں کے حق پسند اور سنجیدہ طبقہ کے سامنے مسئلہ گاؤ کشی کو سیاسی اور غیر مذہبی آلائشوں سے پاک کر کے انہی کے مذہب کی خالص تعلیمات کی روشنی میں پیش کریں اور پھر ان کی عقل و بصیرت کو اس حقیقت صادقہ کی طرف متوجہ کریں کہ جب ایک چیز کی تمہارے مذہب میں کوئی اصل ہی نہیں ہے، تو اس پر ضرورت سے زیادہ زور دینا اور اس کی خاطر ۳۳ کروڑ انسانوں کے مستقبل کو خطرات میں مبتلا کر دینا کسی طرح شیوہ دانائی نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس نقطہ نظر سے ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ "ہندو دھرم میں یدنیہ" کا مطالعہ کرے گا، تو اس کے خیالات میں بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔

* حجاز کے لئے ایک وفد

حجاز کے متعلق جدید افواہوں نے ملک میں جو تشویش پیدا کر دی ہے، اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ ہمارے قابل اعتبار اور با اثر نمائندے جلد سے جلد حجاز بھیجے جائیں اور وہ کچھ عرصہ تک وہیں رہ کر نجدیوں کی نقل و حرکت اور ان کی فوجی و انتظامی کارروائیوں

کی نگرانی کرتے رہیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں ہر قسم کے گمراہ کن پروپیگنڈا کا سدباب ہوجائے گا اور دوسرے یہ کہ ہمارے بااثر نمائندے نجدیوں کو اعتدال و رواداری کی تلقین کرکے ایسی باتوں کے وقوع کو روک سکیں گے جو عام مسلمانوں کے لئے باعث دل آزاری ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں شور مچانے اور نفرت انگیز پروپیگنڈا کا توڑ کرنے سے یہ کام بدرجہا زیادہ مفید ہے اور خود اس مقصد کے حصول میں بھی کارآمد ثابت ہوسکتا ہے جس کے لئے ہمارے ملک کے ایک طبقہ نے شدید ہنگامہ برپا کررکھا ہے۔ مولانا ظفرعلی خان اور مولانا محمد عرفان صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ذاتی طور پر حجاز تشریف لے جانے کے لئے تیاریاں شروع کردیں لیکن ہمارے خیال میں ضرورت ہے کہ اس سفر کے لئے ان حضرات کو بھی دعوت دی جائے جو مخالفین ابن سعود یا حامیان شریف کے معتمد علیہ ہیں۔ تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے تمام حالات کا مطالعہ کرکے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں اور اگر ممکن ہو تو نجدیوں پر اپنا نقطہ نظر واضح کرکے اپنے مسلک کی کوئی عملی خدمت انجام دے سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گرمی کا زمانہ ہے۔ بحری سفر کی تکلیفیں اور پھر ریگستان عرب کی صعوبتیں بہت صبر آزما ہیں اور ہندوستان کی آرام طلب زندگی چھوڑ کر وہاں جانا مشکل ہے، مگر ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ یہاں اپنے عافیت کدوں میں بیٹھ کر شور محشر برپا کرسکتے ہیں۔ ان میں اپنے مقصد اور مذہبی جذبات کے لئے تکلیفیں برداشت کرنے کی قوت کہاں تک موجود ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مجلس عاملہ خلافت اپنے آئندہ اجلاس میں ان حضرات سے ضرور درخواست کرے گی کہ اپنا ایک نمائندہ اس کے وفد میں شامل کردیں۔

✱ مولانا عبدالحلیم صدیقی کی تصریحات

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ حضرت مولانا عبدالحلیم صدیقی کا وہ مضمون درج ہے جو آپ نے مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب گنگوہی کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ مولانا گنگوہی صاحب کے مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شریفی ایجنٹوں نے نجدیوں کے خلاف جو گمراہ کن بیانات شائع کئے ہیں ——— انہوں نے بہت سے

ناپختہ ذہن کے لوگوں کو گمراہ کر دیا اور وہ کم از کم اس حد تک ضرور متاثر ہو گئے ہیں کہ نجدیوں میں کفر کی خصوصیات کو ممکن سمجھ کر ان کے متعلق متعصبانہ سوالات کرتے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے ان کے جواب میں جن امور کی تصریح کی ہے وہ بہت قابل غور ہیں۔ ان سے ہر شخص اندازہ کر سکے گا کہ نجدیوں کی اصلی حالت اور اس حالت میں جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے کتنا عظیم فرق ہے اور شریفی حضرات نے مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے کس قدر کذب و افتراء سے کام لیا ہے۔ صرف یہی ایک چیز ہے کہ جس کو دیکھ کر اہل نظر شریفی مقدمہ کے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں یا ناحق پر۔ ان کا صداقت و راستبازی کو چھوڑ کر جھوٹ اور افتراء کو آلہ کار بنانا صاف طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ خود ان ہی کے دل میں چور ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کمزور مقدمہ جھوٹ کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

* مولانا عبدالباری صاحب کی تصریح

مولانا شوکت علی صاحب کے جواب میں جناب مولانا عبدالباری صاحب نے جو تصریح شائع کی ہے اسے ہم نے غور سے مطالعہ کیا۔ اس پر اظہار رائے کا حق تو خود مولانا شوکت علی صاحب ہی کو ہے لیکن ہم ان کے ہم خیال اور مؤید ہونے کی حیثیت سے کم از کم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اب تک مسئلہ حجاز کے متعلق مولانا اور ان کی جماعت کے مسلک پر جتنی نکتہ چینی کی گئی ہے وہ قطعاً ذاتی مخالفت پر مبنی نہیں ہے جس کا مولانا کو شبہ ہے۔ بلکہ محض اختلاف رائے تک محدود ہے اور اس اختلاف رائے کی حقیقت بھی یہ ہے کہ ہمارے اور مولانا کے مقصد میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حرمین شریفین کی تطہیر ارض حجاز کی حفاظت شعائراللہ کی تعظیم اور سکان حرمین شریفین کی فلاح و بہبود کے مقصد شریف میں ہم اور وہ کلیتہ" متحد ہیں۔ البتہ اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ صرف طریق عمل کا ہے اور وہ ایسا اختلاف ہے کہ اگر سنجیدگی و فراخدلی سے اس پر بحث و تمحیص کی جائے تو اس کا دور ہونا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مسئلہ حجاز میں مولانا کا مسلک تو یہ ہے کہ وہ ابن سعود کو فریقانہ تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے خلاف نفرت پھیلا کر ہر قسم کی مفاہمت کو ناممکن بنا دیتے ہیں لیکن ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ بین

الاسلامی معاملات میں ہم کو فرقہ بندی کے تعصبات سے بالکل پاک ہونا چاہیے۔ ابن سعود خواہ "وہابی" ہو یا حنفی یا شافعی۔ اگر وہ افہام و تفہیم، صلح و مصالحت اور رائے عامہ کی قوت سے اپنے تصلب کو چھوڑ دے، مسلمانوں کے عام جذبات کا پاس کرے اور حجاز میں اسلامی مصالح کی حفاظت کا ذمہ لے تو ہمیں اس کے ساتھ محض اس وجہ سے کوئی عناد نہ ہونا چاہیے کہ وہ کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دنوں مسلکوں میں جو کچھ فرق ہے وہ ظاہر ہے ہر معقول آدمی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسی راہ سیدھی ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر خود مولانا موصوف بھی فریقانہ تعصب سے خالی الذہن ہو کر ان پر غور کریں گے۔ تو انہیں ہمارے مسلک کے صحیح ہونے میں کوئی تامل باقی نہ رہے گا۔

* بہتان و افتراء کا طوفان

{ ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۵ء }

اس سے پہلے حضرت مولانا شوکت علی صاحب کے نام مدینہ طیبہ سے جو تار آیا تھا وہ قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ اب وہیں سے ایک اور تار آیا ہے جو اس سے زیادہ طویل ہے اور اس پر سید محمود احمد فیض آبادی اور سید احمد فیض آبادی کے علاوہ چند اور آدمیوں کے بھی دستخط ہیں۔ جن میں دو تین مدنی حضرات کے سوا باقی سب دمشقی یا بغدادی ہیں۔ اس تار میں بھی انہی الزامات کا اعادہ کیا گیا ہے جو پچھلے تار میں نجدیوں پر عائد کئے گئے تھے اور مزید برآں اس مسئلہ پر نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے کہ نجدی لوگ قطعاً کافر، گمراہ اور دشمن اسلام ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ حجاز میں دو اسلامی جماعتوں کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے۔۔ بلکہ انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ مدینہ پر جس جماعت نے حملہ کیا ہے وہ بالکل کافر ہے اور اس نے کلمہ توحید میں تحریف کر کے لا الہ الا اللہ مالک یوم الدین کا جدید کلمہ جاری کیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب قبلہ نے اس قسم کے تاروں کے متعلق جو شبہات پچھلی اشاعت میں ظاہر فرمائے تھے وہ ان کی حقیقت کو خوب ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کے علاوہ ایک اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان برقی خبروں کا اصلی منبع کون ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ

سید محمد احمد فیض آبادی یا دوسرے حضرات اپنی ذات سے اتنے طویل و عریض تار نہیں بھیج سکتے۔ دونوں تاروں میں تقریباً ایک ہزار الفاظ ہیں۔ جن پر اگر بحری تار کی کم سے کم فیس ڈہائی روپے فی لفظ لگائی جائے تو ڈھائی ہزار روپیہ صرف ہوا ہوگا اور اگر مان لیا جائے کہ یہ تار ہندوستان میں صرف دس پتوں پر آئے ہیں تب بھی ان کا مجموعی خرچ ۲۵ ہزار روپیہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جسے معمولی مہاجرین تو کیا' اچھے خاصے رئیس بھی برداشت نہیں کرسکتے پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مدینہ طیبہ محصور ہے۔ تمام کاروبار بند ہیں اور لوگوں کو اس لئے تنگی و عسرت میں مبتلا کردیا گیا ہے کہ وہ مجبور ہوکر اپنے آپ کو حوالہ کردیں تو یہ بات اور بھی خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ تار بازی چند لوگ اپنی ذات سے کررہے ہونگے۔ ایسی حالت میں یہ یقین کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ سب امیر علی کا پروپیگنڈا ہے اور وہ محض اپنے حریف کو مسلمانوں میں مبغوض و مردود بنانے کے لئے افترا و بہتان کا یہ طوفان برپا کررہا ہے۔

سفر حجاز کی وبا

{ ۲۲ر ستمبر ۱۹۲۵ء }

جب سے مولانا ظفر علی خان نے مدینہ منورۃ جانے کا اعلان کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں حجاز جانے کی ناقابل ضبط خواہش پیدا ہو رہی ہے اور جس کا جی چاہتا ہے، بے تکلف اعلان کر دیتا ہے کہ میں بھی مدینہ جاؤں گا۔ یہ ایسی انارکی ہے جس نے ہماری اکثر قومی تحریکات اور مفید تجاویز کو برباد کیا ہے اور اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ اس وفد حجاز کی تجویز کو بھی نقصان پہنچائے گی۔ یہ ملوک الطوائف نہ حجاز پہنچ کر کوئی مفید کام کر سکیں گے اور نہ ہندوستان واپس آکر، دس منہ ہوں گے اور دس باتیں ہوں گی۔ سلطان ابن سعود جو ایک خالص عملی آدمی ہے ان کی متضاد باتوں سے نہایت برا اثر لے گا اور خود ہندوستان کے متعلق بھی اس کی رائے خراب ہو جائے گی۔ اسی طرح ہندوستان میں جب یہ لوگ اپنے نتائج تحقیق الگ الگ بیان کریں گے تو ان کے متضاد بیانات سے افتراق کا فتنہ فرد ہونے کی بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھے گا۔ پس ضرورت ہے کہ یہ محسنان قوم ذرا اپنے شوق سفر کو قابو میں رکھیں اور مجلس عمل اور خلافت کمیٹی کے نمائندگان حجاز جانے دیں۔

* وفد حجاز

بہار میں مرکزی خلافت کمیٹی کی مجلس عاملہ کا جو جلسہ ہو رہا ہے اس کی اہم ترین تجاویز میں سے ایک وفد حجاز کی تجویز ہے۔ بلاد مقدسہ کی جنگ اب بحر احمر اور بحر ہند کو عبور کر کے ہمارے ملک کی بدقسمت ملک تک بھی پہنچ گئی ہے اور جہالت وناواقفیت کی تاریکی میں مسلمانوں کے دو فریق اس طرح گتھ گئے ہیں کہ جیسے مسئلہ حجاز کا تصفیہ یہیں ہونے والا ہے۔ اس حالت کی اصلاح کرنے کے لئے ہمیں ایک ایسا نمائندہ وفد بھیجنے کی ضرورت ہے جو ایک طرف تو حجاز کے صحیح حالات کی تحقیق کر کے تمام ہندوستان (باستثنائے چند اہل غرض) مطمئن کر دے اور دوسری طرف اس فتنہ کے سدباب کی کوشش کرے جو تاریخ اسلام کے اس نازک دور میں مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کا بچا کھچا شیرازہ بھی منتشر کر رہا ہے لیکن اس مرتبہ ہم کو اس غلطی کا اعادہ نہ کرنا چاہیے جو پچھلے دو وفود کی

ترتیب میں ہم کر چکے ہیں۔ ہمارا موجودہ وفد تمام مختلف **الخیال** جماعتوں کے نمائندوں سے مرکب ہونا چاہیے اور خصوصیت کے ساتھ اس میں ان لوگوں کی شرکت نہایت ضروری ہے جن کے اطمینان پر موجودہ شورش کے اصلی عناصر کا اطمینان منحصر ہے۔ ہمیں ان کو اپنے وفد میں شرکت کی دعوت دینی چاہیے اور انہیں صاف طور پر بتلا دینا چاہیے کہ ہندوستان میں بیٹھکر خواہ مخواہ جلسوں اور تاربازیوں میں وقت ضائع کرنا اور مسلمانوں میں باہمی منافرت و افتراق کو ترقی دینا نہ تو اس فتنہ کو فرو کرسکتا ہے جو حجاز میں برپا ہے نہ اسلام یا مسلمانوں کے لئے کسی طرح مفید ہو سکتا ہے۔ اگر فی الحقیقت آپ حجاز کے موجودہ حالات میں اپنے نقطہ نظر کے مطابق اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو فساد کے اصلی موقع پر پہنچئے۔ صحیح حالات کا مطالعہ کرکے صحیح رائے قائم کیجئے اور پھر سوچئے کہ ایسے حالات میں اصلاح کے لئے کس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ ایسا مشورہ ہے کہ اس کو ہر وہ شخص خوشی کے ساتھ قبول کرے گا۔ جو ایمانداری کے ساتھ سرزمین حرم میں اصلاح چاہتا ہے۔ اور خود ہم کو بھی یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ موجودہ شورش میں کون لوگ ہیں جن کا مدعا فتنہ پردازی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

☐ مسلم آؤٹ لک اور ہم

ہمارے لاہوری ہمعصر مسلم آؤٹ لک نے اپنے ۲۰ر ستمبر کی اشاعت میں جمعیت علماء ہند کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا بہترین جواب تو جناب مدیر نکات اور لطائف ہی دیں گے۔ کیونکہ اس کے اعتراضات کا محرک اصلی انہی کا ایک نوٹ تھا مگر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نے تحریک تنظیم کے متعلق ہماری پالیسی کو جس غلط پیرایہ میں پیش کیا ہے اس کی اصلیت کو واضح کردیں۔

مسلم "آؤٹ لک" کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں عدم شرکت کے لئے جو عذر جمعیت کی جانب سے پیش کیا گیا تھا وہ ایک بناوٹی عذر تھا اور یہ کہ درحقیقت اسے تحریک تنظیم سے دلی عداوت ہے جسے اول اول چھپایا گیا تھا۔ اس قسم کی بدگمانی سے ہمارے ہمعصر نے دراصل اپنی نفسی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ ورنہ خدا کا شکر ہے کہ جمعیت علماء ہند اور اس کے ارکان اس قسم کی منافقت سے بالکل بری ہیں۔ ان کو

تحریک تنظیم سے نہ کبھی اختلاف تھا اور نہ اب ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اس کے مقاصد کی تائید کی۔ البتہ ان کو جس چیز پر اعتراض ہے وہ اس کے محرکین کی ہمہ گیری ہے جس نے اسے ایک قسم کا اضحوکہ بنادیا ہے۔ ڈاکٹر کچلو اور ان کی موید ین کو تنظیم کرنے سے کوئی منع نہیں کرتا اور ہر مسلمان کی یہ دلی آرزو ہے کہ ہماری قوم میں ایک مخلص جماعت اس فرض کو انجام دینے کے لئے مستعد ہو جائے مگر ان کو یہ افسوسناک غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ایک آل انڈیا لیڈر کو ہمیشہ "آل انڈیا تحریک" ہی شروع کرنی چاہیے۔ حالانکہ تحریک تحریک میں فرق ہوتا ہے۔ ایک ہیجانی تحریک کو تو چند جوشیلے اور سرگرم لیڈر تمام ملک میں پھیلا سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایسی ٹھوس تعمیری تحریک کو جیسی کہ تنظیم ہے پورے ملک تو کیا پورے صوبہ بلکہ ایک پورے ضلع میں بھی کامیاب بنانا برسوں کی عرق ریزیاں اور ان تھک کوششیں چاہتا ہے۔ پس اگر ڈاکٹر کچلو پر ہم نے کبھی کوئی اعتراض کیا ہے تو اس کا مدعا صرف یہ مخلصانہ رائے دینا تھا کہ آپ ہمہ گیری کے خیال کو ترک کر کے اپنی عملی کوششوں کا دائرہ ایک ایسے رقبے تک محدود رکھیے۔ جس میں تنظیم کے پروگرام کو آسانی کے ساتھ کامیاب بنایا جاسکتا ہو۔ آپ کے سامنے خود آپ کا گھر موجود ہے۔ سب سے پہلے اس کی تنظیم کر کے اپنے عمل کا ایک مکمل نمونہ پیش کیجئے اور اس کے بعد ضلع امرتسر آپ کی توجہ کا پہلا مستحق ہے اور پھر صوبہ پنجاب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کی زرخیز زمین میں آپ اپنے اعمال حسنہ کی تخم ریزی کریں مگر یہ کیا ستم ہے کہ ان کا مرکز امرتسر تو تنظیم کی برکات سے بالکل محروم ہے اور وہ اس کا ضلع نہیں، کمشنری نہیں، صوبہ نہیں، بلکہ بیچ میں ایک اور صوبہ چھوڑ کر دور دراز کے صوبہ بہار کو تنظیم کی دعوت دینے کے لئے چلے جا رہے ہیں۔ آخر یہ سامان مضحکہ نہیں تو اور کیا ہے۔

* مسلمانوں کی غیرت ملی پر ایک شدید حملہ

انگریزی اخبارات اور کتابوں میں اکثر اوقات اس قسم کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو اس قوم میں جو بد قسمتی سے ہم پر حکمران ہے شرافت کا اتنا احساس ہی نہیں ہے کہ اپنی دس کروڑ اسلامی رعایا کے مذہبی احساسات کا احترام کرے یا وہ باوجود ادعائے علم کے اس قدر جاہل ہے کہ مدتوں سے ہم پر حکومت

کرنے اور ہم سے میل جول رکھنے کے باوجود ہمارے مذہبی جذبات کو آج تک نہ سمجھ سکی۔ اس قسم کی دل آزار تحریروں پر مسلمانان ہند نے سینکڑوں مرتبہ احتجاج کیا ہے اور بعض اوقات تو ان کے جوش سے ہنگاموں تک نوبت پہنچ گئی ہے مگر اس پر بھی بعض وہ انگریز جن کے خمیر میں شرافت و انسانیت کا عنصر شامل ہی نہیں ہے اپنی کمینہ حرکات سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ حال ہی میں مسلمانان عالم کے دل و جگر پر ایک اور خنجر چلایا گیا ہے۔ جس کے تصور سے ہر مومن صادق کی آنکھیں خون رونے لگتی ہیں۔ یہ ایک کارٹون ہے جسے انگلستان کے مصور باتصویر اخبار "اسٹار" نے اپنی ۱۸ اگست کی اشاعت میں شائع کیا ہے۔ اس کے بیچ میں ایک شخص ہابس نامی کی بہت بڑی تصویر دی گئی ہے جو آج کل کرکٹ کے کھیل میں بہت مشہور ہو رہا ہے۔ اس کے اردگرد ایک طرف چارلی چپلن جولیس سیزر حضرت آدم علیہ السلام کی اور دوسری طرف لائڈ جارج اور رسول کریمؐ کی تصویریں اس پوزیشن سے بنائی گئی ہیں کہ یہ سب لوگ ہابس کی شہرت پر انگشت بدنداں ہیں اور حیرت کر رہے ہیں کہ یہ شخص کیونکر ہم سب پر فضیلت لے گیا۔

اللہ اکبر آج ہماری ذلت اس حد کو پہنچی ہے کہ ایک ادنیٰ درجہ کا انسان جس کا مایہ ناز صرف یہ ہے کہ اسے کھیلنا اچھا آتا ہے، ہمارے پیغمبروں سے زیادہ افضل سمجھا جاتا ہے اور ایک انگریز کو اس کی قدر افزائی کے لیے ان مقدس ہستیوں کے سوا اور کوئی شخصیت نہیں ملتی جن کے نقش پا کو بھی ہم کائنات ارضی سے زیادہ محترم سمجھتے ہیں۔ ہمارے مذہبی احساسات کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے کہ جن پاک نفوس کو ہم اپنا ہادی و پیشوا مانتے ہیں ان کو چارلی چپلن جیسے مسخرے اور لائڈ جارج جیسے مکرو دغا کے پتلے کے برابر جگہ دی جاتی ہے اور انہیں ایک کھلاڑی کے اردگرد کھڑا کیا جاتا ہے کہ اس کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کریں۔ یہ درحقیقت ہماری ایمانی غیرت اور دینی حمیت پر ایک شدید حملہ ہے اور کوئی شخص جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان موجود ہو۔ اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے خلاف محض ملی احتجاج اور زبانی اظہار رنج و غم کافی نہیں ہے۔ ہمیں سختی کے ساتھ حکومت برطانیہ سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنی مملکت میں ہمارے مذہب کی ایسی شدید اہانتوں کا سدباب کرے، ورنہ ہمارے لیے اس قسم کی اشتعال انگیزیوں پر قانون کے دائرہ میں رہنا محال ہو جائے گا۔

اس ناپاک کارٹون کے متعلق لندن کی احمدی جماعت نے جس مستعدی کے ساتھ مسلمانون کی وکالت کی ہے وہ قابل تحسین ہے اور اس حدیث شریف کی تصدیق کرتی ہے کہ **ان اللہ لیوید الدین برجل فاجر** اس کے صدر جناب عبدالرحیم صاحب درد ایم اے نے ایک نہایت پر زور عرض داشت ہز میجسٹی کے وزیر داخلہ کے پاس بھیجی ہے جس میں انہوں نے انگلستان، ہندوستان اور مصر و افریقہ کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "رسول اکرم حضرت محمد ﷺ کی ذات مقدس مسلمانوں کی نگاہوں میں سب سے زیادہ محترم ہے۔ آپ کی محبت اور وہ عزت و وقعت جس سے مسلمان آپ کو یاد کرتے ہیں، رنگ، نسل اور قومیت کے تمام حدود سے گزر کر جمیع مسلمانان عالم کے دلوں پر یکساں حاوی ہے۔ دنیا کی تمام موجودات میں جو چیز مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ مقدس ہے وہ ان کے رسول برحق کی ذات بابرکات ہے اور اپنے رسول ﷺ کی حرمت پر مسلمانوں کے عورت، مرد، بچے، بوڑھے سب اپنی جان و مال فدا کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ ایک مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر اپنے عَزیز و محبوب آقا کی حرمت پر کسی ضعیف سے حملہ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جناب والا خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کارٹون کی چند در چند اہانتوں سے مسلمانوں کے قلوب میں کیسے سخت جذبات غیظ و غضب پیدا ہوں گے۔ الفاظ پوری طرح اس کی تشریح نہیں کر سکتے۔ غور تو کیجئے کہ سلطان السلاطین، دنیا کا بے نظیر روحانی پیشوا، قدرت الٰہی کا مکمل ترین نمونہ، تمام دنیا کا مطمح انظار اور رحمتہ اللعالمین ایک اخبار میں اس اندازَ سے پیش کیا جاتا ہے کہ ایک خونی دیوتا کی طرح تلوار اس کے ہاتھ میں ہے اور ایک کھلاڑی کی شہرت پر متحیر کھڑا ہے! اس سے زیادہ ذلیل مصوری کا نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایک اخبار کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا شرمناک حرکت ہو سکتی ہے کہ وہ ایک قوم کے مذہبی احساسات سے اس طرح تلاعب کرے۔ یہ اخبار نویسی کے لیے ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ کیا ایک کرکٹ کھیلنے والے کی قدر افزائی ایک ایسی

> متبرک ہستی کی ذات پر حملہ کئے بغیر کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ جسے عالم انسانی کے بہترین مذہبی مصلحوں کی اولین صف میں جگہ دی جاتی ہے۔ یقیناً یہ شخصیتوں کے تقابل کی نہایت کمینہ اور ذلیل منظر کشی ہے۔ میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ جناب عالی کو اس شدید نفرت اور غصہ کی طرف توجہ دلاؤں جو یہ کارٹون ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک میں پیدا کردے گا۔ جناب والا خود اس کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔ لہٰذا میں نہایت زور کے ساتھ اپنے ہادی برحق علیہ السلام کی اس سفلانہ توہین پر احتجاج کرتا ہوں اور جناب والا سے درخواست کرتا ہوں کہ اس نہایت اہم معاملہ کی طرف فوراً توجہ کیجئے اور ان مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لا کر دنیا میں ثابت کر دیجئے کہ انگلستان اپنی روایتی انصاف پسندی و غیر جانب داری پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے"۔

اس احتجاجی عرضداشت کا لفظ لفظ تائید کا مستحق ہے اور ضرورت ہے کہ تمام مسلمانان ہند بلکہ تمام سلطنت برطانیہ کے مسلمانان بالاتفاق اپنے نبی برحق کی اس شرمناک توہین پر سختی کے ساتھ احتجاج کریں۔ یہ دراصل مسلمانوں کی غیرت ملی کا امتحان ہے۔ اعدائے اسلام اس قسم کے حملے کرکے درحقیقت ہماری دینی حرارت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان حرکتوں سے ان کا مدعائے حقیقی یہ معلوم کرنا ہے کہ ہم میں اپنے مذہب کی حفاظت اور اپنے دین کی حرمت پر مرمٹنے کی کہاں تک قوت موجود ہے۔ پس ہر مسلمان کو اس امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنی چاہئے اور دنیا کو بتا دینا چاہئے کہ جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک اسلام اتنا ذلیل نہیں ہو سکتا کہ اس کے پیغمبر (ارواحنا فداہ) کو انگلستان کے کھلاڑیوں کے کمالات پر داد دینے کے لئے دعوت دی جائے۔

اس وقت خصوصیت کے ساتھ ہمیں دیکھنا ہے کہ ان لوگوں کی اسلامی غیرت بھی حرکت میں آتی ہے یا نہیں جو ابھی ابھی مدینہ منورۃ پر گولہ باری کی خبریں سن کر عشق رسول کے نعرے بلند کرتے ہوئے اپنے خلوت کدوں سے نکل آئے تھے۔ ابن سعود اور نجدی قبائل کے خلاف تو انہوں نے جو کچھ غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا اس میں محبت کے کسی فداکارانہ جذبہ کا مظاہرہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ میدان ہر قسم کے خطرات سے خالی تھا۔ البتہ اب ان کے لئے اپنے جوش عقیدت کے اظہار کا وقت آیا ہے اور ہم دیکھنا چاہتے

ہیں کہ وہ کس طرح ”اسٹار“ کے بدتمیز ایڈیٹر اور کارٹونسٹ کو اس اہانت کی سزا دیتے ہیں۔

❑ حضرت سلطان غازی

{ ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۵ء }

اشاعت گذشتہ میں یہ خبر دی جاچکی ہے کہ دہلی قدیم کے کھنڈروں میں حضرت سلطان ناصرالدین محمود رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے اہل و عیال کے مزارات کو جو ایک مصنوعی غار میں واقع تھے منہدم کردیا گیا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا کسی جنگلی جانور کا فعل نہ تھا۔ بلکہ موقع کے معائنہ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ کسی شقی و بدبخت جماعت نے ان خفتگان خواب راحت کو اذیت پہنچانے کے لئے قصداً یہ حرکت کی ہے۔۔ اس پر جتنی بھی لعنت و مذمت کی جائے کم ہے۔ جن لوگوں نے اس کا ارتکاب کیا ہے وہ انسانیت کے جوہر سے بالکل عاری معلوم ہوتے ہیں کیونکہ قبروں کو کھودنا اور اس دنیا کے لوگوں سے دشمنی و عداوت کی بناپر اس عالم کے لوگوں کو ستانا جہاں پہنچ کر انسان نہ کسی کے لئے باعث مضرت رہ سکتا ہے نہ موجب منفعت۔ یقیناً کسی شریف انسان کا کام نہیں ہوسکتا۔ ان بدبختوں نے صرف چند قبریں ہی منہدم نہیں کی ہیں بلکہ اپنے اس ناپاک فعل کے لئے اس مقدس ہستی کی قبر کو منتخب کیا ہے جس نے بیس برس تک ہندوستان کے براعظم پر اس شان سے حکومت کی تھی کہ ایک پیسہ خزانہ حکومت سے نہ لیا قرآن مجید لکھ لکھ کر اور ٹوپیاں سی سی کر ان کی اجرت سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا قوت لایموت حاصل کیا اور بادشاہی کے تخت پر بیٹھ کر ایسی متقیانہ زندگی بسر کی کہ کوئی بوریائے فقر پر بیٹھ کر بھی نہیں کرسکتا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ بادشاہ بجز چند متبرک نفوس کے اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتا اور اسی لئے مسلمان اسے بادشاہوں میں نہیں بلکہ اولیاءاللہ میں شمار کرتے ہیں۔ اس کی قبر پر یہ دست درازی مسلمانوں کے جذبات پر جراحت اور نمک پاشی کا حکم رکھتی ہے۔

بعض لوگ اس واقعہ کو بھی سنیت و وہابیت کا رنگ دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ علمائے اہل سنت کی جانب سے قبہ شکنی کی عالمگیر تائید کا نتیجہ ہے مگر ہمارے خیال

میں یہ بدگمانی محض سیاسی تعصب پر مبنی ہے ورنہ قبہ کو توڑنا اور قبر کو کھودنا دونوں میں نمایاں فرق ہے اور دونوں کے متعلق شریعت کے احکام بالکل مختلف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کے احترام کی سخت تاکید فرمائی ہے اور ان سے بے حرمتی کے برتاؤ کو منع کیا ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ایک شخص کو جوتے پہنے پہنے قبروں پر پھرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "یا صاحب السبتین القھما" اے جوتیوں والے ان کو اتار کر چل۔ عمرابن حزم کی روایت ہے کہ **رانی رسولؐ اللہ متکئاً علی قبر فقال لا تئوذوا صاحب ھذا القبر** یعنی حضور ﷺ نے مجھے قبر سے تکیہ لگائے دیکھا تو فرمایا کہ اس قبر والے کو تکلیف نہ دے۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ "**ان یجلس احدکم علی جمرہ فتحرق ثیابہ 'فتخلص الی جلدہ خیر لہ من ان یجلس علی قبر**" کسی مسلمان کا دہکتے ہوئے انگارے پر اس طرح بیٹھ جانا کہ اس کے کپڑے جل کر جلد تک داغ پہنچ جائے اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کسی قبر پر بیٹھے' قبر کے احترام کی ایسی سخت تاکید موجود ہوتے ہوئے اگر کسی اصطلاحی وہابی یا نام نہاد اہل حدیث نے ایسا ناپاک فعل کیا بھی ہو' تو وہ ہرگز اہل حدیث نہیں ہے کیونکہ کسی اہل حدیث کاتو درکنار کسی معمولی تہذیب و شرافت والے انسان کاکام بھی نہیں ہو سکتا۔

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی یہ مستعدی قابل تحسین ہے کہ انہوں نے مقامی حکام اور محکمہ آثار قدیمہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے ' ہمیں امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں مناسب اقدام کریں گے۔

* فتح مدینہ

الحمد للہ کہ جیران رسول کی مصیبت بھری فریادیں بارگاہ مستجاب الدعوات میں مقبول ہوئیں اور مدینہ طیبہ کا وہ طویل محاصرہ جو شریف خاندان کی احمقانہ ضد کے باعث ایک سال سے جاری تھا شریفی قوتوں کی شکست اور عساکر نجد کی فتح پر ختم ہو گیا۔ اہل مدینہ کے نام سے جو مصنوعی تار بعض اکابر ہند کے نام بھیجے گئے تھے ان میں نجدیوں پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ جب مدینہ میں داخل ہونگے تو تمام مسلمانوں کو کافر سمجھ کر قتل کردیں گے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنالیں گے اور تمام عمارات مقدسہ کو منہدم کردیں گے

لیکن اگر شیخ معمر نجدی کا بیان صحیح ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ صداقت کے چہرہ سے باطل کا حجاب اٹھ گیا۔ کیونکہ مدینہ طیبہ میں نجدی افواج پر امن انداز میں داخل ہو گئی ہیں اور انہوں نے جان و مال، اور عزت و حرمت سے ادنی تعرض کئے بغیر سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ افضل المساجد بعد المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ میں جاکر دوگانہ شکر ادا کیا۔ حالانکہ یہی وہ مسجد ہے جس کے متعلق مدینہ کے تلغراف میں یہ بے بنیاد دعوی کیا گیا تھا کہ اس پر تاک تاک کر اس طرح گولیاں برسائی جارہی ہیں کہ مؤذن اذان تک نہیں دے سکتا۔

اس فتح پر اہل مدینہ کی خوشی کا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نجدیوں کے مقابلہ میں ادنی سی مدافعت بھی نہیں کی، بلکہ شامی اطلاعات کے مطابق نہایت جوش کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور اظہار شادمانی کے لئے مسجد سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں روشنی کی ۔ اگر یہ صرف نجدی حکومت کا سرکاری بیان ہوتا تو ہم اسے زیادہ وثوق کے ساتھ پیش نہ کرتے مگر واقعہ یہ ہے کہ تمام آثار و قرائن اس کی تائید کرتے ہیں۔ شریف حسین اور اس کے خاندان نے مدینہ والوں کو جتنی مادی اور روحانی تکلیفیں پہنچائی ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ان کے جوئے سے آزاد ہونے پر مسرت و شادمانی کا اظہار کریں۔ ۴ سال تک زمانہ جنگ میں نہایت سخت محاصرہ رکھا یہاں تک کہ ۷۵ ہزار انسان موت یا مہاجرانہ بے کسی کی نذر ہو گئے پھر اس پر قبضہ ہوا تو بجائے اس کے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہمسایوں پر شفقت و رحمت کا برتاؤ کیا جاتا۔ ان سے اور زیادہ سختی کی گئی اور ان بے کسوں کی جو روٹی کپڑے تک سے محتاج تھے بھاری بھاری ٹیکس لگاکر خوب لوٹا گیا۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ آخری ایام میں اس مقدس شہر کا گورنر شریف شحاد جیسے شخص کو مقرر کیا گیا جو شیعی مسلک ہونے کے علاوہ نہایت بدکار زانی اور شراب خوار تھا۔ یہ سلوک تھا اس بدنام کنندگان آل ہاشم اور خاندان سادات کے کنعانوں کا اس شہر کے ساتھ جس کے متعلق سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا تھا کہ!

”الملینتہ خیرلکم و کلنوا یعملون اور ماعلی
الارض بقعتہ احب الی ان یکون قبری بھلمنھا“

پس اگر ان کے اخراج پر اہل مدینہ نے چراغاں کیا ہو تو کچھ زیادہ باعث تعجب نہیں ہے۔

* مسئلہ موصل

موصل پر انگریزی قبضہ بحال رکھنے کے لئے جو گہری چالیں چلی جا رہی ہیں۔ ان سے ترک ابتدا ہی سے واقف تھے اور اسی لئے کانفرنس میں انہوں نے اس اہم مسئلہ کو انجمن اقوام کے سپرد کرنے سے پس و پیش کیا تھا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ ایسی انجمن ان کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کر سکتی جسے چند سرمایہ دار سلطنتوں نے محض کمزور قوتوں کو مہذب طریقوں سے لوٹنے کے لئے قائم کیا ہو اور جس نے عراق شام اور فلسطین کو بلا کسی حق کے برطانیہ و فرانس کی سیادت میں دے دیا ہو۔ چنانچہ جب ان پر بہت زور دیا گیا۔ کہ مقدمہ موصل میں بین الاقوامی ثالثی قبول کر لو تو انہوں نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے صفائی کے ساتھ یہ کہہ دیا تھا کہ کوئی فریق انجمن کے فیصلہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ ہوگا۔ اس وقت انہیں جس بات کا محض اندیشہ تھا وہ اب ایک امر واقعہ کی صورت میں ظاہر ہو گئی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جینوا کی بین الاقوامی انجمن پوری طرح حق اور انصاف کا خون کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

اگرچہ ابھی تک انجمن نے اپنا فیصلہ صادر نہیں کیا ہے مگر اس کا فیصلہ جن معلومات پر مبنی ہوگا وہ موصل کمیشن رپورٹ کی صورت میں ہمارے سامنے آچکی ہیں اور انہیں دیکھتے ہوئے نہایت آسانی کے ساتھ پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ کیا فیصلہ صادر کرے گی۔ کمیشن نے صاف طور پر اعتراف کیا ہے کہ موصل پر ترکی کا قانونی دعویٰ نہایت مضبوط ہے اور اس کے مقابلہ میں عراق کسی طرح بھی اپنے قانونی حق کو پیش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ دبی زبان سے اقرار کرتا ہے کہ جہاں تک باشندوں کی رائے کا تعلق ہے وہ حکومت عراق کے حاکمانہ اثر سے متاثر تھی اور اگر وہ اثر نہ ہو تو یقیناً اہالی موصل کی ایک بڑی اکثریت ترکوں کی حمایت میں ہوگی، مگر باوجود اس کے کہ اس نے نہایت بددیانتی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ اقتصادی اور جنگی نقطہ نظر سے موصل عراق کا غیر منفک جزو ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص بے ایمانی کے ساتھ کسی کی چیز پر قبضہ کر لے اور یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس پر کوئی قانونی حق نہیں رکھتا۔ تب بھی محض اس بنا پر وہ اسی غاصب کے حوالہ کر دی جائے گی کہ وہ اس کے لئے مالی حیثیت سے مفید ہے۔ اگر عدل و انصاف کا یہی اصول دنیا میں رائج ہو جائے تو چوروں اور لٹیروں کے لئے

بسر اوقات کا اچھا سامان ہو جائے گا۔

لیکن یہ نہ سمجھیے کہ اس طریقہ سے کمیشن کے انصاف پسند ارکان نے دراصل عراق کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے۔ ایک عربی قوم کی حیثیت سے اس کی نظروں میں عراق اور ٹرکی دونوں یکساں ہیں اور اگر وہ اپنی اس مخصوص حیثیت سے موصل کا دعوی کرتا تو شاید کمیشن کو اسے مسترد کرنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہوتا۔ اس کو جس عراق سے ہمدردی ہے وہ دراصل عراق نہیں بلکہ برطانوی عراق ہے اور اس نے اپنے نتائج تحقیقات میں نہایت صفائی کے ساتھ یہ بات ظاہر کردی ہے کہ وہ موصل کو صرف اسی صورت میں عراق کے حوالے کرسکتا ہے کہ اس پر برطانوی تسلط بدستور قائم رہے۔ رپورٹ کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ عراق موجودہ حالت میں خود اپنے انتظام کی قابلیت بھی نہیں رکھتا اس لئے اگر برطانوی عراقی معاہدہ کو جس کے ختم ہو جانے میں ۴ سال کی مدت باقی ہے۔ مزید ۲۵ سال کے لئے نافذالعمل کردیا جائے تو موصل بدستور عراق کے ساتھ ملحق رہ سکتا ہے لیکن اگر یہ معاہدہ ۴ سال کے بعد ختم ہونے والا ہے' یا بالفاظ دیگر عراق سے برطانوی فوجیں ۱۹۲۹ء میں واپس آجائیں گی تو کمیشن کو اس بات کا یقین ہے کہ ایسی صورت میں الحاق کے فوائد نہایت نازک سیاسی مشکلات سے بدل جائیں گے اس لئے مناسب یہی ہے کہ علاقہ کو ترکی سیادت میں دے دیا جائے کیونکہ اس کی اندرونی حالت اور خارجی سیاسی پوزیشن عراق کے مقابلہ میں بہت زیادہ مضبوط ہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ موصل دراصل عراق کو نہیں بلکہ برطانیہ کو دیا جا رہا ہے اور عراق کی حیثیت ایک مفید آلہ کار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سارے معاملے کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو ہمیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ عراق اور موصل کو برطانوی اغراض کی دائمی غلامی میں رکھنے کے لئے ڈاؤننگ اسٹریٹ میں جو زبردست چالیں چلی جارہی ہیں۔ ان میں امیر فیصل کے ساتھ لیگ آف نیشنز کے ارباب حل و عقد بھی آلہ کار کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ کے مدبرین نے جس اعتماد پر مئی ۱۹۲۳ء کے پروٹوکول میں بے تکلف اعلان کردیا تھا کہ ترکی سے مصالحت ہوجانے کے ۴ سال بعد عراق سے برطانوی فوجیں ہٹالی جائیں گی۔ اس کا راز اب اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس وقت عراق کے مضطرب حریت خواہوں اور انگلستان کے

بے چین صلح پسندوں کو مطمئن کرنے کے لئے ایک ایسے اعلان کی ضرورت تھی اس لئے لندن اور بغداد میں اس کی اشاعت کردی گئی۔ مگر یہ اسی وقت طے کرلیا گیا تھا کہ اس اعلان کو عملی جامہ ہرگز نہیں پہنایا جائے گا۔ چنانچہ اب جو اس کی تعمیل کا وقت قریب آیا تو ان شاطروں نے فوراً اپنے دو مہروں کو بڑھا دیا جن میں سے ایک کہتا ہے کہ عراق کی تربیت ابھی مکمل نہیں ہوئی اس لئے موصل جو اس کا حق ہے اسے صرف اس شرط پر دیا جاسکتا ہے کہ وہ مزید ۲۵ سال تک برطانیہ کی نگرانی میں رہے اور دوسرا فوراً بول اٹھتا ہے کہ اگر ہمارا حق صرف اسی صورت سے مل سکتا ہے تو اس کی خاطر ہم بہرحال ۲۵ سال تک برطانوی سیادت کو قبول کرنے پر مجبور ہیں۔

ان چالوں سے برطانوی مدبرین ایک ہی وار میں عراق اور موصل کے دو اہم مسائل کا فیصلہ کردینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے نہایت چالاکی کے ساتھ موصل کو عراق کا ایک غیر منفک جزو اور عراق کے لئے برطانوی سیادت کو ایک لازمی چیز قرار دے کر اپنی "جوع ارض" اور "عطش الدہن" کو بیک وقت سیر کرنے کا انتظام کرلیا ہے مگر شاید انہیں معلوم نہیں ہے کہ ترک اب وہ ترک نہیں رہے ہیں جو ایک سادہ لوح سپاہی کی حیثیت سے برلن کانگریس میں شریک ہوئے تھے۔ اب جن ترکوں سے انہیں جنیوا اور ہیگ کے سیاسی قمارخانوں میں واسطہ پڑے گا وہ لوزین کانفرنس کے آزمودہ کار ترک ہونگے جو جنگ کے میدانوں کی طرح صلح کے ایوانوں میں بھی یکساں بہادری کے ساتھ لڑنے کی قوت رکھتے ہیں۔ انہوں نے پوری قابلیت کے ساتھ اپنے مقدمہ کی وکالت کی ہے اور تمام سیاسی، تاریخی، جغرافیائی، اقتصادی، فوجی اور قانونی دلائل سے ثابت کردیا ہے کہ موصل ترکی کا ہے اور اسی کا ہونا چاہیے۔ اگر ان دلائل کی قوت سے انہیں ان کا حق مل گیا تو بہتر ورنہ وہ ان سیاسی چالوں اور مکارانہ سازشوں کی ذرہ برابر پرواہ نہ کریں گے اور تلوار کی قوت سے موصل کو چند لمحوں میں فتح کرلیں گے۔

ترکوں نے ایک سے زائد مرتبہ اس حقیقت کو ظاہر کردیا ہے کہ موصل کے لئے ان کی جدوجہد تیل کے لالچ یا اور کسی اقتصادی غرض پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ محض اپنا حق چاہتے ہیں۔ موصل ان کے وطن کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کے باشندے نسل و زبان کے اعتبار سے ان کے بھائی ہیں اور اس کی سرزمین ترکی کے ساتھ تاریخی جغرافیائی سیاسی

اور حربی حیثیت سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے وہ بہرحال اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ خواہ اس میں تیل کے چشمے اور دوسری قسم کے قیمتی معدنیات ہوں یا نہ ہوں۔ انہوں نے برطانیہ کی ”عطش الدہن“ کو مطمئن کرنے کے لئے یہاں تک اعلان کردیا ہے کہ ہمیں پٹرول کے چشموں سے کوئی غرض نہیں۔ اگر تمہیں ان کی ضرورت ہے تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ تم کو تمام چشموں کی اجارہ داری دینے کے لئے تیار ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے حق و باطل کے فیصلہ کے لئے ایک اور اہم معیار پیش کردیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل موصل کوعراقی و برطانوی تسلط سے عارضی طور پر آزاد کرکے ان سے رائے لے لی جائے۔ اگر وہ عراق کے حق میں رائے دیں تو ٹرکی اپنا دعوی واپس لے لے گا اور اگر ترکی کے حق میں رائے دیں تو عراق اپنے دعوے سے دست بردار ہوجائے۔ تحقیق حق کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے اور اگر اس پر بھی برطانیہ اور اس کے بین الاقوای حلفاء راضی نہ ہوں تو پھر جنگ کے سوا اور کوئی ایسی عدالت نہیں ہوسکتی جو اس مقدمہ کا صحیح فیصلہ کرسکے۔

❑ بینک کا سود اور اس کا مصرف

{۲۹ر ستمبر ۱۹۲۵ء}

اس سے پہلے ہم اپنے ایک نوٹ میں آنریبل مسٹر ہارون جعفر کے اس ریزولیوشن کی تائید کرچکے ہیں جس میں انہوں نے حکومت سے درخواست کی تھی کہ وہ سیونگ بنکوں میں مسلمانوں کے ترک کردہ سود کو کسی اور کام پر خرچ کرنے کی بجائے خود مسلمانوں کے امور پر صرف کیا کرے۔ اب وہ ریزولیوشن دوبارہ آخری منظوری کے لئے پیش کیا جانے والا ہے۔ اور اس کے متعلق حکومت نے مسلمانوں کی رائے عامہ سے حسب ذیل سوالات کئے ہیں۔

۱۔ کیا اس تجویز کو منظور کرکے حکومت ان راسخ العقیدہ مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ تو

نہ پہنچائے گی جنھوں نے آج تک سود نہیں لیا۔

۲۔ کیا تمام مسلمان اس خاص تجویز کو پسند کریں گے کہ ان کا ترک کردہ سود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو تقسیم وظائف کی مد میں دے دیا جائے۔

۳۔ اگر تجویز منظور ہو جائے اور زر امانت بڑھانے کی خاطر باقی سرمایہ داروں پر بھی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ بھی سود لینا ترک کر دیں تو کیا اس سے سیونگ بینکوں کی ساکھ کم ہو جانے کا تو احتمال نہیں ہے۔

ان سوالات کو دیکھ کر ایک خالی الذہن انسان یہ سمجھے گا کہ حکومت مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا بہت زیادہ لحاظ کرتی ہے اور کسی ایسے مسلہ میں جو خالص ان سے متعلق ہو ان کی رائے لئے بغیر فیصلہ نہیں کرتی مگر یہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ مسلمانوں کا روپیہ مسیحیت کی تبلیغ میں خرچ کرتے وقت تو حکومت کو اس بات کا خیال تک نہ آیا کہ یہ حرکت ملکی قانون اور اسلامی شرع کی رو سے جائز ہے یا نہیں اور اسے مسلمان پسند کریں گے یا نہیں لیکن جب اسے خود اسلامی مفاد پر خرچ کرنے کا سوال پیش ہوا تو اب وہ مخالفت کی کوئی گنجائش نہ دیکھ کر مجبوراً ایک تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرتی ہے اور مسلمانوں کی خیر خواہ بن کر ان سے پوچھ رہی ہے کہ اس سود کے حرام روپیہ کو اسلامی کاموں میں صرف کرنا تمہارے مذہبی جذبات کو صدمہ تو نہیں پہنچائے گا۔

ہماری رائے میں تمام مسلمانوں کو اور خصوصاً ان لوگوں کو جو سیونگ بینکوں میں روپیہ جمع کراتے ہیں بالاتفاق حکومت کو ان سوالات کا جواب نفی میں دینا چاہیے اور اسے پوری طرح اطمینان دلا دینا چاہیے۔ کہ اس تجویز کو منظور کرنے سے ہمارے جذبات کو کوئی ٹھیس نہیں لگے گی۔ رہا یہ مسلہ کہ اس روپیہ کو کس مصرف میں صرف کیا جائے تو اگرچہ شریعت کی رو سے تمام امور خیریہ میں اسے خرچ کیا جا سکتا ہے، مگر تقسیم ہو کر اس روپے کی افادیت میں بہت کمی واقع ہو جائے گی اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو کسی ایک اہم اسلامی ضرورت پر خرچ کیا جائے اور وہ موجودہ حالات میں تعلیم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ پس ہمارے نزدیک سیٹھ صاحب کی یہ تجویز بھی قابل قبول ہے کہ اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی وظائف میں صرف کیا جائے۔

حکومت کا تیسرا سوال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اسے خصوصیت کے ساتھ اس

لئے پیچیدہ بنایا گیا ہے کہ وہی اس تجویز کی تعمیل کے راستہ میں ایک مفید روک بن سکتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر تمام وہ مسلمان جو سیونگ بینکوں سے سود لینے کے عادی ہیں خود بخود بلا کسی دباؤ کے اس بات پر اپنی رضامندی کا اظہار کردیں کہ وہ سود کے ناجائز روپے کو امور خیریہ کے لئے چھوڑ دینا پسند کرتے ہیں تو یہ مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جائے گا۔ تاہم اگر ان مسلمانوں کی طرف سے کوئی آمادگی نہ بھی ظاہر کی جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان پر دباؤ ڈالنا بھی منشائے شریعت کے خلاف نہ ہوگا کیوں کہ شرع اسلامی کی رو سے مشکوک رزق سے بچنا ہی بہتر ہے۔

دوسری صورت میں ہر شخص احکام شریعت کے مطابق خود ہی انفرادی طور پر اپنے جمع کردہ سرمایہ کا سود وصول کرکے اسے تبلیغ و امداد یتامی وغیرہ اسلامی امور خیر پر صرف کردیا کرے‘ کیونکہ اس باب میں تساہل سے کام لینا ہدم ارکان شریعت میں حصہ لینے کا ہم معنی ہے اور اس سرمایہ سے تبلیغ مسیحیت اور ارتداد کا جو فتنہ برپا ہوتا ہے اس کا سارا وبال مسلمانوں کے ذمہ عائد ہوتا ہے۔

علی گڑھ ہندو مسلم فساد

{ ۲۹ر ستمبر ۱۹۲۵ء }

رام لیلہ کے موقع پر علی گڑھ میں جو فسادات رونما ہوئے‘ ان کے متعلق اس قدر متضاد خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ صحیح رائے قائم کرنا نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ ہندو اخبارات اور ان کے نامہ نگاروں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مواقع پر شدید پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں اور کثرت سے غلط افواہیں پھیلا کر اصل واقعہ کو چھپانے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے جماعتی نزاعات میں ان کی طے شدہ پالیسی یہ ہے کہ ہر امکانی کوشش سے حکومت کو مرعوب کرکے اصل مجرموں کو قانون کی جائز گرفت سے بچالیا جائے۔ چنانچہ یہی طرز عمل علی گڑھ کے معاملہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ہندو اخبارات میں علی گڑھ کے تاروں کا تانتا بندھا ہوا ہے جن میں واقعات کو توڑ مروڑ کر اور ہندوؤں کے مفید مطلب بنا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان ناجائز تدابیر سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم **الجمعیتہ** کی اس اشاعت میں علی گڑھ کے جو

دو تار شائع کر رہے ہیں ان سے اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اس امر سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ فساد چھ اور ساڑھے چھ بجے شام کے درمیان نماز مغرب کے وقت رونما ہوا جبکہ مسلمان ایک مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔ ابھی تک جس امر کے متعلق شبہ تھا وہ یہ تھا کہ اشتعال کس کی جانب سے دلایا گیا ہے اور پہل کس نے کی مگر اب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بیان اور "ہمدرد" کے نامہ نگار کے تار سے وہ شبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ ہمدرد کے تار میں فساد کی وجہ نہایت صاف بیان کر دی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:۔

> "ہندوؤں نے مسجد کے سامنے سنکھ بجایا۔ بازار کے مسلمانوں نے منع کیا کہ نماز ہو رہی ہے لیکن ہندوؤں نے نہ مانا اور فساد ہو گیا"۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہندوؤں کے اس بیان کی قطعی تردید کر دی ہے کہ مسلمان پہلے سے فساد پر آمادہ تھے یا ہندوؤں کو خطرہ تھا کہ فساد ہو جائے گا۔ بلکہ اس نے اپنے بیان میں یہاں تک تصریح کر دی ہے کہ جب پولیس نے فساد کو فرو کر دیا اور جلوس اچل تال کی طرف روانہ ہوا تو "راستہ میں بعض فسادیوں نے سرائے اور اس کے قریب ایک مکان پر حملہ کر دیا اور بہت سے مردوں اور عورتوں کو مجروح کیا"۔ ہم جہاں تک خیال کرتے ہیں یہ وہی سرائے ہے جو مدار دروازہ میں واقعہ ہے جہاں یہ فساد رونما ہوا تھا۔ اس سرائے کے چاروں طرف مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اس کے برعکس کسی اطلاع سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مسلمانوں نے ہندو مردوں اور عورتوں پر حملہ کیا ہو۔ مجروحین و مقتولین کی جو تعداد بتائی جاتی ہے اس سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندو اپنے سنگھٹن کے زور میں پہلے ہی سے اس فساد کی تیاری کر چکے تھے اور رام لیلہ کے موقعہ پر مسلمانوں کو ایک موثر سبق دینا چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پانچ مقتولین میں سے صرف ایک ہندو ہے اور چار مسلمان اور مجروحین کی تعداد میں بھی ایک اور پانچ کی نسبت ہے۔

ہمیں ان آئے دن کے واقعات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حکومت جلد سے جلد وہ تدابیر کیوں اختیار نہیں کرتی کہ ان فسادات کا ہمیشہ کے لیے سدباب ہو جائے۔ اگر اس جارحانہ پروپیگنڈا کو جاری رہنے دیا گیا اور حکومت اسی طرح ہڑتالوں اور اخباری دھمکیوں سے مرعوب ہوتی رہی تو یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا اور اہنسا کے اصول پر ایمان رکھنے والی قوم مالوی جی کے سنگھٹن کی برکات سے امن عامہ کے لیے مستقل خطرہ بن جائے گی۔

* تنظیم اور جمعیت العلمائے ہند

اس سے پہلے ہم اپنے ایک مختصر نوٹ میں تحریک تنظیم کے متعلق جمعیت العلماء کی پالیسی کو واضح کر چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد ان تمام حضرات کے شکوک و شبہات رفع ہو جائیں گے جو اس خاص مسئلہ میں جمعیت کے مسلک سے مطمئن نہیں ہیں مگر ہم عصر "مسلم آؤٹ لک" کی ایک تازہ اشاعت میں "تنظیم اور جمعیت العلماء ہند" کے عنوان سے جو طویل نوٹ شائع ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے نوٹ نے معاصر موصوف کے شبہات کو دور کرنے کی بجائے کچھ اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اس غلط اور معکوس اثر کی وجہ، جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ہماری تحریر کی پیچیدگی یا ژولیدہ بیانی نہیں تھی۔ بلکہ خود ہمارے عزیز ہمعصر کی خوش فہمی و دقیقہ سنجی تھی۔ وہ مبداء فیاض سے جس قسم کے مناظرانہ ذہنیت لے کر آیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ اسے علماء کی ذات سے جو حسن ظن ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی محدب نگاہوں سے معکوس دیکھے اور کبھی کسی مسئلہ پر احقاق حق اور تحقیق حال کی غرض سے بحث نہ کرے۔ اس ذہنیت کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرنا فضول ہے کہ اظہار حقیقت کے لیے ہماری مزید کوششیں کچھ بار آور ہونگی، کیونکہ جب اعتراض اور نکتہ چینی کو مقصود بالذات بنا لیا جائے تو کبھی کوئی بحث نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی، مگر باوجود اس کے ہم ایک دفعہ پھر اپنے ہمعصر کے شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے جنگجویانہ انداز تحریر کے متعلق پہلے سے اعتراف عجز کئے لیتے ہیں کہ ہم اس کی چوٹوں اور پھبتیوں کے حریف نہیں بن سکتے۔

جمعیتہ العلماء پر ہمارے ہم عصر کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ زبان سے تو تحریک تنظیم کے مقصد سے اتفاق ظاہر کرتی ہے مگر عملاً اس میں شرکت نہیں کرتی۔ اس کے متعلق ہمیں اعتراف ہے کہ اب تک ہم نے اپنے اس اتفاق کے معنی اور عملی بے تعلقی کے اسباب کو واضح کرنے کی کوشش نہیں کی مگر یہ بات ہرگز کسی "غیر اسلامی منافقت" پر مبنی نہیں ہے، جیسا کہ ہم عصر موصوف نے ہم پر شبہ کیا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف

یہ ہے کہ ہم اپنے وجوہ اختلاف کو علانیہ ظاہر کرکے اس تحریک کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر ہمارے معترضین کو اسی پر اصرار ہے کہ وہ وجوہ ظاہر کردیے جائیں تو ہم صاف طور پر عرض کیے دیتے ہیں کہ تنظیم اور ہمارا دلی اتفاق صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ ہر مسلمان کی طرح ہم بھی مسلمانوں کو ایک شیرازہ میں مجتمع کرنا، ان کی منتشر قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا اور ان کی تعلیمی، اقتصادی اور مذہبی و تمدنی حالت کو درست کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ "جمعیتہ التنظیم" نے اختیار کیا ہے وہ شرعی طریقہ نہیں اور ہم سیاسی حیثیت سے بھی اس کو درست نہیں سمجھتے۔ اس لیے عملاً نہ تو اس سے اتحاد عمل کرتے ہیں اور نہ اس کی مخالفت کرکے کوئی ناگوار مناقشہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہمارا دلی اتفاق صرف تنظیم کے مقصد تک محدود ہے اور عملی اتحاد اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہمارے نقطہ نظر کے مطابق اس کے لائحہ عمل میں ترمیم نہ ہو جائے۔

علماء کی جماعت اپنے اس خیال کو "آل مسلم پارٹیز کانفرنس" میں پیش کرنے کے لیے تیار تھی اور اس نے اپنے نمائندے بھی اس مجلس میں شریک ہونے کے لیے منتخب کرلیے تھے مگر وہ محض اس بنا پر شرکت سے معذور رہی کہ بدقسمتی سے مجلس مذکور کے داعیوں نے ایک ایسی جماعت کو بھی شرکت کی دعوت دے دی گئی تھی جسے علمائے اسلام نے بالاتفاق خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس عذر کو ہمارا ہم عصر صحیح تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی عذر ہے، لیکن اگر وہ روشن ضمیری اور اشراقیت کا مدعی نہیں ہے تو ہم اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس کے پاس جمعیت کے دل کا حال معلوم کرنے کے لیے خود اس کے قول اور عمل کے سوا اور کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ جمعیت کے مقتدر ارکان ایک سے زائد مرتبہ انہی کالموں میں اس بات کا اعلان کرچکے ہیں کہ ہم اس کانفرنس میں مرزائی جماعت کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے اور جب مجلس عاملہ کی وہ تجویز منظر عام پر آچکی ہے جس میں جمعیت کی جانب سے حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا احمد سعید اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو اس شرط کے ساتھ کانفرنس کی شرکت کے لیے منتخب کیا تھا کہ اس میں احمدی و قادیانی جماعتیں شریک نہ ہوں، تو پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی عقلمند آدمی کس بنا پر اس عذر کو ایک بناوٹی عذر قرار

دے سکتا ہے۔ البتہ ایک دوسرا سوال ہے کہ یہ عذر جائز اور معقول بھی تھا یا نہیں۔ سو اس کے متعلق "الجمعیتہ" کی پچھلی اشاعتوں میں کافی سے زیادہ بحث ہو چکی ہے اور اگر کسی شخص کو شرعی دلائل مطمئن کر سکتے ہوں تو وہ اس سلسلہ مضامین کا مطالعہ کر کے اپنے تمام شبہات رفع کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے لائق ہم عصر نے ایک ایسی طفلانہ دلیل پیش کی ہے جسے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جمعیت العلماء کے ارکان متحدہ مقاصد کے لیے ہندوؤں تک سے اتحاد عمل کر چکے ہیں تو انہیں لاہوری احمدیوں اور قادیانیوں سے اتحاد عمل کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق ہم اپنے خردمند ہم عصر کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں سے ہم نے جو اتحاد عمل کیا تھا وہ متحدہ ملکی مقاصد کے لیے تھا نہ کہ متحدہ دینی مقاصد کے لیے۔ ملکی و سیاسی مقاصد کے لیے تو ہم ہر جماعت سے اتحاد کر سکتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں لیکن دینی مقاصد کے لیے ہمارا اتحاد صرف انہی جماعتوں کے ساتھ ہو سکتا ہے جو ہمارے نزدیک دائرہ اسلام میں داخل ہیں۔ پس اگر وہ کانفرنس جو امرتسر میں منعقد ہوئی تھی مسلم کانفرنس نہ ہوتی محض آل پارٹیز کانفرنس ہوتی تو اس میں ہم یقیناً قادیانی و لاہوری احمدی حضرات کے دوش بدوش بیٹھ کر ملکی و سیاسی مسائل پر بحث کر سکتے تھے کیونکہ وہاں ان کی حیثیت ایک اسلامی جماعت کی نہیں بلکہ ایک وطنی جماعت کی ہوتی اور اس میں شریک ہونا ہمارے لیے اسی طرح جائز ہوتا جس طرح کانگرس میں ہندوؤں کے ساتھ جمع ہونا جائز ہے لیکن ایسی حالت میں جبکہ یہ کانفرنس ایک اسلامی کانفرنس قرار دی گئی تھی اور اس کا مقصد وحید مسلمانوں کی دینی و سیاسی تنظیم تھا، تو اس میں کسی ایسی جماعت کی شرکت کو قبول کرنا ہمارے لیے مشکل تھا جو ہمارے نزدیک اسلامی جماعت نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے اجتماع میں شرکت اسلامی حیثیت ہی سے ہو سکتی ہے نہ کہ غیر اسلامی حیثیت سے۔

{۶ر اکتوبر ۱۹۲۵ء}

اب رہا یہ سوال کہ ہم نے ڈاکٹر کچلو کی تنظیمی سرگرمیوں پر کیوں اعتراض کیا۔ سو اس کے متعلق ہم پہلے ہی صراحت کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو واضح کر چکے ہیں مگر ہمیں

افسوس ہے کہ ہمارے معزز ہم عصر نے شوق نکتہ چینی کے جوش میں سرے سے اس کو سمجھنے ہی کی کوشش نہیں کی۔ اپنی خوش فہمی سے وہ ہمارے تمام دلائل کا مدعا یہ سمجھا ہے کہ تنظیم کو ایک آل انڈیا تحریک نہ بنانا چاہیے اور اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

> "یقیناً اگر تمام صوبوں کے مسلمان بیک وقت تعمیری کام کے لیے مستعد ہو جائیں تو یہ زیادہ بہتر نتائج پیدا کرے گا۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ مختلف اوقات میں ایک دوسرے سے الگ رہ کر اس پر عمل پیرا ہوں۔ پس اگر ڈاکٹر کچلو تمام صوبوں میں جا کر لوگوں کو جلد سے جلد تنظیم کا کام شروع کرنے کی دعوت دے رہے ہیں تو وہ محض ایک ضروری کام کر رہے ہیں جو تعمیری کام کی خاطر مسلمانوں کی تنظیم کا مقصد حاصل کرنے کے لیے لازمی ہے"۔

ہمارے خیال میں اگر ڈاکٹر کچلو کا مقصد سفر صرف وہی ہے جو "مسلم آؤٹ لک" نے سمجھا ہے تو وہ یقیناً قابل اعتراض نہیں ہے مگر ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ جمعیتہ التنظیم کے قیام کا مقصد محض تنظیم کی ضرورت ظاہر کرنا اور لوگوں میں تنظیم کے لیے آمادگی پیدا کرنا ہے یا درحقیقت ان تعمیری تجاویز کو عملی جامہ پہنانا ہے جو اس کے دستور اساسی میں پیش کی گئی ہیں۔ اگر اس کا مقصد صرف پہلی شق تک محدود ہے تو یقیناً یہ دورے اور یہ تقریریں سب درست ہیں اور اگر مقصد حقیقی دوسری شق پر عمل کرنا ہے تو ہمارے خیال میں ان کی تحریک کو ایک ایسے دائرہ تک محدود رہنا چاہیے جس میں وہ آسانی کے ساتھ کامیاب ہو سکتی ہو لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس کا مقصد دونوں شقوں پر حاوی ہے اور یہ دورے صرف تعمیری کام کی تخم ریزی کے لیے کئے جارہے ہیں تو پھر ہمیں ڈاکٹر صاحب کے وکیل سے پوچھنا پڑے گا کہ یہ تخم ریزی امرتسر اور پنجاب میں بھی کی گئی یا نہیں اور اگر کی گئی تو اب تک اس کے عملی نتائج کیا ظاہر ہوئے؟ نیز یہ کہ اب تک جہاں جہاں تنظیمی دورہ کیا گیا ہے وہاں تعمیری پروگرام کی کون کون سی دفعات پر عملدر آمد شروع ہو گیا؟ اور اگر ہر جگہ الان کما کان کی کیفیت ہے' تو کن مصالح کی بناء پر ڈاکٹر صاحب ایک دعوت تنظیم کو غیر مکمل چھوڑ کر دوسری جگہ وعظ و تلقین کے لیے چلے جاتے ہیں؟

مسلم آؤٹ لک کو ہمارا یہ خیال ایک طفلانہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کچلو

سارے ہندوستان کو دعوت تنظیم دینے سے پہلے خود اپنے گھر میں اس کا ایک عملی نمونہ قائم کریں مگر اس نے جن الفاظ میں ہمارے خیالات پر اعتراض کیا ہے ان سے محسوس ہوا کہ شاید اس نے ہمارے پچھلے نوٹ کو پوری طرح پڑھا ہی نہیں۔ اس لیے ہم دوبارہ اس کو اپنے ان الفاظ کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن کو اس نے "طفلانہ استدلال" سے تعبیر کیا ہے اور اس سے پوچھتے ہیں کہ ان میں کونسی چیز قابل اعتراض ہے:-

> "ایک ہیجانی تحریک کو تو چند جوشیلے اور سرگرم ارکان تمام ملک میں پھیلا سکتے ہیں لیکن ایک ایسی ٹھوس تعمیری تحریک کو جیسی کہ تنظیم ہے، پورے ملک تو کیا پورے صوبہ بلکہ ایک پورے ضلع میں بھی کامیاب بنانا برسوں کی عرق ریزیاں اور ان تھک کوششیں چاہتا ہے۔ پس اگر ڈاکٹر کچلو پر ہم نے کبھی کوئی اعتراض کیا ہے تو اس کا مدعا صرف یہ مخلصانہ رائے دینا تھا کہ آپ ہمہ گیری کے خیال کو ترک کر کے اپنی عملی کوششوں کا دائرہ ایک ایسے رقبہ تک محدود رکھیے جس میں تنظیم کے پروگرام کو آسانی کے ساتھ کامیاب بنایا جا سکتا ہو۔ آپ کے سامنے خود آپ کا گھر موجود ہے۔ سب سے پہلے اس کی تنظیم کر کے اپنے عمل کا ایک نمونہ قائم کیجیے۔ اس کے بعد ضلع امرتسر آپ کی توجہ کا پہلا مستحق ہے اور پھر صوبہ پنجاب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسکی زرخیز زمین میں آپ اپنے اعمال حسنہ کی تخم ریزی کریں مگر یہ کیا ستم ہے کہ ان کا مرکز امرتسر تو تنظیم کی برکات سے بالکل محروم ہے اور وہ اس کا ضلع نہیں، کمشنری نہیں، صوبہ نہیں بلکہ بیچ میں ایک اور صوبہ چھوڑ کر دور دراز کے صوبہ بہار کو دعوت تنظیم دینے کے لیے چلے جا رہے ہیں۔ آخر یہ سامان مضحکہ نہیں تو اور کیا ہے"۔

خط کشیدہ الفاظ کو غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ ان میں کس حقیقت واقعیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمارا آئیڈیلسٹ ہم عصر جس خیالی دنیا میں رہتا ہے وہاں کسی منصوبہ کا عملی پہلو کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ وہم و خیال کے دائرہ میں جس چیز سے بحث کی جا سکتی ہے وہ ایک تجویز کی منطقی ترکیب اور امید کردہ فوائد کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر ایک عملی آدمی کو فوائد کے ساتھ ساتھ کامیابی کے امکانات پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک منصوبہ کی اصلی خوبی کاغذ کی سطح پر نہیں بلکہ عمل کے میدان ہی میں

ظاہر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم تنظیم کے پروگرام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اگرچہ اس کی دفعات میں ہم کو مسلمانوں کے لیے ایک روح پرور پیغام جبلت نظر آتا ہے۔ جس کی تکمیل مسلمانوں کو از سر نو ہندوستان کی حکمراں طاقت بنا سکتی ہے۔ مگر عملی حیثیت سے ہم سمجھتے ہیں کہ اس پورے لائحہ عمل کو تو کیا، اس کی ایک دفعہ کو بھی سارے ہندوستان میں کامیاب بنانے کے لیے برسوں کی محنت درکار ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اوقاف کی تنظیم، مساجد کی اصلاح، ابتدائی تعلیم کی ترویج، اقتصادی خرابیوں کی اصلاح، فتنہ ارتداد کی روک تھام، معاشرتی و تمدنی امراض کا علاج اور لائحہ تنظیم کی ایسی ہی دوسری دفعات مسلمانوں کی اہم ترین قومی ضروریات میں سے ہیں اور ان پر مسلمانان ہند کی حیات ملی کے بقا و تحفظ کا انحصار ہے مگر ان پر ایک شاندار تقریر کر دینا ایک پر شوکت مقالہ لکھ دینا دوسری چیز ہے اور ان کو قوت سے فعل میں لا کر مسلمانوں کو ایک منظم قوم بنا دینا ایک دوسری چیز۔ عملی نقطہ نظر سے اس راہ میں جو مشکلات ہیں ان کا صحیح اندازہ ترکی اور ایران کی موجودہ حالت کو دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ جہاں اسلامی حکومت قائم ہے، ایک پرجوش اور ترقی خواہ جماعت برسر اقتدار ہے اور ہندوستان کے مقابلہ میں بدرجہا کم رقبہ اور آبادی کی تنظیم در پیش ہے مگر باوجود اس کے قدم قدم پر مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ رجعت پسندانہ میلانات اور عام جمود و خمود شدید مزاحمت کئے بغیر ایک انچ پسپا نہیں ہوئے اور تمام مبصرین کی یہ قطعی رائے ہے کہ اگر ایرانی و ترک اصلاح پسندوں کی یہ کوششیں اس ان تھک طریقہ سے جاری رہیں، تب بھی پچیس تیس سال سے پہلے ان دونوں ملکوں کی تنظیم مکمل نہیں ہو سکتی پھر جب ان آزاد ملکوں کا یہ حال ہے تو کیا کوئی عقلمند یہ امید کر سکتا ہے کہ ہم محکوم و غلام ہو کر ان سے بدرجہا زیادہ وسیع رقبہ میں بدرجہا زیادہ کثیر آباد، کو آسانی کے ساتھ منظم کر لیں گے؟

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم تنظیم کو ناممکن العمل سمجھتے ہیں۔ ان مشکلات کو بیان کرنے سے ہمارا اصلی مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ تحریک تنظیم کو جس طرح بچوں کا کھیل سمجھ لیا گیا ہے وہ دراصل ایسی نہیں ہے اس کے موجودہ محرکین اسے ترک موالات کی طرح ایک ہیجانی تحریک سمجھ رہے ہیں اور اس کی دعوت دینے کے لئے صوبہ متحدہ اور بہار کے دورے کو نکلے ہیں مگر ہمارے خیال میں اس طریقہ سے قیامت تک

تنظیم نہیں ہو سکتی۔ وہ جس شہر میں جائیں گے وہاں تنظیم کی فطری خوشنمائی، پروانوں کی طرح چند اسلامی درد رکھنے والے نوجوانوں کو ان کی گرد جمع کردے گی۔ ان کی گرم گرم تقریروں سے متاثر ہو کر وہ ایک مقامی تنظیم کمیٹی بنالیں گے اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ اس ضلع میں تنظیم کی پوری پوری تخم ریزی کردی گئی ہے، لیکن جونہی کہ وہ علاقہ سے باہر قدم نکالیں گے۔ دفعتہ" وہ جوش ختم ہو جائے گا اور تنظیم کی عملی مشکلات ان نوجوانوں کی ہمتوں کو سرد کردیں گی۔ ترک موالات کے زمانہ میں اس حالت کا اچھی طرح تجربہ کیا جاچکا ہے۔ باوجودیکہ گاندھی جیسا طاقتور لیڈر اس تحریک کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ہر صوبہ میں متعدد ایسے بااثر لیڈر موجود تھے جن کے ایک اشارہ پر پبلک جان دینے کے لئے تیار تھی اور جگہ جگہ باقاعدہ کانگریس کمیٹیاں قائم تھیں۔ جن کے ارکان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی مگر جب ہیجان کا دور گزرنے کے بعد تعمیری پروگرام کا عہد آیا تو کانگریس کا سارا نظام اور اس کے لیڈروں کا تمام نفوذواقتدار اس کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام ہوا اور آخر گاندھی جی کو اعتراف شکست کرکے انہی قدیم خطوط کی طرف پسپا ہو جانا پڑا جہاں وہ کلکتہ کی اسپیشل کانگریس سے پہلے تھے۔

ان تمام امور کو دیکھتے ہوئے ہماری اب بھی یہ قطعی رائے ہے کہ ڈاکٹر کچلو کو ہمہ گیری کا خیال ترک کرکے اپنی عملی کوششوں کا دائرہ ایک ایسے رقبہ تک محدود رکھنا چاہیے جس میں تنظیم کے پروگرام کو آسانی کے ساتھ کامیاب بنایا جاسکتا ہو۔ تمام ہندوستان کی تنظیم بے شک ایک مبارک خیال ہے مگر ایک مٹھی بھر جماعت کے لئے "جوئے شیر" لانے کے خیال سے کچھ کم محال نہیں ہے۔ اس خیال کو ترک کردینے سے ڈاکٹر صاحب کی آل انڈیا لیڈر شپ کو نقصان تو ضرور پہنچے گا لیکن اگر انہوں نے ہنگامہ آرائی کو چھوڑ کر اپنی عملی سرگرمیوں سے صرف ایک صوبہ پنجاب ہی کو منظم کردیا تو یہ اسلامی ہند پر ان کا سب سے بڑا احسان ہوگا اور ان کی خدمت مسلمانوں کے تمام لیڈروں کی خدمات سے زیادہ وزنی ہوگی۔

* ایک قابل اعتراض اشتہار

اعظم گڑھ سے مولوی ابوالجلال صاحب ندوی نے ہم کو ایک اشتہار کی طرف توجہ

دلائی ہے۔ جو کارخانہ تجارت کتب کٹڑہ' بڑیان دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں "معجزنما حمائل" کے طرز تحریر کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لئے ادباً اصل قرآن مجید کی عبارت درج کرنے کی بجائے ایک عربی قصہ نقل کردیا گیا ہے مگر کہیں اس امر کی تصریح نہیں کی کہ یہ قرآن مجید کی عبارت نہیں ہے' بلکہ اس کے برخلاف، تمام آثار و قرائن سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعوذ باللہ کلام الٰہی ہے۔ عبارت کے نیچے سورہ یوسف کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ اوپر ایک جانب دماابری اور دوسری جانب یوسف لکھا ہوا ہے۔ پہلو میں منزل لکھا ہے۔ حاشیہ پر سورہ یوسف کی تفسیر کا ایک ٹکڑا مندرج ہے اور عنوان میں بخط جلی لکھا ہے کہ "معجزنما حمائل کی طرز تحریر کا بجنسہٖ ایک اصل صفحہ۔ ان تمام غلطیوں نے مشتہر کے اصل جذبہ تعظیم کی قیمت کو گھٹا کر اس کو ایک اچھے خاصے گناہ میں مبتلا کردیا ہے۔ جس سے اس کو آئندہ احتراز کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح تحریف قرآن کا دروازہ کھلتا ہے۔

جہل مرکب

{۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء}

ہمارے لاہوری ہم عصر "مسلم آؤٹ لک" نے اپنے ایک تازہ نوٹ میں پھر اسی اسپرٹ کا اظہار کیا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات کو سمجھنے سے پہلے جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم نے اپنے پچھلے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ تنظیم المسلمین کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے "جمعیت التنظیم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ شرعی طریقہ نہیں ہے اور ہم سیاسی حیثیت سے بھی اس کو درست نہیں سمجھتے"۔ اس پر ہمارا ہم عصر حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ "ابھی تو آل انڈیا تنظیم کمیٹی بنی بھی نہیں پھر جمعیت علماء کو کس قسم کی غیب دانی سے یہ علم حاصل ہو گیا ہے کہ اس کے وسائل کار کیا ہیں؟ لیکن ہمارے خیال میں جمعیت العلماء کی "غیب دانی" سے زیادہ حیرت انگیز خود "مسلم آؤٹ لک" کی یہ بوالعجبی ہے کہ وہ تحریک تنظیم کے متعلق ضروری معلومات حاصل کئے بغیر اس کی وکالت کر رہا ہے۔ اس بے نظیر وکیل کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ "جمعیت التنظیم" اور آل انڈیا تنظیم کمیٹی میں کیا فرق ہے اور نہ وہ جانتا ہے کہ موجودہ تنظیم کمیٹی کو جمعیت التنظیم کے دستور عمل میں پروویژنل آل انڈیا کمیٹی قرار دیا گیا ہے جس کی تمام کارروائیاں اصل آل انڈیا کمیٹی کی کارروائیاں تصور کی جائیں گی۔ مزید برآں اس نے جمعیت التنظیم کے دستور العمل کو پڑھنے کی ذرہ برابر تکلیف نہیں کی ورنہ وہ ہماری غیب دانی سے زیادہ ڈاکٹر کچلو کی غیب دانی پر حیرت کرتا کیونکہ ہمیں تو صرف جمعیت التنظیم کے طریق کار ہی کا پیشگی علم حاصل ہو گیا، لیکن ڈاکٹر کچلو نے تو اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے جذبات، احساسات اور بہت سی دوسری باتوں کا علم حاصل کر لیا۔ چنانچہ صفحہ ۳ پر لکھا ہے کہ جمعیت التنظیم کو اس امر کا احساس ہے کہ اب تک ۷ کروڑ مسلمانوں کا مجموعی دماغ اپنی اصلاح و علاج کے لیے خود سوچنا شروع نہیں کرے گا، صرف دس بیس آدمیوں کی سوچ موجودہ مشکلات کو حل نہیں کر سکتی"۔ اور آگے چل کر صفحہ ۶ پر لکھا ہے کہ "اگر اس سلسلہ میں برادران وطن کی طرف سے اپنے سہو و قصور سے آگاہ کیا جائے گا تو جمعیت التنظیم شکریے کے ساتھ اپنی فروگذاشتوں پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جمعیت تنبیہ کرنے والوں کا شکریہ ادا

کرے گی اس نے برادران وطن کے متعلق نہایت واضح الفاظ میں اپنا مسلک ظاہر کر دیا ہے"۔ کیا ہمارا بالغ النظر ہم عصر اس امر کی تشریح کر کے ہماری حیرت کو دور کرے گا کہ اگر جمعیت التنظیم ابھی رحم مستقبل ہی میں پرورش پا رہی ہے تو اس کی ولادت س پہلے ڈاکٹر کچلو نے کس طرح یہ معلوم کر لیا کہ وہ ۷ کروڑ مسلمانوں کے تفکر و تدبر کی ضرورت محسوس کر رہی ہے اور اپنی فروگذاشتوں پر (جن کا عملی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے سرزد ہو جانا خود محل تعجب ہے) تنبیہ کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تیار ہے اور برادران وطن کے متعلق وہ اپنا مسلک ظاہر کر چکی ہے۔

بہر حال ہم اپنے ہم عصر کو زیادہ دیر تک حیرت میں نہیں رکھنا چاہتے اور اسے مطلع کئے دیتے ہیں کہ تنظیم کا خیال اور اس کی تجویزیں آج کوئی حدیث العہد چیزیں نہیں ہیں بلکہ کافی عرصہ سے ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے ملک کے سیاسی دماغ کسی طریقہ سے مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں اور اگرچہ اس علم کی صحیح صحیح تاریخ تو ہمیں بھی یاد نہیں لیکن اتنا ضرور بتا سکتے ہیں کہ اس کے حصول کا حادثہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے انعقاد سے بہت پہلے پیش آ چکا تھا۔

آخر میں ہم عصر موصوف نے جو "چند سوالات" کئے ہیں ان کے متعلق ہم وعدہ کرتے ہیں کہ انشاء اللہ کسی قریبی فرصت میں ان کے تفصیلی جواب عرض کریں گے۔

مولانا حسرت موہانی کا خطبہ صدارت

لکھنؤ کانفرنس کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز نے ہم کو مبتلائے حیرت کیا ہے وہ مولانا حسرت موہانی کی شرکت اور صدر کی حیثیت سے ان کا خطبہ صدارت ہے۔ ہم ایک زمانہ سے مولانا کو ایک حق پرست اور مستقیم الفکر اور بااصول انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اسی بنا پر ہمارے دل میں ان کے لئے تمام سیاسی لیڈروں سے زیادہ عزت و احترام کے جذبات موجود ہیں مگر غالباً مولانا کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ انہوں نے ایک ایسی مجلس کا عہدہ صدارت قبول کر لیا جو اصولی حیثیت سے قطعاً کوئی نمائندہ مجلس نہ تھی اور جس کو نہایت بے ضابطگی کے ساتھ ایک فرد واحد نے آزاد پبلک مجالس کے حدود سے خارج کر دیا تھا۔ مولانا کی روش میں اس قسم کا خلاف توقع انقلاب دیکھ کر

سخت افسوس ہوتا ہے بلکہ ضرورت ہے کہ اس قسم کے جذبات سے خالی الذہن ہو کر اس خطبہ صدارت پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں جو اجتماع لکھنؤ میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنے مقصد کو پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ابن سعود اور اہل نجد کے ہاتھوں سرزمین حجاز میں مقابر اور مساجد کی تباہی اور بالقصد بے حرمتی کی جو ناشائستہ حرکات اس وقت تک سرزد ہو چکی ہیں ان کی نسبت اپنی انتہائی بیزاری کا اعلان کر دیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ ان کے مذہبی عقائد کو دیکھتے ہوئے آئندہ بھی ان سے کسی بہتر طرز عمل کی توقع نہیں ہے۔ لہٰذا مقامات مقدسہ پر ان کی حکوت یا اقتدار کو ہم کسی حیثیت یا کسی اور حالت میں برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ جملے بظاہر نہایت سادگی کے ساتھ کہے گئے ہیں۔ مگر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں غلط بیانی اور غیر معقولیت کی حد کر دی گئی ہے۔ مولانا نے مساجد و مقابر کی تباہی کو براہ راست ابن سعود کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ تمام عمارتیں ابن سعود کے مکہ پہنچنے سے پہلے منہدم ہوئی تھیں۔ ابن سعود ان کے انہدام سے بالکل بے خبر تھا کیونکہ مکہ بالکل اچانک اور خلاف توقع فتح ہوا تھا۔ ابن سعود کے پہنچنے کے بعد ایک عمارت کو بھی ہاتھ نہیں لگایا گیا اور اب فتح مدینہ کے متعلق عوای اخبارات میں جو خبریں آئی ہیں وہ سب اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ مدینہ طیبہ میں تمام اماکن و مقابر محفوظ ہیں۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے بھی یہ کہنا کہ یہ ناشائستہ حرکات ابن سعود کے ہاتھوں سرزد ہوئی ہیں۔ صریحاً تلبیس حق بالباطل ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں پھر لطف یہ ہے کہ مولانا حجاز پر نجدی حکومت و اقتدار کو برداشت نہ کرنے کی علت نجدیوں کے مذہبی عقائد کو قرار دیتے ہیں اور یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ نجدی حنبلی المذہب ہیں اور اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ مولانا اور ان کے ہم مسلک حضرات کے نزدیک حجاز پر صرف حنفی مذہب والوں کو اجارہ حاصل ہو گیا ہے اور حنبلیوں کو وہاں حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر یہ خیال بطور ایک اصول کے تسلیم کر لیا جائے تو یقیناً حنابلہ و شوافع کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حنفی تسلط و اقتدار کو برداشت کرنے سے انکار کر دیں۔ کیونکہ جب یہ عدم برداشت اعمال کے بجائے عقائد کے اختلاف پر مبنی ہو جائے گی تو ایک عقیدہ کا پیرو دوسرے عقیدے والوں کا تسلط قبول کرنے سے انکار کر دے گا اور اسلام سے وفاداری رخصت ہو جائے گی۔

مولانا نہایت ستم ظریفی کے ساتھ اس مقصد کو جو سراسر عصبیت پر مبنی ہے۔ جمعیت خلافت کے فیصلہ کا ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ۵۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کا فیصلہ اس قسم کی تنگ نظریوں سے بالکل پاک تھا۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ جمعیت خلافت حجاز میں کسی بادشاہ یا امیر کے وجود کو نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس کا منتہائے نظر ایک شرعی جمہوریت قائم کرنا ہے جس میں امت حجازی کے نمائندے عالم اسلام کے نمائندوں کی شرکت سے کارفرمائی کریں۔ اس فیصلہ میں کہیں اس متعصبانہ عقیدہ کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ جس کی علم برداری کے لئے مولانا حسرت کھڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ حرمت حجاز کو مدنظر رکھ کر محض اس امر کا اعلان ہے کہ یہ ارض مقدس شخصی ہوس رانیوں اور ذاتی اغراض پرستیوں کی جولانگاہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان وہاں ایک شرعی اور خالص اسلامی حکومت دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی عین آرزو یہ ہے کہ کم از کم دنیا میں ایک گوشہ ضرور ایسا باقی رہے جہاں اسلام کی شمع ہدایت اپنی پوری روشنی کے ساتھ جلتی رہے۔

مولانا نے فرماتے ہیں کہ اگر خلافت کمیٹی کے ارکان اپنے اس فیصلہ میں شریف حسین اور امیر علی کے ساتھ ابن سعود سے بھی اپنی بیزاری کا اعلان کردیں تو پھر مولانا عبدالقدیر بدایونی اور شیخ مشیر حسین قدوائی سے ان کا کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا مگر مولانا کو نہیں معلوم کہ جمعیت خلافت امیر علی اور شریف حسین کو اس نظر سے نہیں دیکھتی جس سے مولانا عبدالقدیر اور شیخ مشیر حسین ابن سعود کو دیکھتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک تو رد و قبول کا معیار صرف مذہب کے فروعی اختلافات ہیں جن کی بنا پر ایک وہابی کے مقابلہ میں شریف غدار تو کیا برطانیہ اور فرانس تک کو ترجیح دی جاسکتی ہے لیکن الحمدللہ کہ جمعیت خلافت کے ارکان اور علمائے امت کی ایک بڑی جماعت اس غیر اسلامی عصبیت سے بالکل پاک ہیں اور ان کے نزدیک شخصیتوں کو جانچنے کا اگر کوئی صحیح معیار ہوسکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ان میں سے کون حجاز میں اسلامی مصالح کی حفاظت اور اجنبی مطامع کے مقابلہ کی اہلیت رکھتا ہے اور کون نہیں۔ اس لحاظ سے ان کے لئے ناممکن ہے کہ شریف حسین کی طرح ابن سعود سے بھی اپنی بیزاری کا اعلان کردیں۔ کیونکہ ابھی تک ابن سعود سے کسی ایسی حرکت کا ارتکاب ثابت نہیں ہے جس کی بنا پر اسے اسلام کا غدار کہا جاسکتا ہو۔ بلکہ اگر ایمانداری کے ساتھ اس کے ان کارناموں پر ایک نظر ڈالی

جائے جو اس نے مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد سے اب تک انجام دیئے ہیں۔ تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ عرب میں اس وقت اس سے بہتر اسلام کا خادم اور کوئی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حجاز میں امن وامان کا قیام جس کی گزشتہ چند صدیوں میں کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ حج کا انتظام جو ترکی کی عہد میں اتنا اچھا نہ تھا۔ مکہ معظمہ میں لوکل سیلف گورنمنٹ کا قیام جو شاید دوران جنگ میں آج تک کسی حکومت نے اپنے نو مفتوحہ علاقوں میں قائم نہیں کی اور سب سے زیادہ یہ کہ جوف اور عقبہ و معان کی تسلیم سے انکار جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ حجاز میں اجنبی مطامع کی غلامی نہیں بلکہ ان کا مقابلہ کررہا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ جس شخص کے چند ماہہ اعمال کی فہرست اتنی شاندار ہو اس کے خلاف مولانا حسرت جیسا ایماندار اور حق پرست انسان کیونکر اعلان بیزاری کی دعوت دے سکتا ہے۔

ہمارے محترم مولانا یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ابن سعود حجاز کو غیر مسلم اثر سے پاک کرنے والا ہے اور وہ دعوی کرتے ہیں کہ جس طرح شریف انگریزوں کے زیر اثر تھا اور ہے اسی طرح ابن سعود بھی ان کی اغراض کا غلام تھا اور ہے لیکن اس دعوے کے ثبوت میں مولانا نے جو دلائل و شواہد پیش کئے ہیں وہ اس قدر افسوسناک ناواقفیت پر مبنی ہیں کہ ایک واقف کار آدمی ان کے جواب میں ایک بلند اور مسلسل قہقہہ کے سوا اور کچھ نہیں پیش کرسکتا۔ قارئین کرام ذرا ان مضبوط اور اٹل دلائل کو ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ ابن سعود بھی شریف کی طرح ترکوں سے لڑا۔

۲۔ ابن سعود نے بھی شریف کی طرح انگریزوں سے وظیفہ لیا۔

۳۔ ابن سعود نے بھی شریف کی طرح انگریزوں سے معاہدہ کیا۔

۴۔ ابن سعود کے موجودہ حجاز کا محرک اصلی برطانیہ ہے اور اس میں اس کی یہ مصلحت ہے کہ حسین اور علی کو برطانیہ کے قبضہ فلسطین کی تسلیم پر مجبور کرے۔

۵۔ ابن سعود کوششیں کر رہا ہے کہ برطانیہ حجاز کے اکثر حصوں پر اس کی سیادت کو تسلیم کرلے اور اس کے معاوضہ میں وہ انگریزوں کی تمام شرائط تسلیم کرنے پر تیار ہے۔

۶۔ عقبہ اور معان پر برطانیہ نے ابن سعود کے علم و اجازت بلکہ سازش سے قبضہ کیا ہے۔

ان دلائل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حسرت نے صحیح معلومات حاصل

کرنے کی بجائے صرف انہی موضوعات پر یقین کرلیا ہے جو انڈیا کے امام السیاست نے وقتاً فوقتاً انہیں مہیا کردی ہیں۔ ورنہ اگر وہ اس مسئلہ پر کچھ مطالعہ فرمالیتے اور خصوصاً ان اقتباسات کو ملاحظہ کرتے جو "الجمعیتہ" کی پچھلی اشاعتوں میں مصر و شام کے عربی اخبارات سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ تو ہرگز ایسی مضحکہ انگیز غلطیاں نہ کرتے۔ مولانا کی اصلاح خیال کے لئے ہم ذیل میں ان کے ایک ایک الزام کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

۱۔ اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ابن سعود نے ترکوں کے خلاف برطانیہ کو ایک پیسہ اور ایک آدمی سے بھی مدد دی ہو۔ **فلبی لارنس اور المنبی** وغیرہ کی تصریحات میں جگہ جگہ شریف حسین اور اس کی اولاد کا ذکر آیا ہے، مگر کہیں ابن سعود کا اس حیثیت سے ذکر نہیں ہے کہ اس نے عربی ممالک کی تسخیر میں برطانیہ کی اعانت کی' البتہ وہ بظاہر ترکوں کا ساتھ نہ دے سکا جس کے لئے وہ مجبور تھا۔ کیونکہ اگر وہ جنگ میں شریک ہوجاتا تو یقیناً برطانیہ اور شریف حسین دونوں مل کر اس کو پیس ڈالتے۔ تاہم مجبوریوں کے باوجود اس نے جس طرح ترکوں کی خفیہ اعانت کی اس کا حال جمال پاشا مرحوم کے مذاکرات سے معلوم ہوسکتا ہے جنہیں پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ ابن سعود ترکوں سے لڑا۔

۲۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے برطانیہ سے وظیفہ لیا مگر محض وظیفہ لینا کوئی جرم نہیں تا وقتیکہ اس کے ساتھ انگریزی اغراض کی خدمت اور اسلام سے غداری ثابت نہ ہو۔ اس قسم کا وظیفہ امیر عبدالرحمن خاں مرحوم بھی لیتے تھے اور آج کل سرحدی قبائل بھی لیتے ہیں مگر دنیا جانتی ہے کہ وہ وظائف نہیں بلکہ ایک طرح کا خراج ہے جو برطانیہ کے چالاک سیاست دان محض اس مضرت کو روکنے کے لئے دیا کرتے ہیں جو کسی طاقتور قبائلی سردار سے پہنچ سکتی ہو۔ پس جبکہ انگریزوں سے وظیفہ لے کر ابن سعود نے شریف حسین کی طرح ان کی غلامی نہیں کی بلکہ کویت کانفرنس میں ان کے روز افزوں مطامع سے بلاد عرب کو محفوظ رکھنے کی زبردست کوشش کی، تو کون کہہ سکتا ہے کہ محض وظیفہ لینے کے جرم میں وہ شریف کی طرح اسلام کا غدار ہوگیا۔

۳۔ بے شک ابن سعود نے ۱۹۱۵ء میں برطانیہ سے معاہدہ کیا تھا مگر وہ اعلانیہ کہتا ہے کہ "**اما المعاهده لا ممز قنا ما کل ممزق**" وہ معاہدہ تو صرف اس وقت تک تھا جب تک

نجد کی اندرونی تنظیم مکمل نہیں ہوئی تھی اور وہ خارجی مشکلات سے بچنا چاہتا تھا مگر اب جبکہ وہ اپنے تمام قوی کو پوری طرح منظم کرچکا ہے اس نے سختی کے ساتھ برطانیہ سے معاہدہ کی تنسیخ کا مطالبہ کیا ہے اور ممالک عربیہ میں برطانیہ کی استعماری مطامع کا مقابلہ شروع کردیا ہے۔ چنانچہ ۶۔ اکتوبر کے "الجمعیۃ" میں جریدۃ "الاردن" سے جو اقتباس دیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہی ابن سعود نے برطانیہ سے اس امر کا مطالبہ کیا تھا کہ ۱۹۱۵ء کے معاہدہ کو منسوخ کردیا جائے اور حکومت نجد کے استقلال کامل کو تسلیم کیا جائے۔

۴۔ اگر ابن سعود کا موجودہ حملہ حجاز برطانیہ کی تحریک پر ہوتا تو جدہ پر وہ کبھی کا قابض ہوچکا ہوتا۔ مولانا حسرت سے نہ معلوم کون کہہ گیا ہے کہ شریف حسین نے فلسطین پر برطانی سیادت کو تسلیم نہیں کیا اور اسی لئے وہ حجاز سے نکالا گیا۔ اگر وہ سیاست عرب کے سب سے بڑے ماہر علامہ رشید رضا کی کتاب "خطاب عام" کا مطالعہ فرمائیں تو انہیں معلوم ہوسکتا ہے کہ ممالک عربیہ کا جتنا تجزیہ ہوا ہے سب حسین اور اس کی اولاد کی مرضی سے ہوا ہے۔ شریف کے عزل اور اخراج سے تو اس کو کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اس کی معزولی صرف اس لئے عمل میں آئی تھی کہ وہ دنیائے اسلام میں بہت مغضوب ہوگیا تھا اور اسے تخت پر بٹھائے رکھنے سے اندیشہ تھا کہ تمام مسلمانوں کی ہمدردی ابن سعود کو حاصل ہوجائے گی اور یہی وجہ تھی کہ معزول ہونے کے بعد بھی وہ عقبہ سے بیٹھے بیٹھے تمام پتلیوں کو حرکت دیتا رہا۔ اسی طرح اس کے اخراج میں بھی یہ مصلحت پنہاں تھی کہ جب نجدیوں کے اقدامات سے برطانیہ میں اندیشہ پیدا ہوا۔ کہ کہیں عقبہ اور معان پر بھی وہ قابض نہ ہوجائیں تو اس نے ایک نمائشی الٹی میٹم دے کر حسین کو عقبہ سے قبرص بھیج دیا اور علی سے معاہدہ کرکے دو طرفہ مقامات پر امارت شرق اردن کا جھنڈا گاڑ دیا۔

۵۔ اصل میں یہ ایک واقعہ ہے کہ ابن سعود عرب کے اکثر مسلمانوں پر اپنی سیادت کو تسلیم کرانا چاہتا ہے مگر اس بیان میں کوئی حقیقت نہیں ہے کہ وہ اس کے معاوضہ میں انگریزوں کی جملہ شرائط ماننے کے لئے تیار ہے۔ جریدہ "الاردن" نے اپنے دونوں مضمونوں میں جن کا ترجمہ ۱۸ر ستمبر اور ۶ر اکتوبر کے "الجمعیۃ" میں شائع ہوا۔ صاف لکھا

ہے کہ ابن سعود نے برطانیہ کے تمام معاہدات کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب کچھ عرصہ سے انگریزی اخباروں میں اس کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے اور ریوٹر کی آنکھیں بھی اس سے بدل گئی ہیں، علاوہ ازیں اگر وہ سیادت کی خاطر انگریزوں کے تمام مطالبات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتا تو یقیناً دومۃ الجندل (جوف) پر اس وقت عربی جھنڈے کے بجائے یونین جیک بلند ہوتا۔٦۔ مولانا کے چھٹے الزام سے زیادہ مضحکہ خیز الزام اور کوئی نہیں۔ عربی اخبارات اس امر پر مسرت کا اظہار کررہے ہیں کہ ابن سعود نے عقبہ پر برطانوی قبضہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کردیا ہے اور جنگی مشکلات کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مگر ہمارے مولانا حسرت یہ نعرہ بلند فرمارہے ہیں کہ "عقبہ اور معان پر برطانیہ نے ابن سعود کی سازش سے قبضہ کیا ہے" اس کے ثبوت میں وہ یہ ظنون و اوہام کا گورکھ دھندہ پیش کرتے ہیں کہ جب محاصرہ جدہ سے علی کا ناطقہ بند ہوگیا تو انگریزوں نے ان سے طے کیا کہ ہم جدہ کا محاصرہ اٹھالیں تو عقبہ اور معان کی برائے نام حکومت شرق اردن کے حوالے کردیں گے۔ تب برطانیہ نے ابن سعود کو سمجھایا کہ تم جدے کا محاصرہ اٹھا دو تاکہ عقبہ و معان ہمارے قبضہ میں آجائے اور شام و فلسطین سے حجاز کا کوئی راستہ یا تعلق باقی نہ رہے۔ ایسی حالت میں اگر تم مدینہ پر حملہ کردگے تو ہم کو کچھ عذر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت تک جو اعتراض تھا وہ یہ تھا کہ مدینہ کے بعد بسلسلۂ عقبہ و معان انگریزی ریاست فلسطین میں بھی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ مولانا حسرت ہمیں معاف فرمائیں ان کا یہ گورکھ دھندا کم ازکم ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں۔ اول تو ہم حیران ہیں کہ برطانیہ اور ابن سعود کی اس مفاہمت کا حال ہمارے مولانا کو کیونکر معلوم ہوگیا۔ کیونکہ فلسطین و شام کے کسی ذمہ دار لیڈر یا اخبار کو اس کا نام و نشان تک نہیں معلوم لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جناب قدوائی کے "حاسۂ لاسکی" نے اسے ڈھونڈ نکالا ہے تو پھر ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر جدہ کا محاصرہ کسی سمجھوتہ کے ماتحت اٹھایا گیا تھا تو اب کیوں دوبارہ نجدی فوجوں نے اسے گھیر لیا ہے اور کیوں وہ سمجھوتہ بروئے کار نہیں لایا گیا۔

ابن سعود اور برطانیہ کے اس مزعومہ سمجھوتہ کی پوری تھیوری صرف اس بات پر قائم ہے کہ الحاق عقبہ و معان کے بعد ہی مصری اخبارات نے جدہ سے محاصرہ اٹھ جانے کی اطلاع شائع کی تھی۔ حالانکہ درحقیقت جدہ سے کبھی نجدی محاصرہ اٹھا ہی نہیں۔ اس

کی اصلیت صرف یہ ہے کہ موسم حج کے زمانہ میں ابن سعود نے اپنی فوجوں کے ایک بڑے حصہ کو (جو ضرورت سے زیادہ تھا) حج ادا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کو مصری اخبارات نے غلط سمجھ کر محاصرہ اٹھ جانے کا ہم معنی قرار دیا اور خود علی نے بھی اپنی فوجوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، مگر محاصر فوجیں اپنے مورچوں میں موجود تھیں۔ اس لئے سخت نقصان کے ساتھ انہیں واپس آنا پڑا اور انسحاب و عساکر نجد کی حقیقت ظاہر ہوگئی۔ یہ خبر تفصیل کے ساتھ تمام مصر میں شائع ہو چکی ہے۔

قارئین کرام غور کریں کہ! ابن سعود کی مخالفت میں مولانا حسرت بڑی تلاش کے بعد یہ چھ دلائل پیش کر سکے ہیں اور ان کی صحت و قوت کا بھی یہ عالم ہے کہ تحقیق و تفتیش کے پہلے حملہ ہی میں ان کا تار و پود بکھر جاتا ہے۔ برخلاف اس کے شریف حسین اور اس کی ذریات کے جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اگر انہیں بیان کیا جائے تو اس کے لئے ایک پورا دفتر چاہیے پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایک ایماندار شخص کیونکر ان دونوں کو ایک ہی مرتبہ میں رکھ سکتا ہے اور کس طرح مولانا حسرت کا ہم زبان ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ شریف حسین اور ابن سعود دونوں کو مرفوع القلم قرار دے۔

{ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۵ء }

مولانا نے جگہ جگہ اس امر پر زور دیا ہے کہ جس طرح شریف حسین اور اس کے بیٹے انگریزوں کے زیر اثر ہیں اسی طرح ابن سعود بھی ہیں اور بعض مقامات پر مولانا کے انداز تحریر سے یہاں تک مستنبط ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اب شریف حسین انگریزوں کے دربار میں معتوب ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ابن سعود منظور نظر بن رہا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ :۔

> ”ابن سعود کے موجودہ حملہ حجاز میں بھی حکومت برطانیہ کی یہ مصلحت مد نظر تھی اور ہے کہ پہلے شریف حسین اور اب شریف علی مجبور ہو کر قبضہ فلسطین کے متعلق انگریزی شرائط کو تسلیم کرلیں مگر شریف حسین نے اس عہد نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کردیا اور نکالے گئے اور عجب نہیں کہ آئندہ شریف علی کا بھی وہی حشر ہو“۔

اور اس کی تفسیر میں اس بیان سے استدلال کرتے ہیں کہ:۔

> ”سرگلبرٹ کلیٹن عنقریب ابن سعود سے ملنے والے ہیں اور اب کہ جزیرہ نمائے عرب شریف حسین کی مخالف برطانیہ روش کے اثر سے بالکل پاک ہو چکا ہے۔ اس بات کی پوری امید ہے کہ برطانیہ عظمیٰ اور ابن سعود کے درمیان سابق گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں گے“۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی رائے میں شریف حسین نے آخری ایام میں برطانوی اغراض کے خلاف عمل شروع کر دیا تھا۔ اس لیے انگریزوں نے اسے نکال دیا اور اب اس کی جگہ اپنے دوسرے پٹھو ابن سعود کو بڑھایا ہے۔ اگر فی الواقع مولانا کا مطلب وہی ہے اور ہم نے اسے صحیح سمجھا ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا برطانوی سیاست کے ایک بڑے نقاد ہونے کے باوجود اس کی پالیسیاں بالکل غلط سمجھے ہیں۔ انہوں نے برطانیہ کی گذشتہ سیاسی تاریخ سے کوئی سبق نہیں لیا اور حد یہ ہے کہ انسانی فطرت پر غور کرنے کی بھی تکلیف گوارا نہ فرمائی ورنہ ہرگز ایسی غیر معقول رائے قائم نہ کرتے۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ برطانیہ نے آج تک کسی طاقتور قوت کو حلیف نہیں بنایا۔ اس کی تفریقی سیاست کی رو سے یہ بنیادی اصول رہا ہے کہ وہ دو فریقوں میں سے اس فریق کو اپنا حلیف بناتا ہے جو نسبتاً کمزور ہو اور اس کے ساتھ اپنی قوت شامل کر کے طاقتور فریق کا سر کچل دیا کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی صاحب قوت کسی دوسرے کے اغراض کی غلامی نہیں کر سکتا اور اس کو اگر اپنا حلیف بنایا جا سکتا ہے تو صرف مساویانہ شرائط سے جو سیاسی لوٹ مار کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ کمزوروں کو اپنا آلہ کار بناتا ہے۔ جو اپنی قوت سے بالاتر خواہشات کو پورا کرنے کی طمع میں آسانی کے ساتھ اس کے غلام بن سکتے ہیں اور اپنے نام و نمود کے اقتدار سے مطمئن ہو کر اس کے لیے تمام اقتصادی و سیاسی منافع سے متمتع ہونے کا موقع بہم پہنچا دیتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کا جس شخص نے امعان نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اس پالیسی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اور خود موجودہ دور ہی میں جس طرح کمزور قوتوں کو جرمنی سے لڑا کر اس کا زور توڑا گیا ہے۔ اور جس طرح ترکوں کے مقابلہ میں عربوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں ہمارے مولانا کے لیے سبق ہے پھر جبکہ ہر

واقف کار انسان جانتا ہے کہ ابن سعود شریف حسین اور اس کے بیٹوں کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ طاقتور ہے تو کیا کسی عقلمند کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو برطانیہ نے اپنی غلامی کے لیے منتخب کیا ہے؟

علاوہ ازیں اگر مولانا حسرت موجودہ عربی سیاست پر غور کریں تو وہ اس حقیقت کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ برطانیہ کے نزدیک ابن سعود کی موجودہ فتوحات شدید خطرات کا پیش خیمہ ہیں اور اس کی ہرگز یہ پالیسی نہیں ہے کہ وہ اور طاقتور ہو جائے۔ عرب میں اس کے سیاسی مقاصد کے حصول کی بہترین صورت یہ ہے کہ سارا جزیرہ ملوک طوائف سے بھرا ہوا ہو' چھوٹے چھوٹے سردار ہروقت آپس میں لڑتے رہیں اور وہ ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں اپنا آلہ کار بنا کر ان سے فائدہ اٹھاتا رہے لیکن ابن سعود اور امام یحیٰ کی موجودہ حکومتوں میں سے ایک نے تمام وسط عرب کو خلیج فارس سے لے کر بحراحمر تک ایک سلطنت میں جذب کر لیا ہے' دوسرے نے جنوبی عرب کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مطیع کر کے ایک زبردست یمنی حکومت قائم کرلی ہے اور اس طرح جزیرۃ العرب کا ایک بہت بڑا حصہ دو طاقتور امیروں کے ماتحت جمع ہو گیا ہے۔ اس حالت کو برطانیہ کی سیاست ایک لمحے کے لیے بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی اور اس کے لیے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ ان دونوں امیروں کو اپنا دوست بنا کر ان کی قوت کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش کرے۔

مولانا حسرت موہانی نے اس مسئلہ پر بھی غور نہیں کیا کہ ابن سعود کو برطانیہ کی غلامی اختیار کرنے کے لیے کونسا امر داعی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ غلامی بنفسہٖ کوئی ایسی اچھی چیز نہیں ہے جو اپنے اندر انسانی فطرت کے لیے کوئی جاذبیت رکھتی ہو' بلکہ انسان یا تو اس کو کسی سخت مجبوری کی حالت میں برداشت کرتا ہے یا کسی ایسی غرض کے حصول کے لیے قبول کر لیتا ہے جو اس کی دست رس سے باہر ہو' پر جبکہ ابن سعود برطانیہ کی غلامی اختیار کرنے کے لیے نہ کسی طرح مجبور ہے اور نہ کوئی ایسی غرض رکھتا ہے جس پر وہ قادر نہیں ہے تو اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی مطلق العنان بادشاہی میں ایک دوسری قوت کی دراندازی کو قبول کرے اور اس کے اغراض کی غلامی کیا کرے۔ نجد کی حکومت اس نے اپنی قوت بازو سے حاصل کی ہے' اس پر وہ اپنی قابلیت اور طاقت سے

حکمران ہے۔ اس کی مسند اقتدار پر متمکن رہنے کے لیے وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے پاس ایسی طاقتور، بہادر اور کثیر التعداد فوج موجود ہے جس کے مالک کو کوئی قوت ایک ہولناک جنگ برپا کئے بغیر اپنے اوامر کی اطاعت پر مجبور نہیں کر سکتی اور اس پر مزید یہ کہ جس قوت (یعنی شریف اور آل شریف) کے مقابلہ میں وہ کھڑا ہوا ہے۔ اس کو شکست دینے کے لیے وہ کافی سے زیادہ مضبوط ہے اور اس کو کسی خارجی طاقت کی ادنیٰ سی مدد بھی درکار نہیں ہے پھر کوئی ہمیں بتائے کہ اسے کونسا ایسا لالچ دامن گیر ہو سکتا ہے جس کے باعث وہ برطانیہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر کام کرے۔

اگر سلطان نجد کی صحیح پوزیشن کو سمجھنے کے لیے یہ دلائل بھی کافی نہ ہوں تو ہم اس پر ایک حقیقت کا اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنے گھر میں بیٹھ کر رائے قائم نہیں کی، بلکہ خود عرب جا کر نہایت عمیق نظر سے اس کی سیاست اور ابن سعود کے ذاتی حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جزیرۃ العرب کی تطہیر اور اسلامی مصالح کی حفاظت و حمایت کے لیے اس وقت تمام جزیرہ میں کوئی شخص ابن سعود سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ علامہ رشید رضا جن سے بڑا سیاست عرب کا رازداں اس وقت مسلمانوں میں کوئی نہیں ہے۔ علامہ ابن سعود کی تائید و حمایت کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ سنوسی جو دنیائے اسلام کی محبوب ترین شخصیتوں میں سے ہیں اور مذہبی مسلک میں نجدیوں سے اختلاف رکھنے کے باوجود حجاز کے تمام حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ابن سعود ایک ایسے کام کے لیے اٹھا ہے جس میں اسلام کے لیے خیر و برکت کی بڑی امیدیں ہیں۔ سید توفیق شریف جو شام کے نہایت مخلص مسلمانوں میں سے ہیں نجد کے حملہ حجاز کے بعد خود مکہ گئے اور کئی مہینہ تک تمام حالات کی تحقیق کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کرنے پر مجبور ہو گئے کہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے عرب میں ایک شخص پیدا ہوا ہے، اس کو مزخرفات میں پھنسا کر ہاتھ سے کھو دینا اسلام کی کوئی خیر خواہی نہیں ہے پھر اگر مولانا حسرت اور ان کے جدید حلفاءان حضرات کو خائن اور سعودی ایجنٹ سمجھتے ہیں تو دوسری بات ہے ورنہ اگر انہیں اس کی دیانت و ایمانداری پر اعتماد ہے تو وہ مہربانی کر کے ہمیں بتائیں کہ جن لوگوں نے خود تجربہ اور مشاہدہ کر کے ایک رائے قائم کی ہے ان کی معلومات کو وہ گھر بیٹھے کس طرح جھٹلا رہے ہیں۔

اب مولانا حسرت کا ایک اور اعتراض باقی رہ جاتا ہے جو خود ان کے نزدیک بھی ابن سعود سے ان کی بیزاری کا باعث اصلی ہے۔ وہ انہدام قبب یا مقابر و مساجد کی مزعومہ بے حرمتی کا مسئلہ ہے۔ اگرچہ اس پر اس حیثیت سے بھی بہت کچھ بحث کی جاسکتی ہے کہ آیا شریعت میں قبوں کی کوئی اصل ہے یا نہیں اور آیا قبوں کے توڑ دینے سے جو قبروں سے الگ ایک زائد عمارت کی حیثیت رکھتے ہیں، قبروں کی بے حرمتی لازم آتی ہے یا نہیں اور آیا قبوں کے توڑنے سے فی الحقیقت نجدیوں کا مدعا قبروں کی بے حرمتی کرنا تھا یا انہوں نے اس فعل کو خدا اور رسول کا حکم سمجھ کر انجام دیا۔ لیکن یہ بحث اس مسئلہ کے طے کرنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتی کہ فی الحقیقت قبروں کے معاملہ میں نجدیوں کا تعامل کیا ہونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ قبوں کے متعلق آج پہلی مرتبہ ایک شرعی اختلاف کی آواز سن رہے ہیں، کیونکہ اب تک کتاب و سنت اور اجماع سلف کی رو سے یہ ان مسائل میں شمار کیا جاتا رہا ہے جو بالکل متفق علیہ ہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ قرون اخیرہ میں جہاں اور بدعات نے مسلمانوں میں اصول دین کی حیثیت اختیار کرلی ہے، وہاں ایک قبر پرستی اور اس کے لوازم بھی ہیں اور چونکہ آج مسلمانوں کی بدقسمتی سے ان میں کوئی حضرت فاروق اعظم جیسی ہستی موجود نہیں ہے جو تمام مسائل میں حکم اور آمر شریعت کی حیثیت رکھتی ہو تو کتاب و سنت کی تعلیمات کی رو سے اسلام کے بہترین مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے مسائل میں جب عمل کا سوال آئے تب ایسی معتدل روش اختیار کی جائے جس سے اصول دین بھی نہ چھوٹنے پائیں اور اختلاف و نزاع بین المسلمین کا دروازہ بھی نہ کھلے۔

یہاں تک تو ہم مولانا حسرت کے جذبات و خیالات سے متفق ہیں لیکن جب وہ اعتدال کے حدود سے آگے قدم بڑھا کر اپنے حلفاء کی طرح خود بھی افراط میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور انہدام قبب کے معاملہ کو نجدیوں سے نفرت اور بیزاری کا سبب بناتے ہیں تو ہمارا راستہ ان سے الگ ہو جاتا ہے اور ہمیں ان سے کہنا پڑتا ہے کہ اب آپ حق کے راستہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس کے لیے ہمارے پاس حسب ذیل وجوہ ہیں جن کی طرف ہم مولانا حسرت کو خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاتے ہیں:-

(ا) اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قبوں کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ ایک مختلف فیہ

مسئلہ ہے تو آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس طرح دوسرے مختلف فیہ مسائل میں دونوں پہلوؤں پر عمل کرنا جائز ہے اسی طرح اس مسئلہ میں بھی اسے جائز ہونا یا کم از کم نفرت و بیزاری کا مستوجب نہ ہونا چاہیے۔ ایک مسئلہ کا شرعی حیثیت سے مختلف فیہ ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس کے موافق بھی شرعی دلائل موجود ہیں اور مخالف بھی اور ظاہر ہے کہ جس فعل کے موافق شرعی دلائل موجود ہوں اس کے ارتکاب کو قابل نفرت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آمین بالجہر اور رفع یدین کا عدم جواز حنفیہ میں مسلم ہے لیکن ہم ایک شافعی کو نہ تو اس سے روکتے ہیں اور نہ اس بناء پر ان کے خلاف کسی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ مینڈک کھانا ہمارے ہاں ناجائز ہے' لیکن شوافع بے تکلف اسے کھاتے ہیں اور ہم اسے کوئی قابل نفرت فعل نہیں قرار دیتے' طلاق مکرہ کی صحت مذہب حنفی میں تسلیم کی جاتی ہے' لیکن دیگر ائمہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کے مقلدین کی ایسی مطلقہ عورتوں کو ہم مطلقہ قرار دے کر ان کی اولاد کو ناجائز نہیں کہتے پھر جبکہ یہ مسئلہ بھی ایسا ہی مختلف فیہ مسئلہ ہے اور نجدیوں کے فعل کی تائید میں احادیث صحیحہ' ائمہ اربعہ کی تصریحات اور امام محمد سے لے کر مولانا عبدالحی فرنگی محلی تک بڑے بڑے ممتاز فقہائے امت کے فتاویٰ موجود ہیں تو ان کے فعل کو بربری فعل کہنا اور نفرت و بیزاری کے قابل قرار دینا نعوذ باللہ صاحب احادیث علیہ الصلوۃ والسلام اور اکابر ائمہ و فقہائے امت علیہم الرحمتہ اجمعین کی جناب میں گستاخی کرنا ہے۔ اس کے متعلق آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نجدیوں کو اپنے مذہبی عقائد کا پاس و لحاظ کرنے کی ترغیب دیں اور انہیں سمجھائیں کہ اگر تمہیں اسلامی رائے عامہ کی تائید حاصل کرنی ہے تو ایک ایسے ملک میں اپنے مخصوص عقائد کے مطابق اجرائے احکام نہ کرو جو صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ تمام مختلف العقائد مسلمانوں کا ملک ہے۔

(۲) نجدیوں کے موجودہ تصلب کو مائل بہ اعتدال کرنے کی ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمانان ہند کے اس طبقہ نے جو ان کے خلاف شور و شغب برپا کر رہا ہے ان پر اپنے نقطہ نظر کو واضح نہیں کیا۔ ان کے علماء سے کوئی تبادلہ خیال نہیں کیا ان سے اپنے جذبات کی رعایت نہیں چاہی اور دفعتہ" ان کے خلاف یہ ایک زبردست شورش بربا کردی حالانکہ ازروئے انصاف یہ اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جب ایسی کوئی کوشش کی

جاتی اور نجدی اسے ٹھکرا دیتے۔

(۳) انہدام قبب کے جتنے واقعات ہیں ان کے متعلق یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ سب ابن سعود اور سلطنت نجد کے ذمہ دار ارکان کی غیر موجودگی میں ان کے علم و اجازت کے بغیر پیش آئے پھر جب ابن سعود ان افعال سے اپنی برائت کا اظہار کرتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ آئندہ ان کا ارتکاب ہرگز نہ ہونے پائے گا تو بلا وجہ اس پر ذمہ داری کو تھوپنا اور اسے لعنت و ملامت کا مستوجب قرار دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

(۴) سلطان ابن سعود کے وعدوں پر بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے ڈر کر اس نے ایسے وعدے کیے ہوں۔ نیز اس کے مکہ پہنچنے کے بعد سے اب تک کوئی قبہ نہیں ڈھایا گیا اور نہ کوئی ایسا فعل کیا گیا جسے "مختلف فیہ مسائل میں مخصوص نجدی عقائد کی تعمیل" قرار دیا جا سکتا ہو۔ مدینہ منورہ میں نجدیوں کا پر امن داخلہ ان وعدوں کی صحت پر ایک اور محکم دلیل ہے اور اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ "ان کے ہاتھوں تخریب آثار متبرکہ کا خطرہ رفع نہیں ہو سکتا" ایک بیماری ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔

(۵) یہ کہنا کہ جب تک نجدیوں کے عقائد نہ بدل جائیں اس وقت تک آثار متبرکہ کے باب میں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک افسوسناک تنگ نظری ہے اور اس کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ کو آثار متبرکہ سے نہیں بلکہ نجدیوں کے عقائد سے بحث ہے اور آپ محض اس لیے ان سے کد رکھتے ہیں کہ وہ حنبلی العقیدہ ہیں اور آپ کے عقائد سے متفق نہیں ہیں۔ اگر اختلاف کی بنیاد یہی چیز قرار پا جائے تو نجد و حجاز کی جنگ تمام دنیائے اسلام میں ایک مذہبی جنگ کی صورت اختیار کر جائے گی اور اس میں حنبلی، شافعی، مالکی مسلمانوں کے علاوہ حنفی مسلمانوں کی بھی وہ جماعت نجدیوں کی مؤید ہوگی جو قبر پرستی کے مسلک سے متفق نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی اخوت عنقا ہو جائے گی نفرت اور تفرقہ برپا ہوگا جسے دیکھ کر اغیار ہنسیں گے۔ پس ہمارے نزدیک آپ کو نجدیوں کے عقائد سے کچھ سروکار نہ رکھنا چاہیے۔ اگر وہ موجودہ تصلب کو چھوڑ دیں اور آثار متبرکہ کے متعلق آپ کے جذبات کی رعایت پر آمادہ ہو جائیں تو آپ کو اس سے کیا بحث کہ ان کا عقیدہ کیا ہے اور کس مسلک کے پیرو ہیں۔

پچھلی دو صحبتوں میں مولانا حسرت کی ان شکایات پر کافی گفتگو کی جا چکی ہے جو وہ ابن سعود سے رکھتے ہیں۔ اب یہ بات صاف ہو جانے کے بعد کہ ابن سعود کا دامن اجنبی اثر و اقتدار کی نجاست سے بالکل پاک ہے اور وہ قبوں قبروں کے معاملہ میں اس سلوک کا قطعاً مستحق نہیں ہے جو اس کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ہم کسی منصفانہ نقطہ نظر سے ابن سعود اور شریفی خاندان کو ایک مرتبہ میں نہیں رکھ سکتے۔ جیسا کہ ہم اوپر ایک جگہ عرض کر چکے ہیں۔ ہمارا مسلک شخصیت پرستی نہیں ہے، ہم نام و نسب کے امتیاز اور عقائد کے فروعی اختلاف کو صالحیت کا معیار نہیں سمجھتے۔ ہمارے ہاں صرف اسلامی مصالح کی کسوٹی پر شخصیتوں کو پرکھا جاتا ہے اور اس لحاظ سے ہمارے نزدیک اس خاندان کو جس سے آج تک سوائے اسلام کو نقصان پہنچانے کے اور کوئی فعل سرزد نہیں ہوا ایک ایسے شخص کے برابر جگہ نہیں دی جا سکتی جس نے ابھی تک کوئی فعل اسلامی مصالح کے خلاف نہیں کیا۔

فهل يستوى الاعمى و البصير

پھر کیا اندھے اور آنکھوں والے برابر ہو سکتے ہیں؟

اب ہمیں ان بدگمانیوں پر بھی ایک مختصر گفتگو کرنی چاہیے جو مولانا حسرت کے دل میں مسلمانان ہند کے اس سنجیدہ طبقہ کی طرف سے جاگزیں ہو گئی ہے۔ جو اس وقت ابن سعود کی حمایت کر رہا ہے۔ مولانا کو اپنے ان قدیم رفقاء سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ انہوں نے اہل نجد کو مکر و فریب کے ایسے ایسے گر بتا دیے ہیں جن کے ہوتے ہوئے انہیں نقض عہد میں ذرا بھی دشواری محسوس نہ ہوگی اور وہ بریت کے الزام سے مندرجہ ذیل باتوں سے کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے اپنے تئیں بری الذمہ سمجھ لیا کریں گے:-

(ا)۔ یہ کام ہمارے بعض غیر ذمہ دار اور متشدد افراد نے کیا ہے۔

(۲)۔ یہ فعل ہم سے ارادۃً سرزد نہیں ہوا بلکہ کشمکش جنگ و جدل کا اضطراری نتیجہ ہے۔

(۳)۔ جن آثار کی توہین کا ہم پر الزام ہے ان کی اصلیت ہی مشتبہ ہے، پھر ان کی توہین کیسی۔

(۴) ۔ فقہائے اہل ظاہر کی رائے میں مزاروں اور قبوں کو بنانا ناجائز ہے اس لیے ہمارا فعل تائیدوتوصیف کا مستحق ہے نہ کہ زجروتوبیخ کا۔

(۵) ۔ یہ فعل ہم نے نہیں کیا بلکہ حامیان شریف نے محض ہمارے بدنام کرنے کے لیے خود کیا ہے۔

مولانا حسرت نے یہ الزام خاص طور پر ہماری تحریر کے جواب میں پیش کیا ہے۔ اس لیے ہم مولانا کو اپنی ایک دو سطری تحریر کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ جو ۱۲ ستمبر کے ”الجمعیۃ“ میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے مولانا کو معلوم ہوگا کہ مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا عبدالماجد، مولانا عبدالحی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا احمد عرفان، مولانا عبدالحلیم صدیقی وغیرہ مخلصین امت کی جانب سے اس قسم کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں کونسی مصلحت پوشیدہ تھی۔ ہم نے مدینۃ الرسول کے متعلق غلط افواہوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ”اس وقت ہم دو مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف نجدیوں کا انتہا پسندانہ تشدد اور تصلب ہے، جس کے متعلق خود ابن سعود کو بھی اعتراف ہے کہ وہ اپنی قوم پر غیر معمولی اثر و اقتدار رکھنے کے باوجود اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکے اور دوسری طرف ہمارے ملک کے عوام کی جہالت اور جاہلانہ عصبیت کا یہ حال ہے کہ وہ ہر اس بدعت کو جو مذہب کا رنگ اختیار کر گئی ہے، عین مذہب سمجھتے ہیں اور خود مذہب سے بھی زیادہ اس کی پابندی کرتے ہیں ان دونوں کی انتہا پسندی اسلام کے بہترین مصالح کو نقصان پہنچائے گی ۔ کیونکہ انہی متضاد قوتوں کی ٹکر سے وہ شرارہ پیدا ہوگا جو مسلمانوں کے خرمن اتحاد و اتفاق کو تباہ کر دے گا۔ البتہ ان لوگوں کے لیے جو اصلاح کے طالب ہیں ان دونوں کے درمیان ایک متوسط راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ہندوستان میں اس مبتدعانہ جہالت کے خلاف سخت جہاد کریں جس کے باعث عوام غیر مشروع امور کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں اور دوسری طرف ابن سعود اور نجد کے بااثر علماء کو دین و ملت کے بہترین مصالح کا واسطہ دے کر مسلمانوں کے

ان جذبات کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنے کی طرف مائل کریں جو ان کے مخصوص عقائد کے مطابق خواہ کتنے ہی خلاف شریعت ہوں مگر سیاسی حیثیت سے بہر حال اس کا پاس کرنا ضروری ہے"۔

پس وہ مضامین جن میں قبوں کی شرعی تاریخی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ ہرگز اس مقصد کے لیے نہیں لکھے گئے تھے کہ ان سے نجدیوں کو قبہ شکنی کے لیے مسلح کیا جائے، بلکہ ان کا مدعا صرف یہ تھا کہ حقیقت سے ناواقف دنیا کے سامنے شرعی و تاریخی حقائق کو پیش کر کے اس ناواجب اہمیت کو کم کر دیا جائے جو ان کی نگاہوں میں محض جہل کی بنا پر قبوں کے متعلق پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح اس شورش کا زور کم کر دیا جائے جو اس وقت نجدیوں کے خلاف برپا ہے لیکن ان مضامین کا خطاب صرف ہندوستان تک محدود ہے۔ نجدیوں کے مقابلہ میں ان کی روش دوسری ہے۔ وہاں وہ اسلامی مصالح کو پیش نظر رکھ کر قبوں اور مولد کی حفاظت پر اس سے زیادہ زور دیتے ہیں جتنا حضرات لکھنؤ اور بدایوں نے دیا ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ابتدائے جنگ میں مکہ معظمہ کے اندر جو کچھ ہو لیا وہ تو ہو لیا، لیکن بعد میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہ آیا جو عام مسلمانوں کے لیے باعث دل آزاری ہو۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے اپنے تاروں اور مراسلات میں ابن سعود سے جتنی تاکید کے ساتھ مزارات اور موالد کی حفاظت کا مطالبہ کیا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطوط میں جس طرح اس کو مصالح اسلامی کی رعایت اور اعتدال و رواداری کی تلقین کی ہے اور مولانا محمد شفیع داوَدی، مولانا محمد عرفان اور مولانا عبدالحلیم صدیقی وغیرہ حضرات نے زمانہ حج میں جس سختی کے ساتھ ابن سعود اور حافظ وہبہ پر اس امر کے لیے زور دیا ہے کہ وہ حجاز میں بیٹھ کر اپنے مخصوص عقائد کے مطابق حکومت نہ کریں۔ اس کو دیکھنے کے بعد کوئی انصاف پسند شخص یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ جمعیت العلماء ہند اور مرکزی خلافت کمیٹی نے نجدیوں کو مکرو فریب کے گر سمجھا دئے ہیں"۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب ہم خود اپنی زبان سے قبوں کی شرعی و تاریخی حقیقت کو ضعیف بتا رہے ہیں تو پھر نجدی ان کی حفاظت کے متعلق ہمارے مطالبہ کو کیا وزن دے سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نجدیوں کے مقابلہ میں ہمارا طرز

استدلال اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہم ان سے یہ نہیں کہتے کہ قبوں کا رکھنا شرعاً فرض ہے یا یہ مزارات اور موالد انہی بزرگوں کے ہیں جن کی طرف انہیں منسوب کیا جاتا ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خواہ ان کی شرعی و تاریخی حقیقت کچھ ہو یا نہ ہو' بہر صورت یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ انہیں مقدس سمجھتا ہے۔ جب تک اس کی نگاہوں میں وہ مقدس و محترم ہیں' ان کا باقی رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ان سے تعرض کرنا اسلام کی کوئی خدمت نہیں بلکہ مسلمانوں میں نزاع و اختلاف برپا کرکے اسے کمزور کرنا ہے پھر کیا مولانا حسرت ہمیں بتائیں گے کہ موجودہ حالات میں اس سے بہتر اور کونسا مسلک ہو سکتا ہے؟

لفظ "مصلحت" کے معنی سمجھنے میں مولانا نے جو غلطی کی ہے اس کے متعلق ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ خرابی خود انہی کے دل میں موجود ہے جسے وہ مولانا ابوالکلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر مولانا حسرت نے ان کے اس مفصل مضمون کا مطالعہ کیا ہے جو ہم عصر زمیندار میں شائع ہو چکا ہے' تو غالباً انہیں خود محسوس ہو گیا ہو گا کہ مسٹن روڈ پر "مصلحت" کے جو معنی لیے جاتے ہیں وہ اس مفہوم سے کوئی نسبت نہیں رکھتے جس میں وہ رپن لین پر استعمال کیا جاتا ہے۔

مولانا حسرت کی دوسری شکایت یہ ہے کہ حامیان ابن سعود ہر اس شخص کو شریفی ایجنٹ قرار دیتے ہیں جو ابن سعود کے افعال سے بیزاری ظاہر کرتا ہے' حالانکہ ابن سعود کی مخالفت شریف حسین کی حمایت کو مستلزم نہیں ہے اور " نجدیوں کے موجودہ مخالفین میں سے ۹۵ فی صد وہ ہیں جو شریف حسین و علی کے پہلے ہی سے مخالف چلے آتے تھے"۔ اس شکایت کا ایک جواب تو وہ ہے جو حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے اپنی مسجد محتسب والی تقریر میں دیا اور دوسرا جواب یہ ہے کہ واقعہ کے اعتبار سے بھی حضرات بریلوی کی پوری جماعت شریف و آل شریف کی حامی ہے۔ خود مولانا حسرت اگر اپنے متعلق یقین دلائیں کہ وہ شریف کے حامی نہیں ہیں تو ہم خوشی کے ساتھ اس کو تسلیم کر سکتے ہیں لیکن لکھنؤ کانفرنس کی شرکت کے بعد غالباً خود ان کو بھی یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ مخالفین ابن سعود میں ان کے ہم خیال ۹۵ فی صدی نہیں بلکہ صرف پانچ فی صدی ہیں۔ مشیر حسین قدوائی صاحب' مولانا عبدالقدیر صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب کے متعلق سب کو

معلوم ہے کہ یہ حضرات آج سے نہیں ۱۳۴۲ھ کے ایام حج سے جب شریف حسین نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تھا، اس کے حامی ہیں اور ان کی "حمایت شریف"، "مخالفت ابن سعود" سے زیادہ پرانی ہے۔ ان کے علاوہ بمبئی لاہور اور دہلی میں جتنے مخالفین ابن سعود ہیں انہوں نے کبھی اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے کہ وہ شریف حسین اور اس کے خاندان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ رہے حضرات بریلی سو ان کا مسلک آج سے نہیں اس زمانہ سے سب کو معلوم ہے جب مولانا عبدالباری صاحب بھی شریف سے نفرت کرتے تھے پھر کیا مولانا ہمیں بتائیں گے کہ مخالفین ابن سعود کی ان بڑی بڑی جماعتوں کو الگ کر دینے کے بعد اور کونسی ایسی جماعتیں ہیں جن کا دامن حمایت شریف سے آلودہ نہیں ہے۔

اب ہمارے سامنے صرف ایک سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسئلہ حجاز کے متعلق ہمارے اور مولانا حسرت کے مسلک میں کیا فرق ہے۔ اصول کے اعتبار سے تو ہم اور مولانا اس باب میں متفق ہیں کہ حجاز میں ایک وطنی حکومت قائم کی جائے جو ہر قسم کے اجنبی اثرات سے پاک اور شخصیتوں کے اقتدار سے آزاد ہو، لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے مولانا نے جو تدبیر سوچی ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ مولانا حسرت چاہتے ہیں کہ ابن سعود کو یک قلم حجاز سے نکال دیا جائے اور شیخ سنوی کے ماتحت ایک عارضی حکومت قائم کر کے حجازی قوم کی رائے لے لی جائے کہ وہ کس قسم کا طرز حکومت پسند کرتے ہیں مگر اس طریقہ میں متعدد خرابیاں ہیں۔ جن پر مولانا نے غور نہیں کیا۔

ایک یہ کہ ابن سعود کو حجاز سے یک قلم نکال دینے کی خواہش اس اصول کی بنا پر ہے کہ اسے بھی شریف کی طرح قابل نفرت قرار دیا جائے حالانکہ درحقیقت وہ ایسے جرائم کا مرتکب نہیں ہے، جن کی بنا پر کسی حال میں بھی اس کے قبضہ حجاز کو برداشت نہ کیا جا سکتا ہو۔

دوسرے یہ کہ ابن سعود کے دفعۃً حجاز سے نکل جانے کا نتیجہ یا تو یہ ہوگا کہ فوراً علی اس پر قابض ہو جائے گا یا یہ کہ سارے ملک میں بدامنی و طوائف الملوکی پھیل جائے گی اور ظاہر ہے کہ ان دونوں حالتوں میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔

تیسرے یہ کہ ابن سعود اس قسم کے احمقانہ مطالبہ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ

بھی حجاز میں کوئی قابل اطمینان نظم حکومت قائم ہوئے بغیر اپنی فوجیں وہاں سے ہٹالے۔ حجاز سے واپس چلے جانے کے متعلق اس کا وعدہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مسلمانان عالم وہاں کوئی ایسا انتظام قائم کریں جس کے ماتحت پھر عہد شریفی کے سے مظالم اور ملحدانہ اعمال کا اعادہ نہ ہونے پائے اور ظاہر ہے کہ ایک مسلمان قوم کا سردار ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے۔ اگر دنیائے اسلام ارض حجاز کو بد نظمی اور الحاد و بے دینی کی اشاعت سے بچانے پر قادر نہ ہو تو پھر ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایک دوسری مسلمان قوم کو جو اس پر قدرت رکھتی ہے، محض تعصب کی بنا پر اس فرض کی ادائیگی سے باز رکھیں۔ یہ "حجاز برائے اہل حجاز" کا اصول ایک مستقل اور دائمی اصول کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حجاز صرف حجازیوں ہی کا نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا ہے اور اگر حجازی اس مقدس سرزمین میں حدود واقعی کے قیام کی اہلیت نہ رکھتے ہوں تو ہر اس مسلمان قوم کو وہاں جا کر انتظام کرنے کا حق حاصل ہے۔ جسے یہ فرض ادا کرنے کی مقدرت حاصل ہو۔

چوتھے یہ کہ شیخ سنوی کے ماتحت ایک عارضی حکومت قائم کرنے کے بھروسہ پر ابن سعود سے تخلیہ حجاز کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عارضی حکومت معرض وجود میں آتے ہی اتنی قوی نہیں ہو سکتی کہ سرکش بدوؤں کو قابو کر سکے، شریف علی کی ہوس و طمع اور اجنبی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر سکے اور اگر کوئی بڑی شورش برپا ہو جائے تو اسے آسانی کے ساتھ فرو کر سکے۔ اپنے تمام معاملات کو مستحکم اور منضبط کرنے کے لیے بہرحال اسے ایک مدت معینہ تک کسی اسلامی حکومت کی حمایت درکار ہو گی اور اگر وہ اسلامی حکومت نجد کی نہ ہو تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ اور کون سی ہو سکتی ہے۔ جب تک ایسی کوئی حکومت متعین نہ ہو جائے، ابن سعود سے تخلیہ حجاز کا مطالبہ کرنے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ آپ بد نظمی یا شریفی حکومت دونوں میں سے کسی ایک چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

پس ان تمام حالات کی وجہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حج سے فارغ ہونے کے بعد تمام عالم اسلامی کے نمائندے ایک جگہ پر جمع ہو کر ایسا لائحہ عمل تجویز کریں جو تمام مسلمانان عالم یا ان کی ایک بڑی اکثریت کے لیے قابل قبول ہو۔

* فسادِ علی گڑھ

علی گڑھ کے افسوناک واقعات پر اب تک ہم نے ایک مختصر نوٹ کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف ہندو اخبارات نے نہایت مبالغہ آمیز واقعات بیان کرکے خارجی دنیا کے لیے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل کر دیا تھا۔ دوسری طرف علی گڑھ کے مسلمانوں نے ایک طویل مجرمانہ سکوت کے بعد زبان کھولی بھی تو اس طرح کہ اس سے صحیح حالات کا پتہ چلانا امر محال تھا۔ ایسی حالت میں یہ بات ہمارے مسلک کے خلاف تھی کہ قطعی اور یقینی معلومات حاصل کئے بغیر کوئی اظہار رائے کریں لیکن اب خود ہمارے نامہ نگار نے وہاں جاکر حالات کی تحقیق کی ہے اور اس کے علاوہ ہمارے پاس چند اور بیانات ایسے پہنچ گئے ہیں جن پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں' اس لیے ہم آئندہ اشاعت میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات پیش کریں گے۔

☐ مجاہدہ ریف

{ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۵ء }

کچھ عرصہ سے مجاہدین ریف کے متعلق اس قسم کی تشویش انگیز خبریں آ رہی ہیں جن سے لوگوں میں عام طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ خدانخواستہ ہسپانیہ و فرانس کی متحدہ قوت ریف کی اسلامی جمہوریت کو فنا کر دینے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ ریوٹر کی زبان سے فرانسیسی و ہسپانی ادارہ ہائے جنگ نے جو خبریں اڑائی ہیں ان میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہم نے ریف کو پے در پے شکستیں دے کر اس کے دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا اور اب عنقریب ہم ہر طرف سے اس کو گھیر کر کچل ڈالیں گے۔ ریوٹر کے تازہ ترین افادات یہ ہیں کہ ہسپانی فوجیں اجدیر سے آگے بڑھ کر اور فرانسیسی فوجیں متالسہ سے اقدام کرکے سدی بورقبہ پر باہم مل گئی ہیں اور یہ ریف کے محاصرہ کامل کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن حقائق کا مطالعہ ایک دوسری ہی داستان بیان کرتا ہے۔ جس سے ان تمام دعاوی فتح کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

فرانس سے جنگ کی ابتداء ہوتے ہی بہادران ریف نے دفعتہ" مراکش پر ایسا

زبردست ہجوم کیا تھا کہ فرانس کی ساری قوت ان کے اقدام کو روکنے سے عاجز ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک طرف قصرالکبیر سے آگے بڑھ کر وزان پر قبضہ کرلیا جو مغربی مراکش کا ایک اہم مقام ہے اور دوسری طرف بنی زروال اور منہاجہ کو مطیع کرتے ہوئے عین فاس کی دیواروں تک پہنچ گئے جو مراکش کا دارالحکومت ہے اور تیسری طرف مطیریہ اور تسول کو روندتے ہوئے تازہ تک بڑھ آئے جو رباط سے الجزائر جانے والی ریلوے لائن کا ایک اہم مقام ہے۔ اس تمام فرانسیسی علاقہ میں جس کے حدود ریف کے مجموعی رقبہ سے کچھ زیادہ ہی تھے، سلطان عبدالکریم کے اعلان جہاد کا ایسا زبردست اثر ہوا کہ تمام قبائل اس کی حمایت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہر طرح مجاہدین کی اعانت کی۔ لیکن اس اقدام کا مقصد فرانس کو مرعوب کرنے، اور قبائل مراکش میں اضطراب برپا کرکے حدود ریف کو فرانسیسی تاخت سے بچالینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ اس حقیقت سے خود ریفی بھی واقف تھے کہ وہ اپنے ملک سے ڈیڑھ گنا زیادہ علاقہ فتح کرکے فرانس جیسی قوت کے مقابلہ میں اس پر قابض نہیں رہ سکتے۔ پس جب وہ اپنا کام پورا کر چکے تو فرانس کو زبردست مادی و اخلاقی نقصان پہنچانے کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے ملک کی طرف ہٹنا شروع کر دیا اور اب وہ ایسے وقت پر اپنے ملک میں واپس آئے ہیں جبکہ ان کے ہاں بارش کا موسم شروع ہو رہا ہے۔ اس فرصت کے زمانہ میں ان کے لیے موقع ہے کہ اطمینان سے اپنے اندرونی کاروبار کو درست کرلیں۔ کیونکہ بارش کے موسم میں دنیا کی کوئی قوت بھی یہ جرأت نہیں کر سکتی کہ ریف جیسے پہاڑی ملک میں جنگ کے لیے پیش قدمی کرے۔

بورقبہ پر فرانسیسی و ہسپانی فوجوں کے اتصال اور اجدیر کی فتح کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے لیکن ہسپانیہ و فرانس کے ماہرین جنگ اپنی قوت و شوکت کے نشہ میں اس حقیقت کو فراموش کر گئے ہیں کہ ریفیوں نے در اصل ان کو میدان دیا ہے تاکہ وہ کھلے ہوئے میدانوں سے نکل کر ان کی تنگ اور دشوار گزار گھاٹیوں میں پہنچ جائیں اور جہاں وہ آسانی سے ان کو شکار کر سکتے ہیں۔ اگر ہسپانیہ وادی القراط کی مشہور شکست کو بھول نہیں گیا تو اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بورقبہ تک اس کا اقدام فتح کا نہیں بلکہ ایک ذلیل شکست کا پیغام ہے۔

بہر حال اب تک ریف کی شکست کے متعلق جتنی خبریں ریوٹر نے بھیجی ہیں ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دشمنوں نے ریفیوں کو خود ان کے ملک میں شکست دی ہے۔ بلکہ ان کی حقیقت صرف یہ ہے کہ فرانس نے اس جنگ میں جتنا علاقہ کھودیا تھا اسے اب دوبارہ حاصل کرلیا ہے۔ ورنہ ریف کے علاقہ میں اگر اسے کوئی کامیابی نصیب ہوئی ہے تو وہ صرف اتنی کہ بورقبہ تک اس کی فوجیں بڑھ گئی ہیں۔ سو یا تو بارش کی وجہ سے رسد کا انتظام بگڑ جانے کے باعث خود بخود اس کو واپس آنا پڑے گا یا مجاہدین ریف کسی موقع پر اس کے بہادروں کو اس جرأت کا مزا چکھائیں گے۔ علاوہ ازیں فرانس میں جو اندرونی شورش برپا ہو گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ یقین بھی نہیں کیا جا سکتا کہ موسیو پین لیو کی حکومت زیادہ عرصہ تک اپنی موجودہ جنگی پالیسی پر قائم رہے گی۔ حال میں اشتراکی جماعت کی تحریک پر عام ہڑتال ہوئی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ فرانسیسی قوم مراکش میں جنگ جاری رکھنے سے ناراض ہے اور اگر اس کی مرضی کے خلاف جنگ کا سلسلہ بند نہ کیا گیا تو عام باشندوں میں جن کی اقتصادی مشکلات بہت زیادہ ترقی کر گئی ہیں 'اشتراکیت کے جراثیم پھیل جائیں گے' اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ یا تو موسیو پین لیو کو ریفیوں سے صلح کرنی پڑے گی یا فرانس اپنی حدود میں سکڑ جائے گا۔

ٹائمز کی جہالت

{ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۵ء }

اسٹار کی معافی شائع ہو جانے کے بعد ایک طرح سے وہ افسوسناک قضیہ ختم ہو چکا ہے جو ہابس والے توہین آمیز کارٹون نے شروع کر دیا تھا لیکن اب ٹائمز اف انڈیا نے اسے پھر چھیڑا ہے اور اس انداز میں چھیڑا ہے جس سے اس کی واقفیت اور معلومات کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

> ”جب یہ وہابیوں کے حامی اخبارات رسول اللہ ﷺ کو ایک انسان سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک آپ کو علم غیب حاصل نہیں تھا' نہ آپ کے توسل سے دعا کی جاسکتی ہے نہ آپ کے مزار کا طواف کیا جا سکتا ہے اور نہ آپ کا ”مولود“ پڑھنا جائز ہے تو پھر ان کو اسٹار کے کارٹون پر چیخ پکار کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ اس کا مدعا سوائے اس کے اور کیا سمجھا جائے کہ یہ بھی حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کا ایک طریقہ نکالا گیا ہے“۔

ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ ہمارے مذہب سے اس درجہ ناواقف ہیں وہ کیونکر ہمارے مذہبی معاملات پر بحث کرنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔ ٹائمز کے ایڈیٹر غریب کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ رسول اکرمؐ کے بشر ہونے یا نہ ہونے سے اس مسئلہ کو کوئی دور کا تعلق بھی نہیں۔ آپ کی ذات اقدس کے متعلق مسلمانوں کے عقائد خواہ کچھ ہی ہوں' یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ اسلام میں تصویر کشی قطعاً حرام ہے اور خصوصیت کے ساتھ بزرگان دین اور انبیا علیہم الصلوۃ والسلام کی تصویروں کو مسلمان کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کی تصویریں بنانے کے دو ہی مقاصد ہو سکتے ہیں ایک شرک اور دوسرے توہین جو ظاہر ہے کہ سخت دل آزاری کی باعث ہونی چاہیے۔ رہا یہ خیال کہ اس سے حکومت وقت کے خلاف ناراضی پھیلانی مقصود ہے تو ہمیں نہیں معلوم کہ ان انگلو انڈین اخبارات پر کب سے ”حکومت“ کا اطلاق ہونے لگا ہے اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ان میں اور حکومت میں ”من تو شدم تو من شدی“ والا معاملہ ہے تو شاید اب تک ہم ان کے ساتھ کبھی کا بائیکاٹ کر چکے ہوتے۔

بہر حال خواہ بدگمانی کتنی ہی ناجائز ہو لیکن یہ کہے بغیر جی نہیں مانتا کہ ٹائمز کے اس

نوٹ میں سے کچھ اپنے خرمن کی سی بو آتی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ اس کے لکھنے والے کسی اسلامی انجمن کے کوئی سرگرم رکن ہوں۔

* شام پر فرانس کا برائے نام اقتدار

اگرچہ حکومت فرانس نے صحیح واقعات کی اہمیت کو گھٹانے اور اپنی مشکلات کو پردہ اخفا میں رکھنے کی انتہائی سعی کی، مگر آخر کار یہ راز فاش ہو کر ہی رہا کہ شام میں فرانس کا استعماری اقتدار برائے نام باقی رہ گیا ہے۔ احرن سے جو اطلاع موصول ہوئی ہے اس نے شام کی صورت حال کو نہایت صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے اور اب وہ "تشویشناک" حالات جنہیں چھپا چھپا کر رکھا جا رہا تھا طشت ازبام ہو گئے ہیں۔ اب تک تو ہم سنتے تھے کہ دروز اب ختم ہو چکے ہیں انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان کی تمام قوت کو توڑ کر انہیں اطاعت پر آمادہ کر لینے میں اب زیادہ دشواریاں باقی نہیں رہیں مگر مانی کمیشن کے ایک رکن کو جواب دیتے ہوئے موسیو پین لیو کا یہ بیان کرنا کہ صرف جولائی ۲۵ء تک دروز کے مقابلہ میں چھ ہزار بیالیس افسر اور سپاہی مارے جا چکے ہیں اس امر کی بین دلیل ہے کہ دروز فرانس کے لیے نہایت خوفناک دشمن ثابت ہوئے ہیں مگر حقیقت کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ فرانس کے خلاف بغاوت کچھ دروز ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ شام کا تمام ملک فرانس سے بغاوت پر آمادہ ہے اور عملی جدوجہد شروع کی جا چکی ہے۔ چنانچہ ٹائمز کے نامہ نگار پیرس کی رپورٹ اس پر شاہد ہے۔ "دمشق اور حماۃ کے شدید فسادات" اگر اس بغاوت کی علامات نہیں تب اور کیا ہیں؟ ان فسادات کے فرو کرنے کے لیے "حلب اور رائق کی فوجوں" کو کمک کے طور پر طلب کرنا اگر اس بغاوت کا مقابلہ نہیں تو پھر اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ دمشق کے باہر جان و مال کا محفوظ نہ ہونا اور ہر جگہ بدوؤں کا آزادی کے ساتھ خود مختار بن کر رہنا۔ اس امر کے بین ثبوت ہیں کہ جہاں تک اثر و اقتدار اور قوت و حکومت کا تعلق ہے شام پر اب فرانس حکمران نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تخویف و مظالم کے بل پر برائے نام حکومت بھی کب تک باقی رہتی ہے۔

* جنگ مراکش اور جمعیتہ اقوام

اگر جمعیتہ اقوام میں اس ذمہ داری کا کچھ احساس ہو جو دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے اس نے خود ہی اپنے اوپر لی ہے تو ہماری رائے میں التوائے جنگ کا یہ زمانہ جبکہ بارش کے بہانہ سے فرانس و ہسپانیہ ریف کی سخت جانی کا تلخ تجربہ کرکے واپس ہو رہے ہیں اور بظاہر ان کے تمام حوصلے پست ہو چکے ہیں اس امر کے لئے نہایت مناسب ہے کہ وہ اپنی مداخلت سے اس ناشدنی جنگ کو ہمیشہ کے واسطے ختم کرادے۔ انگلستان کے اخبار "نیو لیڈر" میں مسٹر بریلس فورڈ نے مجاہدین ریف کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لیے برطانوی اشتراکیوں اور تجارتی یونین سے جو اپیل کی ہے اس میں موصوف نے یورپ کی ان سرمایہ دار دول کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے تمام ممالک میں مظاہرے کرنے پر ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے جس پر بہت واویلا کیا گیا۔ تو دیکھنا ہے کہ وہ جمعیتہ اقوام جو روغن اور دھاتوں کی کانوں پر مباحثہ کرنے میں نہایت جوش و خروش کا اظہار کرتی ہے اور جس کی تمام تجاویز سرمایہ کی حمایت اور کمزوروں کی مخالفت کے لئے وقف ہوتی ہیں یورپ کے سپید رنگ کے بھیڑیوں کو مراکش کی سرزمین سے نکل جانے پر کیونکر مجبور کرتی ہے اور اس چھوٹی سی بہادر قوم کے لئے زندگی کا حق تسلیم کرکے کس طرح اپنی انصاف پسندی کا ثبوت دیتی ہے۔ جس نے دنیا میں پہلی مرتبہ ایسے زبردست مجاہدہ حریت کی نظیر پیش کی ہے۔ اگر اس موقع پر جمعیتہ نے اپنے فرض کو محسوس نہ کیا تو ہم دول یورپ کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن کی جو کوششیں کی جارہی ہیں اور نکارنو کے معاہدہ پر دستخطوں کے بعد امن عام کے جو ترانے گائے جارہے ہیں وہ ایک بے وقت کی راگنی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ کیونکہ جب تک یہ طاقتیں اپنے حریصانہ استعماری لالچوں کو نہ چھوڑیں گی اور طاقتور کمزور کو نگل جانے کی سعی کرتے رہیں گے اس وقت تک دنیا کو موجودہ بدامنی و فساد سے نجات دلانا قطعاً ناممکن ہے۔

☐ میسور میں گاؤکشی کی ممانعت

{ ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۲۵ء }

ریاست میسور کو ہم اب تک اس حیثیت سے جانتے تھے کہ وہ ایک نہایت روشن

خیال اور ترقی یافتہ ریاست ہے۔ اس کے طرز جہانبانی کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید تھی کہ اگر موجودہ ہندو مسلم تعصب کی آگ ریاستوں میں بھی بھڑک اٹھی تو غالباً ہندو ریاستوں میں میسور وہ سب سے آخری ریاست ہوگی جو اپنے خرمن عدل اور رواداری کو اس سے متاثر ہونے کا موقع دے گی مگر یہ دیکھ کر ہمیں سخت افسوس ہوا کہ ہماری توقعات کے بالکل برعکس اس نے اپنے ممالک محروسہ میں گائے ذبح کرنے کی قطعی ممانعت کردی ہے اور اس معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات کی کوئی رعایت نہیں کی ممکن ہے کہ اس حرکت کے جواز میں ریاست کے ارباب حل و عقدار اور میسور اسمبلی کے ہندو ارکان کی طرف سے وہی پامال اقتصادی و زراعتی دلائل پیش کئے جائیں جو ہندوستان کے سنگھٹن حضرات پیش کرتے ہیں مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ تمام دلائل ان مذہبی جذبات کی پیداوار ہیں جو گذشتہ چند سال سے مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے گئے ہیں اور اس لیے ان کے اصلی معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ برادران ہنود قوت کے بل پر مسلمانوں سے اس چیز کا احترام کرانا چاہتے ہیں جو اسلام میں محترم نہیں ہے۔

ریاست میسور کی اس تنگ نظری اور عصبیت نے کم از کم یہ بات بالکل صاف کردی ہے کہ ہندو ریاستیں خواہ کتنی ہی وسیع القلب ہوں، مگر وہ مسلمانوں کے ساتھ اتنی رواداری کا سلوک نہیں کر سکتیں جتنا اسلامی ریاستوں میں ہندوؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسی جنوبی ہند میں حدود میسور سے بالکل متصل ایک اسلامی ریاست بھی موجود ہے جس کے عالی حوصلہ فرمانروا نے آج سے بہت دن پہلے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا پاس کرتے ہوئے قربانی گاؤ کے امتناع کا حکم صادر کر دیا تھا اور اس طرح دنیا کو بتا دیا تھا کہ مسلمان جب غالب اور ذی مقدرت ہوتے ہیں تو اپنے محکوموں کے ساتھ ایسی ایسی رعایتیں کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جن پر کوئی قوت انہیں مجبور نہیں کر سکتی لیکن اس کے مقابلہ میں ہم میسور اور دوسری ہندو ریاستوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی قوت و قدرت کا بزدلانہ استعمال کرتے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے رواداری و تحمل کا سلوک کرنے کی بجائے انہیں حکومت کے زور سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان دونوں اعمال میں جو نمایاں فرق ہے اسے دنیا دیکھ سکتی ہے اور اس طرح نہایت آسانی کے ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں کے قومی اخلاق کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال ہمیں مہاراجہ صاحب میسور سے یہ امید نہ تھی کہ وہ حضور نظام کے مقابلہ میں اتنے خفیف الوزن ثابت ہوں گے۔ یہ باتیں تو کچھ بھرت پور اور کشمیر کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتی ہیں۔

* نادان عورتیں

کچھ عرصہ ہوا کہ شملہ میں بعض اونچے طبقہ کی ہندوستانی عورتوں نے پنڈت موتی لال نہرو کو ایک ایڈریس دیا تھا؟ اور اس میں نہایت کھلی ظرافت کے ساتھ جو مشرقی نقطہ نظر سے بے حیائی کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ پنڈت جی کی مونچھوں کا ماتم کیا تھا جنہیں بدقسمتی سے حال ہی میں انہوں نے مونڈوا دیا۔ اور اگرچہ اس ایڈریس پر دستخط کرنے والیوں میں چند مسلمان عورتوں کا نام دیکھ کر ہمیں بھی سخت روحانی تکلیف ہوئی تھی کیونکہ مسلمان عورتوں کو خواہ وہ نام نہاد ہی کیوں نہ ہوں۔ تبرج جاہلیہ میں مبتلا ہوتے ہوئے کوئی سچا مسلمان نہیں دیکھ سکتا مگر یہ دیکھ کر ہمارے ان جذبات رنج و ملال میں ایک سکون سا پیدا ہو گیا تھا کہ ان بیباک خواتین میں پنجاب کے مشہور فرنگیت مآب بزرگ، سر محمد شفیع کی بیگم صاحبہ اور دونوں صاحبزادیوں کے سوا اور کوئی مسلمان خاتون شامل نہ تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس خانوادہ محترم پر مغربیت کی غلامی سیاست کے دائرہ سے ترقی کر کے معاشرت اور دل و دماغ تک وسیع ہو چکی ہے اور ہم ان کی اسلامیت اور مشرقیت کا اسی وقت ماتم کر چکے تھے جب ان کی خواتین نے رقص خانوں میں انگریز مردوں کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا تھا اس لئے ہم نے جدید جرم پر جو نسبتاً بہت زیادہ خفیف تھا، کوئی نوٹس لینے کی ضرورت محسوس نہ کی لیکن ہمعصر زمیندار اور سب سے زیادہ ہمعصر مسلم آؤٹ لک نے خالص اسلامی جوش کے ساتھ اس پر سختی کے ساتھ بازپرس کی اور اس لحاظ سے ان کی پیش بینی یقیناً قابل داد تھی کہ اس ایڈریس پر فرنگی اور نیم فرنگی حلقوں سے تحسین و آفرین کی جو صدائیں بلند ہو رہی تھیں ان سے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ شور تحسین ان خواتین کو بھی پردہ حیا سے باہر نہ نکال دے جو ابھی تک نقاب و چلمن کی قید میں اسلام کی حلت و حرمت کو لئے بیٹھی ہیں۔

اس موضوع پر مسٹر ایسن نے جو قابلانہ مضامین لکھے ہیں وہ ہر مسلمان کی دلی تائید

کے مستحق ہیں اور خصوصیت کی ساتھ اس لحاظ سے ان کی قدر وقیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ ان میں ایک ایسے شخص نے خالص اسلامی اور مشرقی نقطہ نظر سے بحث کی ہے جس کے قوائے ذہنی کا نشوونما کلیتہ ”مغرب کی آب و ہوا میں ہوا تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ کم از کم ان مضامین کو دیکھ کر تو وہ فرنگیت مآب حضرات ضرور کچھ شرم محسوس کریں گے جنہوں نے مشرق میں پیدا ہونے اور مشرقی عورتوں کی عفت مآب گودوں میں پرورش پانے کے باوجود یورپ کے چمکتی ہوئی تہذیب پر اپنی تہذیب و مدنیت اور سب سے زیادہ اپنے مذہب کے حکیمانہ اصولوں کو قربان کردیا ہے لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ وہ اپنی غلطیوں پر نادم ہونے کی بجائے ان پر اور زیادہ اصرار کررہے ہیں اور ان کے بہت سے ہندوستانی اینگلو انڈین حامی بھی جن میں اس محفل طرب و نشاط کے ہیرو پنڈت موتی لال جی بھی شامل ہیں۔ ان کی مدد پر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مسٹر اپسن پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ شروع کردی ہے اور اب وہ سر فضل حسین اور شیخ عبدالقادر صاحب سے جن کی خواتین شعائر اسلامی پر کاربند ہیں۔ یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ وہ مسلم آوٹ لک کی پالیسی کے خلاف اپنی ناراضی کا اظہار کریں اول تو یہ مسلمانوں کا ایک خالص داخلی مسئلہ ہے جس کی بنیاد ایک مذہبی اصول پر قائم ہے اس لئے اس میں کسی غیر مسلم کا مداخلت کرنا ویسے بھی نہایت ناموزوں ہے اور دوسرے اگر اس پر بحث بھی کرنی ہے تو جو حضرات مغربیت کی تقلید میں ہندوستانی عورتوں کو یورپین عورتوں کی طرح شوخ و شنگ اور بیباک دیکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے دلائل پیش کریں۔ اس پر سب و شتم کی کیا ضرورت ہے۔ پردہ کا مسئلہ آج کوئی نیا نہیں اور ابھی تک اس پر ایسا اجماع نہیں ہوا ہے کہ اس کی حمایت کرنے والے دلائل کی بجائے صرف گالم گلوچ کے مستحق سمجھے جائیں۔

ہمیں خصوصیت کے ساتھ موتی لال جی کے اس تار پر بہت افسوس ہوا جو انہوں نے کرنل بھولا ناتھ کی بیگم صاحبہ کو بھیجا ہے۔ اگر اس میں پنڈت جی نے مسٹر اپسن کے ذاتی حملوں کا بدلا لینے کی کوشش نہیں کی ہے تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ یہ تار بھیج کر وہ ایک شدید غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مسٹر اپسن کے جن مضامین پر انہوں نے اظہار ملامت کیا ہے ان میں غیر مسلم خواتین اور یورپین لیڈیوں کی حیا پر کوئی خاص حملہ نہیں

کیا گیا ہے۔ بلکہ عمومیت کے پیرایہ میں اس غلط آزادی کے مخالفت کی گئی ہے جو فطرتاً حیا اور عصمت کے لئے نقصان دہ ہے اور جس کے نتائج کو ہم یورپین معاشرت میں خوب اچھی طرح مشاہدہ کرچکے ہیں۔ اگر مسٹر اپسن کے اس خیال سے پنڈت جی کو کوئی اصولی اختلاف تھا تو اس کے لئے کوئی درشت لہجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی وہ نہایت صفائی کے ساتھ پردہ کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکتے تھے اور اس سلسلہ میں ہمیں بھی بہت کچھ استفادہ کا موقع ملنا ممکن تھا کیونکہ ہم عورتوں کی آزادی کے مسئلہ پر مدت سے کسی ایسے شخص کے خیالات سننے کے متمنی ہیں جس کے ذاتی تجربات بھی اس باب میں کچھ کم تلخ نہیں ہیں۔

یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ اسلام میں پردہ کے لئے کیا حدود مقرر ہیں۔ ان حدود سے عورتوں کی ترقی پر کیا اثر پڑتا ہے اور عورتوں کی ترقی کا صحیح معیار کیا ہے؟ اس وقت ہمارے سامنے صرف یہ سوال درپیش ہے کہ کیا مشرقی اور خصوصاً مسلمان عورتوں کو انگریز عورتوں کی تقلید میں اتنا اندھا ہوجانا چاہیے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بے تکلف مذاق کیا کریں اور ان کے حسن پر تنقیدیں کرکرکے اعلانیہ اپنے حسن کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ پردہ کے حدود اور اس کے مفید یا غیر مفید ہونے کے متعلق مسلمانوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن کوئی مسلمان بلکہ کوئی عصمت و حیا کی قدر کرنے والا انسان اس باب میں دو رائیں نہیں رکھ سکتا کہ عورت کے لئے سب سے بڑا جوہر اس کی حیا ہے اور اس کے لئے مردوں کے ساتھ اتنے خلاملا سے پرہیز کرنا تو بہرحال ضروری ہے جو اس کے جوہر حیا پر برا اثر ڈالنے والا ہو۔ آپ اسلام اور ایشیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو بیشک تلاش کرسکتے ہیں کہ عورتوں نے لڑائی کے میدانوں میں سیاست و حکمرانی کے ایوانوں میں اور علم و حکمت کی مجلسوں میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا ہے لیکن آپ کو مشرق کی کسی شریف سوسائٹی میں عورتوں کی اتنی آزادی کی مثال نہیں مل سکتی کہ وہ مردوں میں بیٹھ کر کسی کی مونچھیں غائب ہوجانے کا ماتم کریں۔ کسی کی ڈاڑھی کو اس کے حسن کا لازمی عنصر بتائیں۔ کسی سے کہیں کہ تمہاری منڈی ہوئی ڈاڑھی مونچھیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کسی کی تعریف کریں کہ تم نے مونچھیں بڑھاکر اپنے چہرہ کو خوب حسین بنالیا ہے اور کسی سے التجا کریں کہ کہیں اپنی چکنی چکنی ٹھوڑی پر ڈاڑھی بڑھاکر ہماری حسن پرستی کے

لطیف جذبات کو صدمہ نہ پہنچا دینا۔ عورتوں کی اس حد تک بیباکی مشرقی زندگی کے شریف اور اعلیٰ طبقہ تو درکنار۔ ادنیٰ طبقوں میں بھی کہیں نظر نہیں آسکتی۔ یہ صرف یورپ کے لئے مخصوص ہے اور جو لوگ اس کو مشرقی زندگی میں داخل کرنا چاہتے ہیں انہوں نے یا تو اس زبردست تمدنی اختلال سے باہر نکل آنکھیں بند کرلی ہیں جو اسی آزادی کی بدولت مغربی زندگی میں پیدا ہوگیا ہے۔ یا وہ اس مضرت کو محسوس کرنے کے باوجود اسے محض اس لئے قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں کہ اس طریقہ سے ہندوستانی زندگی بھی مغربی معیار کے مطابق "پرلطف" ہوجائے گی۔

بہرحال خواہ ہمارے غیر مسلم ہندوستانی بھائی اس حالت کو پسند کریں یا نہ کریں مگر کم از کم مسلمانوں کو ہم اتنی بد اخلاقی میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور ان حضرات کو سختی کے ساتھ ملامت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جو اپنی عورتوں کو اسلامی تہذیب کی بجائے نصرانی تہذیب کا نمونہ بنانا چاہتے ہے۔ ان حرکات میں ہم کو مستقبل اسلام کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ نظر آرہا ہے۔ انگریزی مدارس کی تعلیم اور انگریزی حکومت کے الحاد پرور اثرات نے ہماری جدید نسلوں میں جس حد تک اسلام سے بعد پیدا کردیا ہے وہ ہمارے لئے کچھ کم خطرناک نہیں ہے کہ اب اس پر ایک اور شدید خطرہ کے اضافہ کو قبول کرلیا جائے۔ اگر اس زہریلی تحریک کے خلاف سختی کے ساتھ جہاد نہ کیا گیا اور عورتوں میں بھی مغربیت کے انہی جراثیم کو پھیلنے دیا گیا جو مردوں میں صنف مخالف کی جانب بڑھنے کی تحریک پیدا کرتے ہیں تو ہمارے معاشرہ سے شرم و حیا کا جنازہ اٹھ جائے گا اسلام کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری اندرونی زندگی میں اسلامی روح باقی ہے' مگر جب مغربی الحاد ہمارے گھروں میں گھس کر حملہ کریگا اور ہمارے بچوں کو گھٹی میں زندقہ و الحاد پلایا جانے لگے گا تو پھر اسلام کا بس خدا ہی حافظ ہے۔

حسن پرستی کا مظاہرہ

{ ۱۰ر ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ --- ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۵ء }

اشاعت گزشتہ میں ہم نے بعض اونچے طبقہ والی عورتوں کی جس بے باکی پر نکتہ چینی کی تھی اس کی اہمیت کو بعض حضرات بہت گھٹا کر پیش کررہے ہیں۔ پنڈت موتی لال

نہرو کا ارشاد ہے کہ وہ ایک پر لطف اجتماعی مشغلہ تھا۔ جسے خواہ مخواہ مغربی اور ہندوستانی عورتوں پر حملے کرنے کے لئے بگاڑ لیا گیا ہے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ اور اس کے بعض ہمنوا حضرات فرماتے ہیں کہ وہ ایک لطیف مذاق تھا جس نے شملہ کی خشک سیاسی فضا میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی کی ایک لہر پیدا کردی تھی اور چند ہندو اخبارات نے تو اسے کھلم کھلا مسلمانوں کی مذہبیت پر چوٹیں کرنے کے لئے ایک نزاعی مبحث بنالیا ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر مضامین کا مفاد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی قیود نے انہیں نہایت بدمذاق بنا دیا ہے اور وہ ذرا ذرا سی دل لگی کی باتوں پر بھی بگڑنے لگتے ہیں گویا ان حضرات کے نزدیک وہ کچھ بات ہی نہ تھی جسے اتنا بڑا افسانہ بنالیا گیا ہے۔

اس غلط تعبیر کا پردہ اٹھانے کے لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس ایڈریس کو قارئین کرام کے سامنے پیش کریں جس پر یہ ساری بحث مبنی ہے۔ ذیل میں ہم اس کا لفظ بلفظ ترجمہ درج کرتے ہیں۔

بخدمت پنڈت موتی لال نہرو لیجسلیٹو لیڈر سوراج پارٹی لیجسلیٹو اسمبلی کے افتتاح کے دن ہم مستدعیات کو جو صنف اعلیٰ سے تعلق رکھتی ہیں فردوس بریں کی بلندیوں سے یہ دیکھ کر سخت رنج ہوا کہ سوراج پارٹی کا قابل لیڈر اپنی مونچھوں سے خالی ہے اور اس پر ہم نے خوب آنسو بہائے۔ ہم مستدعیات یہ سمجھتی ہیں کہ سوراج پارٹی کے لیڈر نے اس زیادتی سے قومی حسن کی ایک خاص علامت کو مٹا دینے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس سنگدلانہ حرکت سے اسمبلی کا حال بالکل اس طرح اپنے ایک بہترین زیور سے محروم ہوگیا ہے جس طرح دیوان خاص تخت طاؤس کے بغیر اجاڑ نظر آتا ہے۔

مستدعیات کی رائے میں مذکوہ بالا لیڈر کا یہ فعل اسمبلی کے دوسرے ممبروں کے لئے ایک بری مثال ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں اور ممبر بھی اسی طرح دوسری علامات حسن مٹا دینے آمادہ نہ ہوجائیں۔ مثلاً مسٹر جناح مونچھیں رکھنے لگیں۔ مسٹر گوسوامی راسپوٹین جیسی بے ڈھنگی ڈاڑھی بڑھائیں یا نواب اسماعیل خان اپنی چکنی تھوڑی پر بھیڑ کے صوف کی طرح ڈاڑھی رکھ رلیں۔ خدا ہندوستان کو ایسی شدید قومی مصیبت سے محفوظ رکھے۔ ہم آرٹ کو پسند کرنے والی مستدعیات صرف مسٹر رنگاایر کو اس بات پر معاف کرسکتی ہیں کہ انہوں نے اپنی گھنی ڈاڑھی اور زمین بوس لٹوں کو کاٹ پھینکا۔

کیونکہ ہمارے نزدیک جہاں تک ہندوستان کے خوفزدہ بچوں کا تعلق ہے۔ ان کا یہ فعل انتہائی رحمدلی پر مبنی تھا اور اس کام سے وہ نان کواپریٹو ہونے کے باوجود بچوں کی نگہداشت کی تحریک میں کوآپریٹو ثابت ہوئے ہیں۔

مستدعیات کی حسن پرستی کو یہ سن کر سخت صدمہ ہوا کہ بعض حلقوں میں اس قسم کی تجویزیں پیش کی جارہی ہیں کہ آنربیل مسٹر پٹیل اس واجب التعظیم برفانی کھیتی پر ایک استرے کی دھار کو استعمال کریں جو ان کے زنخدان کی زینت ہے۔ مستدعیات کی درخواست ہے کہ ایوان عالی کے ان محترم شیوخ کے خلاف ایک مستقل حکم نامہ جاری کرکے انہیں قومی حسن کی مزید تخریب و تنسیخ سے روک دیا جائے۔ کیونکہ اس حرکت کے باعث ہندوستان بے شمار امریکن سیاحوں کی آمد سے محروم ہوجائے گا۔ جو وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہتے ہیں اور اس طرح ملک کو ایک زبردست اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ چنانچہ وہ تمام مستدعیات جن کے دستخط اس ایڈریس پر موجود ہیں وہ پنڈت جی استدعا کرتی ہیں کہ وہ دوبارہ مونچھوں کو اپنے چہرہ کو آراستہ کرنے کی اجازت دیں اور اس طرح دوسرے سال کے آغاز سے پہلے ایک بڑی قومی یادگار پھر بحال کردیں"۔

یہ ہے وہ حسن پرستی کا مظاہرہ جسے بعض حضرات ایک "لطیف مذاق" اور ایک پُرلطف تفریح" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محض مذاق کی حیثیت سے یہ کوئی قابل اعتراض ایڈریس نہیں ہے' کیونکہ سنجیدگی کے دائرہ میں رہ کر اس سے بھی زیادہ کھلا ہوا مذاق کیاجاسکتاہے لیکن اس لحاظ سے کہ یہ مذاق عورتوں نے مردوں کے ساتھ کیا ہے اس کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے اور وہ صرف ایک مذاق ہی نہیں رہتا' بلکہ ایک اہم اجتماعی مسئلہ کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ عورتوں کی طرف سے مردوں کو اس قسم کا ایڈریس دیا جانا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ صرف بے پردہ ہی نہیں ہیں' بلکہ مردوں کے ساتھ ایسا بے تکلف میل جول رکھتی ہیں کہ ان سے خوب چہل کرسکتی ہیں۔ ان کے چہروں اور صورتوں پر تنقید کرسکتی ہیں' ان پر اپنے لطیف جذبات کا اظہار کرسکتی ہیں اور ان پر یہ تقاضا کرسکتی ہیں کہ ہمیں فلاں وضع نہیں بھاتی' اس لیے فلاں وضع اختیار کرو۔ جب عورتوں اور مردوں میں اس حد تک بے تکلفی بڑھ جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ یہ بے تکلفی اس مقام سے کتنی دور رہ جاتی ہے جہاں حیا کی حد ختم ہوجاتی ہے۔

یہاں یہ مقصود ہرگز نہیں ہے کہ خاص طور پر اس مجلس اور شخصیتوں پر تنقید کی جائے جن کا اس ایڈریس سے بلاواسطہ تعلق ہے۔ ہم آسانی کے ساتھ ان شخصیتوں کی شرافت اور ان کی پاکدامنی کا اعتراف کر سکتے ہیں لیکن سوال اشخاص اور خاص حالات کا نہیں ہے' بلکہ اصول اور عام رواج کا ہے اور ہمیں در اصل یہ دیکھنا ہے کہ آیا عورتوں اور مردوں کے درمیان اس قسم کا بے تکلفانہ ربط ضبط مناسب ہے یا نہیں ممکن ہے کہ چند مردوں اور چند عورتوں کو اپنے نفس پر اتنا قابو حاصل ہو کہ وہ آزادی کے ساتھ باہم میل جول رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو اخلاقی دنائت سے بچا سکتے ہوں لیکن اس شاذ اور غیر معمولی صورت پر عمومیت کے ساتھ کوئی اجتماعی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جب تک انسان میں حیوانی قوتیں اور بشری کمزوریاں موجود ہیں۔ اس سے یہ توقع کرنا حماقت ہے کہ وہ آزادی عمل ہونے کے باوجود شیطانی وساوس سے متاثر نہ ہوگا۔ جو لوگ سرے سے اس انسانی کمزوری ہی کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے تو بحث فضول ہے' کیونکہ وہ غریب ایک خیالی دنیا میں بستے ہیں۔ جہاں اس دنیا کے ہنگامہ عمل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ ہماری موجودہ عملی دنیا میں رہتے ہیں ان کے لئے اس کمزوری کو دیکھتے ہوئے دو راستے اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ یا تو وہ حیا اور عصمت کے سوال کو قطعاً نظر انداز کر دیں اور اپنا نقطہ نظر محض "ترقی" کو قرار دیں خواہ اس کے ساتھ عصمت وعفت ہو یا نہ ہو۔ یا پھر بنیادی چیز حیا اور عصمت کو قرار دیں اور "ترقی" کو صرف اسی حد تک جائز رکھیں جہاں تک وہ حیا کے دائرہ میں محدود رہ سکے۔ اول الذکر لوگوں کے لیے پردہ کو چھوڑ دینا ایک قدرتی بات ہے اور آخر الذکر کے لئے پردہ ایک ناگزیر شے' لیکن جو لوگ ان دونوں کے درمیان کسی حد اوسط کو تلاش کرتے ہیں' ان کا مطلوب ایک خیال ہے جو شرمندہ وجود نہیں ہے۔

یہی اصول ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے اور اسی کی بنا پر وہ مسلمان جو **وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیہ الاولی** پر ایمان رکھتے ہیں اس طریقہ کے خلاف اظہار ناراضی کر رہے ہیں۔ جسے بعض مسلمان عورتوں نے اسلامی تعلیم سے بعد کی بنا پر اختیار کر رکھا ہے۔

* جے پور میں ہندوؤں کی چیرہ دستی

۲۵ر اکتوبر کے "ہمدم" میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "قصبہ لالوٹ ضلع دوسہ ریاست جے پور" میں ایک شاہی زمانہ کی مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا ہے۔ مسجد کے نیچے جو دوکانیں ہیں ان کا کرایہ وصول کر کے مندروں پر صرف کر رہے ہیں اور اگر اس طرز عمل کے خلاف کوئی صدا بلند کی جاتی ہے تو اپنی اکثریت اور ہندو ریاست کی حمایت کے بھروسہ پر مسلمانوں کا مقاطعہ کراتے ہیں اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا کر پریشان کرتے ہیں۔ مسجد کے دروازہ میں ہندوؤں کا قفل پڑا ہوا ہے اور کوئی مسلمان اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا ہمیں تعجب ہے کہ ریاست جے پور جس کے تعلقات مسلمانوں سے نہایت قدیم ہیں اور جو مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں راجپوتانہ کی تمام ریاستوں پر سبقت کا شرف رکھتی ہے۔ اس افسوسناک طرز عمل کو کس طرح برداشت کر رہی ہے۔ ہم حکام ریاست کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ مہاراجگان جے پور کی قدیم روایات عدل و رواداری کو صدمہ نہ پہنچائیں اور اپنی ریاست میں اس مذہبی عصبیت کی اشاعت کو روکیں۔ جو دیسی ریاستوں میں برطانوی ہند سے بھی زیادہ برباد کن ثابت ہوں گی۔ برطانوی ہند میں تو ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک تیسری طاقت کا خوف ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس سے جانبداری کی امید نہیں کر سکتا، لیکن دیسی ریاستوں میں یہ روک بھی موجود نہیں ہے اور اگر وہاں یہ روح پھیل گئی تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہندو ریاستوں میں مسلمانوں کا مذہب محفوظ نہ رہے گا اور اسلامی ریاستوں میں ہندوؤں کے لیے کوئی رواداری موجود نہ ہوگی۔ پس ریاستوں کے لیے اولیٰ اور انسب یہی ہے کہ وہ اس عام سیلاب میں نہ بہ جائیں جو چند خود غرض لوگوں نے برطانوی ہند میں پھیلا رکھا ہے۔

* غازی عبدالکریم کی شرائط صلح

معلوم ہوتا ہے کہ ریف کے ساتھ اب کوئی نئی سیاسی چال چلنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ کچھ روز پہلے ریف کے ایک گمنام نمائندے کا ذکر اخبارات میں آیا تھا جس

کے متعلق یہ شک کیا گیا تھا کہ وہ ایک خود ساختہ نمائندہ ہے۔ مگر اب ریوٹر نے اسے باقاعدہ نمائندہ تسلیم کر کے یہ خبر مشہور کی ہے کہ وہ غازی عبدالکریم کی طرف سے ہسپانیہ و فرانس کی شرائط صلح وصول کرنے آیا ہے۔ اور یہ امید ظاہر کر رہا ہے کہ غازی عبدالکریم سلطان مراکش کی مذہبی سیادت کا اعتراف کر کے ایک ایسی داخلی آزادی قبول کر لیں گے جس کی حیثیت برطانیہ کی ایک خود مختار نو آبادی سے کچھ زیادہ نہ ہوگی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان بیانات کی کیا حقیقت ہے؟ مگر ہمارے نزدیک یہ بات ایک لمحہ کے لیے بھی قابل تسلیم نہیں ہے کہ جمہوریہ ریف کے صدر نے ایک ریفی کی بجائے ایک یورپین کو اپنا نمائندہ مقرر کیا ہوگا اور اسے یہاں تک اعلان کر دینے کا اختیار دے دیا ہوگا کہ وہ خارجی آزادی سے دست بردار ہو کر محض داخلی خود مختاری پر قناعت کر سکتے ہیں۔ اب تک غازی موصوف نے جن مبادی و اصول کو اپنے جہاد آزادی کا بناؤ اساس قرار دیا ہے وہ یہ تھے کہ ریف کو ایسی ہی ایک خود مختار اور مستقل سلطنت تسلیم کیا جائے جیسی افغانستان ہے۔ اور اسے اپنے خارجی و داخلی امور میں ویسی ہی آزادی عمل حاصل ہو جیسی کسی یورپین سلطنت کو حاصل ہے پھر جبکہ مراکش کی جنگ میں وہ نمایاں کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور ہسپانیہ و فرانس کی متحدہ قوت اپنے تمام سازو سامان کے باوجود انہیں زیر کرنے میں ناکام ہو چکی ہے، تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کیونکر اپنے ان مبادی سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ ہم کو تو بظاہر ان تمام خبروں کی حقیقت صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ کیپٹن گارڈن کیننگ صاحب پیرس ہی کے کسی ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ریف کے نمائندے بن گئے ہیں اور فرانسیسی وزارت خارجہ نے ان کو وہ شرائط طے کرانے کے لئے بھیجا ہے۔

❑ انڈمان میں موپلوں کی حالت زار

{ ۲ر نومبر ۱۹۲۵ء }

آخر کار انڈمان میں موپلوں کے ساتھ وہی زیادتیاں شروع ہو گئیں جن کا اس نوآبادی کی اسکیم سے اندیشہ تھا۔ اول اول تو موپلوں کو شوق دلانے کے لیے ان سے لمبے چوڑے وعدے کیے گئے اور مالی اعانت تک سے دریغ نہیں کیا گیا، مگر اب جبکہ موپلہ خاندانوں کی ایک کافی تعداد ان سیاسی چالوں کی شکار ہو گئی تو نامہ نگار "ہمدم" کی اطلاع کے مطابق وہ سب وعدے فراموش کر دیئے گئے اور ان کے ساتھ ایسی زیادتیاں شروع ہو گئیں جو بہت جلدی ان کی جسمانی، اخلاقی اور اقتصادی حالت کو تباہ کر دیں گی۔

نامہ نگار مذکورہ کا بیان ہے کہ ان پر زیادہ تر ہندو افسر مقرر کیے گئے ہیں جن کا سلوک ان سے کچھ اچھا نہیں ہے۔ زراعت کے لیے جو امدادی رقوم انہیں دی گئی تھیں وہ سختی کے ساتھ وصول کر لی گئی ہیں اور عربی اور دینی تعلیم کے لیے ان سے جو وعدے کیے گئے تھے وہ سارے سراب ثابت ہوئے ہیں۔

✱ جمعیت اقوام کی مسیحی حمیت

بلغاریہ اور یونان کے قضیہ میں جمعیت اقوام نے جس مستعدی کے ساتھ مداخلت کی ہے وہ اس کی مسیحی حمیت کو خوب ظاہر کرتی ہے۔ آج کئی سال سے ریف کے مجاہدین اپیل پر اپیل کر رہے ہیں کہ وہ اس خونریزی کو بند کرا دے جو یورپ کی دو استعماری طاقتوں نے مراکش میں برپا کر رکھی ہے مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی شام کے مظلوم باشندوں کو اس سے فریاد کرتے ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں مگر اس غفلت و بے توجہی کی بدولت یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ہزارہا بے گناہوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ عراق کے پامال استبداد باشندے برطانوی انتداب کے خلاف اس سے اپیل کرتے کرتے تھک گئے، مگر وہ ان کی کسی آواز پر کان نہیں دھرتی اور برطانوی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے انہیں ایک اور جنگ کے تنور میں دھکیل رہی ہے لیکن جب بلغاریا اور یونان میں ذرا سی آویزش ہو جاتی ہے تو وہ امن و صلح کی پیکر مجسم بن کر کھڑی ہوتی ہے اور اپنے ان لاڈلے فرزندوں کو للکار کر کہتی ہے کہ تم اتنی اتنی سی باتوں پر لڑ کر

یورپین تہذیب کو بٹا لگا رہے ہو۔ اس تفاوت عظیم کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ عراق شام اور ریف کے باشندے مسلمان ہیں۔ اس لیے ان کا خون جمعیت اقوام کی نگاہوں میں کوئی قیمت نہیں رکھتا اور اگر اس کے چھینٹے یورپ کے دامن پر لگتے ہیں تو وہ انہیں حسین نقش و نگار سمجھتی ہے لیکن بلغاریا اور یونان مسیحی اور فرنگی ہیں اس لیے ان کا ایک ایک بچہ کائنات سے زیادہ قیمتی ہے اور ان کے خون سے یورپین تہذب پر بد نما داغ لگ جاتا ہے۔

کیا یہی وہ مساوات ہے جس کا علم لے کر یہ انجمن کھڑی ہوئی تھی۔

* مجاہدین ریف کی نمایاں فتح

ریف کے متعلق جو تازہ خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کا نقشہ اس سے بالکل ہی مختلف ہے جو گذشتہ چند ہفتوں سے ہمارے سامنے پیش کیا جارہا تھا۔ فرانس اور ہسپانیہ کی سرکاری اطلاعات میں دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ مجاہدین ریف کو کافی سزا دینے کے بعد اب دونوں سلطنتوں نے محض بارش کی وجہ سے اپنی پیش قدمی کو روک دیا ہے اور ان کی فوجیں دم لینے کے لیے اپنے سرمائی مراکز کی طرف لوٹ آئی ہیں مگر ریوٹر نے اب اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ فرانس اور ہسپانیہ سخت شکست فاش کھا کر ریف سے بھاگے ہیں۔ یہ صرف **ریفیوں** کی جنگی چال تھی کہ وہ قصداً پسپا ہوتے چلے گئے اور دشمن کو اس کے مرکز جنگ سے ہٹا کر اپنے ملک کی دشوار گزار پہاڑیوں میں لے آئے۔ ہسپانیہ و فرانس کے ماہرین جنگ نے اپنی قوت کے گھمنڈ میں اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اسے **ریفیوں** کی کمزوری پر محمول کر کے اجدیر اور عین بورقبہ کی طرف بڑھ گئے مگر جب **ریفیوں** کی چال کامیاب ہو گئی تو انہوں نے ایک ہی حملہ میں ان کی متحدہ قوت کو توڑ کر رکھ دیا۔

اب حالت یہ ہے کہ **ریفیوں** نے نہ صرف اپنے ملک کو دشمنوں سے خالی کر لیا ہے بلکہ وہ فرانس کے ایک بہت بڑے علاقہ پر قابض ہیں۔ وہی بیابان جسے خالی کرا لینے پر فرانس نے بہت کچھ نعرہ ہائے مسرت بلند کئے تھے' آج پھر ریفی مجاہدین سے معمور ہے۔ وہی دریائے درغہ جس سے **ریفیوں** کو ہٹا دینے پر بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں اب دوبارہ

عبدالکریم کی قلمرو میں لہریں لے رہا ہے اور آج فرانس دس کروڑ فرانک اور دس ہزار آدمیوں کو ضائع کرنے کے بعد بھی ٹھیک اسی نقطہ پر ہے جس پر وہ جنگ کی ابتدا میں تھا۔ بالفاظ دیگر اس نے اپنی ہزاروں قیمتی جانوں اور کروڑوں روپے کے عوض ایک ذلیل شکست کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ فرانسیسی مدبرین اس شکست کی ذلت کو چھپانے کے لیے بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ ہم موسم سرما میں دوبارہ حملہ کریں گے۔ لیکن تازہ تاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین ریف کی جنگی سرگرمیاں برابر جاری ہیں اور ان کی فوجیں مراکش میں بڑھی چلی جا رہی ہیں۔ علاوہ ازیں "طان" کے نامہ نگار نے ان سرمائی امیدوں کی حقیقت بھی ظاہر کر دی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ:۔

> "عبدالکریم تو خود جاڑے کے زمانے تک جنگ کو طول دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے ریف کے برفستانی ملک میں ہسپانیہ و فرانس کی فوجیں کوئی جنگی کارروائی نہ کر سکیں گی اور ریفی مجاہدین جو برف سے کھیلنے اور اس پر اٹھنے بیٹھنے کے عادی ہیں، ان کو پیہم حملوں سے پریشان کر دیں گے"۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرانس جس چیز پر آس لگائے بیٹھا ہے وہ بھی اس کے لیے کچھ مفید ثابت نہ ہوگی اور یا تو اسے مجاہدین ریف کے مطالبات تسلیم کرنے پڑیں گے یا اپنی غیر محدود حرص پر اپنے موجودہ مراکشی مقبوضات کو بھی قربان کر دینا پڑے گا۔

* دمشق کی بربادی

دمشق کے تازہ واقعات اس قدر ہولناک ہیں کہ ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں جو ذرہ برابر بھی انسانیت کا احساس رکھتا ہو، فرانسیسی وحشت و بربریت کے خلاف ایک شدید جذبہ نفرت و غضب بھڑک اٹھتا ہے مگر ٹائمز اور ریوٹر کے نامہ نگاروں نے دمشق اور قاہرہ سے جو تفصیلات بھیجی ہیں اور جمعیت علمائے ہند کے نام فلسطین کی مجلس اسلامی اعلیٰ کا جو تار آیا ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دمشق کا قتل عام ان تمام مظالم سے بازی لے گیا ہے جو موجودہ دور تہذیب و تمدن میں کسی قوم پر کیے گئے ہیں اور اس لحاظ سے اس کو بلا خوف تردید بیسویں صدی کا

سب سے زیادہ ہولناک جرم کہا جا سکتا ہے۔ کوریا میں جاپان کے مظالم، پنجاب، مالابار، عراق اور مصر میں انگریزوں کی دراز دستیاں، سمرنا اور تھریس میں یونان کی حیوانی حرکات اور مقدونیہ میں بلقانی ریاستوں کے خوف ناک جرائم بجائے خود انتہا درجہ کے ننگ انسانیت اعمال ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دمشق کے اس ذبح عظیم کے سامنے وہ سب ماند پڑ گئے ہیں اور اس نئی مدنیت اور تہذیب کے عہد میں اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔

اب تک ہماری اطلاع کے ذرائع صرف چند مختصر تاروں تک محدود ہیں جن میں یقیناً پورے واقعات کا استقصاء ہونا مشکل ہے لیکن ان مختصر بیانات میں بھی جن حقائق کا اظہار کیا گیا ہے ان سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ فرانسیسیوں نے دمشق کی بے بس اور کمزور آبادی کو محض جذبہ انتقام سے مشتعل ہو کر تباہ کیا ہے۔ دروزی مجاہدین اور ان کے حلیف شامی قبائل پر جب ان کا کوئی بس نہ چلا اور ان کی پوری فوجی قوت بھی بہادران عرب کے جذبہ استقلال کو دبانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو وہ نامردانہ حرکات پر اتر آئے اور طاقتور کا بدلہ کمزور سے لینے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو وحشیانہ کارروائیاں کی ہیں وہ ہمارے سامنے فرانسیسی اخلاق کا ایک عجیب نمونہ پیش کرتی ہیں۔ نواح دمشق کے ایک جرگہ کو قتل کرکے اس کے چوبیس مقتولوں کی لاشیں موٹر میں ڈال کر دمشق لائے اور انہیں اونٹوں پر لٹکا کر شہر میں ان کا جلوس نکالا جس سے دمشق کی ساری آبادی رنج و غضب کے جذبات سے بھڑک اٹھی۔ پھر جب اس پر بھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو آسانی کے ساتھ قتل عام کا بہانہ بنایا جا سکتا ہو۔ تو اہل دمشق پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے باغی جرگوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے اور وہ جنرل سارائیل کو قید کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جس جرگہ پر ۱۰ ہزار فرانسیسی فوج کے سپہ سالار کو گرفتار کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا ہے اس کی تعداد ۴۰ سے زیادہ نہیں ہے اور اس کے متعلق بھی ریوٹر کا بیان ہے کہ جب اسے معلوم ہوا کہ فرانسیسی فوج اس کی موجودگی کو قتل عام کا بہانہ بنانا چاہتی ہے تو وہ شہر سے باہر چلا گیا لیکن اس کے نکل جانے کی خبر سن کر بھی فرانسیسی فوج اپنے ارادہ سے باز نہ آئی اور اس نے دمشق کی آبادی پر مسلسل ۵۷ گھنٹہ گولہ باری کی جس میں توپیں، مشین گنیں، ٹینک، ہوائی جہاز اور تمام برباد کن آلات حرب سے کام لیا گیا۔ اس عام تابکاری سے قبل کوئی اعلان نہیں کیا گیا جس سے بے گناہ

لوگ متنبہ ہو کر خطرہ کے مقام سے نکل جاتے' اس لیے تمام باشندے بلا کسی امتیاز کے اس گولہ باری کی نذر ہو گئے اور قدس شریف کے تار کی رو سے ۲۵ ہزار جانوں کا نقصان ہوا جس میں عورتیں' بچے' بوڑھے اور ضعفاء و معذورین سب ہی شامل تھے۔ اس قدر کثیر انسانی آبادی کے علاوہ بہت سے قیمتی آثار اور بیسیوں مساجد و معابد بھی مسمار ہو گئے اور کوئی ایسی چیز ان علمبرداران تہذیب کے جذبہ انتقام سے محفوظ نہ رہ سکی جو مذہب و تاریخ یا اخلاق کی نگاہوں میں مقدس و محترم ہے۔ متعدد مظلوم مسلمان اپنے بال و بچوں کو لے کر فرانسیسی حکام کے پاس پہنچے۔ وہاں امان طلب کر کے کامل اطاعت کا عہد کیا' مگر اس کے بعد بھی ان کی خون آشام بربریت مطمئن نہ ہو سکی اور وہ مزید ۶ گھنٹہ تک شہر پر آگ برساتے رہے۔

یہ اس قوم کے اعمال ہیں جسے یورپ کی سب سے زیادہ مہذب اور لطیف الحس قوم سمجھا جاتا ہے۔ وہ حریت مساوات اور جمہوریت کی داعی اول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور اسے اپنی شرافت و مدنیت پر ناز ہے' مگر آج شام میں اس نے جن صفات کا اظہار کیا ہے وہ ان حیوانی صفات سے ذرہ برابر بھی مختلف نہیں جن کا مظاہرہ آج سے سات سو برس پہلے وسط ایشیا کے نیم وحشی تاتاریوں نے اسی شہر دمشق میں کیا تھا پھر جب یورپ کے مورخین تیمور لنگ کی جہانسوزی اور چنگیز خان کی عالم کشی پر لعنت و ملامت کرنے میں اپنی ساری قوت بیان صرف کر دیتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ بیسویں صدی کے ان مہذب تاتاریوں پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرنے میں تامل کر رہے ہیں۔ جنہوں نے تمدن کے شاندار لباس میں ایسا خونخوار دل چھپا رکھا ہے۔

حسن اتفاق سے یہ المناک حوادث عین اس وقت پیش آئے ہیں جبکہ جنیوا میں جمعیت اقوام کا چھٹا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے اور مجلس انتدابات ان ممالک کی انتظامی حالت کے متعلق رپوٹیں پیش کر رہی ہے جنہیں جمعیت نے انگلستان اور فرانس کی "تربیت" میں دے رکھا ہے۔ اس بین الاقوامی انجمن کا دعویٰ ہے کہ وہ ضعیف قوموں کے مفاد و مصالح کی نگہبان ہے اور اسی نگہبانی کے حق کی بنا پر اس نے شام کو فرانس کی تربیت یا حمایت میں دیا تھا۔ اس لیے آج وہی تمام دنیا کے سامنے اس خون کی ذمہ دار ہے جو شام میں انتہائی بیدردی کے ساتھ بہایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے انتداب کی حقیقت چند لٹیروں کی تقسیم مال غنیمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن

اب وقت آگیا ہے کہ یا تو اس دھوکہ کے پردہ کو بالکل چاک کردیا جائے یا اگر وہ کوئی حقیقت رکھتا ہے تو وہ اپنے وجود کی صحت کو ثابت کرے۔ اس نے شام کو نہ تو فرانس کی غلامی میں دیا تھا اور نہ اس پر فرانسیسیوں کے کسی فاتحانہ حق کو تسلیم کیا تھا۔ اس کے میثاق انتداب میں صراحت کے ساتھ اس امر کی پابندی عائد کی گئی تھی کہ دولت منتدبہ شام کی ترقی اور رفاہیت اور حسن انتظام کے لئے اس کے سامنے جواب دہ ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ فرانس نہایت آزادی کے ساتھ آج چھ سال سے غریب شامیوں پر ظلم ڈھا رہا ہے اور جمعیت اقوام کے عین سالانہ اجلاس کے موقع پر اس نے محض اس جرم پر دمشق کو برباد کردیا ہے کہ اہل شام اس کی غلامی میں رہنے کے لئے تیار نہیں لیکن جمعیت اقوام اس سے ذرہ برابر بازپرس نہیں کرتی۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ یا تو جمعیت انگلستان و فرانس کی استعماری خواہشات کو پورا کرنے کا ایک نظر فریب آلہ ہے جس نے دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے ان کے استعمار کو انتداب کی شکل دے رکھی ہے یا وہ ان تمام ہولناک واقعات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتی جو شام میں پیش آرہے ہیں اور فرانس کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کو توپوں اور طیاروں کی قوت سے اپنی اطاعت پر مجبور کرے جو اس کی غلامی میں نہیں رہنا چاہتی۔

اس وقت جنیوا میں شام، فلسطین اور لبنان کا ایک وفد موجود ہے جس کے صدر عرب کے مسلمہ لیڈر امیر شکیب ارسلان ہیں۔ انہوں نے اپنی قوم کے مقدمہ کو بہترین طریقہ سے جمعیت اقوام کے سامنے پیش کیا ہے اور ناقابل انکار دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کردی ہے کہ شام میں فرانس کی حکومت ایک بدترین حکومت ہے اور فرانس کے لئے اب بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنے انتدابی دعاوی سے دست بردار ہوکر شام سے ایک ایسا دوستانہ معاہدہ کرلے جس میں شامی سیادت سے ادنی تعرض کئے بغیر اسے اقتصادی منافع حاصل ہوسکیں۔ اس کے ساتھ ہی امیر شکیب ارسلان نے یہ اعلان کردیا ہے کہ اگر فرانس سلامت روی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہو تو ۲۴ گھنٹہ کے اندر وہ دروزیوں کی جنگی حرکت کو روک سکتے ہیں لیکن اگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا تو ان کے لیے دروزی جہاد کو روکنا ناممکن ہے۔ یہ اعلان اور یہ توضیحات حوادث دمشق سے پہلے مجلس اقوام کے سامنے پیش کی جاچکی تھیں اور اس وقت مجلس نے ان پر کوئی توجہ نہیں کی تھی

مگر اب دمشق کے حوادث اور شام کے چپہ چپہ پر شورش و ہنگامہ کے ظہور نے امیر شکیب ارسلان کے ایک ایک لفظ کی صداقت ظاہر کردی ہے اور دنیا کے کسی صاحب عقل و بصیرت کے لئے اس حقیقت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ شام میں فرانسیسی حکومت ایک بدترین حیوانی حکومت ہے اور شامی قوم کا بچہ بچہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اگر ان باتوں کے پایہ تحقیق کو پہنچ جانے کے بعد بھی جمعیت اقوام کوئی نوٹس نہیں لیتی تو مظلومین اور مجبوروں کے دلوں سے اس کی وقعت بھی جاتی رہے گی اور اسے رہزنوں کے ایک مجمع ناجائز سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دی جائے گی۔

بہرحال خواہ مجلس اقوام اس طرف توجہ کرے یا نہ کرے مگر ضرورت ہے کہ مسلمانان عالم اور تمام مشرقی اقوام اس خوفناک غارت گری کے سبق سے عبرت حاصل کریں اور یورپین استعمار کی ان چیرہ دستیوں کو روکنے کے لئے ایک زبردست جدوجہد شروع کردیں۔ دمشق کا حادثہ صرف شام' یا صرف عرب' یا صرف اسلامی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا' بلکہ وہ مغرب کی طرف سے مشرق کو ایک کھلا چیلنج ہے جس کا صاف اور واضح مفہوم یہ ہے کہ مغرب کے لئے مشرق کی کوئی چیز محترم نہیں' اگر مشرقی قومیں اپنی غلامی کی بندشوں کو کاٹنے کی کوشش کریں گی تو ان کی جان و مال' عزت' آبرو' تہذیب و تمدن اور مذہب کسی چیز کا احترام نہ کیا جائے گا اور طلب حقوق کے جرم میں ان کو وہی سزا دی جائے گی جو فرانس نے دمشق کو دی ہے۔

☐ شام اور فرانس

{۱۸ر ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ - ۶ر نومبر ۱۹۲۵ء}

ہم نے اپنے گزشتہ مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ دمشق کا حادثہ مشرق کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے۔ جس کا صاف اور واضح مفہوم یہ ہے کہ مغرب کے لئے مشرق کی کوئی چیز محترم نہیں ہے۔ اگر مشرقی قومیں اپنی غلامی کی بندشوں کو کاٹنے کی کوشش کریں گی تو ان کی جان' مال' عزت و آبرو' تہذیب وتمدن اور مذہب کسی چیز کا احترام نہ کیا جائے گا اور طلب حقوق کے جرم میں ہر مغربی قوم انہیں وہی سزا دے گی جو فرانس نے دمشق کو دی ہے۔ یہ الفاظ احیاناً ہمارے قلم سے نکل گئے تھے اور ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ ان کی

صداقت پر فوراً ہی ایک معتبر شہادت مہیا کر دی جائے گی لیکن ۱۴؍ اکتوبر کے ٹائمز آف انڈیا میں یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ عین اس وقت جبکہ ہم وہ الفاظ کہہ رہے تھے۔ ٹائمز کا افتتاحیہ نگار ان پر صداقت کی مہر ثبت کرتا جا رہا تھا۔ اس نے ظلم کے عنوان سے حادثۂ دمشق پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مغرب کا "انسان اعلی" خواہ وہ یورپ کی کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، اپنے آپ کو مشرقی قوموں کا مالک الرقاب سمجھتا ہے۔ اور اس کے نزدیک ان مشرقی قوموں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر کوئی ایسی تعدی ناجائز نہیں ہے جس کا مقصد انہیں غلامی کے آداب سکھانا ہو۔ یہ حیوانیت ٹائمز کے جذبات سے کوئی اپیل نہیں کرتی کہ فرانس نے ایک شہری آبادی پر جس میں عورتیں، بچے، بوڑھے اور بیمار سب ہی شامل تھے۔ بلا کسی امتیاز کے گولہ باری کی، یہ درندگی اس کے دل میں کوئی نفرت پیدا نہیں کرتی کہ اہل شہر کے اظہار عجز اور طلب امان کے بعد بھی ان پر ۶ گھنٹہ تک آگ برسائی گئی۔ یہ ہولناک منظر اس کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں کرتا کہ ایک انسانی آبادی پر مسلسل ۵۷ گھنٹے گولہ باری کی گئی اور تیس چالیس ہزار انسانوں کو پیوند خاک کر دیا گیا۔ یہ تاتاری وحشت اس کے اندر کسی مدنی احساس کو متحرک نہیں کرتی کہ دنیا کے قدیم ترین شہر کے بے بہا تاریخی آثار کو نہایت بیدردی کے ساتھ مٹا دیا گیا۔ اس کے دل میں اگر کوئی خیال آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ فرانس شام کا متولی تھا۔ جمعیت اقوام نے اہل شام کو اس کی تربیت میں دیا تھا اور شامیوں کو کوئی خاص حق نہیں تھا کہ اسے ان ذمہ داریوں کو انجام دینے سے روکیں جو جمعیت اقوام نے اس پر عائد کر دی ہیں اس لئے وہ پورا حق رکھتا تھا کہ "امن و آئین" کو برقرار رکھنے کے لئے شامیوں کے تشدد کا جواب سخت تشدد سے دے۔ ممکن ہے کہ اس کور چشمی کو یہ کہہ کر معاف کر دینے کی سفارش کی جائے کہ یہ محض ایک اخبار کے خیالات ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ خیالات دراصل مغربی ذہنیت کی بالکل صحیح نمائندگی کرتے ہیں اور ان میں ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ تنہا فرانس ہی اس ظلم و ستم کا مجرم نہیں ہے جو دمشق میں کئے گئے ہیں۔ بلکہ ہر یورپین قوم اپنے مشرقی محکوموں پر ایسے ہی مظالم کرنے کے لئے تیار ہے کیونکہ ایک مغربی کی نگاہوں میں ایک مشرقی کے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

پھر سب سے زیادہ حیرت ہمیں یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ٹائمز نے اپنے ان خیالات کی حمایت میں دلائل بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا میں شاید ظلم و استبداد ہی ایک ایسی پالیسی ہے جو کبھی دلائل کی شرمندہ احسان نہیں ہوئی، کیونکہ تلوار کے سوا اس کا اعتماد اور کسی چیز پر نہیں ہے مگر یہ صرف یورپ کی جدت آفرینی ہے کہ وہ اس کی حمایت میں بھی دلائل پیش کرتا ہے اور اس پر دیدہ دلیری و جسارت کا یہ حال ہے کہ ایسے ناجائز مقدمہ کی وکالت کرتے وقت نہ اس کی آنکھ میں کوئی شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ دل میں کوئی خجالت۔ بہرحال اگر قتل و غارت اور وحشیانہ درندگی کی حمایت میں بھی کوئی دلیل پیش کی جاسکتی ہے تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہے۔ ٹائمز کے استدلال کی بنیاد تین امور پر ہے:۔

پہلے یہ ہے کہ: اہل دمشق نے باغی جرگوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک جائز اور قانونی حکمران کے خلاف بغاوت غیر قانونی ہے اس لئے فرانس ان کے خلاف قوت کے استعمال میں حق بجانب ہے۔

تیسرے یہ کہ فرانس دمشق میں سخت تعزیری کارروائیاں کرنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ باغیوں کے اقدامات نے بیروت اور دمشق کے مواصلات کو سخت خطرہ میں مبتلا کردیا تھا اور شام میں فرانسیسیوں کا نفس وجود معرض ہلاکت میں تھا۔

ان تینوں دلیلوں کی ترتیب پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کے تمام حقوق اور فرائض کی بنیاد جمعیت اقوام کا انتداب ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جمعیت اقوام نے اسے شام میں امن و آئین کے قیام کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارا پہلا سوال تو یہی ہے کہ جمعیت اقوام کو شام کی قسمت کا فیصلہ کردینے کا کیا اختیار تھا۔ کیا ارض شام اس کی جائیداد تھی کہ وہ اس کو ہبہ کردینے کا حق رکھتی تھی۔ کیا شام کے نمائندے جمعیت میں شریک تھے جن کی رائے سے اہل شام کی قسمت فرانس سے وابستہ کردی گئی تھی۔ کیا اہل شام کو حق انتخاب حکومت دیا گیا تھا جس کے مطابق انہوں نے اپنی مرضی سے فرانس کی حکومت پسند کرلی تھی پھر اگر ان تینوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں تھی تو جمعیت اقوام نے کس حق کی بناپر فرانس کو شام کی حکومت سونپ دی۔ فرانس نے شام کو تلوار کے زور سے فتح نہیں کیا تھا کہ وہ اس پر کسی فاتحانہ حق کا دعویٰ کرسکتا ہو۔ شامیوں نے

فرانس یا اس کے اتحادیوں کی اطاعت قبول نہیں کی تھی کہ وہ ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں۔ وہ جنگ میں اتحادیوں کے صریح وعدوں کی بنا پر ایک اتحادی کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اور ان کی شرکت کے بغیر بلاد عرب پر اتحادیوں کا تسلط قطعاً ناممکن تھا پھر اگر سائیکس پکو کے خفیہ عہد نامہ کی بنا پر جو بلا شک و شبہ ایک ناجائز اور غیر قانونی تقسیم نامہ تھا اور جس سے اہل شام قطعاً بے خبر تھے۔ ان کو فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا ہے تو اسے کیونکر ایک جائز فعل کہا جا سکتا ہے۔

یہ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انتداب کی گفت و شنید شروع ہو جانے کے بعد سے آج تک برابر اہل شام اس کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ انہوں نے جلسوں میں اپنی ناراضی کا اعلان کیا، اخبارات میں اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔ جمعیت اقوام کے فیصلہ کے خلاف قومی حکومت قائم کی اور جب جمعیت اقوام کی طرف سے ایک امریکی کمیشن تحقیق کے لئے بھیجا گیا تو تمام باشندگان شام نے ہم آہنگ ہو کر اس امر کا اعلان کیا کہ ہم آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جب فرانسیسی فوجیں انتدابی حقوق کا چارج لینے کے لئے شام پہنچیں تو انہوں نے سختی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور قوت سے مغلوب ہونے کے بعد نہ صرف زبان سے اس ناجائز حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔ بلکہ ملکار، بلاد العلوبین، جبل عاملہ دیرالزورا اور جبل الدروز میں عملاً فرانس کے خلاف مسلح جدوجہد کرتے رہے۔ جنہیں فرانسیسیوں نے "بغاوتوں" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ان تمام کوششوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اہل شام کی رضامندی حاصل کئے بغیر بلکہ ان کی شدید ناراضی کے باوجود فرانس کو ان پر مسلط کیا گیا ہے۔ پھر کیا کسی بین الاقوامی قانون سے یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ کسی غیر مفتوح قوم کو جس سے اتحاد کا معاہدہ اور آزادی کا عہد کیا گیا تھا اس کی مرضی کے بالکل خلاف ایک غیر قوم کی غلامی میں دے دینا جائز ہے۔

لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اس انتداب کو جائز تسلیم کر لیا جائے تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ فرانس کو یہ انتدابی خدمت کس غرض کے لئے سونپی گئی تھی؟ خود ٹائمز کے الفاظ میں اس کی غرض صرف یہ تھی کہ فرانس اس کو تربیت دے کر ایک جدید طرز کی آزاد اور ترقی یافتہ حکومت کے درجہ تک پہنچا دے۔ مگر فرانس کے گزشتہ پنج سالہ اعمال

اس کے بالکل خلاف شہادت دیتے ہیں۔ اس نے اپنی انتدابی زندگی میں آج تک ایک کام بھی ایسا نہیں کیا ہے جسے ترقی کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہو۔ نہ زراعت کو کوئی ترقی دی۔ نہ صنعت و تجارت کو فروغ دیا نہ علوم و فنون کی اشاعت کی اور نہ قومی ثروت کو بڑھانے کا کوئی انتظام کیا بلکہ اس کے برعکس شام کو اس حالت سے بھی گرا دیا جس پر ترک اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ چنانچہ شام کا سب سے بڑا گہوارہ علمی آج ان درسگاہوں سے محروم ہے جو ترکوں نے وہاں قائم کی تھیں۔ اس کا مدرستہ الحقوق (لا کالج) بند کردیا گیا ہے۔ اس کا مدرستہ الصنائع ایک فوجی ہسپتال بنادیا گیا ہے۔ اس کے مشہور مدرستہ التجارت کو توڑ دیا گیا ہے اور ترکی کے زمانہ میں جو ٹریننگ کالج قائم تھے انہیں ایک اوسط درجہ کے مدرسہ میں منتقل کردیا گیا ہے۔ البتہ اس نے شام کو "ترقی" دینے کے بجائے اپنے لئے یہ فرض کرلیا ہے کہ شہری آبادیوں پر گولے برسانا عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو قتل کرنا اور مجرموں کا بدلہ بے قصوروں سے لینا سب کچھ جائز ہے۔ اس کے انتداب کا آغاز خونریزی سے ہوا ہے۔ دوران انتداب میں وہ برابر خون بہاتا رہا ہے اور اب ان آخری ساعتوں میں بھی وہ برابر خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔ یہ اس کی ساری "ترقی پرور" زندگی کا خلاصہ ہے۔

ممکن ہے کہ ہمارے اینگلو انڈین ہم عصر کو اپنے حلیف کے اعمال سے پوری واقفیت نہ ہو۔ لیکن ہمیں اس کے انتدابی اعمال کی پوری تاریخ ازبر ہے۔ اس نے معرکہ قیلون میں شامیوں کا خون بہا کر دمشق پر اپنی حکومت قائم کی۔۔ اس نے بعلبک کی بغاوت کے جواب میں تمام اطراف ونواح کے دیہات پر کئی لاکھ روپے کا جرمانہ عائد کیا۔ حالانکہ دیہات کے باشندوں کو بغاوت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے سلطان اطرش پاشا کی پہلی اور دوسری بغاوت کے زمانہ میں ایسے ایسے دیہات پر گولے برسائے۔ جس کے باشندے بغاوت سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس نے ۱۹۲۱ء میں صرف اس قصور پر کئی بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی کہ ان کے علاقہ سے گزرتے وقت چند غیر معلوم اشخاص نے جنرل گورو پر گولی چلائی تھی۔ اس نے قریہ مرجانہ کو محض اس جرم میں صفحہ ہستی سے مٹادیا کہ اس کے قریب چند لوگوں نے جن کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے، ایک فرانسیسی جنرل پر حملہ کیا تھا۔ اس کے ایک گورنر

نے سرحد کے قائم مقام (ڈپٹی کمشنر) کو جو دروزی النسل تھا ایک ادنی سے قصور پر کوڑے لگوا دیئے تھے اور ایک معزز دروزی افسر کو جو سالہ کا کمشنر تھا۔ سڑک کوٹنے کی سزا دی تھی۔ اس نے متعدد بغاوتوں کے موقع پر اصل باغیوں کا بدلہ غریب شہری آبادیوں سے لیا اور ان کے بچوں' بوڑھوں' عورتوں اور بیماروں کو نہایت بے دردی کے ساتھ بم کے گولوں اور ڈائنامائیٹ سے اڑا دیا پھر کیا یہی وہ کام تھا جس کے لئے فرانس کو شام میں بھیجا گیا تھا اور کیا جمعیت اقوام یہی چاہتی تھی کہ شام کی درسگاہوں کو توڑ کر اس کی صنعت و تجارت کو برباد کر کے اور اس کی بے گناہ آبادی کو موت کے گھاٹ اتار کر انتدابی فرائض انجام دیئے جائیں۔

اب رہا یہ دعوی کہ فرانس شام کا جائز حکمران ہے اور دروزی باغی ہیں اسلیئے فرانس کو ان کے خلاف ہر تعزیری کارروائی کا حق حاصل ہے' سو اول تو اس کی جائز حکمرانی اور دروزیوں کی بغاوت ہی معرض بحث میں ہے لیکن اگر ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں تب بھی فرانس کی تعزیری کارروائیاں صرف ان لوگوں کے خلاف جائز ہو سکتی ہیں جو اس سے جنگ کر رہے ہیں وہ دروزیوں اور ان کے حلفاء پر گولے برسا سکتا ہے' مگر بے گناہ شہری آبادیوں پر اور بے بس عورتوں بچوں' بوڑھوں' اور بیماروں پر جو کسی حیثیت سے بھی بغاوت کے مجرم قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ طیاروں اور مشین گنوں کا ستعمال کسی اخلاقی قانون کی رو سے جائز نہیں ہو سکتا ۔ اس حرکت کو خواہ کتنے ہی پیچ در پیچ قانونی الفاظ میں ظاہر کیا جائے' مگر یہ حقیقت بہرحال بالکل صاف نظر آتی ہے کہ فرانس نے دمشق اور حماۃ میں باغیوں کے خلاف اپنی قوت استعمال نہیں کی ہے۔ بلکہ انہیں مرعوب کرنے کے لئے ان کے بے گناہ اہل وطن اور بے کس و بے بس عزیز و اقارب سے شدید انتقام لینے کی کوشش کی ہے۔ جو ہر حالت میں ایک نہایت وحشیانہ فعل ہے۔ پس اگر ٹائمز اور اس کے ہم خیال حضرات کے پہلو میں دل اور دل میں انسانیت کا کوئی احساس موجود ہے تو انہیں ہر شریف انسان کی طرح وحشت و بربریت کے خلاف پوری نفرت کا اظہار کرنا چاہیے جس کے لئے جواز کا کوئی ادنی سا پہلو بھی نہیں نکالا جاسکتا۔

* ایران کا انقلاب

حکومت ایران کے انقلاب کے متعلق جو تازہ خبر موصول ہوئی ہے اس کی امید ایک عرصہ سے کی جارہی تھی۔ ایرانیوں کی بیداری کے بعد خاندان قاچار کا بر سر حکومت رہنا بالکل غیر ممکن تھا۔ کیونکہ اس خاندان کی تمام تاریخ میں کوئی ایک بھی بادشاہ ایسا نہیں گزرا جس نے اپنے تدبر و قابلیت سے ملک کو کوئی فائدہ پہنچایا ہو۔ یا جس کے عہد میں ایران کے لئے ترقی کی راہیں کھولی گئی ہوں۔ بلکہ اس کے برعکس اگر یہ خاندان کچھ دنوں اور باقی رہ جاتا تو بہت ممکن تھا کہ اس کے حکمران اپنی عیش پرستیوں پر ایران کی برائے نام آزادی کو بھی قربان کر کے چھوڑتے مگر خدا کا شکر ہے کہ ایرانیوں نے وقت کی نزاکت اور ترقی کے مواقع کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت تمام ایران میں سردار رضاخان سے بہتر کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ رضاخان میں اپنے ملک کو عروج و کامیابی پر پہنچانے کی قابلیت موجود ہے اور اس نے اپنی اس قابلیت کو بھی تسلیم کرایا ہے اس لئے ایرانی پارلیمنٹ کا خیال ہے کہ نظام دستوری کے ماتحت اسے عارضی حکمران بنادیا جائے یہ امراس کی انتہائی دانشمندی پر دلالت کرتا ہے۔ ایران میں جمہوریت کے بجائے نظام دستوری قائم کرنا اور بھی زیادہ دور اندیشی پر مبنی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یورپ کی اندھی مقلد نہیں ہے اور ایران کی سیاسی حالت کا صحیح احساس رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایران نے ابھی تک اس قدر ترقی نہیں کی ہے کہ بہترین سیاست دانوں اور مدبروں کی ایک بڑی تعداد پیش کر سکے اس لئے ابھی ایک طویل عرصہ تک اسے معدودے چند افراد کی خدمات پر اکتفا کرنا پڑے گا اور اس طرح نظام دستوری کے ماتحت وہ سردار رضاخان کی اعلیٰ قابلیت اور حسن تدبیر سے ایک غیر متعین عرصہ تک فائدہ اٹھا سکے گا۔ ہمیں امید ہے کہ ایران کا دور جدید اس کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوگا اور وہ اس "عارضی حکومت" کے بعد مستقل حکومت کے نظام میں بھی سردار رضاخان ہی کو اپنا رہنما قرار دے گا۔ خاندان قاچار کی حکومت کے باعث برطانیہ جن امیدوں کو قائم کئے بیٹھا تھا اور سمجھتا تھا کہ شاید کوئی سیاسی چال پھر اسے دخل در معقولات کا موقع دیدے وہ بھی اب سب سراب ثابت ہوں گی۔

❑ اسلامی ریاستوں کے لئے درس عبرت

{ ۱۰ر نومبر ۱۹۲۵ء }

آل انڈیا جاٹ چھتری مہاسبھا کے اجلاس میں مہاراجہ بھرت پور نے جو صدارتی تقریر ارشاد فرمائی ہے وہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جاٹوں کے ایک زبردست اجتماع کے سامنے ایک والی ریاست کا شدھی کی حمایت میں اعلانیہ تقریر کرنا اور یہ کہنا کہ میں اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کو نہیں بھول سکتا جن کو جبراً تبدیل مذہب پر مجبور ہونا پڑا۔ گویا اس بات کا کھلم کھلا اعلان کرنا ہے کہ ان کے نزدیک تمام نومسلم قومیں جبراً مسلمان کی گئی ہیں اور ان کو دوبارہ ہندو مذہب میں داخل کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اگر ان خیالات کا اظہار کسی غیر زمہ دار متعصب ہندو کی طرف سے کیا جاتا تو شاید ہم ان کی طرف توجہ بھی نہ کرتے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا والی ملک جس کے ممالک محروسہ میں بکثرت نومسلم آباد ہیں ان کے جبریہ قبول اسلام کا ذکر دردانگیز الفاظ میں کرتا ہے اور اس طرح انہیں اپنی ذاتی وجاہت اور شان و شکوہ سے مرعوب کرکے اسلام کی راہ راست سے گمراہ کرنا چاہتا ہے تو ہمیں مجبوراً آئین جہانداری کی اس کھلی توہین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے ریاست بھرت پور مساجد کی بے حرمتی اور تبلیغ کی ممانعت کرکے مسلمانوں کو یقین دلا چکی ہے کہ موجودہ والی ملک کے دور حکومت میں مساوات، مذہبی رواداری اور عدل و انصاف محض ایسے الفاظ رہ گئے ہیں جن کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اب مہاراجہ صاحب کا یہ جدید اعلان ان کے مذہبی تعصب پر مزید مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو اخبارات نہایت شاندار عنوانات اور طویل سرخیوں کے ساتھ مہاراجہ کی اس تقریر کو شائع کررہے ہیں اور ان کے مذہبی و قومی جذبہ کی داد دے رہے ہیں مگر ہم ان سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ہندوستان کے اندر اسلامی ریاستیں موجود نہیں ہیں پھر اگر انہوں نے بھی اسی طرح اپنی رعایا کو قبول اسلام کی دعوت دینی شروع کردی اور اعلائے کلمتہ اللہ کی خاطر تبلیغ اسلام کا علم لے کر کھڑے ہوگئے تو اس سے ہندوؤں کو کس قدر شکایت کا موقع ملے گا۔ اب تک تبلیغ کی تحریک کے متعلق مسلمان ریاستوں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس کے خلاف کوئی ہندو اخبار ایک لفظ

بھی نہیں کہہ سکتا۔ اگر حضور نظام اور دیگر مسلمان رؤسا چاہیں تو اپنی حدود مملکت میں تبلیغی کانفرنس منعقد کر کے کھلم کھلا اسلام کی خوبیاں بیان کر سکتے ہیں اور ہر دہقانی تک اسلام کی عالمگیر اخوت و مساوات کا پیغام پہنچا سکتے ہیں مگر انہوں نے اس رویہ کو اصول غیر جانبداری کے خلاف سمجھا اور اس لیے ہمیشہ اس قسم کی تحریکات سے اجتناب کرتے رہے لیکن اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ ایک ہندو راجہ کی طرف سے اس میدان میں اعلانیہ اقدام شروع ہو جانے کے بعد ان کا طرز عمل کیا ہوگا اور اس سے کس قسم کے نتائج رونما ہوں گے۔

* ہندو مہاسبھا کی فساد پروری

ہندو مہاسبھا کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۴ر نومبر ۱۹۲۵ء میں جو ایک مخصوص تجویز منظور کی ہے اسے ہم آج کی خبروں میں شائع کر رہے ہیں۔ اس تجویز میں جس فریب کاری کے ساتھ اصل مدعا کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے وہ نہایت خطرناک ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی فرائض و رسومات میں صریح مداخلت مذہبی وغیرمذہبی جلوسوں کا روکا جانا اور ان کے خلاف سخت اور جائز تدابیر اختیار کرنا یہ سب وہ الفاظ ہیں جن کا مفہوم ہر وہ شخص اچھی طرح سمجھ سکتا ہے جو اس جماعت کے گزشتہ کارناموں سے واقف ہے بعض فرضی اور مہمل اعمال کو مذہب کا حصہ بنا لینا اور پھر ایسے اعمال جن کے متعلق کسی ایک فریق کو قطعی فیصلہ صادر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اپنے جائز حقوق قرار دے لینا اور پھر ان کی موافقت میں تمام قوم کو جائز تدابیر اختیار کرنے کی دعوت دینا ظاہر ہے کہ ملک میں از سرنو فسادات کی داغ بیل ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ابھی تک، تو یہ ہوتا تھا کہ جہاں کہیں مساجد کے سامنے باجہ جانے یا مسلمانوں کو اذان دینے سے روکنے کے متعلق فساد ہوا۔ ہندو سبھا نے خفیہ طور پر وہاں کے ہندوؤں کی اعانت کی اور نہایت پیچیدہ الفاظ میں ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کو معصومیت کا جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے فریاد شروع کر دی مگر اب اس تجویز کی منظوری کے بعد ہندو مہاسبھا اپنی قوم کو اعلانیہ دعوت دیتی ہے کہ وہ اس کی حمایت کے بھروسہ پر ہر جگہ مسلمانوں سے ٹکرائے اور تمام ملک کے اندر فسادات کا بازار گرم کر دے۔ ہم ہمیشہ اپنی اس رائے کا اظہار کرتے رہے

ہیں کہ مسلمانوں کو بھی کسی دوسری ہمسایہ قوم کے جائز حقوق کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے لیکن جب ایک مفروضہ حق کا استعمال محض مسلمانوں کی دل آزاری اور ان کی مساجد کی توہین کرنے کے لئے مسلسل و متواتر کیا جائے گا اور اس غرض کے لیے منظم سعی عمل میں لائی جائے گی۔ تو ظاہر ہے کہ مسلمان اپنی عبادت گاہوں کی کھلم کھلا توہین اور اپنے مذہب کی بے حرمتی کو کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے ہیں۔ ایسی حالت میں دونوں قوموں کا باہمی تصادم قطعاً ناگزیر ہے اور ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندو مہاسبھا نے یہ فساد کا صور ایسے وقت پر پھونکا ہے جبکہ ہندو مسلم نزاعات کی آگ ذرا ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔

ہم پنڈت مالویہ جی کو ان کی اس جدید تجویز پر مبارکباد دیتے ہیں کیونکہ ان کی پالیسی کی کامیابی کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہندوؤں کو آئندہ سال کی ہنگامہ آرائی کے لئے کوئی بھروسہ دلایا جائے اور انہوں نے اس کمی کو اپنی اس تجویز کے ذریعہ پورا کردیا ہے۔

✱ فساد آفرینی کی نئی کوششیں

ہندو مہاسبھا کی اس فساد انگیز پالیسی کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ دہلی جہاں رام لیلاؤں کے خیریت سے گزر جانے کے بعد ذرا اطمینان سا پیدا ہوگیا تھا۔ اب پھر ایک خطرہ سے دوچار ہے اور آریوں کا مفسد فرقہ ہندو سبھا کے لیڈروں کو اپنی شرمناک حرکات کی حمایت پر آمادہ پاکر پھر فساد کی آگ مشتعل کررہا ہے۔ چنانچہ مسجد فتحپوری کے سامنے حدود ممنوعہ میں متعدد بار ہندوں نے علانیہ باجہ بجایا ہے۔ اگر ان مواقع پر بعض سنجیدہ مسلمان مداخلت نہ کرتے تو فساد کا یقینی خطرہ موجود تھا لیکن مسلمانوں کے صبرو تحمل کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ۲ر نومبر کو غالباً آریوں کے ورغلانے سے سکھوں نے عین مغرب کے وقت مسجد فتحپوری کے سامنے ۱۵ منٹ تک مسلسل باجہ بجایا اور جن مسلمانوں نے انہیں اس خلاف قانون و ناجائز حرکت سے روکنے کی جرأت کی انہیں سختی کے ساتھ ڈانٹ دیا گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کی شرانگیز کارروائیوں کی اطلاع بار بار پولیس کو دی جاچکی ہے مگر سه

کون سنتا ہے فغان درویش
قہر درویش بجان درویش

کوتوالی میں اس وقت ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے مسلمانوں کی فریاد پر ذرا مشکل ہی سے توجہ کی جاسکتی ہے۔

ہم اس موقع پر برادران ہنود اور حکومت دونوں کو متنبہ کردینا چاہتے ہیں کہ اگر اس قسم کے افسوسناک واقعات کو فوراً نہ روکا گیا تو وہ مسلمان جو اب تک نہایت حیرت انگیز طریقہ پر اپنی امن پسندی اور صبروسکون کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ مذہب کی اس علانیہ توہین کو دیکھ کر قابو سے باہر ہوجائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری یا تو ان مفسدوں پر عائد ہوگی جو ان حرکات کے بانی مبانی ہیں۔ یا پھر حکومت کے سر رہے گی جو نہایت خاموشی کے ساتھ ان فساد انگیز کارروائیوں کو دیکھ رہی ہے۔

* ایک مسلمان رئیس کی بے جا مخالفت

ہندوستان کے موجودہ جماعتی نزاعات کا ایک بدترین نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے بعض خفیف العقل لوگوں میں فساد آفرینی و نزاع پسندی کا ایک مستقل ذوق پیدا کردیا ہے اور اگر انہیں لڑنے کے لئے حقیقی وجہ نہیں ملتی تو وہ کوشش کرکے اسے پیدا کرلیا کرتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال کنج پورہ کا قضیہ ہے۔ تقریباً ۱۶۵ سال سے ریاست کنج پورہ میں ۱۷؍ ربیع الثانی کو ایک فتح کی یادگار منائی جاتی ہے۔ جو نواب محمد نجابت خان نے مرہٹوں پر حاصل کی تھی۔ آج تک اس پر کبھی کسی ہندو نے اعتراض نہیں کیا بلکہ خود ہندو اس رسم کو مقدس سمجھ کر اس میں شریک ہوتے رہے۔ کیونکہ وہ اب کسی فتح کی یادگار نہیں رہی تھی بلکہ محض ایک مذہبی رسم رہ گئی تھی جس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمتہ کی روح کو ثواب پہنچایا جاتا ہے لیکن اس سال پہلی مرتبہ چند آریہ حضرات نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی اور محض اخبارات ہی میں شور مچانے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ نواب ابراہیم علی خان صاحب کو چراغاں بند کرنے کے لئے نوٹس تک دے دیا اور ایک وفد لے کر ڈپٹی کمشنر کرنال کے پاس بھی پہنچ گئے کہ اس دل آزار رسم کو بند کردیا جائے۔ اس تمام ایجی ٹیشن کی اصلی بنیاد تو صرف یہ ہے کہ بعض متعصب ہندوؤں کو ایک

اسلامی فتح کی یادگار اور اس میں ہندوؤں کی عقیدت کے ساتھ شرکت سخت ناگوار ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہمعصر تیج کے ایک مقالہ افتتاحیہ کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے مگر انہوں نے اس کے لئے بہانہ یہ تراش لیا ہے کہ چراغاں کے لئے گائے کی چربی سے بتیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان بتیوں کو جبراً ہندوؤں کی دکانوں پر جلایا جاتا ہے اور چربی کو پگھلانے کے لئے ہندوؤں کی کڑاہیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہوتا تو یقیناً ہندوؤں کی تمام شکایتیں بالکل جائز ہوتیں اور ہم ان کی حمایت میں سب سے پہلے آواز بلند کرتے لیکن جناب ابراہیم علی خان صاحب کے بیان اور دیگر ذرائع سے یہ امر متحقق ہوگیا ہے کہ ان شکایتوں کی کوئی اصلیت نہیں ہے اور نہ صرف یہی شکایتیں بلکہ ہندوؤں کی اصلی شکایت بھی قطعاً بے بنیاد ہے۔ چنانچہ ذیل کے حقائق سے اس معاملے پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

۱۔ بتیوں میں جو چربی استعمال کی جاتی ہے اس میں کسی خاص جانور کا التزام نہیں کیا جاتا۔ بلکہ قصابوں سے خرید لی جاتی ہے جس میں گائے بکری اور بھینس سب کی چربیاں مخلوط ہوتی ہیں اس لئے یہ کہنا بالکل جھوٹ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ گائے کی چربی استعمال کی جاتی ہے۔

۲۔ اس رسم کی کسی چیز کو غیر مسلم کا ہاتھ لگنے نہیں دیا جاتا اور مسلمان بھی باوضو ہو کر اس میں شریک ہوتے ہیں پھر یہ ہندوؤں کی دکانوں پر موم بتیاں جلانا اور کڑاہیوں کا لینا سب بے معنی ہے جبکہ ہندو خود اپنی خوشی سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ رسم اب کسی فتح کی یادگار نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک عقیدت کی بنا پر کی جاتی ہے جسے نواب محمد نجابت خان مرحوم نے اپنے تمام جانشینوں کے لئے لازم کردیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۰۱ء تک موجودہ نواب صاحب کی نابالغی کے زمانہ میں کورٹ آف وارڈز کے حکام اس وصیت کی تعمیل کرتے تھے جنہیں ظاہر ہے کہ مرہٹوں پر مسلمانوں کی فتح سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔

ان تمام امور کو دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی کہ یہ سارا ایجی ٹیشن محض ہندوؤں میں ہیجان پیدا کرنے کی خاطر برپا کیا گیا تھا۔

* اسلام پر سوامی شردہانند کے اعتراضات

سوامی شردہانند نے اپنی سیتاپور والی تقریر میں اسلام اور مسلمانوں پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ علم و عقل پر تعصب کے بدترین نتائج کی ایک نمایاں مثال پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تقریر میں کوئی چیز نئی نہیں تھی بلکہ تقریباً وہی باتیں تھیں جو عام طور پر ہم پیشہ ور آریہ مناظرین سے سنا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک عام مناظرین سے ان کا درجہ بہت بلند ہے اور اس لئے جب ان جیسے ہندو عالم کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بچپن کی شادیوں کے رواج کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ رہا ہے اور اسلام کو ایک مشرکانہ مذہب بنا کر آریہ مذہب کو اصلی توحید کا مبلغ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو ہمیں ان کی تنگ نظری اور عالمانہ جہالت پر سخت افسوس ہوتا ہے اور ہم یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ وہ محض تعصب کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کو ان چیزوں سے متہم کررہے ہیں جن کا آج تک کسی پڑھے لکھے انسان نے ان پر گمان بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ سوامی جی کے علم و کمال اور وسعت مطالعہ سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ انہوں نے اپنی ساری عمر مذہبی علوم کے مطالعہ اور تقابل ادیان کی تحقیق و تدقیق پر صرف کی ہے اور ان جیسے عالم سے یہ ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ہندوؤں کی قدیم تاریخ اور ہندو مذہب کے ابتدائی مسائل سے بالکل ناواقف ہونگے اور مذہب اسلام کے متعلق جو ہمیشہ ان کی مناظرانہ عیب جوئیوں کا ہدف رہا ہے۔ انہیں اتنی بھی واقفیت نہ ہوگی جتنی دیہات کے ایک معمولی طالب علم کو ہوا کرتی ہے۔ پس جب کوئی شخص انہیں اسلام پر ایسے جاہلانہ اعتراضات کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ صرف یہی رائے قائم کرسکتا ہے کہ تعصب نے ان کی بصیرت کو زائل کردیا ہے اور وہ ہر اس چیز جو آریہ دھرم کے ماسوا ہے۔ نکتہ چینی کرنے کے جوش میں اس حد تک وارفتہ ہوگئے ہیں کہ ان کی عقل انہیں کسی مسئلہ کی تحقیق پر آمادہ کرسکتی ہے اور نہ ان کا علم انہیں غلط بیانیوں اور کذب آفرینیوں سے روک سکتا ہے۔

سوامی جی نے بال بواہ (بچپن کی شادیوں) کی رسم پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:۔

"ہندوؤں کے زمانہ عروج میں بال بواہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ عورت مرد پندرہ

اور سولہ برس کی عمر سے پہلے شادی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ صغر سنی کی شادی کا دستور مسلمانوں کے دور حکومت میں دیویوں کی عزت بچانے کے خیال سے جاری کیا گیا تھا"۔

اس بیان سے سوامی جی نے دراصل یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مسلمان اپنے دور حکومت میں ہندوں کی لڑکیاں جبراً لے جایا کرتے تھے اس لئے ہندوؤں نے انہیں بچانے کی خاطر بچپن ہی میں ان کی شادیاں کرنی شروع کردیں لیکن اول تو یہ بات عقل ہی کے خلاف ہے کیونکہ جو قوم بداخلاقی کے اس درجہ تک پہنچی ہوئی ہو کہ لوگوں کی لڑکیوں کو جبراً لے بھاگنے کی عادی ہوجائے وہ کنواری اور منکوحہ میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتی اور محض اس کی دست برد سے بچانے کے لئے بچپن میں شادیاں کردینے کی رسم جاری ہوجانا کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے عقلاً درست تسلیم بھی کرلیا جائے تو کیا اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود ہے؟ کیا سوامی جی بتا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہشت صد سالہ حکومت کے کون سے دور میں ہندوؤں نے اس رسم کو جاری کیاہے؟ اور کیا وہ اسلامی تاریخ کے کسی عہد کے متعلق یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اس میں مسلمان ہندوعورتوں کو جبراً لے بھاگنے کے عادی ہوگئے تھے؟ اگر تاریخ سے ان باتوں کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کیاجاسکتا۔ تو ہم پوچھتے ہیں کہ محض قیاس کی بناپر ایک قوم کے سراتنا بڑا اخلاقی الزام تھوپ دینا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔

اگر ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف ہندوؤں کی تاریخ میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں بلکہ ان کے مذہب میں بھی اس کے صریح احکام موجود ہیں اور ان سے کوئی ایسا شخص انکار نہیں کرسکتا جس نے ہندوؤں اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ آج سوامی جی اپنے مذہب کو غیر مہذب اور خلاف عقل قوانین سے بری ثابت کرنے کے لئے خواہ کتنی ہی غلط بیانی سے کام لیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو قوم اپنے مذہبی قوانین کی قیود سے آزاد ہوئے بغیر بال بواہ جیسی مہلک رسم سے نجات نہیں پاسکتی۔ کیونکہ بال بواہ محض ایک رسم نہیں، بلکہ ایک ہندو اس کی پابندی پر مذہباً مجبور ہے۔ چنانچہ منوسمرتی میں صاف حکم موجود ہے کہ:۔

"سن بلوغ سے پہلے ہی مناسب خاوند کو لڑکی دینی چاہیے"۔

اور وکش سمرتی میں ہے کہ:۔

آٹھ برس کی لڑکی کا بیاہ کر دینا چاہیے۔ اس سے دھرم محفوظ رہتا ہے۔ اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ ایک اور جگہ حکم دیا گیا ہے کہ:۔

> "جو کوئی حائضہ لڑکی سے بیاہ کرے وہ کچھ بھی معاوضہ لڑکی کے باپ کو نہ دے کیونکہ حیض کی حد کو پہنچنے کے بعد لڑکی خود مختار ہو جاتی ہے اور باپ کا حق ولایت ساقط ہو جاتا ہے"۔ (منوادھیایہ)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مذہب کی رو سے بالغ لڑکی کا باپ اس رقم کا مستحق ہی نہیں رہتا جو مہر کے طور پر اسے ملنی چاہیئے اس لئے ہر ہندو مجبور ہے کہ اپنی لڑکی کا بیاہ سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے کر دے۔ ایسے صریح احکام کی موجودگی میں سوامی جی کا یہ کہنا کہ کسی ہندو لڑکی کا بیاہ ۱۶ برس سے کم عمر میں نہیں ہوتا تھا۔ کیسی حیرت انگیز دیدہ دلیری ہے۔

سوامی جی کا ارشاد ہے کہ ہندوؤں کے زمانہ عروج میں بال بواہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا مگر ہم انہیں بتا سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں صرف ہندوؤں کے عوام ہی اس کے عادی نہیں تھے بلکہ اونچے درجہ کے ہندو خاندانوں میں بھی یہ رسم موجود تھی۔ رام اور سیتا سے زیادہ ممتاز ہستیاں شاید ہندو تاریخ میں کوئی نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کی شادیاں کس عمر میں ہوئی تھیں۔ خود رانی سیتا کا بیان ہے کہ:۔

> "جب ہمارے بیاہ کو بارہ برس ہو گئے تو اس وقت میرے دولہا کی عمر پچیس سال کی تھی اور میری اٹھارہ کی۔ (رامائن ارتیہ کانڈم سرگ ۴۷)۔

بیاہ سے قبل راجہ دشرتھ نے وشوامتر رشی سے کہا تھا کہ:۔

> "رام تو سولہ برس سے کم عمر کا ہے اس لیے کے قابل نہیں ہے"۔

اور راتر رام پریتم میں رام کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں کہ:۔

> "اس وقت (سیتا جی کے) دودھ کے دانت گرنے سے مسوڑے چھدے ہوئے تھے اور نئے نکلتے دکھائی دیتے تھے"۔

کیا ہندوؤں کے عہد عروج میں بال بواہ کے موجود ہونے کی اس سے بھی زیادہ بین مثال اور کوئی ہو سکتی ہے؟ پھر یہ کیسی افسوسناک بددیانتی ہے کہ آریہ دھرم کا سب سے بڑا

علمبردار مذہب کے ایک عیب کو چھپانے کے لئے دوسرے مذہب کے پیروؤں پر اس کا الزام عائد کر رہا ہے۔

اس کے بعد سوامی جی ایک اور قدم آگے بڑھاتے ہیں اور مسلمانوں کو چھوڑ کر نفس اسلام پر ایک حملہ کرتے ہیں۔ جو ان کی متعصبانہ تنگ نظری پر اس سے بھی زیادہ بین دلیل ہے۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے کہ:۔

> "مجھے مسلمانوں سے ذرا بھی اختلاف نہ ہوتا اگر وہ محض اللہ ہی کی عبادت کرتے اور محمد ﷺ کا اضافہ نہ کرتے۔ میں بلا تامل ایک مسلمان کو گلے لگا سکتا تھا مگر ایک محمدی کو نہیں لگا سکتا۔ خود میں نے اس حد تک اسلام کو قبول کر رکھا ہے جہاں تک اس کا تعلق اللہ کی عبادت سے ہے۔ مگر محمد ﷺ کی ذات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے"۔

اگرچہ اس بیان سے سوامی جی کا اصلی مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اسلام ایک مشرک مذہب ہے کیونکہ وہ کلمہ توحید میں اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی شریک کرتا ہے مگر کم از کم یہ معلوم کر کے ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ انہوں نے لا الہ الا اللہ کی حد تک اسلام قبول کرلیا ہے اور اب تکمیل اسلام میں صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی کمی باقی رہ گئی ہے۔ اب اگر انہیں یہ بتا دیا جائے کہ کلمہ توحید میں حضور خاتم النبین ﷺ کی شرکت نعوذ باللہ الوہیت میں آپ کی شرکت کی ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کد مدعا محض آپ کی رسالت کا اقرار ہے۔ تو غالباً انہیں پوری طرح اسلام قبول کرنے میں کوئی تامل باقی نہیں رہے گا۔

سوامی جی جیسے عالم تو درکنار' ایک معمولی طالب علم بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام نے ماسویٰ اللہ کی عبادت اور صفات ربانی میں کسی غیر خدا کو شریک کرنے کی شدید ممانعت کی ہے اور بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ اگلی امتوں پر جو عذاب نازل ہوئے ان کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے شرک کیا اور اپنے انبیاء کو معبود بنالیا۔ رسول اکرم ﷺ کے متعلق قرآن حکیم میں جگہ جگہ اس امر کی تصریح موجود ہے کہ آپ ایک رسول کے سوا کچھ نہیں ہیں جن کا مقصد خدا کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے اور اسی طرح احادیث میں ہزاروں مواقع پر آنحضور صلعم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد کہیں

ایسا نہ کر بیٹھنا کہ مجھے عبادت میں شریک کرنے لگو۔ ایسی بین تصریحات کے باوجود سوامی جی کا محض کلمہ طیبہ کی ظاہری صورت پر اعتراض کرکے اسلام کو شرک کا الزام دینا اس سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا کہ وہ عام پیشہ ور مناظرین کی طرح لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے سوفسطائی دلیلوں سے کام لیتے ہیں۔ ورنہ ہر مسلمان کی طرح سوامی جی بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے معنی جانتے ہیں اور شاید یہ بات سمجھنے سے ان کی عقل قاصر نہیں ہے کہ کسی انسانی ہستی کو رسول اللہ ﷺ کہنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ اللہ ہے۔

ممکن ہے کہ سوامی جی ان باتوں کو بہت معمولی سمجھتے ہوں مگر ہم انہیں خلوص کے ساتھ بتا دینا چاہتے ہیں کہ آریہ دھرم کے پیشوا اور ہندو قوم کے مسلمہ رہنما کی حیثیت سے ان کا ایسی لچر اور پوچ باتوں پر اتر آنا ان کی ذات ہی کے لئے ناموزوں نہیں ہے۔ بلکہ ان کے مذہبی و قومی اخلاق کے متعلق بھی دنیا کو بہت بری رائے قائم کرنے کا موقع دیتا ہے۔ کیونکہ دنیا پیشواؤں اور رہنماؤں کو ان کی مذہبی تعلیمات کا نمونہ دیکھنے اور سمجھنے کی عادی ہے۔

اشاعت تہذیب کے جدید طریقے

{ ۱۴ر نومبر ۱۹۲۵ء }

دمشق اور حماۃ کے متعلق عربی اخبارات اور ریوٹر کے تاروں میں جو تفصیلات آرہی ہیں ان سے اشاعت تہذیب کے وہ بہت سے طریقے معلوم ہوتے ہیں جو فرانس نے شام میں اختیار کئے ہیں۔ اب تک تو ہم نے صرف اتنا ہی سنا تھا کہ تہذیب و تمدن کی ترقی دینے کے لیے شہری آبادیوں پر ٹینکوں، طیاروں اور آتشبار توپوں کا استعمال نہایت سریع الاثر ہوتا ہے، مگر اب اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مجرب نسخے روشنی میں آرہے ہیں۔ مثلاً پسپا ہوتے وقت قریوں اور قصبوں کو جلا دینا، انسانی بستیوں کو ڈائنامائیٹ سے اڑا دینا اور پھانسی دے کر بیجان لاشوں کو شاہراہ عام پر لٹکا دینا وغیر ذالک۔ ان نسخوں کے استعمال سے شام کی تہذیب و مدنیت میں اس قدر ترقی ہو گئی ہے کہ اس وقت تیس چالیس ہزار بے گور و کفن لاشوں کے علاوہ تقریباً ۸۰ ہزار آدمی بے خان و ماں پھر رہے ہیں اور خرمنوں اور کھیتوں کے برباد ہو جانے کے باعث ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی وسیلہ نجات باقی نہیں رہا کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں!

اس شریف ترین انسانی مشن کی تکمیل کے لیے آخری تدبیر یہ اختیار کی گئی ہے کہ ان شہروں پر جو خوب دل کھول کر برباد کئے جا چکے ہیں، کئی کئی لاکھ روپے جرمانے عائد کئے جا رہے ہیں اور ان جرمانوں کو اس عام بے سروسامانی کے باوجود نہایت سختی کے ساتھ وصول کیا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں کی خبروں میں غالباً قارئین کرام نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ دمشق میں تاوان کے استحصال میں اتنے جبر و تشدد سے کام لیا گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے کپڑے بیچ بیچ کر مطلوبہ رقمیں ادا کرنی پڑیں اور جو رائفلیں اہل شہر سے طلب کی گئی تھیں انہیں ارمنوں اور چرکسوں سے دوگنی اور تگنی قیمتوں پر خرید کر عسکری حکومت کے حوالہ کیا گیا۔ جس شہر میں تقریباً ساڑھے ۴ کروڑ روپے کا نقصان کیا جا چکا ہے اور جہاں کی نصف سے زیادہ آبادی خانماں برباد کردی گئی ہو اس میں یہ تاوان کی سختی جیسی کچھ تہذیب و مدنیت کی گرم بازاری پیدا کر سکتی ہے ظاہر ہے۔

معلوم نہیں دنیا ان حرکات کو کس نظر سے دیکھتی ہے مگر ہمارے خیال میں تو اس طریقہ سے حکومت فرانس کے اس اعلان حریت و آزادی کی لفظ بلفظ تعمیل کی جارہی ہے

جو آج سے ٹھیک ۵ برس پہلے جنرل گورو نے لبنان کے دارالحکومت میں کیا تھا۔ ہمارے کانوں میں وہ الفاظ اب تک گونج رہے ہیں جو فرانس کے پہلے ہائی کمشنر نے جمہوریہ فرانس کی عزت کی قسم کھا کر کہے تھے کہ:۔

> ”فرانسیسی سپاہی تمہاری آزادی کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے تمہاری حفاظت کے لیے بھی اپنا قیمتی خون نہایت دریا دلی کے ساتھ بہایا ہے“۔

غور کیجئے! جو اعلان یکم ستمبر ۲۰ء کو کیا گیا تھا وہ ۲۰ اکتوبر ۲۵ء کو کیسی خوبی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا دیا گیا!

* مارشل پی تین کا اعلان

مراکش سے فرانس و ہسپانیہ کی ناکام واپسی اور اعدائے اسلام کی فوجوں کی زبردست ہزیمت کے بعد مارشل پی تین کا یہ اعلان کہ ”غازی عبدالکریم کا مکمل محاصرہ کر لیا گیا ہے اور اب ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے“ نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس کو مراکش میں جو سخت ذلت آمیز شکست نصیب ہوئی ہے اس کو ان الفاظ سے زیادہ بہتر کسی اور طریقہ سے ادا نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ عبدالکریم کے محصور ہو جانے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہر طرف سے فتح و ظفر نے اس کو گھیر لیا ہے اور اب اس کی فتوحات اس درجہ کمال کو پہنچ گئی ہیں کہ اس کے بعد کوئی ایسی چیز باقی ہی نہیں رہی جو موجب خوف و خطر ہو۔ انہی جملوں کی ایک تفسیر آگے چل کر مارشل صاحب نے اس طرح کی ہے کہ ”اب جنگی کارروائیاں ختم ہو چکی ہیں اور معاملات ماہرین سیاست کے حوالے کر دیئے گئے ہیں“۔ دراصل اس امر کا اعلان ہے کہ اب انہیں میدان جنگ میں کسی کامیابی کی توقع نہیں رہی اس لئے وہ اپنے سپاہیوں کو آرام کرنے کا موقع دیں گے اور ان کی جگہ سیاسی چڑیماروں کو آگے بڑھائیں گے تاکہ وہ بھی مرغان ریف کو پھانسنے کے لیے اپنے پھندوں کی آزمائش کر دیکھیں۔

سچ یہ ہے کہ یورپ والوں نے خوبصورتی کے ساتھ مطلب ادا کرنے میں بڑا ہی کمال پیدا کیا ہے۔

* مسٹر بالڈون کا اعتراف

حکومت فرانس اور اس کی افواج نے دمشق اور حماۃ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا ہے اس کے سلسلے میں تو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں ایک نہایت دلچسپ بات ارشاد فرمائی۔ آپ نے کہا کہ "اس سے قبل کہ ہم دوسروں کو نشانہ ملامت بنائیں ہمیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لینا چاہیے کہ ایسے نازک مواقع پر خود ہمارے واسطے کس قدر سخت دشواریاں پیش آتی ہیں"۔ اس بیان میں جس جرأت کے ساتھ صداقت کو بے نقاب کیا گیا ہے، اس کے لیے مسٹر بالڈون یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔ اس سے زیادہ روشن صداقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو قوم خود جلیاں والہ باغ میں دمشق کا منظر پیش کر چکی ہو اور عراق، فلسطین اور ہندوستان میں ان وحشیانہ مظالم کا اعادہ کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ نظر آتی ہو، اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنی ہم پیشہ ہم مشرب قوم کے ایسے ہی افعال پر نفرت کا اظہار کرے۔ حقیقت میں یورپ کے تمام سرمایہ دار ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کمزور قوموں کو غلام بنانے اور ان پر انواع و اقسام کے مظالم کرنے میں کس کا پایہ بلند ہے۔ ہماری رائے میں وزیر اعظم برطانیہ کا مفہوم غالب کی زبان میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا جا سکتا تھا جو لکھتا ہے کہ:-

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

* ایک عجیب مشورہ

ہمعصر "تیج" نے اپنے ایک مقالہ افتتاحیہ میں مظالم دمشق پر اظہار نفرت کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ ایسے معاملات کو "مذہبی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ انسانی نقطہ نظر سے دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور ایسے موقعوں پر بھی خاموش نہیں رہنا چاہیے جبکہ اس قسم کے مظالم کا کسی مسلمان سلطنت کی طرف سے ارتکاب کیا جائے"۔ اگرچہ یہ بجائے خود کوئی غلط مشورہ نہیں ہے کیونکہ انسانیت کے شریفانہ احساس کا تقاضا یہی ہے کہ انسان دوسرے انسان کی مصیبت سے بلا امتیاز ہمدردی کرے لیکن ایک ایسے

اخبار سے یہ مشورہ سن کر ہمیں سخت تعجب ہوا جو خود بھی اسی تنگ نظری میں مبتلا ہے جس سے پرہیز کرنے کا وہ دوسروں کو مشورہ دیتا ہے اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم عصر موصوف کی پوری زندگی میں ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی ہے جس میں اس نے اپنی قوم کی کسی زیادتی پر دبی زبان سے بھی ملامت کی ہو اور "ایک قوم پر دوسری قوم کی دست درازی" کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھنے کی اخلاقی جرات کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہو کہ اس نے اپنی قوم کی ایسی حرکات کی اعلانیہ حمایت سے بھی کبھی دریغ نہیں کیا ہے پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے خود اپنے مرض کا علاج کئے بغیر دوسروں کو مداوا کی صلاح دینا کس لیے ضروری سمجھا؟ کیا یہ بھی ایثار کی کوئی قسم ہے"۔

تاہم اگر وہ مسلمانوں کے کسی واقعی ظلم کی طرف اشارہ کرکے ہمیں اس پر ملامت کرنے کا مشورہ دیتا ہے، تب بھی ہمیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ تھا مگر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اس نے مثال کے طور پر مولوی نعمت اللہ کی سنگساری اور مظالم آرمینیا کو پیش کیا ہے اور ان کے متعلق ہم سے کہتا ہے کہ اگر تم اس وقت ان مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے تو آج تمہارے احتجاجات میں بڑا وزن ہوتا۔ یہ دونوں مثالیں اگر اسی تنگ نظری اور شوق عیب چینی پر مبنی نہیں ہیں جنہیں ہمارے ہم عصر نے قابل ملامت قرار دیا ہے تو کم از کم دوسری مثال اس کی انتہائی ناواقفیت پر دلالت کرتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی مسئلہ پر کافی مطالعہ کئے بغیر اظہار رائے کر دینے کا عادی ہے۔ ہم اپنے ہم عصر کو بتانا چاہتے ہیں کہ جن حوادث کو اس نے مظالم سے تعبیر کیا ہے انہیں کوئی واقف کار اور منصف مزاج آدمی ظلم نہیں کہہ سکتا۔ ارمنوں نے عین اس موقع پر جبکہ ترک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے اور روس جیسا خوفناک دشمن کئی لاکھ فوج کے ساتھ اس کے مشرقی صوبوں پر حملہ آور تھا، کھلم کھلا علم بغاوت بلند کیا اور روسی فوجوں سے مل گئے۔ ترکوں اور کردوں کا قتل عام کیا اور روس کے لیے اناطولیہ کے دروازے کھول دئے اور ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء کے خطرناک ایام میں ترکی حکومت کو فنا کر دینے کی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ وان، تفلیس، ارزنجان، معمورہ، العزیز، دیاربکر، سیواس، طرابزون اور انگورہ میں انہوں نے مواصلات

قطع کر دیے۔ تار کاٹ دیے، سڑکوں کو خراب کر دیا، بموں سے سرکاری عمارتیں اڑا دیں۔ ترکی فوجوں کی رسد پر ڈاکے ڈالے اور ایک طرف ہزاروں ارمن روسی فوج میں جا ملے اور دوسری طرف ہر ضلع اور شہر میں سینکڑوں ارمنوں نے اندرونی اضطراب برپا کر دیا۔ ایک روسی افسر ٹودرڈو فلیبوف جو حملہ آور فوج میں ایک توپ خانہ کا کمانڈر تھا خود اپنے چشم دید حالات کے سلسلہ میں بیان کرتا ہے کہ:۔ "ارمنوں نے ارض روم پر ترکی قبضہ ہونے سے پہلے اسلامی آبادی کو خوب قتل و غارت کیا ارزنجاں میں ایک جرمن ڈاکٹر کے زیر قیادت ۸۰۰ ترکوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا ارزنجان سے ارض روم کی طرف پسپا ہوتے وقت راستے میں ہر ترکی گاؤں کو جلایا اور اس کی نہتی آبادی کو بری طرح قتل و غارت کیا۔۔۔ کمانڈر اوڈی شلز نے اپنا آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کیا ہے کہ صرف ایک شام کو ہم نے ۳ ہزار ترک قتل کیے ہیں"۔

ہم پوچھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ایسے نازک موقع پر بغاوت کی ہو اور ایسے ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا ہو وہ کس رعایت کے مستحق ہیں؟ پھر آپ کو معلوم ہے کہ ترکوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ دنیا یہ سن کر حیران ہوگی کہ انہوں نے اس ناسور پر کوئی عمل جراحی نہیں کیا، بلکہ صرف ان ولایتوں سے جو سرحد سے ملی ہوئی تھیں، تمام ارمن آبادی کو اندرون ملک میں منتقل کر دیا اور اس تبادلہ میں انہیں نہ صرف انتظام کے لیے بہت سی فوجوں کو مصروف رکھنا پڑا بلکہ ساڑھے گیارہ لاکھ پونڈ بھی خرچ کرنے پڑے، حالانکہ میدان جنگ میں وہ ایک ایک پونڈ اور ایک ایک سپاہی کے سخت محتاج تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عام تبادلہ میں بہت سے ارمن ہلاک و برباد بھی ہو گئے، لیکن یہ صورت بالکل ناگزیر تھی کیونکہ عین جنگ کی حالت میں ان کی پوری حفاظت ممکن نہیں تھی اور ذرائع حمل و نقل کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔

یہ ہیں وہ حوادث جنہیں ہمارے ہم عصر نے مظالم سے تعبیر کیا ہے۔ اب رہا نعمت اللہ کی سنگساری کا معاملہ، تو وہ ایک خالص مذہبی معاملہ ہے۔ ہم اسے مذہباً صحیح سمجھتے ہیں اس لیے اس پر ملامت کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے، اور جو مسلمان اس پر ملامت کرتے ہیں ان کے خیال میں وہ مذہباً صحیح نہیں ہے، ورنہ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ احکام مذہب کی روح سے صحیح ہے تو وہ بھی اس پر ملامت کرنا چھوڑ دیں۔ اس فعل کو

خلاف انسانیت قرار دے کر اس پر اظہار نفرت کرنا دوسرے الفاظ میں خود اپنے مذہب سے نفرت کا اظہار کرنا ہے اور کوئی شخص مسلمان رہتے ہوئے ایسا نہیں کر سکتا۔ تاہم اگر ہمارا ہم عصر مسلمانوں سے اس بے دینی کا مطالبہ کرتا ہے تو پہلے اسے اقدام کرکے اعلان کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مذہب کے ایک مسئلہ کو مذہباً صحیح سمجھتے ہوئے بھی خلاف تہذیب وانسانیت قرار دینے اور اس پر اظہار نفرت کرنے کے لیے تیار ہے۔

* شام کا نیا ہائی کمشنر

شام کے جدید ہائی کمشنر صاحب نے اپنے جدید منصب کی باگ ہاتھ میں لینے سے پہلے پتی پارنیریاں کے نمائندے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار کی حریت نواز کرسی سے اٹھ کر گورنری کی استبداد پرور کرسی پر بیٹھتے ہی تنگ نظر دماغوں میں کیسا عجب انقلاب ہو جاتا ہے، ابھی ابھی یہ شخص جنرل سارائی کی واپسی اور حوادث شام کو صلاحیت کے ساتھ روبراہ لانے کی ضرورت پر دھواں دھار مضامین لکھ رہا تھا اور ابھی حکومت کا منصب ملتے ہی اس کے دماغ میں اسی منافقانہ سیاست کی ہوا بھرنی شروع ہو گئی۔ جس نے وزارت فرانس کے دوسرے مریضان استعمار کے دماغوں کو ماؤف کر رکھا ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ شام میں نظم و سکون بھی پیدا کرنا چاہتا ہے اور فرانسیسی انتداب سے دست بردار ہونے کے لیے بھی تیار نہیں ہے ایک ہی وقت میں اس کی خواہش ہے کہ شامیوں سے صلح بھی ہو جائے اور ملک بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ فرانس کو صلح کی ضرورت ہے مگر ایسی صلح کی جس میں عزت بھی ہو۔ حالانکہ باعزت صلح کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ فرانس نکالے جانے سے پہلے خود نکل جائے۔ وہ اب تک یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ شام کے ناقابل تسخیر عزم و ثبات پر غارت گران فرانس غالب آجائیں گے اور اسی لیے بڑے زور سے کہتا ہے کہ "ترک و تخلیہ" کے الفاظ ہماری لغت سے نکال دو مگر اسے نہیں معلوم کہ دمشق اور حماۃ کے ہولناک مظالم کے بعد شامی قوم کو غلام رکھنا تقریباً ناممکن ہے اور ایسی حالت میں فرانس کے لیے "ترک وتخلیہ" سے زیادہ شرمناک الفاظ "شکست و ہزیمت" کے ہیں جو اس کی لغت ہی میں نہیں بلکہ اس کی شاندار تاریخ میں بھی ایک تاریک داغ بن کر چمکتے رہیں گے

موسیو ژود نیل کی مہارت سیاسی کا سب سے زیادہ دلچسپ نمونہ اس فقرہ میں نظر آتا ہے کہ:۔ ”میں جہاں تک جلدی ممکن ہوگا شام میں امن و سکون قائم کردوں گا تاکہ انجمن اقوام کو اس امر کی اطلاع دی جا سکے کہ اب وہ خود اپنے اوپر حکومت کرنے کے قابل ہوگیا ہے“۔ اس قسم کے خوش نما فقرے موسیو بریان اور موسیو پین لیو نے بھی استعمال کئے ہیں اور شام کو آزادی و خود مختاری کی حد تک پہنچانا اپنا مقصد قرار دیا ہے‘ مگر ہمارے نزدیک اس سے زیادہ حماقت کا مظاہرہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ یہ دانایاں فرنگ ایک ہی چیز کو اپنا مطلوب بھی قرار دے رہے ہیں اور پھر اسی کے مقابلے پر روپیہ اور خون بھی بہا رہے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ان کا مقصد شام کو آزاد ہی کرنا ہے تو پھر اسے غلام بنانے کے لیے اتنی محنت صرف کرنے سے کیا حاصل ہے؟ شامیوں کی قابلیت اور اہلیت کا مسئلہ تو اب حل ہو چکا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی تلوار کی دھار سے اسے ثابت کر دیا ہے اور حکومت کی اہلیت کا ثبوت تلوار سے بہتر اور کس چیز سے مہیا کیا جا سکتا ہے؟

* ایک معاصرانہ شکایت

ہم اپنے معاصرین سے خلوص و صداقت کے تعلقات رکھنا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں مگر ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ بعض معاصرین نے ہماری مروت سے بہت بے جا فائدہ اٹھایا ہے۔ آج کئی مہینہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اقتباسات کو نہایت آزادی کے ساتھ نقل کرلیا جاتا ہے اور آخر میں الجمعیۃ کا حوالہ دینے کی بجائے اصل عربی اخبار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ الفاظ میں ذرہ برابر بھی تغیر نہیں ہوتا جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ فی الحقیقت اس اخبار سے براہ راست ترجمہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارا مقصد اسلامی دنیا کے ان حالات کی تبلیغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے جو ہم تک عربی اخبارات کے ذریعے پہنچتے ہیں‘ لیکن ہمارے معاصرین کا تو یہ اخلاقی فرض ہے کہ جس پرچہ سے نقل کریں اس کا حوالہ دے دیا کریں۔ اس وقت ہم کافی عرصہ تک تسامح سے کام لینے کے بعد مجبوراً اپنے معاصرین کو ان کا اخلاقی فرض یاد دلاتے ہیں اور یہ

تنبیہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر اب بھی اسے محسوس کرنے سے اعراض برتا گیا تو ہم آئندہ اپنی شکایت میں ابہام و اجمال کی بجائے تفصیل و توضیح سے کام لیں گے اور اس وقت لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ کیسے کیسے ثقہ دامن سرقہ کے جرم سے ملوث ہیں۔

❑ فرانسیسی مال کا مقاطعہ

{ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۵ء }

فرانس کو بے گناہ مسلمانوں کا خون بہاتے ہوئے ایک سال کے قریب ہونے کو آیا ہے۔ ۱۹۲۵ء کی ابتداء سے وہ ریف میں آگ اور خون کا کھیل کھیل رہا ہے اور گذشتہ چار پانچ مہینہ سے شام کی مظلوم و بے کس آبادی پر ایسے وحشیانہ ظلم و ستم ڈھا رہا ہے جن سے انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس زمانے میں تمام دنیائے اسلام نے اپنی پوری قوت سے اس کے ان افعال کے خلاف احتجاج کیا، اس سے انسانیت کے نام پر فریادیں کیں، اس کو تنبیہ کرنے کے لیے جمعیت اقوام سے اپیلوں پر اپیلیں کیں اور شرافت کے ساتھ کسی ظالم کو راہ راست پر لانے کے جتنے طریقے ہو سکتے تھے سب اختیار کر لئے لیکن اس تمام چیخ و پکار کا اس پر خاک اثر نہ ہوا۔ اس بے حسی کا علاج اہل فلسطین نے یہ سوچا ہے کہ فرانسیسی مال کا قطعی بائیکاٹ کر دیا جائے تاکہ فرانس کو بھی اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ ہماری چیخ و پکار محض کھوکھلی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک زبردست جذبہ نفرت و غضب پوشیدہ ہے اور ہم زبان کے ساتھ ساتھ کچھ ہاتھوں سے بھی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے فلسطین والوں نے عملاً اس مقاطعہ کی تحریک شروع کر دی ہے اور اب ضرورت ہے کہ مسلمانان ہند بھی ان کا ساتھ دیں اور تمام دوسرے ممالک اسلامیہ کو بھی اس طرف توجہ دلائیں۔ کمزور قوموں کے لیے ایسی تمام بے حسیوں کا علاج مقاطعہ سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تجارت یورپین استعمار کی شہ رگ ہے اور جب کوئی شخص اس پر حملہ کرتا ہے تو گویا وہ اس کے عین رشتہ حیات پر چھری رکھتا ہے پھر خصوصیت کے ساتھ فرانس کے مقابلہ میں تو وہ ہتھیار بہت زیادہ کارگر ثابت ہوگا۔ کیونکہ اس کی مالی حالت اس وقت بھی خراب ہو رہی ہے اور روپے کا مسئلہ اس کی عین زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس لیے اگر ایسے موقع پر

اس کی تجارت کا بائیکاٹ کر دیا جائے تو چند ہفتوں میں اس کی دماغی حالت درست ہو سکتی ہے۔

ہم جمعیتہ العلماء ہند اور مرکزی خلافت کمیٹی کو اس تجویز کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتے ہیں۔

* ہمدرد کی سال گرہ

ہم عصر ہمدرد نے ۱۱ر نومبر کو اپنی زندگی کا پہلا سال ختم ہونے کی خوشی میں "یوم سال گرہ" منانا تھا۔ جس کے سلسلے میں شہر کے معززین اور مقامی اخبارات کے ایڈیٹروں کو چائے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔ باوجود ہر قسم کی بے شمار مشکلات کے "ہمدرد" نے جس وضع داری اور بلند حوصلگی کیساتھ اپنی زندگی کا ایک سال گزارا ہے اس پر ہم اسے قابل مبارک باد سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی صحافت کے عام ابتذال اور پبلک کی روز افزوں بد مذاقی کو دیکھتے ہوئے ایسے جرائد کی زندگی بسا غنیمت ہے جو اپنے مقررہ نصب العین پر سختی کے ساتھ قائم رہتے ہیں اور کبھی مشکلات سے گھبرا کر ضمیر فروشی پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگرچہ اس بار تصنع اور شان استقلال میں ہر حق پرست اخبار کی طرح ہمدرد کو بھی کافی سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ وقت بہت جلدی آنے والا ہے جب ہمارا ملک ضمیر فروش اور ابن الوقت لوگوں کی غلط تعلیمات سے خود بخود بیزار ہو جائے گا اور دل بھر کر ٹھوکریں کھالینے کے بعد دوبارہ اپنے انہی مخلص خادموں کی طرف رجوع کرے گا جو کیسہ زر کے بندے نہیں بلکہ حق و صداقت کے پرستار ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم عصر موصوف کو اسی عزم و ثبات اور ہمت و استقلال کے ساتھ زندہ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

* برطانیہ اور ابن سعود

تازہ تاروں سے معلوم ہوا ہے کہ سر گلبرٹ کلیٹن کی سرکرگی میں حکومت انگلستان نے جو مشن ابن سعود کے پاس روانہ کیا تھا وہ اپنے ایک مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے اور دوسرے میں ناکام۔ یعنی عراق اور نجد کی سرحد کا قضیہ تو طے ہو گیا، مگر نجد اور شرق اردن کا جھگڑا

ابھی باقی ہے۔ اس دوسرے جھگڑے کے متعلق ریوٹر نے صرف اس قدر تشریح کی ہے کہ ابن سعود اپنی سلطنت کے حدود شام سے ملا دینا چاہتا ہے اور سر گلبرٹ کلیٹن نے اس مطالبہ پر غور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن جو لوگ عرب کے پچھلے واقعات کا بغور مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ابن سعود نے دراصل حجاز کے اس حصہ پر جو شرق اردن کے خود ساختہ نام سے موسوم کیا گیا ہے برطانی انتداب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ نہ صرف عقبہ و معان کو بلکہ پوری ریاست شرق اردن کو انگریزی قبضہ سے نکالنا چاہتا ہے۔ اسی خبر سے ان بیانات کی مزید تصدیق ہوتی ہے جو پچھلے دنوں "الف اور باء" وغیرہ عربی اخبارات نے شائع کئے تھے۔ اب یہ امر بالکل صاف ہو گیا ہے کہ ابن سعود اپنے عہد پر قائم ہے اور بڑی سے بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بھی عربی مفاد کی حفاظت کر سکتا ہے۔

ایک حد تک یہ اعتراض ممکن ہے کہ نجد و عراق کی سرحد کا قضیہ طے ہو جانا دوسرے معنوں میں عراق پر برطانوی سیادت کو تسلیم کرنا ہے جسے کوئی عرب محب وطن اور کوئی مسلمان قبول نہیں کر سکتا لیکن ابن سعود کے اس فعل کو حمیت اسلامی کے منافی خیال کرتے ہوئے بھی ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ جن سیاسی مجبوریوں سے اس نے ایسا کیا ہے ان کی رعایت ایک حد تک ضروری ہے۔ عراق کا مسئلہ اب اس حد سے گزر گیا تھا کہ ابن سعود اسے کسی مناسب موقع کے انتظار میں ٹالتا رہتا' کیونکہ اب انگریزوں کو یہ قوی اندیشہ پیدا ہو چکا تھا اگر موصل پر جنگ ہوئی تو ابن سعود عقب سے انہیں ضرور پریشان کرے گا اور اس لیے وہ آخری طور پر فیصلہ کر چکے تھے کہ یا تو جنگ کا موقع آنے سے پہلے اس سے سرحدوں کا تعین کر لیں' یا پھر اسے صاف طور پر اعلان جنگ دے دیں تاکہ انہیں ایک وقت میں دو حریفوں کا مقابلہ نہ کرنا پڑے۔ پس اب ابن سعود کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جنگ اور صلح دونوں میں سے ایک کو اختیار کر لے اور یہ ظاہر ہے کہ برطانیہ جیسی قوت سے وہ تنہا جنگ کرنے کے قابل نہیں ہے اور نہ اس وقت اس کے حالات اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ حجاز کے قضیہ کو ناتمام چھوڑ کر ایک ہولناک جنگ میں مبتلا ہو جائے۔

* شاہ ایران کا احتجاج

پچھلے ہفتہ کے تاروں میں احمد مرزا سابق شاہ ایران کا احتجاجی پیغام دیکھ کر ہمیں اس شخص کی جسارت پر سخت حیرت ہوئی۔ یہ سادہ لوح انسان ابھی تک اسی عہد تاریک کی غلط فہمی میں مبتلا ہے جب ملکوں اور قوموں کو شخصی جائیداد سمجھا جاتا تھا اور حکمرانی کا حق نطفہ میں منتقل ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ اب وہ دور گزر چکا ہے اور آج ذاتی قابلیت کے بغیر حکومت و فرمانروائی کا کوئی موروثی حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جس عہد کی باتیں کر رہا ہے اس میں "پدرم سلطان بود" کا دعویٰ سیاسی عدالتوں میں قبول کیا جاتا تھا اور صرف یہ بات ایک شخص کے لیے کافی سفارش تھی کہ وہ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ لیکن آج کی دنیا حکومت کی اہلیت کو خون اور ہڈی میں نہیں بلکہ دماغ اور دست و بازو میں دیکھنے کی عادی ہے اور اگر کوئی شخص اپنے اندر یہ سند نہیں رکھتا تو اس کے لیے کوئی دوسری سند کار آمد نہیں ہو سکتی۔ ایرانی قوم نے اس کے اور اس کے خاندان کے ساتھ کافی نہیں بلکہ کافی سے زیادہ تسامح سے کام لیا۔ اس نے فتح علی شاہ کی عیاشیاں، ناصرالدین شاہ کی نفس پرستیاں، مظفرالدین شاہ کی استبداد پروریاں اور محمد علی شاہ کی غداریاں سب کچھ برداشت کیں اور پھر بھی خاندان قاچار کے دعوائے فرمانروائی کا اس حد تک لحاظ رکھا کہ احمد مرزا کو ایسے نازک موقع پر اپنا سردار بنا لیا جبکہ وہ بارہ برس کا ایک نادان بچہ تھا اور اس کے پاس اپنا موروثی "حق" حاصل کرنے کے لیے کوئی قوت موجود نہ تھی لیکن اس آخری سفلہ پروری کا انجام اسے یہ دیکھنا پڑا کہ جس گرگ بچہ کو وہ اپنی عزیز ترین متاع سمجھ کر برسوں تک پالتی رہی اس نے ہوش سنبھالتے ہی اس کا خون حیات پینا شروع کر دیا اور یورپ کے طرب خانوں میں اپنے وقت اور ایران کی دولت کو نہایت بیدردی کے ساتھ ضائع کرنے لگا، حالانکہ اس کا ایک ایک سیکنڈ اور ایک ایک پیسہ ایران کی ترقی و اصلاح میں صرف ہونا چاہیے تھا۔ ان احسان فراموشیوں کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ایرانی قوم ایسے ناکارہ خاندان اور اس کے تاجدار کے جوئے سے اپنی گردن کو ہمیشہ کے لیے ہلکا کر لے جس نے ۱۳۰ سال کی طویل مدت میں ایک دن بھی ایران کی فلاح و بہبود کا کوئی کام نہیں کیا۔ احمد شاہ اس انقلاب کے خلاف خواہ کتنا ہی شور مچائے لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حقوق ہمیشہ فرائض

کیساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور جب کوئی شخص فرائض کو بھول جاتا ہے تو اس کے حقوق خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ شاہ معزول اب بھی اپنے گناہوں پر نادم نہیں ہے اور بعید از عقل تاویلیں کر کے اپنی عیش پرستانہ زندگی کے متعلق دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں نے تو محض ازراہ ایثار اپنے ملک کو اندرونی کشمکش سے بچانے کے لیے یورپ کی جلاوطنی اختیار کی تھی ممکن ہے کہ اس نے واقعی یہ ایثار ہی کیا ہو مگر ہم حیران ہیں کہ جب وہ محض اندرونی کشمکش اور اضطراب و خانہ جنگی سے بچنے کی خاطر اب تک ملک سے نکلا رہا ہے تو اب کیوں وہ ایران جا کر اسی خانہ جنگی کی آگ بھڑکانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اس کے ایثار کے امتحان کا اصلی وقت تو یہی ہے۔

✱ تفرقہ پردازی کا جدید منتر

”یادش بخیر ریوٹر نے ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد قبہ ایجی ٹیشن کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو پھر پھونکنا شروع کر دیا ہے۔ جب تک سر گلبرٹ کلیٹن کے مشن سے کچھ آس لگی ہوئی تھی تو وہ بھی خاموش تھا، مگر اس طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد اسے پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ قبوں کی مفروضہ داستانیں چھیڑ کر مسلمانوں کے درمیان نئے سرے سے خانہ جنگی کی آگ بھڑکا دے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ ریوٹر کا یہ نیا تیر بھی کہیں ٹھیک نشانہ پر نہ لگ جائے اور حامیان شریف ریوٹر کی اس چالبازی کے شکار ہو کر تازہ خواہی داشتن گرداغہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں آں قصہ پارینہ را“ کا سبق شروع کردیں اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قارئین کرام کو بالشویک روس کے مشہور اخبار ”ایزویستیا“ کے اس مضمون کی طرف توجہ دلائیں جس کا ترجمہ ہم نے ۱۰ر نومبر کے الجمعیۃ میں شائع کیا تھا ـــــ اس کے حسب ذیل الفاظ میں مسلمانوں کے لئے عبرت و نصیحت کا کافی سامان موجود ہے:

> ”برطانیہ نے بلاد عرب اور خصوصاً حجاز پر اقتدار قائم رکھنے کے لیے جو حکمت عملی وضع کی ہے اس کا ایک آخری حربہ سلطان ابن سعود کے خلاف مصر، ہندوستان اور ایران میں مذہبی تعصب کی آگ مشتعل کر دینا ہے۔ وہ جانتا

> ہے کہ ابن سعود کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اس کے اقتدار کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے اس لیے اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ مذکورہ بالا ممالک میں نہایت شدید پروپیگنڈا شروع کرا دیا ہے جس کا نتیجہ کم از کم یہ ضرور ہوگا کہ مسلمانوں میں ایک مذہبی نزاع شروع ہو جائے گا اور ان کی قوتیں منتشر ہو کر آپس میں ٹکرانے لگیں گی -- پس آج جو ابن سعود کے خلاف شورش برپا کی جارہی ہے اور جو اس پر بہتان و افتراء کے طومار باندھے جارہے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دولت انگلشیہ عرب کو اپنی غلامی میں رکھنے کی تمام تدبیروں سے مایوس ہو کر اب اس آخری حربہ کو استعمال کرنے پر اتر آئی ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی جنگ کی آگ مشتعل کر دے۔ اگر مسلمان اس مرحلہ سے بھی گزر گئے تو پھر یقین ہے کہ برطانیہ کی تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا"۔

یہ خیالات ایک ایسی قوم کے نمائندہ اخبار کے ہیں جو مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے ساتھ اپنی تمام توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے اور نہایت غور کے ساتھ مغربی استعمار اور مشرقی حریت طلبی کی کشمکش کو دیکھ رہی ہے اس لیے ان معاملات کو اس سے زیادہ غیر جانبداری اور دردمندی کے ساتھ دیکھنے والا شاید اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کاش ہندوستان کے سادہ لوح بزرگ جو اس وقت برطانیہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے دانستہ یا نادانستہ اس حکمت عملی کو کامیاب بنارہے ہیں۔ اس راز کو سمجھیں اور اپنے ہاتھوں سے اسلام کے لیے جدید مصائب کا دروازہ نہ کھولیں۔

مسئلہ اصلاح اور ترکی مدبرین

{ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۵ء }

کچھ عرصہ سے ترکی کے متعلق پھر اس قسم کی خبریں آنی شروع ہو گئی ہیں۔ جن سے الحاد و بے دینی اور مذہب سے کلی تنفر (نفرت) کی بو آتی ہے۔ کبھی ہم سنتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے جمہوریت کے جشن سالگرہ میں محفل رقص منعقد کی اور اس میں شریک ہونے والی عورتوں کو حکم دیا کہ اپنی نقابیں الٹ دیں۔ کبھی ہم سنتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے علانیہ شرح اسلامی کو ایک ریاکارانہ قانون بتلایا اور کہا کہ وہ کسی مہذب قوم کا دستور العمل نہیں بن سکتا۔ کبھی ہم سنتے ہیں کہ وہ تعدد ازدواج کو ایک غیر مہذب رسم قرار دیتے ہیں اور انہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ اسے قانوناً جرم قرار دیا جائے گا۔ کبھی ہم سنتے ہیں کہ جمہوریت کے نیم سرکاری اخبار "حاکمیت ملیہ" نے ترکی قوم کو مہذب مغربی اقوام کی سطح پر لانے کے لئے جمعہ کی بجائے اتوار کی تعطیل مقرر کرنے کا مشورہ دیا ہے اور کبھی ہم کو سنایا جاتا ہے کہ بروصہ کے ایک جلسہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کو ترکی کا پیغمبر کہنے پر اصرار کیا گیا اور اس شخص کے قول کی سختی کے ساتھ تردید کی گئی جو کہتا تھا کہ اگر آنحضرت خاتم النبیین نہ ہوتے تو مصطفیٰ کمال کو بلا خوف تردید پیغمبر کہا جا سکتا تھا۔ ریوٹر ایجنسی تو غیر اسلامی معاملات میں بہت زیادہ بدنام ہے مگر اکثر اوقات اسلامی ذرائع سے بھی ایسی ہی خبریں ہم تک پہنچ جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ ابھی چند ہی روز ہوئے الشوریٰ میں یہ اطلاع درج تھی کہ ترکی اخبارات نے مسلمانان مدراس کے اس تار کو مضحکہ انگیز سرخیوں کے ساتھ شائع کیا جس میں مصطفیٰ کمال پاشا کو مدینہ منورہ کے واقعات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور انگورہ کی خبر رساں ایجنسی نے اسے پریس کو مہیا کرتے ہوئے اس نوٹ کا اضافہ کر دیا کہ ترکی کو بیرونی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں اس لئے غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے اس تار کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور نہ تار بھیجنے والوں کو اس کا کوئی جواب دیا۔

ان تمام خبروں کو سن کر مختلف طبیعتوں پر مختلف قسم کے اثرات ہوتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں صحیح تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محض پروپیگنڈا ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو ترکوں سے متنفر کر دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بعض ان

پر لفظ بلفظ یقین کر کے ترکوں کو بالکل خارج از اسلام سمجھنے لگتے ہیں اور بعض جنہیں خود بھی مذہب سے بہت کافی بعد ہے۔ انہیں سن کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں مگر جن لوگوں نے ترکی کے گزشتہ و موجودہ حالات کا امعان نظر سے مطالعہ کیا ہے اور جو مسئلہ اصلاح و ترقی کے مختلف پہلوؤں پر کافی غور کر چکے ہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان تمام خبروں میں ایک اہم صداقت پوشیدہ ہے جو خواہ جزئی و فروعی واقعات کا ساتھ دیتی ہو مگر عمومیت کے ساتھ ہر خبر میں اس کا شائبہ ضرور موجود ہے اور آج سے نہیں. نصف صدی سے ترکی کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کے آثار پائے جا رہے ہیں لیکن اس حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود نہ تو وہ ترکی کے ان حالات پر کسی خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں اور نہ وہ ترکوں کے خلاف اس ناواجب نفرت کو اپنے دل میں جگہ دے سکتے ہیں۔ جو بعض لوگوں میں پوری ترکی قوم کے خلاف پیدا ہو رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ترکی میں گزشتہ صدی کے نصف آخر سے ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے دماغی قویٰ نے یورپ کے اثر میں نشوونما پائی ہے اور وہ اپنے ملک میں فرنگی مدنیت کے اصولوں پر اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ انیسویں صدی میں جبکہ ترکوں کی پستی و ذلت کی انتہا ہو چکی تھی اور دول یورپ نے ان کی جہالت، تاریک خیالی اور بد نظمی سے فائدہ اٹھا کر دولت عثمانیہ کی تقسیم شروع کر دی تھی تو بعض محب وطن ترکوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ترکی کے سیاسی و اجتماعی نظام میں ایسی اصلاح کی سخت ضرورت ہے جس سے یورپی استعمار کے بڑھتے ہوئے اثرات کا ازالہ ہو سکے اس وقت علماء کا یہ فرض تھا کہ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے، اسلام کی تعلیمات کے مطابق مغربی علوم و صنائع اور اسلامی تمدن و اخلاق کے صحیح توازن کے ساتھ ترکی قوم کے لئے ایک جدید نظام حیات وضع کرتے اور سلاطین عثمانی کا فرض تھا کہ اپنے استبداد و مطلق العنانی کے جکڑ بند کو ڈھیلا کر کے اپنی تمام قوتوں کو ملک کی اصلاح و ترقی میں صرف کر دیتے لیکن افسوس کہ ایک طرف علماء نے ضرورت سے زیادہ تنگ خیالی سے کام لے کر ان تمام وہمیات و خیالات پر اصرار کیا جو محض جہالت کی وجہ سے جزو مذہب بن گئی تھیں اور دوسری طرف سلاطین نے قوم کے احساس حریت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے نہایت احمقانہ تنگ نظری کے ساتھ اس کو دبانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاح طلب اور قدامت

پسند طبقہ کے خیالات میں بعد بڑھتا چلا گیا۔ ایک طبقہ دوسرے کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگا ایک نے مغرب کی تمام چیزوں کو حتیٰ کہ اس کے علوم و صنائع کو بھی کفر قرار دیا' دوسرے نے اس کے جواب پر مشرق کی ہر چیز کو حتیٰ کہ مذہب کو بھی جہالت سے تعبیر کرنا شروع کردیا اور اس کشمکش میں کوئی ایسا معتدل مفکر اور صائب الرائے طبقہ نہ پیدا ہوسکا جو اصلاح و ترقی اور دین و ملت دونوں چیزوں کو لازم و ملزوم سمجھ کر کوئی صحیح راہ اختیار کرتا۔

یہ کشمکش شاید کچھ عرصہ بعد اعتدال کی صورت اختیار کرلیتی لیکن بدقسمتی سے ترکی کو اپنی تاریخ کے سب سے زیادہ نازک دور میں سلطان عبدالحمید خان جیسا مطلق العنان استبداد پرور اور تجدید و اصلاح کا شدید دشمن حکمران میسر آیا۔ جس نے اپنی ساری قوت آزادی کے شجر ممنوع کی بیخ کنی پر صرف کردی۔ اس زمانہ میں سینکڑوں آزاد خیال ترک اپنا وطن چھوڑ کر پیرس اور جینوا چلے گئے جہاں دنیا بھر کے دہریئے' انقلاب پسند' انارکسٹ' سوشلسٹ اور نہلسٹ جمع تھے۔ ان کے ساتھ ملنے جلنے اور متحدالمقصد ہوکر کام کرنے کی بدولت ان میں ہر قسم کے ملحدانہ خیالات سرایت کرگئے اور ترکی انقلاب پسندوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جو نام کی مسلمان تو ضرور تھی مگر مذہب سے اس کو کچھ سروکار نہ تھا۔

۱۹۰۸ء میں جب انقلاب ہوا اور سلطان عبدالحمید خان کے ساتھ ان کے استبداد اور قدامت پرست طبقہ کا اقتدار بھی رخصت ہوگیا تو یورپ سے یہ آزاد خیال لوگ فوج در فوج ترکی پہنچے اور انہوں نے اپنے مخصوص نظریوں کے مطابق ملک کو فرنگیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی مگر حسن اتفاق سے اس انقلاب کے لیڈر احمد رضا بے جیسے لوگ نہیں تھے۔ بلکہ محمود شوکت پاشا' سعید حلیم پاشا' انور پاشا (جو اس وقت بے تھے) اور نیازی بے جیسے لوگ تھے۔ جو ترکی قوم کو ترقی یافتہ دیکھنے کے ساتھ ہی مسلمان بھی دیکھنا چاہتے تھے اور ایسی اصلاح کے طالب تھے جو ہر طرح حدود شریعت کی پابند ہو اس لئے جب تک یہ لوگ برسراقتدار رہے۔ ترکی میں اصلاح افرنجی کے حامیوں کو کوئی کامیابی نہ ہوسکی اور باوجود ان کمزوریوں کے جو شریعت کا صحیح علم اور علماء کی صحیح رہنمائی موجود نہ ہونے کے باعث ان میں موجود تھیں۔ انہوں نے ترکی کے نظام اجتماعی میں کوئی

ایسا بنیادی تغیر پیدا نہیں کیا۔ جو اسے گمراہی و ضلالت کی طرف لے جاتا لیکن جنگ عظیم کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ اس کے تمام صحیح **الخیال** لیڈر ایک ایک کر کے قتل کردیئے گئے اور ملک کی باگ ایسے انتہا پسندوں کے ہاتھ میں آگئی جو مغرب کی اندھی تقلید کئے بغیر ترقی کو ناممکن سمجھتے ہیں اور مغربی زندگی کی چمک سے اس قدر مرعوب ہوگئے ہیں کہ اس کی خوبیوں اور برائیوں میں کوئی تمیز ہی نہیں کرسکتے۔

تاہم جب تک حریت و استقلال کی جنگ جاری رہی، تمام مختلف **الخیال** جماعتیں ایک بالاتر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مل کر کام کرتی رہیں اور فریضہ دفاع کی مصروفیتوں میں فروعی اصلاحات کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا جو کوئی اختلاف پیدا کرتا مگر جب سمرنا و تھریس کی فتح کے بعد وہ متحد رکھنے والی جدوجہد ختم ہوگئی اور صلحنامہ لوزین نے ترکی کے لئے وہ امن مہیا کردیا جو اندرونی تنظیم واصلاح کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ تو دفعتہ "یورپ کے پیدا کئے ہوئے فرنگیت مآب ترکوں نے اپنے چہرے پر سے نقاب الٹ دی اور ساری دنیائے اسلام یہ سن کر حیران رہ گئی کہ وہ اب مشرقی و اسلامی ترک نہیں رہنا چاہتے۔ بلکہ جرمنی، انگریزی اور فرنچ ترک بننا چاہتے ہیں۔ آزادی کی لڑائی کے زمانہ میں ان کے ساتھ بہت سے صحیح **الخیال** اور معتدل الفکر لوگ بھی شامل تھے اور ان عظیم الشان فتوحات میں ان کا حصہ کسی طرح بھی ان شوریدہ سر انتہا پسندوں سے کم نہ تھا۔ جو ۲۱ اور ۲۲ء میں ترکوں کو حاصل ہوئی تھیں مگر حصول مقصد کے بعد انہوں نے تمام ایسے لوگوں سے اقتدار و سربراہی کی کرسیاں خالی کرالیں جو ان کے فرنگی نقطہ نظر سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ رؤف بے،عمی بے، فوزی پاشا اور کاظم قرہ بکرپاشا جیسے جلیل القدر لوگ ایک ایک کرکے گوشہ عزلت میں بٹھادیئے گئے اور اب ان کے بعد انگورہ کی مجلس ملی چند ایسے جوشیلے متفرنجین کی ایک خالص اور بے میل جماعت رہ گئی ہے جن کے خیالات کسی طرح بھی ترکی کی عام رائے کے مطابق نہیں ہیں اور جن کی انتہا پسندی خود مصطفیٰ کمال اور عصمت پاشا جیسے مفرطین سے بھی کئی منازل آگے بڑھی ہوئی ہے۔

{۲۲ر نومبر ۱۹۲۵ء}

اس مختصر تدریج سے قارئین کرام کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ تدریج کے ساتھ ترکی میں

متفرنجین و مفرطین کی جماعت نے عروج و اقتدار حاصل کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے طریقوں میں کیا نقائص ہیں؟ ان کے اصولوں میں کیا غلطیاں ہیں؟ ان کی اصلاحی تحریک ترکی کو کس طرف لیے جا رہی ہے؟ اور اصلاح کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ترکی بھی اصلاح کا محتاج ہے۔ اس کے موجودہ حالات ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو باقی رکھا جائے۔ اس کی مسجدیں' اس کے مدرسے' اس کی دوکانیں' اس کے بازار' اس کی کھیتیاں' اس کے محاکم سب کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی ضرورت ہے اور کوئی صاحب عقل و خرد انسان یہ پسند نہیں کر سکتا کہ وہ اسی ڈگر پر چلتا رہے جس پر اب تک چلتا رہا ہے لیکن اصلی سوال نفس اصلاح کا نہیں بلکہ طریق اصلاح اور مقصد اصلاح کا ہے اور وہی دراصل بنائے اختلاف و نزاع ہے۔ آج تقریباً ایک صدی سے نہ صرف ترکی بلکہ تمام دنیائے اسلام کے ارباب فکر و بصیرت اس سوال کے حل میں مصروف ہیں' اور اس باب میں ان کی راہیں اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا احصاء کم از کم اس چھوٹے سے مقالہ میں مشکل ہے مگر اصول کے اعتبار سے ہم ان کو چار جماعتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

ایک وہ جماعت ہے جو خالص دینی احیا کی قائل ہے اور یورپ کی ہر چیز سے کامل مقاطعہ کر کے مسلمانوں میں خالص مذہبی روح پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کی بہترین مثال شیخ عبدالوہاب بخدی کی دعوت ہے۔

دوسری وہ جماعت ہے جو مقصد میں پہلی جماعت سے متحد ہے مگر علوم و صنائع جدیدہ سے استفادہ کو ضروری سمجھتی ہے اور قدیم و جدید تمدن کی تمام خوبیوں کو چن کر ایک معتدل اسلامی تمدن قائم کرنا چاہتی ہے۔

تیسری وہ جماعت ہے جو مذہب کو صرف مذہبی زندگی کے اصطلاحی دائرہ میں محدود رکھ کر زندگی کے باقی تمام شعبوں میں مغرب کی تقلید کرتی ہے اور مسلمانوں کو عہد جدید کا مسلمان بنانا چاہتی ہے۔ ہندوستان میں سرسید کی تحریک' مصر میں محمد علی پاشا کی تحریک اور ترکی میں سلطان محمود مصلح اور مدحت پاشا کی تحریک' اسی حلقۂ فکر سے تعلق رکھتی ہے۔

چوتھی وہ جماعت ہے جو مغربی تمدن کی شان و شوکت سے بالکل مرعوب ہو گئی ہے

اور مذہب کی قیود کو صرف اسی حد تک برداشت کرنے کے لیے تیار ہے، جس حد تک وہ اسے یورپین تہذیب و تمدن اختیار کرنے سے مانع نہ ہو۔ اس جماعت کے لوگ تمام اسلامی ممالک میں موجود ہیں مگر ایک طاقتور اور مؤثر جماعت کی حیثیت سے انکا ظہور صرف ترکی اور عرب میں ہوا ہے۔ جہاں انہیں عربی اور ترکی "وطنیت" کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خالی میدان ہاتھ آگیا ہے۔

ان چاروں جماعتوں کا مقصد وہی اصلاح ہے لیکن سب کے نصب العین مختلف ہیں۔ اس لیے طریقوں میں بھی عظیم الشان اختلاف ہے۔ پہلی جماعت مسلمانوں کو قرون اولیٰ کا مسلمان بنانا چاہتی ہے مگر اس میں وقت کی ضرورت کا صحیح احساس نہیں ہے اس لیے اس کی رہنمائی مسلمانوں کو دنیا کی بالا تر قوت نہیں بنا سکتی۔ دوسری جماعت صحت مقاصد، صحت تشخیص اور صحت تدابیر کے اعتبار سے مفکرین اسلام کی بہترین جماعت ہے اور اس کی رہنمائی مسلمانوں کو وہی **خیر امت اخرجت للناس** بنا سکتی ہے جس کے مصداق وہ قرون اولیٰ میں تھے۔ تیسری جماعت اگرچہ مفکرین اسلام کی کوئی آئیڈیل جماعت نہیں ہے کیونکہ اس میں مذہبیت کا عنصر بھی موجود ہے اور اگرچہ اپنے اندر کم دینی صلاحیت رکھتی ہے، گو باوجود اس کے اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمانوں کو یورپین استعمار کے ہلاکت خیز سیلاب سے بچانے میں بہترین روک ثابت ہوئی ہے اور گذشتہ ایک صدی میں صرف اسی نے دفع اعداء اور اصلاح احوال کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے پھر چونکہ اس میں مذہب کے احترام اور احکام مذہبی کی اطاعت کا جذبہ بہت کچھ موجود ہے اس لیے مذہبی طبقہ کی صحیح رہنمائی نہایت آسانی کے ساتھ اسے راہ اعتدال پر لا سکتی ہے۔

اب رہی چوتھی جماعت سو وہ دراصل اسلام پر یورپ کے غلبہ کی بدترین پیداوار ہے۔ اسلامی ممالک پر یورپ کا قبضہ، اسلامی قوموں پر یورپ کے مظالم، بلاد اسلامیہ کے مفاد و مصالح پر یورپ کا تسلط اور یہاں تک کہ اماکن مقدسہ پر یورپ کا استیلاء بھی اتنا خطرناک نہیں جتنا اس جماعت کا وجود ہے۔ کیونکہ پہلی چیز تو محض اسلام کی مادی شکست ہے جس کی تلافی ہر وقت ممکن ہے لیکن دوسری چیز دراصل اسلامی تہذیب و تمدن کی ہزیمت کو ظاہر کرتی ہے اور ہر شخص جس نے فلسفہ تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اچھی طرح

سمجھتا ہے کہ جب کوئی قوم شکست و ہزیمت کے اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو کوئی قوت اسے فنائے کامل سے نہیں بچا سکتی ہے۔ اگر یورپ کی استعماری قوتیں محض ہمارے جسموں پر مسلط ہو جائیں تو ہمیں ڈرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جب تک قلب اور روح آزاد ہیں ہمارے لیے آزادی کی امید باقی ہے اور ہمارے مستقل قومی وجود کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن اگر اس نے ہماری روحوں پر قبضہ حاصل کر لیا اور ہمارے دماغوں پر اس کی حکومت قائم ہو گئی تو پھر ہمارے جسموں کا آزاد ہو جانا بھی بے کار ہے' کیونکہ اس کی تہذیب سے مغلوب ہو جانے کے بعد ہمارا مستقل وجود قائم رہنا قطعاً محال ہے اور دنیا میں آج تک یہ معجزہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی قوم دوسری قوموں کی تہذیب اختیار کرنے کے بعد بھی ان میں جذب ہونے سے بچ گئی ہو۔

اس جماعت کو ہم نے یورپ کے "غلبہ کی بدترین پیداوار" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس میں محض لفاظی نہیں بلکہ ایک اہم حقیقت پوشیدہ ہے۔ اگر آپ اس کی اصلیت پر غور کریں گے تو پہلی نظر ہی میں معلوم ہو جائے گا کہ وہ دراصل یورپ کی سطوت و جبروت اور اسلام کی نکبت و ذلت کے اجتماع سے پیدا ہوئی ہے اور اس لیے اس کے دماغ پر یورپ اس بری طرح مسلط ہو گیا ہے کہ وہ ترقی اور یورپ کی تقلید جامد کو لازم و ملزوم سمجھنے لگی ہے۔ اس کے نزدیک کوئی پرانی چیز باقی رکھنے کے قابل نہیں ہے' مشرق کا تمدن اخلاق' تہذیب' معاشرت اور اس کے اجتماعی نظام کی ہر چیز پستی و ذلت کی یادگار رہے اور ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مشرق ہر بات میں مغرب کی پیروی نہ کرے۔ اس جماعت کے بعض بلند خیال طبقوں میں اتنی تمیز تو ضرور موجود ہے کہ وہ یورپ کے معائب پیدا کرنے کے ساتھ اس کے محاسن بھی اپنے اندر پیدا کرتے ہیں مگر عموماً ہم نے اس کے افراد میں یہ عیب دیکھا ہے کہ وہ یورپ والوں کی خوبیوں کو چھوڑ کر صرف عیوب کو چن لیتے ہیں اور صرف انہی کو لازمہ تہذیب سمجھنے لگتے ہیں۔ یورپ کی زندگی میں اگر کوئی چیز قابل تقلید ہے تو وہ اس کی مستعدی' قومی عصبیت' احساس فرض' مضبوطی اخلاق' شوق تحقیق' ذوق علمی اور عملی سرگرمی ہے اور دراصل یہی خوبیاں یورپین قوموں کے عروج و اقتدار کی ذمہ دار ہیں مگران سطحی النظر لوگوں کو ان میں سے کوئی چیز بھی قابل تقلید نظر نہیں آتی۔ انہیں لے دے کے اگر کچھ پسند آیا ہے تو

وہ صرف یورپ کا مسرفانہ نیم عریاں لباس‘ اس کی فضول خرچ معاشرت‘ اس کی غیر مشروط آزادی‘ اس کی مخرب اخلاق تہذیب‘ اس کی عفت کش بے پردگی اور اس کی دہریت و بے دینی ہے۔ بدقسمتی سے ترکی میں یہ آخری جماعت برسراقتدار آگئی ہے۔ وہاں اب کچھ اس طریقہ پر حلقہ ہائے فکری کی تقسیم ہوئی ہے کہ ان میں معتدل اور متوسط طبقے پوری طرح نشوونما نہ پاسکے اور ارتقاء اور ارتجاع کی ایک طویل کشمکش کے بعد دو ایسے طبقے پیدا ہو گئے ہیں جو قدامت پسندی و جدت طلبی کے دو انتہائی نقطوں پر قائم ہیں۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو سرے سے اصلاح ہی کا مخالف ہے اور ہمارے ہاں کی بریلوی جماعت کی طرح ہر قسم کے اوہام باطلہ و خرافات کاذبہ کو عین مذہب سمجھتا ہے اور دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو اپنی انتہا پسندی کے لحاظ سے اس چوتھی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی صفت ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ آج کل ان دونوں طبقوں کے درمیان تنازع للبقا کا سخت ہنگامہ برپا ہے اور ترکی کے متعلق جو کچھ خبریں ہم تک پہنچ رہی ہیں یہ زیادہ تر اسی ہنگامہ کی سرگذشت ہمیں سناتی ہیں۔ اگرچہ ان میں بڑی حد تک مبالغہ کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔

ہمارے لیے ان دونوں طبقوں کے درمیان کوئی مفصل محاکمہ کرنا تو بہت مشکل ہے‘ کیونکہ اس کے لیے جزئیات پر عبور ہونا ضروری ہے لیکن اس حد تک بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں طبقے غلطی پر ہیں اور ترکی کی فلاح و بہبود کے لیے دونوں کو مٹ جانا چاہیے۔ ہم نہ ترکوں کو اس جہالت و تاریکی میں مبتلا دیکھنا چاہتے ہیں جس کی بدولت وہ اپنی عظیم الشان سلطنت کھو بیٹھے ہیں اور نہ انہیں اس گمراہی و ضلالت میں پھنسے ہوئے دیکھنا پسند کرتے ہیں جو انہیں اسلام سے دور لیے جا رہی ہے۔ ہمیں نہ پسند ہے کہ ان کے درویش محافل سماع میں بدستور رقص کرتے رہیں اور نہ یہ پسند ہے کہ درویش کا ناچ ختم ہو کر عورتوں کا ناچ شروع ہو جائے۔ ہم نہ اس کو پسند کر سکتے ہیں کہ ان کا جاہل ملا انہیں غلط اور خود ساختہ مذہبی مسائل بنا کر گمراہ کرتا رہے اور نہ اس کو پسند کر سکتے ہیں کہ مشرقی ملا کی جگہ مغربی ملا مسند نشین ہو جائے اور مذہب کی قطع و برید کر کے اسے یورپ کے ملحدانہ خیالات کے مطابق ڈھال لے۔ ہم نہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی عورتیں تدبیر منزل کی تمام ضروریات سے بے خبر رہ کر ان کی نسلوں کو خراب کرتی رہیں‘

اور نہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ سرے سے خانہ داری کے مطلب ہی کی نہ رہیں اور محض مجالس عیش و نشاط کی سنگھار بن جائیں۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں حالتیں قابل اصلاح ہیں اور ترکی کو ان دونوں کے درمیان ایک متوسط راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جدید طبقہ نے ترکی کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ بے حد قابل قدر ہیں اور ہم ان لوگوں کی صف اول میں ہیں جو سیاسی اصلاح، فوجی تنظیم، اقتصادی ترقی اور استقلال قومی کی راہ میں اس کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اس کی یہ خدمات ان غلطیوں کے لیے کوئی سفارش نہیں ہو سکتیں جو وہ اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبوں میں کر رہے ہیں۔

{۲۶ر نومبر ۱۹۲۵ء}

پچھلی دو صحبتوں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ امر بخوبی واضح ہو چکا ہو گا کہ ہم نفس اصلاح کے مخالف نہیں ہیں بلکہ صرف اس اصلاحی نصب العین کے مخالف ہیں جو ترکی مدبرین نے اپنے پیش نظر رکھا ہے اور محض اس مسلک کو پسند نہیں کرتے جس پر وہ آج کل چل رہے ہیں جن چیزوں پر انہوں نے تغیر و تبدل کا عمل جاری کیا ہے، ان کو بدلنے کی ضرورت پر تو ہم بھی اتنا ہی زور دیتے ہیں جتنا وہ دیتے ہیں، مگر اس تغیر کے لیے جو صورتیں انہوں نے اختیار کی ہیں، ان کو ہم غلط اور بے بصیرتی و عدم تعمق کی دلیل سمجھتے ہیں۔ اس باب میں ان کی راہ افراط و انتہا پسندی کی راہ ہے اور ہم اعتدال و توسط کے قائل ہیں۔

افراط و اعتدال کے اس فرق کو واضح کرنے کے لیے ہم مثال کے طور پر اس اصلاح کو لیتے ہیں جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا، ترکی لباس میں کی گئی ہے۔ غیر قوموں کی تقلید میں سب سے زیادہ معصوم چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ لباس کی تقلید ہے۔ کیونکہ اس کی تائید میں نہایت آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ محض لباس کے اختیار کر لینے میں کوئی اخلاقی نقصان نہیں ہے، ہر شخص جس لباس کو اپنے لیے آرام دہ اور خوشنما سمجھے اسے آزادی کے ساتھ پہن سکتا ہے اور محض تبدیلی لباس کو قابل اعتراض قرار دینا تنگ نظری کی دلیل ہے۔ لیکن اگر اس تبدیلیٔ لباس کو نفسیات کے اصول پر جانچیے تو معلوم

ہوتا ہے کہ یہ تحریک بھی اتنی معصوم نہیں ہے جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ انسان کا لباس محض اس کی جسمانی ہیئت ہی کا مظہر نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک اس کے اندرونی خیالات اور اس کی ذہنی کیفیات کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ آپ جس قسم کا لباس پہنیں گے اس سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبہ و عمامہ زیب بدن ہو گا تو لوگ سمجھیں گے کہ مولوی ہیں۔ پرانے طرز کی کامدار ٹوپی اور گھنڈی دار انگرکھا پہنے ہوں گے تو لوگوں کو خیال ہو گا کہ دلی کے قدیم شرفاء میں سے ہیں۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن کر نکلیں گے تو لوگ یہ رائے قائم کریں گے کہ روشن خیال متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں' یورپین وضع کا لباس بدن پر ہو گا تو لوگ سمجھ لیں گے کہ انگریزی تہذیب اور مغربی خیالات آپ کے قلب میں متمکن ہو چکے ہیں اور اگر سوٹ کے ساتھ ہیٹ بھی آپ کے سر پر ہو گی تو ہر شخص کو فوراً شک گزرے گا کہ آپ پر مغربیت اچھی طرح مسلط ہو چکی ہے اور عرف عام میں "پورے صاحب" بن گئے ہیں۔

یہ مختلف رائیں آخر کیوں قائم کی جاتی ہیں؟ ایک جبہ پوش کو متفرنج اور ایک سوٹ بوٹ پہنے ہوئے شخص کو مذہبی طبقہ کا آدمی کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ اس کی اصلیت پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ انسان محض اتفاقاً اور اچانک کسی لباس کو اختیار نہیں کرتا' بلکہ اپنی قوت تمیز سے کام لے کر مختلف اوضاع میں سے کسی ایک وضع کو پسند کرتا ہے اور اس طرح اختیار لباس سے پہلے اندر ہی اندر اس کی ذہنی دنیا میں ایک بہت بڑا ہنگامہ کسی خاص فیصلہ پر مختتم ہو چکا ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص فرنگی وضع کا لباس پسند کرتا ہے تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ اس لباس میں اسے آسائش اور خوشنمائی نظر آتی ہے بلکہ دراصل اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے ذہن میں ایک عرصہ تک مشرقیت و مغربیت کے درمیان تنازع للبقا کا ہنگامہ گرم رہا ہے اور آخر کار وہ ہنگامہ اس نتیجہ پر ختم ہو چکا ہے کہ مشرقیت کو شکست فاش ہوئی' قومی شعائر کی عظمت آپ کے دل سے رخصت ہو گئی اور یورپین تہذیب و تمدن کا رعب آپ پر مسلط ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ قوموں کے باہمی میل جول سے اس قسم کی تغیر لباس صرف انہی قوموں میں ظاہر ہوا کرتی ہے جو مغلوب و مفتوح ہوتی ہیں اور جن کے دلوں پر فاتح قوموں کی ہیبت قائم ہو جاتی ہے مگر فاتح انگریزوں میں سے شاید کوئی ایک بھی ایسا نہ مل سکے گا جو

ہندوستانی لباس پہنتا ہو۔ رذیل و منکوب مصریوں میں آپ کو بیشمار نوجوان انگریزی کپڑوں میں ملبوس نظر آئیں گے مگر انگریزوں میں آپ کو ایک فرد بھی ایسا نظر نہ آئے گا جو عبا و قبا کو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ اس کی وجہ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی کہ انگریزوں کی قوت نے ہندوستان اور مصر کو ذلت کے انتہائی مدارج تک پہنچا دیا ہے اور غیر تو غیر خود ہندوستانی اور مصری بھی اپنے قومی شعائر کو انگریزی شعائر کے مقابلہ میں ذلیل سمجھتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ صرف اجتماعی اختلاط کا نتیجہ ہوتا اور اس میں فاتحانہ قوت کی ہیبت کو کوئی دخل نہ ہوتا تو کم از کم ایک فی صد انگریز، مصری و ہندوستانی لباس ضرور پہنے ہوئے نظر آتے۔

اس معاملہ میں آسائش اور خوشنمائی کی دلیل محض مصنوعی دلیل ہے۔ اگر یورپین ہیٹ میں یہ آسانی ہے کہ اس کا چھجہ دھوپ کی تمازت سے چہرے اور گدی کو محفوظ رکھتا ہے تو شاید مشرقی پاجاموں اور کرتوں میں بھی یہ آسانی ہے کہ وہ گرمی کے زمانہ میں بہت ہوا دار ہوتے ہیں اور ان میں نہایت راحت اور آسائش سے آدمی اٹھ بیٹھ اور چل پھر سکتا ہے لیکن اس آسائش نے آج تک ایک یورپین کو بھی مشرقی لباس کی طرف متوجہ نہیں کیا اور اس آسائش نے سینکڑوں ہزاروں مشرقیوں کو ہیٹ پہنوا دی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یورپ والوں کی قومی غیرت ہماری قومی غیرت سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے اور وہ اتنے بے غیرت نہیں ہیں کہ محض معمولی سی تن آسانیوں پر اپنے قومی شعائر کی عزت کو قربان کر دیں۔

پس اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ لباس کی عصبیت تنگ نظری کی دلیل ہے تو اس سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنگ نظری کے ساتھ وہ ذہنی آزادی اور قومی غیرت کی دلیل بھی ہے، اور کم از کم ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ انسان کے لیے تنگ نظر ہونا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ بے غیرت اور غلام ہو۔

اس نقطہ نظر سے جب ہم اس جدید تحریک کو دیکھتے ہیں جو ترکی میں یورپین وضع کی چھجے دار ٹوپی رائج کرنے کے متعلق جاری ہے تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں ترکی کے مدبرین سخت غلطی کر رہے ہیں۔ ان کی یہ تحریک درحقیقت کوئی اصلاح نہیں بلکہ الٹا فساد ہے اور ترکوں کو ایک بڑی ذلت میں مبتلا کر رہی ہے۔ ترکوں نے اپنی شجاعت و شہامت سے ڈیڑھ سو برس کے بعد پہلی مرتبہ یورپ پر فتح حاصل کی تھی اور اب وقت آیا

تھا کہ وہ اپنے کیریکٹر کی مضبوطی سے دنیا پر اپنی عظمت و فوقیت کا سکہ بٹھا دیتے مگر افسوس کہ وہ جنگ و پیکار کے میدان میں کامیاب ہونے کے بعد تہذیب و تمدن کے میدان میں یورپ سے شکست کھا رہے ہیں اور انہوں نے اپنی اس ذلت و نکبت کی یادگار کو اپنے سروں پر جگہ دی ہے جو گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے انہیں یورپین طاقتوں کے مقابلہ میں نصیب ہو رہی تھی۔ اگر یہ تحریک صرف انفرادی حیثیت ہی سے جاری ہوتی، تب بھی ہم صبر کر لیتے کہ یورپ کی ذہنی غلامی کا یہ اثر صرف افراد تک محدود ہے اور اجتماعی حیثیت سے پوری قوم اس میں مبتلا نہیں ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہاں ایسی تمام تحریکات کی سربراہی حکومت اور برسر اقتدار جماعت کر رہی ہے اور خواہ اس میں جبر سے کام نہ لیا جاتا ہو لیکن وہ نفوذ و اثر ضرور شامل ہے جو حکمران طبقہ کو اجتماعی امور میں حاصل ہوا کرتا ہے۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو تمدنی و معاشرتی اصلاح کے مخالف ہیں اور کسی خاص لباس کو الہامی و آسمانی لباس سمجھتے ہیں مگر ہمارے خیال میں تمدنی اصلاح کی بنیاد غیر قوموں کی تقلید نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ محض ایسی اصلاح ہونی چاہیے جس سے قدیم تمدن جدید ضروریات کے مطابق ہو جائے۔ جہاں تک اس قسم کی ترمیم و تغیر کا تعلق ہے کوئی **صحیح الخیال** آدمی اس کو برا نہیں کہہ سکتا مگر جب اعلانیہ غیر قوموں کا طرز معاشرت اختیار کیا جانے لگے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی قومی معاشرت کو جہالت و تنگ نظری سے تعبیر کر کے اس کو قابل نفرت قرار دیا جانے لگے تو اسے کوئی بالغ النظر آدمی پسند نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی اصلاح کو موجودہ ترکی مدبرین ”ارتقائے ذہنی“ کی دلیل سمجھتے ہیں مگر ہمارے نزدیک وہ خفت عقل اور سطحیت کی دلیل ہے۔

☐ عجیب رواداری

{ ۲۲ر نومبر ۱۹۲۵ء }

اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ پنجاب کے مشہور ہندو لیڈر بھائی پرمانند صاحب کی تقریر درج کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ بھائی جی نے اپنی قوم کو کس قسم کی زہریلی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے ہم اس پر کوئی رائے

زنی کرنا فضول سمجھتے ہیں لیکن معزز مقرر نے اس سلسلہ میں ایک بات ایسی دلچسپ فرمائی ہے کہ اس کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انہوں نے جگہ جگہ مسلمانوں کی رواداری پر حملے کئے ہیں اور انہیں متعصب و تنگ نظر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر ایک جگہ ریواڑی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے خود اپنی "رواداری" اور "وسیع النظری" کا اس طرح اظہار فرمایا ہے کہ جب ریواڑی کے چماروں نے لکھ پڑھ لینے کے بعد آریوں سے کہا کہ ہمیں مساوی حقوق دو ورنہ ہم مسلمان ہو جائیں گے تو آریہ بھاگے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں نے کہا کہ اگر تم میں ان کو جذب کرنے کی طاقت نہیں تھی تو پھر کیوں انہیں پڑھایا لکھایا۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ انہیں آزادی کی تعلیم دینے کی بجائے تاریکی ہی میں رہنے دیتے۔

ہم حیران ہیں کہ آخر یہ کس قسم کی رواداری ہے۔ جو شخص صرف اس بنا پر ایک قوم کو علم و تہذیب کی روشنی سے محروم رکھنا چاہتا ہو کہ وہ اس کی قوم میں جذب ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی یہ جرأت بے حد قابل داد ہے کہ وہ اس تنگ نظری کے باوجود دوسری قوموں کی عصبیت پر نکتہ چینی کرتا ہے۔

* فکر معکوس

سنگٹھن کی تحریک نے ہمارے ہندو معاصرین میں اس قدر تنگ نظری و عصبیت پیدا کر دی ہے کہ وہ ہر چیز کو حتیٰ کہ ایسی چیزوں کو بھی جن سے ان کا کوئی خفیف سا تعلق بھی نہیں ہوتا، خواہ مخواہ ہندو مسلم منافرت کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ تعصب کا اندھا جوش ان کی آنکھوں پر کچھ ایسی پٹی باندھ دیتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے خلاف نہایت صاف اور واضح دلائل کو بھی اس کی تائید میں پیش کرتے ہوئے نہیں چوکتے۔ پچھلے دنوں مولوی عبدالماجد صاحب نے "سچ" میں ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو فوجی و سرکاری ملازمت کی غیر شرعی حیثیت سے آگاہ کرنا تھا۔ قابل مضمون نگار نے مسلمانوں کو بتایا تھا کہ ان کا "غیر اسلامی حکومتوں کی پولیس میں بے دغدغہ بھرتی ہو جانا" اور غیروں کی دی ہوئی مجسٹریٹی اور ججی کو بلا تامل قبول کر کے مسلمانوں کے لیے سزائے قتل صادر کرنا" شریعت اسلامی کے نزدیک ایسے شدید

جرائم ہیں جو کسی طرح معاف نہیں کیے جا سکتے لیکن ہمیں ۱۸ر نومبر کے "ہندو" میں یہ دیکھ کر بے انتہاء حیرت ہوئی کہ اس نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں اس مضمون کو "ہائی کورٹ کا ایک اور جج مسلمان بنایا جائے اور مسلمانان پنجاب کا مطالبہ" کے عنوانات کے ماتحت یہ سمجھا ہے کہ "اگر جج مسلمان ہوگا تو ہرگز کسی مسلمان مجرم کو سزائے موت نہ دے گا ورنہ کافر سمجھا جائے گا"۔ لہٰذا مسلمانان پنجاب ایک مسلمان جج کا مطالبہ صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ "آئندہ سے ہر مسلمان مجرم قتل صاف بچ جایا کرے"۔ ان چند فقروں میں اس تنگ نظر ہم عصر نے "چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا" کی جو بہترین مثال پیش کی ہے وہ جس قدر مضحکہ خیز ہے، اسی قدر افسوسناک بھی ہے۔ وہ جس مضمون سے استدلال کر رہا ہے۔ اس کی تو صاف صاف تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ تمام سرکاری ملازمتیں حرام ہیں جن میں غیر مسلموں کا آلہ کار بن کر مسلمانوں کا خون بہانا پڑتا ہے لیکن وہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ اس کے معنی یہ قرار دیتا ہے کہ صاحب مضمون نے مسلمانوں کو نہایت کثرت کے ساتھ سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کی ترغیب دی ہے تاکہ کوئی مسلمان مجرم اپنے افعال کی سزا نہ پا سکے! خوش فکری و سخن فہمی کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے معنی یا تو یہ سمجھے جائیں کہ ہمارے ہمعصر نے مضمون کے صحیح مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود اسے عمداً معکوس صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے یا یہ کہ وہ مولانا عبدالماجد کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے کی قابلیت بھی نہیں رکھتا۔ اگر پہلی چیز صحیح ہے تو اس سے معاصر موصوف کا اخلاقی درجہ جس قدر بلند ثابت ہوتا ہے وہ ظاہر ہے اور اگر دوسری چیز صحیح قرار دی جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو نہایت سلیس اردو کا مضمون پوری طرح نہیں سمجھ سکتا اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی روزنامہ اخبار کی ذمہ داری سے خواہ مخواہ رائے عامہ کو گمراہ کرتا رہے؟ کیا اخبار نویسی اب محض ایک بازیچہ اطفال رہ گئی ہے کہ ہر نادان بچہ اس کے فرائض انجام دینے کا اہل سمجھا جاتا ہے؟۔

* ایس ایس آر لائن پر مسلمانوں کی تکالیف

ہمارے پاس متعدد مرتبہ اس امر کی شکایتیں پہنچی ہیں کہ دلی سے سہارن پور ریلوے

لائن پر دیوبند کے سوا کہیں مسلمانوں کے لیے پانی کا انتظام نہیں ہے اور اس سے ان مسلمانوں کو سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے جو ہندوؤں کے ہاتھ سے پانی پینا مکروہ سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس لائن پر تقریباً تمام کارکن ہندو ہیں۔ اس لیے انہیں اس تکلیف کا احساس نہیں ہے مگر ہمارے نزدیک کم از کم ان مسلمانوں کو اس کا ضرور احساس ہونا چاہیے جو بلا کسی وقت کے نہایت آسانی کے ساتھ چند اسٹیشنوں پر پانی کا انتظام کر سکتے ہیں۔ باغپت، بڑوت اور تھانہ بھون وغیرہ قصبات میں مسلمانوں کی کافی تعداد آباد ہے اور خدا کے فضل سے سب خوشحال ہیں۔ اگر وہ اسلامی اخوت کا خیال کر کے ایک ایک سقہ کو ان اسٹیشنوں پر مقرر کر دیں تو اس سے مسلمانوں کی ایک بڑی تکلیف رفع ہو جائے گی۔

☐ خیبر ریلوے

کم و بیش ۳۵ سال سے جس خیبر ریلوے کا غلغلہ ہم برطانیہ کے سیاسی منصوبوں میں سن رہے تھے، آج وہ پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور ایسوسی ایٹڈ پریس ہمیں خبر دیتا ہے کہ عنقریب وائسرائے بہادر اس کا افتتاح کرنے والے ہیں۔ بادی النظر میں یہ ایک نہایت معمولی واقعہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں بیسوں ریلوے لائنیں اب تک تعمیر ہو چکی ہیں اور ہم ان کی طرف کوئی ادنیٰ سا اعتناء بھی نہیں کرتے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خیبر ریلوے لائن میں بیشمار ایسی سیاسی مصلحتیں پوشیدہ ہیں جنہیں ہندوستان، افغانستان، علاقہ سرحد اور ان کے واسطہ سے دنیا کی سیاسی قسمت کے ساتھ اب گہرا تعلق ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج اس ریل کا افتتاح وہ شخصیت کر رہی ہے جو ہندوستان میں برطانوی فرعونیت کی سب سے بڑی علمبردار ہے۔ حالانکہ عام طور پر ریلوں کے افتتاح کے لیے بڑے حضور کو تو کجا چھوٹے حضوروں کو بھی دعوت نہیں دی جاتی۔ اس راز کو سمجھنے کے لیے ہمیں سرحدی سیاست کی گذشتہ ہشتاد سالہ تاریخ پر ایک مختصر نظر ڈالنی چاہیے۔

خیبر ریلوے کی تجویز آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے برطانوی مدبرین کے دماغوں میں گشت لگا رہی ہے جب ہندوستان کی طرف روس کے اقدام نے مستقل برطانوی روسی رقابت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ جس وقت روس کی فوجی طاقت تمام وسط ایشیا کی قوتوں کو پامال کر چکی تو اس نے پطرس اعظم کی وصیت کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کی تسخیر کا

ارادہ کیا اور افغانستان کی سرحد کو یورپین روس کے بہترین فوجی مرکزوں سے ملا دینے کی کوشش شروع کردی۔ چنانچہ اس نے اپنی ٹرانس پرشین ریلوے کو سمرقند تک وسیع کرکے، مرو سے کنکر تک ایک چھوٹی سی لائن تعمیر کی اور وہاں اتنا ذخیرہ تعمیر جمع کردیا کہ بوقت ضرورت آناً فاناً میں ہرات تک راستہ صاف کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی درنبرگ، تاشقند ریلوے تعمیر کرکے ٹرانس سائبیرین ریلوے سے ٹرانس کیپین ریلوے کو ملادیا تاکہ جنگ کے موقع پر مشرق و مغرب کی تمام قوتیں پوری امکانی سرعت کے ساتھ افغانی سرحد پر جمع کی جاسکیں۔

روس کی ان تیاریوں کو دیکھ کر برطانیہ نے بھی ہندوستان کی سرحدوں کو مضبوط کرنے اور ان تمام راستوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع کردیں جن سے ہندوستان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان پر روسی حملہ کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک خیبر جو ایشیائی قوموں کا تاریخی راستہ ہے اور دوسرا درہ بولان جو سیستان کی طرف سے ہندوستان آنے کا راستہ ہے۔ پس برطانیہ نے ان دونوں کو محفوظ کرنے کے لیے ایک طرف بلوچستان پر قبضہ کرکے چمن تک ریلوے لائن تعمیر کردی جہاں سے قندھار تک دو مہینہ میں راستہ صاف کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف ۱۸۷۹ء کے مشہور عہد نامہ گندک میں امیر عبدالرحمٰن خاں سے خیبر کا تاریخی درہ حاصل کرلیا جسے صحیح معنوں میں افغانستان کا دروازہ کہنا چاہیے۔ برطانوی مدبرین مدت سے اس دروازہ کی تمنا کر رہے تھے اس لیے اس کے حصول نے انہیں ان تمام قربانیوں کو بھلا دیا جو پہلی مرتبہ ۱۸۴۱ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۵۵ء میں انہیں دینی پڑی تھیں اور لارڈ بیکنزفیلڈ یہ کہہ کر خوشی سے اچھل پڑے کہ

"افغانستان سے ہماری لڑائی صرف اسی مقام کے لئے تھی"۔

خیبر کو حاصل کرتے ہی افغانی سرحد کی طرف ریلوں کی توسیع کے لیے نئی نئی سکیمیں بنی شروع ہو گئیں، یہاں تک کہ پنجدہ پر روسی قبضہ کے واقعہ نے جس پر ۱۸۸۵ء میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی، برطانوی مدبرین کو چونکا دیا اور انہوں نے ۱۸۹۱ء میں اسمبلی میں بل پاس کیا کہ خیبر تک ریلوے لائن تیار کی جائے ـــــ ۱۹۰۲ء میں اس راستہ کی پیمائش تک کرلی گئی اور ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کی مستعدی سے کام بھی شروع ہو

گیا، مگر بعد کے واقعات سے برطانیہ کی سرحدی سیاست میں کچھ ایسے اتار چڑھاؤ ہوئے کہ ان کی بدولت یہ عظیم الشان اسکیم بھی ایک عرصہ کے لیے معرض التوا میں پڑ گئی۔

ان واقعات میں سب سے اہم واقعہ کنگ ایڈورڈ سے زار روس کی ملاقات کا مشہور واقعہ ہے جس کے اثر سے ۱۹۰۷ء میں برطانیہ و روس کی رقابت ایک گہری دوستی میں منتقل ہو گئی اور جرمنی کے فوجی دیوتا کو زیر کرنے کے لیے ان دونوں قوتوں نے آپس میں اتحاد کر لیا پھر جنگ عظیم برپا ہوئی اور اس میں روس کی شہنشاہیت مٹ جانے سے بظاہر وہ خطرہ بالکل ہی رفع ہو گیا جو خیبر ریلوے کا محرک تھا۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ و جاپان کے اتحاد نے اس امر کی ضمانت بھی مہیا کر دی کہ خطرہ کے وقت ایک زبردست ایشیائی طاقت ہندوستان کو برطانیہ کا غلام رکھنے میں مدد دے گی۔ ان انقلابات نے لارڈ لٹن اور کرزن کی اقدامی سیاست کو بڑی حد تک بدل دیا تھا لیکن جنگ کے بعد جو واقعات پیش آئے ان سے دفعتہ" سرحدی سیاست نے ایک دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ افغانستان کی لڑائی اور پھر استقلال کامل، روس کی نشاۃ ثانیہ اور سوویٹ جیسے زبردست نظام شوروی کے قیام اور ان سب باتوں کے ساتھ افغانستان، ایران اور ترکی کے ساتھ جدید روسی حکومت کے دوستانہ تعلقات نے دفعتہ" اس حقیقت کا انکشاف کر دیا کہ اس جدید دور میں وہ پرانے سرحدی انتظامات بھی قائم نہیں رہ سکتے جو لارڈ کرزن نے مرتب کئے تھے کیونکہ ایسی صورت میں جبکہ افغانستان مدمقابل ہو۔ سرحدی اقوام کی دوستی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ۲۰ر اگست ۱۹۲۰ء کو لارڈ چیمس فورڈ نے ایک جدید سرحدی پالیسی کا اعلان کیا جس میں وزیرستان کی فوجی تنظیم اور سرحدی ملیشیا کی جگہ باقاعدہ فوج مقرر کرنے کے ساتھ ہی خیبر کی مردہ اسکیم میں بھی جان ڈالی گئی جسے اب محض روس کا مقابلہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ افغانستان کا گلا گھونٹنے کے لیے بھی تعمیر کرنا ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا اربوں روپیہ خرچ کرکے سرحد ہند پر ایسے زبردست فوجی استحکامات تعمیر کئے گئے جو اس وقت بلا مبالغہ دنیا کے بہترین استحکامات کہے جا سکتے ہیں۔

یہ اس ریلوے کی مختصر تاریخ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان اور افغانستان کی قسمت سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ہندوستان کے متعلق تو صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسکیم بھی، انہی استعماری اسکیموں میں سے ہے جو ہندوستان کو دائمی غلامی میں رکھنے کے

لیے عمل میں لائی جارہی ہیں اور اس لحاظ سے ہر حریت پسند ہندوستانی کو اس خیبر ریلوے سے اتنی نفرت ہونی چاہیے جتنی نہر سویز کے قبضہ اور عقبہ و معان کے الحاق سے اس کے دل میں موجود ہے لیکن افغانستان کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیبر ریلوے کی تکمیل متعدد حیثیات سے اس کے لیے ایک شدید خطرہ ہے اور وہ اس کی زندگی کو کبھی نہ کبھی ضرور دھمکی دے گا۔ پہلے تو یہ ریلوے صرف اس لیے تعمیر کی جارہی تھی کہ افغانستان کو روس کے اثر میں جانے سے روکا جائے، مگر اب اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے سر پر برطانوی تلوار قضائے مبرم کی طرح ہر وقت لٹکتی رہے اور کابل میں برطانوی استعمار کے لیے خطرہ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی پشاور سے انبالہ تک کی تمام چھاؤنیوں کو چند گھنٹہ کے اندر جلال آباد کے دروازہ پر پہنچا دیا جائے۔ اس ریلوے کی تعمیر نے برطانیہ کی اس اسکیم کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے جس کا مقصد ہندوستان کی حدود سے آگے بڑھ کر ایشائی فاتحوں کا راستہ روکنا ہے۔ چنانچہ اب انگریز کی ریلوے لائنیں دو طرف سے افغانی سرحد کو مس کرتی ہیں۔ ایک طرف چمن کے ریلوے اسٹیشن نے مغربی افغانستان کو کوئٹہ سے ملا دیا ہے اور دوسری طرف خیبر کے جدید ریلوے اسٹیشن نے مشرقی سرحد سے پشاور کو قریب تر کر دیا ہے۔ دراصل یہی وہ پھندا تھا جس کو امیر عبدالرحمٰن خاں اور امیر حبیب اللہ خاں مرحوم نے پہننے سے انکار کر دیا تھا اور اب ہم سمجھتے ہیں کہ امیر امان اللہ خاں بھی اس کو ہرگز پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ امیر عبدالرحمٰن خاں نے ہمیشہ اس اسکیم کی مخالفت کی اور خود اپنی تزک میں بھی اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ ”میری ناراضگی کے باوجود وہ (انگریز) کوئٹہ سے پسنی تک ریلوے لائن نکال لائے ہیں“۔ امیر حبیب اللہ خاں شہید کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ انہوں نے سر لوئیس ڈین سے محض اس بنا پر گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا کہ وہ منجملہ دیگر امور کے خیبر ریلوے کے متعلق بھی ان سے مفاہمت کرنا چاہتے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت غازی امیر امان اللہ خاں جن کی حریت پسندی اور قومی خودداری اپنے تمام پیش رووں سے بڑھی ہوئی ہے اس کے متعلق کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

ٹائمز آف انڈیا نے اپنے ایک اڈیٹوریل نوٹ میں یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ اس ریلوے سے افغانستان اور ہندوستان کے درمیان تجارتی آسانیاں پیدا ہو

جائیں گی اور حمل و نقل کی مشکلات میں بہت کچھ کمی ہو جائے گی مگر واقعہ یہ ہے کہ افغانستان اور سرحد کی دوسری اقوام پر اس کا نہایت برا اثر پڑے گا۔ مثلاً افغانستان میں غلہ اور اسباب خوردونوش کی افراط کے باعث جو ارزانی ہے وہ بہت جلدی کافور ہو جائے گی، کیونکہ اس ریلوے سے اجناس کی برآمد میں آسانیاں پیدا ہوں گی اور سرمایہ واروں کے لیے تجارتی منافع کا ایک نیا میدان کھل جائے گا۔ اسی طرح افغانستان میں یورپ کے عیش پسندانہ لوازم کی درآمد زیادہ ترقی کر جائے گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ افغانی قوم کی زندگی میں بھی ہندوستان کی طرح یورپ کے زہریلے عناصر شامل ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا مادی نقصان یہ ہو گا کہ سرحدی آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کی روزی ماری جائے گی۔ کیونکہ سرحد پر آمدنی کا اہم ترین ذریعہ بار کشی اور حمل و نقل ہے۔ جس پر خیبر ریلوے کا اثر نہایت مہلک ہو گا۔ اقوام خیبر کو راستوں کی حفاظت کا جو معاوضہ دیا جاتا تھا وہ بھی غالباً بند کر دیا جائے گا اور اس طرح ان کی تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی ختم ہو جائے گی۔ جس کا شاید لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ پھر ڈاکہ زنی پر اتر آئیں گے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ جب ہم دیکھتے ہیں کہ صحیح جنگی نقطہ نظر سے یہ ریلوے کچھ ہندوستان کی حفاظت کے لیے بھی مفید نہیں ہے تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ یہ عظیم الشان منصوبہ محض ایک احمقانہ منصوبہ ہے۔ برطانوی مدبرین خواہ کتنے ہی دور اندیش ہوں مگر ان کی آنکھیں اس حقیقت کے مشاہدہ سے قطعاً عاجز ہیں کہ انگلستان کے قبضہ ہند کے لیے اصلی خطرہ وسط ایشیا یا افغانستان کی پہاڑیوں میں نہیں ہے بلکہ خود انگریز عمال کی بداعمالیوں اور ان کی اس غلط استعماری سیاست میں ہے جس نے تمام مشرقی اقوام کو ان سے متنفر کر دیا ہے۔ اگر آج وہ اس حقیقت کو محسوس کر لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ خیبر ریلوے، سرحد کے استحکامات اور آلات جنگ کی کثرت، سب کچھ ایسی حالت میں بیکار ہے جب وہ اپنے اعمال سے خود ہی اپنی سلطنت کی جڑیں کھود چکے ہیں۔

* مستقبل حجاز اور ابن سعود

۱۰ر دسمبر کے تنظیم میں جناب قرشی نے سلطان ابن سعود کے اس خط پر جو انہوں

نے شاہان اسلام کے نام بھیجا ہے' ایک افتتاحیہ تحریر فرمایا ہے اور اس میں چند نہایت صاف اور سادہ باتوں پر کچھ اس طریقے سے تنقید کی ہے کہ اگر ہمیں جناب موصوف کے حسن نیت کا یقین نہ ہوتا تو شاید ہم یہ سمجھتے کہ انہوں نے قصداً اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ سلطان نے اس خط میں جس قدر وضاحت کے ساتھ اپنی پالیسی کے مبادی و اصول بیان کئے ہیں ان مین ظاہر میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی مگر قرشی صاحب کو اس میں جگہ جگہ نہ صرف پیچیدگیاں نظر آتی ہیں بلکہ کہیں کہیں بدنیتی کے آثار بھی نظر آجاتے ہیں۔ چنانچہ سلطان کے ان الفاظ پر تنقید کرتے ہوئے کہ "حکومت سعودیہ کی فراہم کردہ ان سہولیات کے لحاظ سے جو دنیائے اسلام کو حجاز میں حاصل ہیں حجاز تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ہے"۔ آپ فرماتے ہیں کہ! اس بنیادی اصول کے بعد سلطان نے حجاز گورنمنٹ کا جو نظام ترکیبی بیان کیا ہے اس سے "حجاز حجازیوں کے لیے" کا اصول بالکل فنا ہو کر "حجاز نجدیوں کے لیے ہے" کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ سلطان کے اس خط میں کونسی چیز ایسی ہے جس سے "نجدیوں کے لیے ہے" کا منظر آنکھوں کے سامنے آسکتا ہے۔ سلطان تو خدا کی قسم کھا کر یقین دلا رہا ہے کہ "میں نے حجاز پر تسلط اور قبضہ کا کبھی ارادہ نہیں کیا" اور صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ "میں حجاز کو اپنے ہاتھ میں محض ایک امانت سمجھتا ہوں"۔ جسے ہر اس شخص کے سپرد کرنے پر تیار ہوں جس کو مندوبین مسلمانان عالم منتخب کرلیں مگر باوجود اس کے جناب قرشی اس پر یہی بدگمانی کر رہے ہیں کہ وہ حجاز کو نجدیوں کے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہے۔

آگے چل کر سلطان کے یہ الفاظ کہ

> "ہم ایک استفتائے عام نکالنے والے ہیں جس میں دنیا کے مسلمانوں سے حاکم حجاز کے متعلق رائے لی جائے گی کہ کس شخص کو مندوبین عالم اسلام کی نگرانی میں حاکم بنایا جائے"۔ آپ کے دل میں ایک دوسرا شک پیدا کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ سلطان "حجاز حجازیوں کے لیے" کا اصول باطل کرکے "حجاز دنیائے اسلام کے لئے" کا اصول قائم کر رہے ہیں۔ آپ کو سخت حیرت ہے کہ "حجاز حجازیوں کے لیے کیسے؟ جبکہ نہ وہ صدر کو اپنے میں سے منتخب کریں گے اور نہ پارلیمنٹ کے اراکین کو"۔

مگر یقین جانئے کہ ہمیں اس بات پر قریشی صاحب سے زیادہ حیرت ہوئی کہ انہوں نے یہ مضمون کہاں سے نکال لیا۔ سلطان کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ:۔

> "حجاز میرے ہاتھ میں اس وقت تک کے لیے ایک امانت ہے جبکہ حجازی محض اپنے میں سے ایک ایسا حاکم مقرر کرلیں جو عالم اسلامی کی رائے کے سامنے سرنگوں اور اقوام اسلام اور ان اقوام کی زیر نگرانی ہو جنہوں نے مسلمانان ہند کی طرح غیرت ملی اور حمیت دینی کا ثبوت دیا ہو"۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ حجازیوں کا حاکم وہی ہو گا جسے "حجازی محض اپنے میں سے" مقرر کریں گے۔ اس کے بعد یہ سمجھنا کہ حجاز کا حاکم حجازیوں میں سے نہ ہو گا اور انہیں انتخاب کا کوئی حق نہ ہو گا عقل سلیم پر ظلم سے کم نہیں ہے ممکن ہے کہ قریشی صاحب کو استفتائے عام کی تجویز سے دھوکہ ہوا ہو جس میں عالم اسلامی کے مندوبین پر حاکم حجاز کے انتخاب کو چھوڑ دیا گیا ہے لیکن اگر اول الذکر تصریح سے اس تجویز کو ملا کر پڑھا جائے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ حجازیوں کے منتخب کردہ حاکم کے لیے عالم اسلامی کی مرضی اور نگرانی لازمی ہوگی اور یہ ایسی ناگزیر شرط ہے جس سے خود قریشی صاحب کے بقول "کوئی فرزند اسلام انکار نہیں کر سکتا"۔

اس کے بعد قریشی صاحب نے حکومت حجاز کے اختیارات پر بحث کرتے ہوئے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ سلطان حکومت حجاز کے خارجی اختیارات کو بالکل اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں حالانکہ سلطان نے اس کے اختیارات کی تشریح میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا کہ اسے تاویل بعید کے بعد بھی "اپنے مخصوص کرنے" کے معنی پہنائے جا سکتے ہوں۔ سلطان کی شرائط یہ ہیں کہ "حکومت حجاز کو کسی حکومت سے جنگ کرنے یا کوئی سیاسی معاہدہ کرنے یا اسلامی حکومتوں کے سوا کسی سے اقتصادی معاہدہ کرنے کا اختیار نہ ہو گا"۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ اختیارات حکومت نجد کو ہوں گے۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ حجاز کے متعلق اس قسم کی خارجی سیاست کا کبھی وجود ہی نہیں ہو گا اور اس کے وجوہ بالکل صاف ہیں۔ حجاز کی سرزمین کو سیاسی جوڑ توڑ، اقتصادی لوٹ مار اور جنگ و خونریزی سے محفوظ رکھنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ وہ سیاسی معاہدات کی الجھنوں سے الگ رہے، اسلامی حکومتوں کے سوا کسی سے

تعلقات نہ رکھے اور اپنی حفاظت کے لیے پوری طرح تیار رہتے ہوئے کسی کے خلاف جنگ کا اقدام نہ کرے۔ ممکن ہے کہ اس میں قریشی صاحب کو کوئی نئی بات نظر آئی ہو مگر یہ وہی باتیں ہیں جن کو دنیائے اسلام کے بہترین ارباب فکر عرصہ سے سوچ رہے ہیں۔

❑ دہلی میں آریوں کی تازہ شرارت

{۲۶ر نومبر ۱۹۲۵ء}

ہمارے پاس چند مسلمان یہ شکایت لے کر آئے ہیں کہ ہندوؤں کے بعض لڑکے چاندنی چوک اور دوسری بڑی بڑی سڑکوں پر ایسی نظمیں گا گا کر فروخت کر رہے ہیں جن سے مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوتی ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں پھر کوئی جھگڑا نہ ہو جائے۔ ان نظموں میں سے ایک نہایت دل آزار نظم ایک مسلمان کی فریاد ہے۔ جس کے چند بند یہ ہیں۔

کچھ دنوں تک سب مسلمان آریہ ہو جائیں گے، بھول کر اپنے نبی ﷺ کو ان پہ ایمان لائیں گے۔

یہاں آریہ دیں گے نہ جینے مجھے
میرے مولا بلالو مدینے مجھے

پھر مسلمانوں مسلماں ہند میں باقی کہاں، گر رہی رفتار شدھی کی یہی قائم یہاں
رہے سوچ یہ بارہ مہینے مجھے
میرے مولا بلا لو مدینے مجھے

آریہ ہی ایک ہیں یا جان کو میری وبال پیٹتا ہوں دیکھ کر میں اہل ترکی کا یہ حال
دیے رنج پہ رنج سبھی نے مجھے
میرے مولا بلا لو مدینے مجھے

بچہ بچہ آریوں کا ہوگیا ہے عربی خواں، بحث کرنے ان سے آئے کون بتلاؤ میاں
لگے خوف سے آنے پسینے مجھے
میرے مولا بلالو مدینے مجھے

ہند میں باقی وہ اپنی شوکت و صولت نہیں، زور وہ اپنا نہیں پہلی سی وہ سطوت نہیں

نظر آتے نہیں وہ دفینے مجھے
میرے مولا بلالو مدینے مجھے

یہ دراصل اس نعتیہ غزل کا جواب ہے جو دلی کے بعض مسلمان بچے شہر میں گاتے پھرتے ہیں۔ اس غزل میں کسی جگہ اشارتاً بھی ہندوؤں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے اور مدینہ جانے کی تمنا کے سوا اور کسی چیز کا شائبہ تک نہیں ہے مگر آریوں کی عدم رواداری اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ اس کو بھی برداشت نہیں کرسکتے اور انہوں نے اس کے جواب میں ایسی سخت دل آزار نظم شائع کی ہے۔

اس حرکت سے ان شرارت پسندوں نے تو اپنا مطلب حاصل کرلیا لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر یہ نظمیں اسی طرح بازاروں میں گاگا کر بیچی جاتی رہیں تو کسی دن کوئی دل جلا مسلمان ان لڑکوں پر حملہ کر بیٹھے گا اور پھر انفرادی جنگ سے آگے بڑھ کر یہ حادثہ اجتماعی جنگ میں تبدیل ہوجائے گا اس لئے ہم حکام شہر کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ فوراً اس نظم کی اشاعت کو روک دیں اور آئندہ سے ایسی تمام اشتعال انگیز تحریروں کو خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے شائع ہوں یا ہندوؤں کی طرف سے، پبلک میں عام ہونے سے پہلے روک دیا کریں۔ اس قسم کی تحریریں بظاہر بہت معمولی نظر آتی ہیں لیکن اکثر اوقات ان سے نہایت خطرناک نتائج پیدا ہوا کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم آریوں کے ذمہ دار حضرات سے بھی یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر ان لغویات سے انہوں نے کیا فائدہ سوچا ہے۔ نہ ان باتوں سے انہیں اپنے مذہب کی اشاعت میں کوئی مدد مل سکتی ہے۔ نہ ان سے آریہ دھرم کو کوئی عزت و وقعت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ اسلام کی قوت کو کوئی صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ البتہ اس کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہندؤں اور مسلمانوں میں نفرت و عداوت کی آگ اور زیادہ بھڑک جائے، ان کے جذبات آپس میں ٹکرا جائیں اور فساد و بدامنی کے علاوہ باہمی کاروبار میں خرابیاں پیدا ہوں جن سے ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں نقصان پہنچتا ہے پھر کیا وہ ان نتائج کو سمجھ کر انہیں برداشت کرنے کے لئے خوشی سے تیار ہیں۔

* مصر میں حریت و استبداد کی کشمکش

سرلی اسٹیک کے قتل کے بعد مصر کی سیاسی زندگی پر جو جمود طاری ہوگیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کو لارڈ ایلن بی کے جانشین سر جارج لائڈ کے دور استبداد نے ختم کردیا اور اب پھر مصر میں قومیت کی روح تازہ ہوگئی۔ سر لائڈ جارج یہ سمجھتے تھے کہ پہلے زمانے میں وہ جو حرکتیں کرچکے ہیں وہ برداشت کرلی گئی ہیں

چنانچہ اسی امید پر انہوں نے حکومت مصر سے یہ فرمان جاری کرایا تھا کہ تمام سیاسی جماعتیں اپنے اغراض و مقاصد اور ارکان کے نام باقاعدہ شائع کردیں لیکن خدا بھلا کرے اس جور و استبداد کا کہ اس نے مصریوں کو پھر خواب غفلت سے جگا دیا اور وہ دوبارہ اپنے سپہ سالار کے گرد جمع ہوگئے۔

گزشتہ ہفتے کی خبروں سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ پارلیمنٹ جسے زیور پاشا کی حکومت نے برطانیہ کے ایما سے بالکل غیر آئینی طریق پر معطل کردیا ہے۔ اس کے شیوخ و مبعوثین اپنا ایک اجلاس پارلیمنٹ کے چیمبر میں منعقد کرنا چاہتے ہیں اور اس کا اعلان کردینا چاہتے ہیں کہ حکومت کی یہ کارروائی دستور و آئین کے بالکل خلاف ہے انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ حکومت نے قوم کے صحیح نمائندوں کا جلسہ روکنے کے لئے احکام جاری کردیئے ہیں اور اس کا اعلان کردیا ہے کہ "سابق" مبعوثین کا کوئی جلسہ پارلیمنٹ کے چیمبر میں یا اور کہیں منعقد نہ ہوسکے گا اور اگر اس کے انعقاد کی کوشش کی جائے گی تو حکومت بہ جبر اسے روک دے گی۔ اس سلسلہ میں پولیس نے بھی جلسہ روکنے کے بڑے بڑے انتظامات کرلئے تھے اور حکومت کو یقین تھا کہ وہ اپنی چال میں کامیاب ہوگی مگر تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ زاغلول پاشا کی حکمت عملی نے پولیس اور عمال حکومت کو ایسا چکمہ دیا کہ وہ بھی یاد کرتے ہونگے۔ انہوں نے ایک طرف تو عوام کو صبر و سکون کی تلقین کرکے عام طور پر یہ خیال پیدا کردیا کہ وہ حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتے اور دوسری طرف کانٹی نینٹل ہوٹل میں ۲۴۴ مبعوثین کا جلسہ منعقد کردیا۔ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز منظور کردی اور پولیس کو اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ جلسہ میں مداخلت کی کوشش بھی کرتی۔

اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ زاغلول پاشا کی اس کارروائی کا حکومت کیا جواب دے

گی۔ آئینی حیثیت سے پارلیمنٹ کا اجلاس بالکل جائز تھا اور جب اس میں قوم کے منتخب کردہ نمائندوں کی اکثریت نے یہ تجویز پاس کردی ہے کہ انہیں موجودہ وزارت پر اعتماد نہیں ہے۔ تو قانوناً اس وزارت کا یہ فرض ہے کہ وہ مستعفی ہوجائے لیکن جہاں استبداد کی فرمانروائی ہو وہاں یہ آئینی اصلاحات کوئی کام نہیں دے سکتیں۔ پس اگر حکومت مستعفی نہ ہوئی اور اس نے پارلیمنٹ کے اس اجلاس میں شریک ہونے والوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی کی تو اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ مصر میں نئے سرے سے ہنگامے برپا ہونے شروع ہوجائیں گے اور ان کی بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ جہاں پہلے ہنگاموں میں مصری احرار کا مقابلہ انگریزی قوت سے ہوتا تھا وہاں اب انہیں نام ونہاد مصری حکومت سے لڑنا پڑے گا۔

شام میں برطانوی مداخلت

[۲۹ر نومبر ۱۹۲۵ء]

مسٹر چیمبرلین نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے دارالعوام میں یہ بیان کیا ہے کہ موسیو ژوونیل سے جو گفتگو ہوئی ہے اس میں نہ تو ہم سے کسی فوجی اعانت کی درخواست کی گئی تھی اور نہ ہماری طرف سے اس قسم کی کسی مدد کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ اس سے برطانیہ عظمیٰ کے چالاک وزیر خارجہ نے دنیا کو دھوکہ دینا چاہا ہے کہ برطانوی حکومت شام کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے فرانس کو کسی قسم کی فوجی مدد نہیں دے گی لیکن تازہ خبروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی خفیہ پخت وپز ہو چکی ہے اور چونکہ جنگ کا کوئی معقول سبب موجود نہیں ہے۔ اس لئے وہ فوجی مداخلت کے لئے بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ مانچسٹر گارجین کے نامہ نگار نے قدس شریف سے جو تار بھیجا ہے وہ اس خطرہ کو صاف ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔

> ”اگر فرانس نے فوراً اس علاقہ میں امن قائم نہ کردیا جو فلسطین کے حدود سے ملحق ہے تو ہم کو بادل ناخواستہ اس جھگڑے میں شریک ہونا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ جب فرانسیسیوں نے خود نامہ نگار مذکور کے قول کے مطابق ہرمون سے لیتانی تک کا علاقہ خالی کردیا ہے اور وہاں دروز کے سوا اور کوئی قوت باقی نہیں ہے۔ تو فرانسیسی وہاں کیونکر امن قائم کرسکتے ہیں۔ پس یہ ایسی شرط ہے جو پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے اور اس پر اپنی فوجی کارروائی کو منحصر قرار دیتے وقت خود انگریزوں کو بھی یہ یقین ہے کہ شئے مشروط کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اس امر کا قوی اندیشہ ہے کہ چند روز توقف کرکے لارڈ پلومر یقیناً جبل الدروز میں پیش قدمی شروع کردیں گے۔

ایک مبارک تحریک

موجودہ انشقاق و افتراء کی تاریک فضا میں جبکہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں لاہور سے ایک شعاع امید نظر آئی ہے۔ سیکرٹری مجلس ”اتحاد لاہور“ مطلع فرماتے ہیں کہ مجلس مذکور کی لگا تار کوششوں سے تمام روزانہ اخبارات نے مل کر ایک اہم فیصلہ کیا ہے ”جس کے مطابق وہ آئندہ اپنے اخباروں کے

کسی حصہ میں بھی کوئی ایسی اشتعال انگیز خبر، ایڈیٹوریل یا عنوان نہ لکھیں گے جس سے ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں یا دیگر اقوام کے درمیان جذبات منافرت بھڑکنے کا احتمال ہو"۔ اگر لاہور کے "روزانہ اخبارات" اپنے اس متفقہ فیصلے پر سختی کے ساتھ قائم رہے اور ان کی قابل تقلید مثال پر ہندوستان کے دوسرے اخبارات نے بھی عمل کیا تو ہمیں یقین ہے کہ ملک کی موجودہ فضا ایک ماہ کے اندر ہی بالکل بدل جائے گی اور آئے دن کے جھگڑوں سے ہندو مسلمانوں کے ماتھوں پر جو کلینک کا ٹیکہ لگ گیا ہے وہ مٹ جائے گا۔ اگرچہ اس حقیقت نفس الامری سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو مسلم فسادات کا سبب بڑی حد تک بعض خود غرض اور بدطینت فتنہ پردازوں کی فساد انگیز تعلیم بھی ہے لیکن اس آگ کو ایک حصہ سے دوسرے حصے تک لے جانے والے اور اس کو پھونکیں مار مار کر مشتعل کرنے والے اخبارات ہی ہیں۔ پس اگر ان سب نے مل کر عہد کرلیا کہ ہم آئندہ اپنے اس گمراہ کن پروپیگنڈا سے باز رہیں گے اور اس عہد پر قائم بھی رہے تو یہ آگ دب کر رہ جائے گی اور ملک میں فساد کرانے والے خود بخود سرد پڑ جائیں گے۔

* آفریدیوں کا مطالبہ

پشاور کی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ آفریدی جرگوں نے حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ انہیں مزید روپیہ اور جاگیریں دی جائیں۔ کیونکہ انہوں نے صرف سڑک بنانے کی اجازت دی تھی اور اس پر گاڑی چلانے کی اجازت کے لئے اور روپیہ ملنا چاہیے۔ آفریدیوں کا یہ مطالبہ اب بالکل فضول اور بے کار ہے۔ پہلے انہوں نے روپیہ کے لالچ میں آکر انگریزوں کو اپنے ملک میں ریلوے لائن کا جال بچھا لینے دیا اور تھوڑے سے منافع کی خاطر عمر بھر کی غلامی کو منظور کرلیا اور اب جبکہ تمام انتظامات مکمل ہوگئے۔ خیبر ریلوے تیار ہوگئی تو انہوں نے احتجاج کرنا شروع کردیا ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ حکومت ریلوے لائن کے دونوں جانب پانچ پانچ میل تک کے علاقہ کو خالی کرانا چاہتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ یہ خبر کہاں تک صحیح ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ اور اس قسم کی دوسری تجاویز کا زیر عمل آنا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے۔ انگریز جب ایک دفعہ کسی جگہ ہاتھ ٹیکنے کی جگہ پالیتا ہے تو پھر وہ ہمیشہ پھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ سب سے پہلی

اور شدید غلطی تو اس کو جگہ دینا ہے' اس کے بعد پھر توسیع کی شکایت بے کار ہے۔ کاش آفریدی اس راز کو پہلے ہی سمجھ جاتے اور انہوں نے اپنے اور افغانستان کے لئے جو خیبر ریلوے سے مشکلات پیدا کردی ہیں۔ ان سے باز رہتے۔

☐ برطانیہ و فرانس کا اتحاد عمل

{۲۹ر نومبر ۱۹۲۵ء}

جنگ عظیم کے بعد تقسیم غنائم کے حریصانہ اختلافات نے فرانس اور انگلستان کو ایک دوسرے سے الگ کردیا تھا مگر اب لوٹ کی بھیڑوں میں تمرد کے آثار دیکھ کر یہ دونوں پھر ہاتھ ملا رہے ہیں اور اس باب میں انہوں نے خالص یورپین کیریکٹر کا اظہار کیا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت احساس ضرورت ہے۔ شام کی بغاوت اور ریف کی جنگ سے پہلے برطانیہ اور فرانس کے راستے الگ الگ تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی مشکلات میں الجھنے کے لئے "تنہا چھوڑ" دیا تھا اور دونوں اپنے اپنے مفاد کے لئے اس طرح ایک دوسرے کا لحاظ کئے بغیر کوشش کر رہے تھے کہ بعض اوقات ان کی اغراض آپس میں متصادم بھی ہوجاتی تھیں مگر پہلے ریف کے مجاہدین حریت نے اور پھر شام کے جہاد آزادی نے دونوں میں یکجہتی کی کشش پیدا کرنی شروع کردی اور آخر اس باہمی تجاذب کا نتیجہ اس مفاہمت کی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا جو حال میں کرنل ایمری اور موسیوڈی ژوونیل کے درمیان ہوئی ہے۔ بظاہر دنیا کو ان سرگوشیوں سے بے خبر رکھا گیا ہے جو کولونیل آفس کے پراسرار کمروں میں یورپ کے ان شاطران سیاست نے آپس میں کی ہیں لیکن

خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمی آید

کرنل ایمری نے کیپٹن ویج وڈبین کے سوال کا جواب جس سکوت سے دیا ہے وہ ہزار صراحتوں سے زیادہ بلیغ ہے اور موسیو ژودنیل کا یہ بیان اس کی تفسیر سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا کہ شرق ادنیٰ میں برطانیہ و فرانس کے مفاد متحد ہیں اس لئے انتدابی علاقوں میں ایک عام برطانوی فرانسیسی اتحاد عمل کا ظہور یقینی ہے۔

یہ مفاہمت جس طریقہ سے عمل میں آئی ہے۔ اس کی داستان شرقیوں اور خصوصاً ہم مسلمانوں کے لئے بے حد سبق آموز ہے۔

دول متوسط کی شکست اور روس کی ہولناک زاریت کے انقراض نے یورپ کو تمام بڑی بڑی طاقتوں سے خالی کر دیا تھا اور پورے براعظم میں برطانیہ کے مقابلہ کی صرف ایک طاقت فرانس رہ گئی تھی۔ برطانوی سیاست کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ وہ یورپ میں کسی ایسی قوت کو نہیں دیکھنا چاہتا جو اس کی ٹکر کی ہو اور وہ جس طاقت کو ابھرتے دیکھتا ہے اسے دبانے کے درپے ہوجاتا ہے۔ چنانچہ عہد نپولین کے فرانس اور عہد ولیم کے جرمنی کے ساتھ وہ یہی سلوک کرچکا ہے اور اس کی سیاسی اصطلاح میں توازن دول کا منشا محض یہی ہے کہ اس کی بالادستی و تفوق کو برقرار رکھا جائے۔ پس اب اس کے رقیبانہ جذبات کا تمام یورپین سلطنتوں سے ہٹ کر صرف فرانس سے متعلق ہوجانا ایک قدرتی بات تھی۔ اول تو اس نے سمجھا کہ فرانس جرمنی کی زبردست ٹکر سے تقریباً ادھ مؤا ہوچکا ہے اور اب اس کی مشکلات اسے اتنا سر اٹھانے کی مہلت ہی نہ دیں گی کہ وہ کبھی کوئی خوفناک قوت بن سکے لیکن جب تھوڑی ہی مدت میں اس نے اپنی زبردست مالی مشکلات کے باوجود اتنی زبردست طاقت بہم پہنچالی کہ تمام دنیا میں اول درجہ کی قوت بن گیا تو برطانیہ نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنا شروع کردیا اور اس کا زور توڑنے کے لئے تدبیریں سوچنے نگا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد انگریزی اخبارات اور پولیٹیکل مبصرین کے مضامین میں جس طریقہ سے فرانس کا تذکرہ کیا جاتا تھا اس سے ان جذبات کا نہایت آسانی کے ساتھ پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

برطانوی مدبرین نے اپنے اس جذبہ رشک و رقابت کو اعلانیہ ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ ابھی تک وہ خود بھی اس اختلال کے خطرات سے گھرے ہوئے تھے۔ جو جنگ عظیم نے یورپ کی سیاسی و اقتصادی زندگی میں پیدا کردیا تھا اور ایسی حالت میں وہ کسی حتمی فیصلہ پر پہنچنے سے قاصر تھے۔ بہرحال اپنے آپ کو پس پردہ رکھتے ہوئے جس حد تک فرانس کو مشکلات میں مبتلا کرسکتے تھے اس میں انہوں نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ تاوان کے مسئلہ کو سلجھانے کے لئے جتنی کانفرنسیں ہوئیں اور پھر احتلال روہر کے بعد برطانوی سیاست نے جو پلٹے کھائے۔ ان میں مدبرین دولت برطانیہ کے خفیہ ارادوں کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں فرانس بھی یہ محسوس کرچکا تھا کہ جرمنی کو شکست دینے کے بعد

اب برطانیہ کی قوت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور وہ حلیف کی حیثیت سے جس قدر مفید ہے، دشمن کی حیثیت سے اتنا ہی زیادہ خطرناک ثابت ہوگا اس لئے اس نے نہ صرف اپنی قوت کو بڑھانا شروع کردیا بلکہ برطانوی مفاد و مصالح کے خلاف ہر وہ کارروائی کرنی شروع کردی جو برطانوی تفوق کو نقصان پہنچا سکے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں تخلیہ کیلیکیہ کے بعد اس نے ترکی کے ساتھ جو دوستی کے پینگ بڑھانے شروع کردیئے تھے اور پیرس میں ترکی نمائندوں کے ساتھ جو دوستانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا اس کی علت غائی یہی تھی کہ مشرق کی کنجی کو کسی طرح اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ اسی پالیسی کے مطابق فرانس نے اپنے تمام اتحادیوں کو چھوڑ کر تنہا ترکوں سے مصالحت کرلی تھی جو انگورہ اگریمنٹ کی صورت میں مدتوں برطانوی وزارت خارجہ کو برے خواب دکھاتی رہی اور اسی پالیسی کا ایک جزو وہ رویہ تھا جو لوزین کانفرنس میں فرانسیسی نمائندوں نے اختیار کیا تھا۔ اگر اس وقت روہر کا مسئلہ بیچ میں نہ آجاتا تو غالباً لارڈ کرزن آنجہانی عصمت پاشا کے ہاتھوں اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز شکست اٹھا کر جاتے۔ جتنی انہیں معاہدہ لوزین میں اٹھانی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ فرانس اور برطانیہ کی اس روز افزوں رقابت کی ایک جھلک ان بین المللی کانفرنسوں میں بھی نظر آتی ہے جو یورپ کے پیچیدہ سیاسی مسائل کو سلجھانے کے لئے مختلف مقامات پر منعقد ہوتی رہیں۔

یہ حالات ایسے تھے کہ ان کی بدولت برطانیہ و فرانس کبھی کے ایک دوسرے سے بچھڑ چکے ہوتے، مگر ان تمام مواقع پر صرف ایک چیز تھی جس نے ہمیشہ انہیں ھذا فراق بینی وبینک کا مبادلہ کرنے سے روک دیا اور آج صرف وہی ایک چیز ہے جس نے ان کے تمام اختلافات کو مٹا کر ان کے درمیان نئے سرے سے حلیفانہ اتحاد عمل کا رابطہ پیدا کردیا ہے۔ یہ جادو اثر قوت مشرق کی وہ عام بیداری ہے جس نے آج تمام مشرقی قوموں کو آزادی کی خواہش سے متحرک کرکے یورپ کے مقابلہ میں کھڑا کردیا ہے۔ شمالی افریقہ، مصر، عرب، ترکی، ایران، افغانستان، ہندوستان اور وسط ایشیا کے تورانی ممالک سب کے سب ایک نیا جنم لے کر اٹھے ہیں۔ ان کی سوکھی ہوئی ہڈیوں اور ٹھٹھرے ہوئے جسموں میں کسی فوق العادہ طاقت نے نئے سرے سے زندگی کی حرارت پیدا کردی ہے اور ایک عجیب پراسرار طریقہ سے ان سب میں بیک وقت ایک ہی جذبہ پیدا ہوا ہے۔ جس

کی بدولت بلاکسی ظاہری اتحاد عمل کے وہ سب ایک ہی نصب العین کے لئے سعی و جہد کر رہے ہیں۔ مشرقی قوموں کی اس غیر متوقع بیداری نے فرانس و برطانیہ کے مدبرین میں یہ خوف پیدا کردیا ہے کہ اگر وہ آپس کے اختلافات میں اسی طرح الجھے رہے تو دونوں کو اس مستقل سرچشمہ سے ہاتھ دھولینا پڑے گا۔ جس کی زرپاشیوں پر ان کی اس ساری شوکت و حشمت کا انحصار ہے۔ پس اب وہ مشرق پر مغرب کی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ اس عالمگیر مشرقی بیداری کا مقابلہ کرنے کے لئے باہم متحد ہوگئے ہیں اور اس متحدہ خطرہ کے مقابلہ میں انہوں نے اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے ایشیائی افریقی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے تو وہ بنیاد ہی باقی نہیں رہے گی جس پر ہماری سعی مسابقت کی عمارت قائم ہے۔ البتہ اگر ہم نے متحدہ قوت کے ساتھ ایشیاد افریقہ پر اپنی سیادت کا دائمی اجارہ دوبارہ حاصل کرلیا تو آپس میں بھگت لینے کے لئے پھر کافی فرصت موجود ہوگی۔

【۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء】

مشرقی نہضت و بیداری کے خلاف فرانسیسی، انگریزی حکومتوں کے اس اتحاد عمل میں جو قوت کام کر رہی ہے وہ محض مغربی حمیت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان کی مشترک اغراض و مصالح بھی شامل ہیں۔ جس طرح اغراض کے اتحاد نے روس، انگلستان اور فرانس کی قدیم عداوتوں کو مٹا کر انہیں دول متوسطہ کے خلاف متحد کر دیا تھا، اسی طرح آج استعماری اغراض کے اتحاد نے انگلستان و فرانس کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ ان مشرقی قوموں کی تحریک آزادی کا متحدہ قوت کے ساتھ مقابلہ کریں، جنہیں غلام رکھنا اب ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ایک طرف برطانیہ خلیج فارس، عراق اور فلسطین میں کچھ اغراض رکھتا ہے جو عربوں کی بیداری اور ترکوں کی نشاۃ جدید کی بدولت سخت خطرہ میں ہیں اور دوسری طرف فرانس شمالی افریقہ اور شام میں کچھ ایسی ہی اغراض رکھتا ہے جنہیں ریف اور امتِ عربیہ کی نہضت جدیدہ نے فیصلہ کی آخری گھڑیوں تک پہنچا دیا ہے۔ پس اب انہیں خوف ہے کہ اگر ہم نے اپنی ان اغراض میں ایک دوسرے کی حمایت نہ کی اور ایک کی مصیبت پر دوسرا محو لطف اندوزی رہا تو نتیجہ دونوں کے لیے

خراب ہوگا اور اپنے اپنے وقت میں دونوں کو اس بے تعلقی کا مزہ چکھنا پڑے گا۔

ان اغراض کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تشریح کی ضرورت ہے۔ مشرق اولیٰ اور مشرق اوسط میں برطانوی اقتدار ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا بنیادی پتھر ہے۔ جب سے انگریزوں کو ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے، ان کی یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ ہندوستان تک پہنچنے کے تمام راستوں پر قابض ہو جائیں تاکہ کوئی طاقت جزیرہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کو منقطع نہ کرسکے۔ اول اول انگریزی جہازوں کو پورے براعظم افریقہ کا چکر کاٹ کر آنا پڑتا تھا، اس لیے مشرق اولیٰ کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی اور زیادہ تر زور افریقہ و جنوب غرب کے سواحل اور اوقیانوس جزائر پر دیا جاتا تھا مگر بعد میں جب نہر سویز کھودی گئی تو برطانوی سیاست کا مرکز ثقل کیپ آف گڈ ہوپ سے ہٹ کر سویز اور خلیج فارس کی طرف منتقل ہو گیا اور قبرص، مصر، فلسطین، شرق اردن، حجاز، عسیر، بحرین اور عراق وغیرہ ممالک پر، حمایت، انتداب، سیادت اور حمیت وغیرہ مختلف ناموں سے نفوذ و اثر قائم کر دیا گیا۔ ان تمام ملکوں سے برطانیہ کی اہم ترین اغراض وابستہ ہیں اور اگر انہیں دولت برطانیہ کے نظام عصبی کا مرکز قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہے۔ کیونکہ ان پر اینگلو انڈین ایمپائر کے قیام و بقا کا بڑی حد تک انحصار ہے۔

اس کے علاوہ وہ خلیج فارس کی اہمیت ایک اور حیثیت سے بھی بہت زیادہ ہے۔ جنوب مغربی ایران اور جنوب مشرقی ترکی میں (جس کا جغرافیائی نام ولایت موصل ہے) تیل بہت کثرت سے پایا جاتا ہے۔ جو اب میکانکی دنیا میں کوئلے کی جگہ حاصل کرتا جا رہا ہے۔ ہر قسم کی مشینیں، موٹریں، ہوائی جہاز اور ٹینک وغیرہ اسی قوت سے چلتے ہیں اور ہر وہ سلطنت جو دنیا میں بالاتر قوت بن کر رہنا چاہتی ہے۔ اس کے زیادہ سے زیادہ چشموں پر قبضہ کرنے کی خواہش مند ہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے برطانیہ شرق اوسط کے ان منابع ثروت سے متمتع ہونے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اینگلو پرشین آئل کمپنی کی مراعات اس کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے کافی نہ تھیں اس لیے اس نے عراق پر حملہ کیا اور کروڑہا روپے کے خرچ سے موصل کے چشمہ ہائے روغن پر قبضہ کر لیا۔ جیسا کہ مسٹر کوک نے اپنی کتاب قلب شرق اوسط (The Heart of the Middle East) میں لکھا ہے، عراق پر حملہ کرنے اور انتداب عراق کے بے اندازہ مصارف برداشت کرنے

سے برطانیہ کی تین اغراض تھیں جن میں سے سب سے بڑی غرض برطانوی صنعت کے لئے تیل کی بہم رسائی کو محفوظ کر دینا تھا۔

چنانچہ شرق اوسط کی یہ ریاستیں برطانیہ کی زندگی کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ برطانیہ ان کی حفاظت چاہتا ہے لیکن ترکوں اور عربوں کی بیداری ان کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئی ہے۔ ایک طرف عرب اپنے استقلال کے لیے سختی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اور انہوں نے عراق، حجاز، فلسطین اور شرق اردن میں برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہلا دی ہیں، دوسری طرف مصر آزادی کے لیے بے چین ہے اور اس میں وطنی حریت کا احساس اب اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اسے موجودہ نام نہاد استقلال سے مطمئن رکھنا تقریباً ناممکن ہے اور تیسری طرف ترک موصل میں اپنا حق مانگ رہے ہیں اور اس تمام قوت کے ساتھ جو موت و حیات کی کشمکش میں کوئی آزاد قوم صرف کر سکتی ہے۔ موصل کو حاصل کرنے کے لیے مستعد ہو رہے ہیں۔

ان گوناگوں خطرات سے اپنی سیاسی و اقتصادی اغراض کو محفوظ کرنے کے لیے برطانیہ کسی طاقتور حلیف کا محتاج ہے اور وہ موجودہ حالات میں فرانس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ موصل کے مسئلہ میں برطانیہ کو فرانسیسی اعانت کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ اسے اب یقین ہو چکا ہے کہ ترک لڑائی کے لیے پوری طرح مستعد ہیں اور اگر جمعیت اقوام نے ان کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ بلا تامل موصل پر حملہ کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج شام پر فرانسیسی مظالم کے فلک پیما شور و ہنگامہ میں برطانوی مدبرین کے لبوں پر مہر سکوت لگی ہوئی ہے اور وہ انہیں روکنے کی سعی کرنا تو درکنار، ان خونی ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں جو ہزارہا بے گناہ شامیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف شام اور شمالی افریقہ کے مسائل فرانس کی استعماری زندگی کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ ابتداءً وہ ہندوستان اور مصر میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا لیکن جب استعماری فوائد کے اس میدان میں برطانیہ نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تو اس کی امیدوں کا مرکز وادی گنگا اور وادی نیل سے ہٹ کر بیوانٹ اور شمالی افریقہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس نے الجزائر کو سسکا سسکا کر مارا، تیونس پر غاصبانہ قبضہ کیا،

مراکش پر انگریزوں کی سی چالاکی سے اپنی حکومت قائم کی اور سالہا سال تک شام میں اپنی عیاری و مکاری کے جال بچھائے رکھنے کے بعد انگریزوں کی مدد سے اس پر تسلط حاصل کر لیا۔ ایک صدی کی پے در پے کوششوں سے اب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچا تھا کہ ریف میں ایک ایسی حیرت انگیز قوت پیدا ہو گئی جس نے بظاہر ایک نہایت حقیر قوت ہونے کے باوجود تلوار کے زور سے نہ صرف اپنی آزادی کا علم بلند کر دیا بلکہ تمام شمالی افریقہ میں حریت و استقلال کی ایسی روح پھونک دی کہ اس کی بدولت کوہ اطلس کے گلہ بان اور قرطاجنہ کے فداکار بادیہ نشین' پھر اسی آگ سے مشتعل ہو گئے جسے فرانسیسی فوجوں نے خون کے چھینٹوں سے بجھایا تھا۔ یہ شعلے ابھی بھڑک ہی رہے تھے کہ شام میں ایک دوسری آگ بھڑک اٹھی جس نے اپنی حقیر چنگاریوں سے فرانسیسی رعب و اقتدار کے خرمن کو پھونک کر رکھ دیا اور فرانس جیسی عظیم الشان قوت جو امریکہ و انگلستان کے بعد دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے ایک چھوٹی سی قوم کے ہاتھوں اس قدر ذلیل ہوئی کہ آج اگر اس کے مدبرین میں ذرہ برابر بھی غیرت موجود ہو تو انہیں دنیا میں منہ دکھانے کی جگہ نہیں ہے۔ مشکلات کے اس دو طرفہ ہجوم نے فرانس کے لیے یہ زبردست خطرہ پیدا کر دیا ہے کہ اس کی استعماری قوت کا یہ عظیم الشان قصر کہیں یک دم ہی پیوند خاک نہ ہو جائے۔

یہی وہ خطرہ ہے جو فرانس کو دوبارہ انگریزوں کے در پر استمداد و استعانت کی بھیک مانگنے لے گیا ہے۔ خدا خدا کر کے جرمنی کی ہولناک عسکریت کے زوال نے اسے اس "دوکاندار قوم" کی سیاسی غلامی سے نجات دلائی تھی کہ اب پھر وہ اپنے ناعاقبت اندیشانہ کرتوتوں کے باعث ان کے آگے جھکنے پر مجبور ہوا ہے اور اس پرانی عداوت کو جو صدیوں سے چلی آرہی ہے' دل سے نکال کر ان سے پیمان موانست و صداقت استوار کر رہا ہے تاکہ وہ اسے اس دوگونہ عذاب سے نجات دلائیں۔

{۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء}

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس اتحاد کا حلقہ اثر کہاں تک وسیع ہے؟ سر آسٹن چیمبرلین اور کرنل ایمری ہم کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ اتحاد صرف ان علاقوں تک محدود ہے۔ جن پر برطانیہ و فرانس کو انتدابی حقوق ملے ہوئے ہیں لیکن آثار سے صاف

معلوم ہو رہا ہے کہ ان دونوں طاقتوں نے صرف شام، فلسطین اور عراق ہی کے متعلق اتحاد عمل کی مفاہمت نہیں کی ہے بلکہ یہ تعاون باہمی کا عہد و پیمان ان کی پوری مشرقی پالیسی پر حاوی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ شام میں برطانوی امداد موصل میں فرانسیسی اعانت کے معاوضہ میں پیش کی گئی ہے۔ برطانیہ کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ تنہا کسی بڑے جھگڑے میں حصہ نہیں لیتا اور ہمیشہ جوڑ توڑ کر کے اپنے کچھ اتحادی پیدا کر لیا کرتا ہے۔ تاکہ فائدہ ہو تو وہ شیر کا سا حصہ حاصل کر سکے اور نقصان ہو تو اسے برابر برابر تقسیم کر لے۔ موصل کے مسئلہ میں وہ اپنے آپ کو تنہا دیکھ کر مضطرب تھا اور اسے اندیشہ پیدا ہو رہا تھا کہ ترکی روسی اتحاد کے مقابلہ میں اسے کہیں منہ کی نہ کھانی پڑے۔ فرانس اور ترکی کی دوستی کو دیکھ کر اسے یہ امید بھی نظر نہیں آتی تھی کہ وہ مشرق اوٹی میں اپنے فوائد کو چھوڑ کر ترکی کے مقابلہ میں اس کی مدد کرے گا۔ اسی لیے وہ اس جھگڑے کو برابر ٹال رہا تھا اور ایک دنیا محسوس کر رہی تھی کہ وہ آخر میں ترکوں سے ضرور دب جائے گا لیکن اب شام میں فرانسیسی مشکلات نے اس کے لیے ایک اتحادی طاقت پیدا کر لینے کا موقع بہم پہنچا دیا ہے اور وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ اس موقع کو فائدہ اٹھائے بغیر ہاتھ سے کھو دے۔

مسئلہ موصل میں برطانوی فرانسیسی اتحاد کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ برطانوی حکومت شام میں فرانسیسی انتداب کی بقاء و تحفظ کی حمایت اس وقت تک ہرگز نہیں کر سکتی جب تک فرانس موصل پر انگریزی قبضہ کی حمایت نہ کرے۔ ترکی، شام اور موصل کی جغرافی پوزیشن پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ شام کے حدود ایک طرف موصل سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ترکی سے۔ اگر وہ ترکی کا ساتھ دے تو موصل پر برطانیہ ایک لمحہ کے لیے بھی قابض نہیں رہ سکتا، کیونکہ ایسی صورت میں ترک اسے دو طرف سے گھیر کر ایک ہی حملہ میں فتح کر سکتے ہیں اور اگر وہ برطانیہ کی مدد کرے تو ترکوں کے لیے بہت کچھ مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً سرحد موصل پر افواج کے اجتماع اور رسد و کمک کے تسلسل میں بڑی دقت واقع ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شام کے مخالف ہونے کی صورت میں وہ بغداد ریلوے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ پس برطانیہ کے جنگی مصالح کا اقتضاء یہ ہے کہ شام میں کوئی غیر

دوستدار قوت حکمران نہ رہے۔ جب تک فرانس ترکی کا دوست تھا تو اس کی پالیسی یہ تھی کہ شام پر فرانسیسی انتداب کو وہ اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا اور اسے کسی دوستدار حکومت سے بدل دینا چاہتا تھا مگر اب اس سے دوستانہ تعاون کی مفاہمت ہو جانے کے بعد وہ اس کے انتداب کی حمایت کر رہا ہے اور اس کا قبضہ بحال رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے، کیونکہ اب اگر فرانسیسی حکومت شام سے اٹھ گئی تو اسے اندیشہ ہے کہ کہیں مذہبی کشش شامیوں کو ترکوں سے ملا کر موصل کے لیے شدید خطرہ نہ پیدا کر دے۔

یہ محض قیاس ہی نہیں ہے بلکہ سیاسی دنیا میں اسے ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ترکی سے خبر آئی تھی کہ وہاں کے تمام اخبارات میں برطانوی فرانسیسی مفاہمت پر نہایت سخت نکتہ چینی کی گئی اور قوم پرست ترکوں نے فرانس کو صاف طور پر متنبہ کر دیا کہ وہ اپنے اس رویہ سے اپنے مفاد و مصالح کو سخت نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ترکوں کو بھی اس امر کا یقین ہے کہ چیمبرلین اور فرانسیسی وزیر خارجہ کے درمیان نہ صرف شام کے بارے میں بات چیت ہو چکی ہے، بلکہ مسئلہ موصل میں بھی ان کے درمیان عملی تعاون کا معاہدہ ہو چکا ہے۔

لیکن جیسا کہ پچھلے مباحث میں عرض کیا جا چکا ہے، یہ اتحاد عمل صرف ترکوں، شامیوں اور عراقیوں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ آگے چل کر دنیا دیکھ لے گی کہ یورپ کی ان دونوں استعماری طاقتوں نے تمام مشرقی قوموں کے خلاف اتحاد کر لیا ہے اور جب کبھی کوئی مشرقی قوم اپنے مغربی آقاؤں کی قید سے آزاد ہونے کی کوشش کرے گی تو دونوں مل کر اسے کچلنے کی تدبیر کریں گے تاکہ ان غلام قوموں میں یہ حریت طلبی کی بیماری ترقی کر کے یورپ کی حیات استعمار کے لیے مستقل خطرہ نہ بن جائے پھر کیا مشرقی قومیں اب بھی اسی بے ربطی اور انتشار کی حالت میں مبتلا رہیں گی جس نے انہیں آج اس درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ یورپ کو جس چیز نے تمام ملل مشرق پر مسلط ہو جانے کا موقع دیا ہے وہ ان کی یہی باہمی بے تعلقی ہے۔ ان کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ جب ایک ہمسایہ قوم پر آفت آئی تب دوسری قومیں اس کی بدحالی و ذلت پر ہنستی رہیں اور آپس کے بغض و عناد سے بعض اوقات یہاں تک کیا کہ اس کی خلاف مغربی حملہ آوروں کی مدد کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اسی چیز نے ایک ایک کر کے سب کو مغرب کا غلام بنا دیا اور یہی چیز ہے جس

سے اب بھی برطانیہ و فرانس فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پس اب اگر ایشیا اور افریقہ کے باشندے دائمی غلامی کی ذلت سے بچنا چاہتے ہیں تو اس پرانی حماقت کا اعادہ نہ کرنا چاہیے اور مشرق و مغرب کی اس فیصلہ کن جدوجہد میں جو اب شروع ہو گئی ہے، متحدہ قوت سے اپنے حقوق کا دفاع کرنا چاہیے ورنہ وہ یاد رکھیں کہ سارائی اور ڈائر جیسے خون آشام درندوں کے ہاتھوں ان کی جان و مال، عزت و ناموس اور تہذیب و تمدن کا وہی حشر ہوگا جو ابھی ان کی آنکھوں کے سامنے دمشق کا ہو چکا ہے۔

* مجاہدین شام کے خلاف مسیحی پروپیگنڈا

شام میں برطانوی مداخلت کے لیے جو بہانے تلاش کئے جا رہے ہیں ان کی بنیاد برطانوی ایجنٹوں نے اپنے قدیم دستور کے مطابق مسیحی پروپیگنڈا پر رکھی ہے۔ جس طرح ارمنوں اور یونانیوں کی داستان مظلومی بیان کر کر کے ترکی کے خلاف یورپ کے مذہبی تعصب کو بھڑکایا جاتا تھا۔ اسی طرح اب مجاہدین شام کے متعلق بھی یہ شور برپا کیا جا رہا ہے کہ وہ شامی عیسائیوں پر ہولناک مظالم برپا کر رہے ہیں۔ چنانچہ مانچسٹر گارجین کے نامہ نگار قدس نے لکھا ہے کہ شامی فوجی حوران کا تخلیہ کر چکے ہیں" اور "اگر فرانسیسیوں نے فوراً اس علاقہ میں امن قائم نہ کر دیا تو اس کا امکان ہے کہ فلسطین بھی اس کشمکش میں بادل ناخواستہ شریک ہو جائے"۔ شام کے جہاد آزادی کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ہم مجاہدین کے متعلق اس قسم کی شکایات سن رہے ہیں ورنہ اب تک جتنی خبریں مختلف ذرائع سے شائع ہوئی ہیں وہ غیر مسلموں کے ساتھ ان کے بہترین طرز عمل کی شہادت دیتی ہیں۔ نہ صرف عربی اخبارات بلکہ ریوٹر بھی اس امر کو بارہا تسلیم کر چکا ہے کہ مجاہدین نے شام کی عیسائی آبادی کے ساتھ جس قدر اخلاق اور رواداری کا سلوک کیا ہے اسکی مثال تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔ حماۃ میں جس وقت مجاہدین شام کا داخلہ ہوا اور بعض متعصب فدائیوں نے عیسائی آبادی کو لوٹنے کا قصد کیا-- تو ان کے جتھے کے سردار نے شہر کے دروازے پر کھڑے ہو کر انہیں روک دیا اور کہا کہ اگر تم عیسائی آبادی کو لوٹنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے مجھے قتل کر دو، پھر تمہیں اختیار ہوگا کہ جو چاہو کرو۔ اسی طرح دمشق کا ایک واقعہ ہم اپنی گذشتہ اشاعت میں درج کر چکے ہیں۔ جس میں دکھایا گیا

ہے کہ جس وقت فرانسیسیوں نے دمشق پر گولہ باری کی ہے تو ایک یہودی لڑکی اپنے مکان میں نہایت خوف زدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دفعتہ" اس نے دیکھا کہ "باغیوں" کا ایک جتھہ برہنہ تلواریں لیے ہوئے داخل ہوا۔ لڑکی نے رونا پیٹنا شروع کر دیا مگر جتھے کے سردار نے نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ اس سے سوال کیا کہ "مائی تو کیوں روتی ہے" اور کہا کہ ہم تو صرف ارمنوں کو تلاش کرتے ہیں۔ لڑکی نے "خدا اور حضرت موسیٰ" کی قسم کھا کر کہا کہ ارمنی یہاں نہیں ہیں۔ سردار یہ سن کر نہ صرف واپس چلا گیا۔ بلکہ لڑکی کی درخواست پر اپنے آدمیوں کی حفاظت میں اسے اور اس کے بچہ کو اس کے چچا کے ہاں پہنچا دیا۔

یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات ایسے ہوئے ہیں جن میں مجاہدین شام کی رواداری اور حسن سلوک کی روشن مثالیں موجود ہیں۔ شامیوں کا یہ اسلامی اخلاق صرف عیسائیوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ریوٹر اور خود انگریزی اخبارات اس پر متفق ہیں کہ ان کا طرز عمل تمام یورپین آبادی کے ساتھ مصالحانہ رہا ہے۔

* قومی غداری کی سزا

ہاں یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ارمنوں کے خلاف تلوار اٹھائی مگر وہ اس پر مجبور تھے۔ اس میں ان کے مذہبی تعصب کو ذرہ برابر دخل نہ تھا۔ انہوں نے ارمنوں اور چرکسی مسلمانوں کے ساتھ ایک سا سلوک کیا کیونکہ یہ دونوں کھلم کھلا فرانس کا ساتھ دے رہے تھے اور ان کو تباہ و برباد کر دینے کے لیے فرانس سے کچھ کم آمادہ نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے بعض مقامات پر عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کو سخت سزائیں دیں مگر یہ سزائیں کسی مذہبی تعصب کی بناء پر نہ تھیں بلکہ محض ان لوگوں کی غداری کا نتیجہ تھیں جنہوں نے فرانسیسی فوجوں سے ساز باز کر کے مجاہدین شام کے خلاف جنگ کی اور ان کی فتوحات کو ہزیمتوں سے بدل دینے کے درپے ہوئے۔ قارئین کرام کو یاد گا کہ دروز کے سردار سلطان الاطرش نے شروع ہی میں اس کا اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ حکومت فرانس کی ملازمتیں کر رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی مفوضہ خدمات کو سرانجام دیں لیکن اگر انہوں نے قومی حکومت کے خلاف کوئی کارروائی کی تو انہیں نہایت سخت عبرتناک

سزائیں دی جائیں گی۔ اس اعلان کے بعد شام کے عیسائیوں، ارمنوں، یہودیوں یا پھر چرکسیوں کا فرانس کے ساتھ مل کر نبرد آزمائی کرنا اور پھر سزا کی امید نہ رکھنا کس قدر حماقت ہے۔

☐ اکسائز ڈیوٹی کی تنسیخ

{۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء}

حال میں ہزایکسلنسی وائسرائے نے کاٹن اکسائز ڈیوٹی کی تنسیخ کا جو اعلان کیا ہے اس نے ہندوستان کے تمام سیاسی و اقتصادی حلقوں میں تحسین و اعتراف کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ ایک عرصہ سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر اور کپڑے کے کارخانہ دار حکومت سے اس محصول کی تنسیخ کا مطالبہ کر رہے تھے اور حکومت کی طرف سے بارہا ان کے مطالبات کے جواب میں مایوس کن وعدے پیش کئے جا چکے تھے۔ اس لیے یہ اعلان بڑی حد تک توقع کے بالکل خلاف تھا۔ اگرچہ اب بھی اس کی تنسیخ صرف تین مہینہ کے لیے کی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا ہے، کہ اگر آئندہ بجٹ کی ترتیب کے وقت ملک کی مالی حالت قابل اطمینان نظر آئی تو اس کی مستقل تنسیخ بھی عمل میں آجائے گی۔ اس لیے امید ہوتی ہے کہ شاید ہندوستان کی ایک بہت بڑی شکایت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

یہ محصول دراصل اس غیر منصفانہ پالیسی کی ایک یادگار تھا جو گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان کی صنعتوں کو فنا کرنے کے لیے انگریزی مدبرین نے اختیار کر رکھی تھی۔ ۱۸۵۶ء سے جبکہ ہندوستان میں یورپین طریقہ پر کپڑا بننے کی صنعت شروع ہوئی ہے، لنکاشائر کے کارخانہ دار حکومت ہند پر سے اس بات کا تقاضا کرتے رہے ہیں کہ ہماری تجارت کو محفوظ کرنے کے لے ہندوستان میں صنعت پارچہ بافی کو ترقی کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اول ان کے اس دباؤ کی وجہ سے حکومت ہند نے انگریزی کپڑے کی درآمد پر رعایتی محصولات عائد کئے اور اعلیٰ درجہ کی روئی کی درآمد پر بھاری بھاری محصول لگائے تاکہ ہندوستانی کارخانے کسی طرح انگریزی کارخانوں کا مقابلہ نہ کرسکیں مگر جب وہ اس مہنگائی اور شدید رکاوٹ کے باوجود ترقی کرتے چلے گئے تو دسمبر ۱۸۹۴ء میں لارڈ ایلجن نے برطانوی

صنعت کاروں کے دباؤ سے متاثر ہو کر ہندوستانی کارخانوں کے مصنوعہ مال پر یہ ظالمانہ محصول عائد کر دیا جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ہندوستان میں صنعت پارچہ بانی کو بالکل فنا کر دیا جائے۔ اس وقت سے تمام ہندوستان کی سیاسی جماعتیں اس صریح بے انصافی کے خلاف احتجاج کر رہی تھیں اور ہر موقع پر اس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا جاتا تھا مگر کبھی انصاف طلبی کی اس آواز پر توجہ نہ کی گئی۔ اسمبلی کے گذشتہ سرمائی اجلاس میں غیر سرکاری عنصر نے اس کے خلاف سختی کے ساتھ احتجاج کیا تھا اور گذشتہ اگست میں ایک وفد بھی ہزاکسلنسی وائسرائے کے پاس پہنچا تھا، مگر سب کے سامنے صرف وہی وعدہ دہرا دیا گیا جو ۱۹۱۷ء میں لارڈ ہارڈنگ نے کیا تھا، یعنی یہ کہ "جب مالی حالات اجازت دیں گے تو فوراً اکسائز ڈیوٹی موقوف کر دی جائے گی"۔ ——— اب انہوں نے توقع کے خلاف بہت جلدی مالی حالت کی اجازت کو قبول کر لیا ہے ورنہ ہمیں تو امید نہیں تھی کہ ہندوستان کی مالی حالت انہیں ایک ایسے محصول کو منسوخ کرنے کی اجازت دیتی جس سے تقریباً دو ڈھائی کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی کے علاوہ لنکاشائر کی پرورش بھی ہوتی تھی۔

جیسی کہ توقع تھی، ہندوستانی مفاد کی اس خفیف سی رعایت نے انگلستان کے سرمایہ داروں میں سخت اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ تازہ تاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کے لنکاشائری ممبر اس محصول کی تنسیخ کو انگریزی صنعت پارچہ بانی پر ایک شدید حملہ سے تعبیر کر رہے ہیں اور ایک ممبر صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ دراصل ہندوستان کی روز افزوں صنعت کی حفاظت ہے۔ جس سے لنکاشائر کی تجارت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ مانچسٹر گارجین نے بھی اس کے خلاف کے آواز بلند کی ہے اور وہ کہتا ہے کہ "یہ تنسیخ لنکاشائر کی صنعت کو مجروح کئے بغیر نہ رہے گی"۔ اس سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں حکومت ہند، لنکاشائر کے ایجی ٹیشن سے دب کر لارڈ ریڈنگ کے اس وعدہ کو فراموش نہ کر جائے کہ اگر آئندہ سال کے بجٹ میں مالی حالت بہتر معلوم ہوئی تو اس تنسیخ کو مستقل کر دیا جائے گا۔ ابتداء سے اب تک وہائٹ ہال میں جس طریقہ سے لنکاشائر کا اثر قبول کیا جاتا رہا ہے اور اس سے شملہ میں جو عاجزانہ تاثر کی کیفیت پیدا ہوتی رہی اس کی گذشتہ تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ کچھ بے جا نہیں ہے۔ جب کہ نارتھ بروک جیسے قابل وائسرائے کو محض اسی بناء پر مستعفی ہونا پڑا تھا کہ وہ لنکاشائر کو

خوش کرنے کے لیے ہندوستان کے ساتھ حد سے زیادہ بے انصافی نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں لارڈ لٹن نے محض اسی لنکا شائر کے دباؤ میں آکر ڈیڑھ کروڑ کے خسارہ کے باوجود انگریزی کپڑے کو محصولات درآمد سے بری کر دیا تھا' ۱۸۸۲ء میں صرف یہی دباؤ تھا جس نے لارڈ کرومر سے انگریزی کپڑے کے تمام محصولات معاف کرائے تھے' ۱۸۹۲ء میں صرف یہی اثر تھا جس نے لارڈ ایلجن کو ہندوستانی کپڑے کی صنعت پر اکسائز ڈیوٹی عائد کرنے پر مجبور کر دیا تھا' اور ۱۹۱۷ء میں یہی قوت تھی جس نے ہندوستان پر ۱۰ کروڑ پونڈ کا جنگی خرچ عائد کرنے کے باوجود اسے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے انگریزی کپڑے پر محصول درآمد بڑھانے سے روک دیا تھا پھر جبکہ ہمیشہ حکومت ہند کے ارباب حل و عقد لنکا شائر کے اشاروں پر چلتے رہے ہیں اور ہندوستان کی فسکل پالیسی انگریزی کارخانہ داروں کی ہدایت کے مطابق حرکت کرتی رہی ہے تو یہ امید کرنا ذرا مشکل ہے کہ اس مرتبہ حکومت ہند لنکاشائر کے مقابلہ میں اپنے اس منصفانہ فیصلہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے گی۔

✱ ترکی میں افراط و تفریط کا ہنگامہ

افسوس ہے کہ ترکی میں موجودہ برسراقتدار جماعت کی ناعاقبت اندیشانہ افراط پسندیوں کی بدولت وہ رد عمل شروع ہو گیا ہے' جو ان کی ٹھیٹھ مغربی اصلاحات کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس سے پہلے کردستان میں یہی چیز غیر ملکی سازشیوں کے لیے خلق اضطرابات کا سامان بن چکی ہے اور اب ہم سنتے ہیں کہ ارض روم میں جو مشرقی اناطولیہ کی مذہبی زندگی کے اہم مرکزوں میں سے ہے' اسی قسم کی ایک اور بغاوت رونما ہو گئی ہے جسے فرد کرنے کے لیے وہاں مارشل لا جاری کر دیا گیا ہے اور تین آدمیوں کو پھانسی دینے کے علاوہ ۱۴۴ آدمیوں کو سخت سزائیں دی گئی ہیں۔ یہ وقت ترکی کی تاریخ میں سب سے زیادہ نازک تھا۔ ترک اپنی حیات و ممات کی ایک فیصلہ کن کشمکش میں سے کامیاب ہو کر نکلے تھے اور اس وقت انہیں تعمیر و ترقی کے نہایت اہم مرحلوں سے گزرنا تھا کہ آئندہ کے لیے اپنے وجود اور استقلال کو ہر غاصب کی دست برد سے محفوظ کر دیں۔ ضرورت تھی کہ ایسے موقع پر ترکی قوم کی تمام قوتیں ایک مرکز پر جمع ہوتیں اور اصلاح و ترقی کا عمل صرف انہی شعبوں میں جاری کیا جاتا جو عام عقائد اور پسندیدگی کے مطابق ہوتے۔ مگر ترکی قوم کی بدقسمتی

ہے کہ اس کا موجودہ حکمران طبقہ نہایت سطحی جزئیات میں اپنی اصلاحی تحریک کو الجھا کر اس کی قوت کو اندرونی اختلاف میں ضائع کر رہا ہے۔

ترکی کی عام آبادی کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ نہایت سخت مذہبی آبادی ہے اور خصوصاً مشرقی اناطولیہ کے باشندے تو اپنی مذہبیت کے اعتبار سے دنیا کے مسلمانوں میں شاید سب سے زیادہ راسخ العقیدہ ہیں۔ ان میں ایک نہایت قلیل التعداد طبقہ کے سوا جسے بمشکل ایک فی ہزار کی نسبت حاصل ہوگی، مغربی خیالات اور مغربی تہذیب کو بہت بری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسی آبادی میں بیٹھ کر محض فوجی قوت کے بھروسہ پر اس قسم کے انتہا پسندانہ اصلاحی خیالات کو عملی جامہ پہنانا جو مذہب اور مذہبیت سے بعد تام رکھتے ہیں کسی عقلمند اور صاحب تدبر کا یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس کا طبعی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ عوام انتشار میں پڑ جائیں۔ علاوہ ازیں یہ جمہوری اصول کے بھی قطعاً منافی ہے۔ عام باشندوں کے عقائد اور جذبات کے خلاف ایک قلیل التعداد جماعت کا اپنے مخصوص خیالات کو جبراً نفاذ پذیر کرنا ہرگز جمہوریت نہیں ہو سکتا۔ یہ صریح استبداد ہے اور اتنا ہی قابل نفرت ہے جتنا سلطان عبدالحمید مرحوم جیسے ایک شخصی حکمران کا استبداد ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص جمہوریت ترکیہ کے موجودہ علمبرداروں سے پوچھے کہ قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے کے باوجود تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف اسے اپنے مخصوص عقائد کا غلام بناؤ، تو ہم حیران ہیں کہ وہ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

آثار کو دیکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے کہ ارض روم کی بغاوت کوئی مذبوحی حرکت نہیں ہے جسے ہم بسمل کی آخری تڑپ سے تعبیر کر سکیں بلکہ وہ بغاوتوں کے اس سلسلہ کی ایک ابتدائی کڑی ہے۔ جو اس جمہوری استبداد کے مقابلہ میں آیندہ برپا ہونے والی ہیں۔ مذہبی تعصب کی جو آگ ترکی عوام مین بھڑک چکی ہے وہ اتنی معمولی نہیں ہے کہ ایک دو دفعہ مشتعل ہو کر خود بخود ٹھنڈی ہو جائے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ابھی بہت بھڑکے گی اور ترکی کے دشمن اس پر تیل چھڑک چھڑک کر اسے بھڑکائیں گے۔ کیونکہ عموماً اس قسم کی ارتجاعی تحریکات کی رہنمائی وہ تنگ نظر اور تاریک حال لوگ کیا کرتے ہیں، جو اپنے عقائد کے خلاف ہر چیز کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے مخالفوں کو مرتد سمجھ کر ان کے خلاف کفار سے مدد لینا جائز سمجھتے ہیں۔ بغاوت کردستان میں ہم اس حقیقت کا کافی تجربہ کر چکے

ہیں اور شاید ہمارا یہ خیال غلط نہ ہو کہ آئندہ بھی اس قسم کی تمام بغاوتوں میں کسی یورپین طاقت کا ہاتھ ضرور شامل ہوگا۔ کاش ترکی مدبرین اب بھی اس راز کو سمجھ جائیں اور اپنی مفرطانہ کارروائیوں سے ترکی قوم کو مذہبی تعصب اور اغیار کی ریشہ دوانیوں کا شکار نہ ہونے دیں۔

* ارباب عمائم کے جرائم

علمائے حق کا گروہ ملت حنیفی کے لیے جس قدر برکت کا موجب ہے اسی قدر علماء سوء کا گروہ اس کے لیے مصائب و نوائب کا باعث ہے۔ تاریخ اسلام کے ہر دور میں علماء حق کے ساتھ ساتھ علماء سو کی بھی ایک جماعت پیدا ہوتی رہی ہے جس نے ہمیشہ نیابت رسول کے جلیل القدر منصب پر بیٹھ کر اسلام اور مسلمانوں کے گلے پر چھری پھیری ہے۔ اور اصلاح امت کی ہر تجویز اور رفاہ ملت کے ہر راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دور اخیر میں جب کہ اسلام پر ہر طرف سے اعداء نے ہجوم کیا اور خطرات و مصائب کی کثرت کے ساتھ منصب ارشاد و ہدایت کی ذمہ داریاں اور آزمائشیں بھی بڑھ گئیں، تو ایک بہت بڑی جماعت ایسے نفس پرستوں کی پیدا ہو گئی جنھوں نے ظاہر میں تو حق پرستی کا لباس پہن لیا ہے مگر سینہ میں ایسا دل چھپا رکھا ہے جو خشیت الٰہی سے خالی اور حب دنیا سے بھرا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ہر موقع پر اعداء اسلام کی خدمت کے لیے پیش کیا ہے اور اپنے نفس کی خاطر ہمیشہ ان کے ہاتھوں میں آلہ کار بن کر کام کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں جب اسلامی حکومت مٹ گئی تو انھوں نے بڑھ کر انگریزوں کے قدم چومے اور صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں کو نہیں آزاد اسلامی ممالک تک کے مسلمانوں کو بھی انگریزوں کا غلام بنانے کی تدبیریں کیں۔ تونس و الجزائر میں ان کا ایک پورا گروہ اسلام کے خلاف فرانسیسیوں کو مدد دینے کے لیے تیار رہا، اور آج ہم شام کے متعلق سنتے ہیں کہ جب سویداء میں فرانسیسی فوجوں کے داخلہ کی خبر دمشق پہنچی تو مفتی شہر اور قاضی شہر علماء کا ایک وفد لے کر جنرل سارائی کے پاس پہنچے اور اسے فتح پر مبارک دے کر یقین دلایا کہ ہم فرانس کے سچے وفادار ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس سے پہلے جب ۱۹۲۱ء میں شام و فلسطین کا ایک وفد امت سوریہ

کی آزادی کا مطالبہ کرنے کے لیے یورپ گیا تھا تو اس وقت بھی ان بزرگوں نے جمعیۃ اقوام کو تار دیا تھا کہ یہ وفد ہرگز قوم کا نمائندہ نہیں ہے اور شامی قوم فرانس سے بالکل خوش ہے۔ آج پھر وہ لوگ فرانس کی ہیبت و جبروت کے آگے سربسجود ہو رہے ہیں اور یقین ہے کہ کل اگر جنرل سارائی کے بجائے ڈاکٹر دائزمین دمشق میں حاکم بن کر پہنچ جائے تو وہ اس کے آگے بھی اسی طرح پیشانی رگڑیں گے کیونکہ انہیں اشخاص سے مطلب نہیں بلکہ اس نفس امارہ سے مطلب ہے جو اپنی پرورش کے لیے انہیں ایمان کا سودا کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

ایسے ہی علماء سو کے حق میں مرحوم مفتی عبدہ نے کہا تھا:

ولکن دینا قد اردت صلاحہ
احاذر ان تقضی علیہ العمائم

حقیقت یہ ہے کہ اس دین کو جس چیز نے ذلت و نکبت کے اس درجہ تک پہنچا دیا ہے وہ ایسے ہی ملت فروش علماء کی بے ضمیری اور نفس پرستی تھی ایسے علماء سو سے بچو!

میسور میں انسداد گاؤ کشی کا قانون

{ ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۵ء }

پچھلے دنوں انسداد گاؤ کشی کے متعلق ریاست میسور کی اسمبلی میں جو قانون منظور کیا گیا تھا اس پر تمام ہندوستان کے اسلامی حلقوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی چنانچہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ غیر جانبداری کی روایات کے خلاف عمل نہ کرے۔ اب اس قانون کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مسلمانان میسور کا ایک عام جلسہ بنگلور میں منعقد ہوا ہے جس کے صدر جناب "مولوی عبدالغفور صاحب رئیس اعظم بنگلور" کے خطبہ صدارت سے قانون گاؤ کشی کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ۱۹۲۴ء کے دسمبر کے اجلاس میں اسمبلی کے ہندو اراکین نے چار تجاویز پیش کرنے کا نوٹس دیا تھا جن کا مقصد "ریاست کے اندر گائے کی حفاظت کے لیے فوری ذرائع اختیار کرنا" اور "گائے کے ذبیحہ کو قانوناً بند کر دینا" تھا۔ ریاست کے ارباب حل و عقد کو جب یہ تجاویز موصول ہوئیں تو انہوں نے کمال فراست و دانشمندی سے ان تجاویز کو پیش کرنے کی اجازت دینے کے بجائے

اپنے ایک نوٹ کا اضافہ کر کے "بغرض اظہار رائے" واپس کر دیا۔ اس میں حکومت نے موتمر اتحاد منعقدہ دہلی کی متفقہ تجاویز کا حوالہ دیتے ہوئے اس امر کو بالکل واضح کر دیا تھا کہ "قانونی مدد سے اس کی توقع رکھنا کہ دوسرے لوگوں کے پیدائشی حقوق کو اپنے ذاتی جذبات و حسیات کی بناء پر پامال کر دیا جائے" مصلحت اندیشی اور رواداری کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مسائل "باہمی سمجھوتہ" پر چھوڑ دئے جائیں۔ حکومت کا یہ نوٹ جس وقت اراکین اسمبلی کے سامنے پیش ہوا تو مسلمانوں کے نمائندے جناب "محمد عباس خاں صاحب" نے مسلمانوں کے نقطہ نظر کو نہایت صفائی کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اسمبلی کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احترام کرے اور کسی قسم کی آئینی کارروائی کرنے سے قبل ریاست کی مقتدر اسلامی جماعتوں کو اظہار رائے کا موقع دے۔ لیکن ہندو ارکان اپنی ضد پر قائم رہے اور "چاروں تجاویز پر بحث کرنے" کی اجازت طلب کی۔ اپنے ہندو ارکان کے اس اصرار پر دیوان صاحب نے ایک تقریر فرمائی جس میں ان کے جذبات رواداری سے اپیل کرنے کے بعد صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ حکومت کے نوٹ کا منشا یہ ہے کہ اگر یہ تجویز "باہمی مصالحت اور آپس کی رعایت" سے فی الحال نہ ٹل گئی اور جیسا کہ ظاہر ہے اسے کثرت رائے سے پاس کر دیا گیا تو حکومت کے لیے سخت دقت کا سامنا ہوگا کیونکہ اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ اس قسم کی تجویز منظور نہیں کر سکتی تو وہ اس پر مجبور ہوگی کہ اسے مسترد کر دے لیکن دیوان صاحب کی یہ تنبیہ کارگر نہ ہوئی اور ۱۹۲۴ء کی تجاویز ۱۹۲۵ء میں اسمبلی نے منظور کر ہی دیں۔

اب اسمبلی کی منظور کردہ تجویز ایک سفارش کی صورت میں حکومت کے سامنے پیش ہے تاکہ اسے حکومت کی منظوری کے بعد قانون بنا دیا جائے اور اس طرح ایک ایسی ریاست کو جو ہمیشہ اپنی وسیع النظری اور آزاد خیالی کے لیے مشہور رہی ہے تعصب اور جانبداری کا شکار کر دیا جائے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ریاست کے ارباب حل و عقد اسمبلی کی اس قسم کی سفارشات کو مسترد کر کے ریاست کے وقار کو برقرار رکھیں گے اور میسور کی مسلمان رعایا کے مذہبی جذبات کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے کوئی ایسی کارروائی نہ کریں گے جو ان کے فطری حقوق کو پامال کرنے کا باعث ہو۔ دیوان صاحب نے اس تجویز

کے متعلق اسمبلی کے سب سے پہلے جلسہ میں جو الفاظ حکومت کی جانب سے فرمائے تھے وہ انہیں یقیناً یاد ہوں گے اور اب یہ وقت ہے کہ حکومت ان الفاظ کو عملی جامہ پہنائے اور اس تجویز کو ہرگز منظور نہ کرے جو اس کی تنبیہ کے باوجود بعض متعصب ارکان اسمبلی کی ضد سے منظور کی گئی ہے۔ ریاست کی اسلامی رعایا نے اس تجویز کے خلاف احتجاج کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اس کی وفاداری کا بین ثبوت ہے اور یقیناً اس کا مستحق ہے کہ مہاراجہ صاحب اس قدر کی کریں۔

* موسیو ژوونیل کی عیاری

جس وقت جنرل سارائی کی جگہ ایک سول ہائی کمشنر کے تقرر کا اعلان کیا گیا تھا اسی وقت ہم سمجھ گئے تھے کہ اب شام میں بھیڑیے کا کام ختم ہونے کے بعد لومڑی کا کام شروع ہو گا۔ چنانچہ بیروت سے خبر آئی ہے کہ موسیو ڈی ژوونیل نے سرزمین شام میں قدم رکھتے ہی لبنان کبیر کے نمائندوں کو یہ مژدہ سنایا کہ لبنانیوں کو ان کی وفاداری کے صلہ میں دستوری حکومت عطا کی جائے گی اور اگر "دوسری ولایات نے بھی جارحانہ کارروائیوں کو چھوڑ دیا تو انہیں بھی یہ موقع مل سکے گا"۔ جو لوگ دول یورپ کی سیاست سے واقف ہیں وہ اس راز کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے نازک موقع پر ہمیشہ مشرقی اقوام کو سبز باغ دکھا کر شیشے میں اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوستان، آئرلینڈ، مصر، حجاز، فلسطین اور عراق میں برطانیہ نے جو کچھ کیا اس سے تمام دنیا خبردار ہے اور اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ فرانس بھی اپنے سیاسی مرشد کے قدم بقدم چل کر شامیوں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے لیکن اگر اہل شام کا جذبہ حریت صادق ہے اور آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دینے کو تیار ہیں تو موسیو ڈی ژوونیل کے یہ سبز باغ ان کے دلوں کو ہرگز نہ لبھا سکیں گے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ متحد ہو کر فرانس کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائیں گے۔

مجاہدین شام نے اب تک جس ہمت و شجاعت کا ثبوت دیا ہے اور اپنے استحقاق حریت کو تلوار کے زور سے تسلیم کرانے کی جو عدیم المثال سعی کی ہے اس نے فرانس کے چھکے چھڑا دئے ہیں اور اس کے لیے اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا کہ وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے سیاسی تدابیر اختیار کرے۔ اگر اس موقع پر فرانس کے کھوکھلے اور حقیر عطیات کو شام نے ٹھکرا دیا اور آزادی کامل کے مطالبہ پر سختی کے ساتھ

قائم رہا تو موسیو ژوونیل اور ان کی حکومت مجاہدین شام سے براہ راست گفت و شنید کرنے اور مساویانہ شرائط صلح کے ساتھ ایک باعزت معاہدہ ترتیب دینے پر مجبور ہو جائے گی۔ پس شام کی آئندہ قسمت کا فیصلہ اس وقت شامیوں کے ثبات و استقلال، سعی و جدوجہد اور ایثار پر منحصر ہے

مسلم پریس کانفرنس

{ ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۵ء }

ہمارے ملک کے کہنہ مشق اور تجربہ کار اخبار نویس جناب سید جالب صاحب کی تحریک سے یہ قرار پایا ہے کہ علی گڑھ جوبلی کے موقع پر ۳۰ دسمبر کو "مسلم ایڈیٹروں" کی ایک کانفرنس منعقد ہو۔ ہم اس مبارک تحریک کا نہایت خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اخبار نویسوں کا طبقہ جو تمام دنیا کو تنظیم کی دعوت دیا کرتا ہے خود اسقدر بے ربطی و انتشار کی حالت میں ہے کہ شاید ہندوستانی مزدوروں کی کوئی جماعت اتنی غیر منظم نہ ہوگی ان میں باہمی اتحاد و اشتراک کا کوئی ایسا سلسلہ نام کو بھی موجود نہیں ہے جس سے وہ ایک سلک میں منسلک ہو سکیں۔ اس کا بین نتیجہ یہ ہے کہ ان میں باہم کوئی اتفاق نہیں ہے اور وہ اس طرح آپس میں لڑتے نظر آتے ہیں کہ بعض اوقات ان کی رقابتیں نہایت شرمناک چشم چوٹ تک پہنچ جاتی ہیں۔ علی ہذا القیاس ان کے درمیان کوئی تبادلہ خیال نہ ہونے کے باعث ان کے مسلک بھی بے حد مختلف ہیں اور اس کا اثر قوم کی رائے عامہ پر بہت برا پڑتا ہے حالانکہ مسلمانوں کی داخلی و خارجی سیاست کا اقتضا یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلم پریس اسقدر متفق ہو جائے کہ ملک و قوم کے عام مفاد کی خاطر صدا بلند کی جائے اس کی حمایت کے لیے سب متحد ہو کر سعی کریں۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ سید جالب صاحب کی تحریک کو کامیابی نصیب ہو اور اس کا حشر ان تحریکات کی طرح نہ ہو جو محض کاغذ پر پیدا ہوتی اور پنڈال کے گہوارہ میں پرورش پاتی ہیں مگر عمل کے میدان میں قدم نہیں رکھتیں۔ یقین ہے کہ اگر علی گڑھ میں "تبادلہ خیالات" کے بعد اخبار نویس حضرات کے درمیان کوئی تنظیم قائم ہو جائے تو ملک و قوم کی کشتی کنارے لگ جانے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ **لھو المراد۔**

* لالہ لاجپت رائے کا خطبۂ صدارت

بمبئی ہندو مہا سبھا کے اجلاس میں لالہ لاجپت رائے نے جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا ہے وہ ان کے تمام پچھلے خطبوں کے مقابلہ میں ایک خاص شان امتیاز رکھتا ہے۔ اب تک ہندو اسٹیج سے انہوں نے جتنے خطبے دیۓ تھے وہ منطقی استدلال سے خالی اور ہیجان انگیز تعلیمات سے مملو ہوتے تھے مگر یہ خطبہ ان تمام خرافات سے پاک ہے اور اس میں انہوں نے اپنے مسلک کی تائید میں نہایت سنجیدگی و متانت کے ساتھ فلسفیانہ دلائل پیش کئے ہیں جو معیار صحت و صداقت پر پورے نہ اترنے کے باوجود اپنے اندر اتنا وزن ضرور رکھتے ہیں کہ ان سے ایک معقولیت پسند آدمی بڑی حد تک متاثر ہو سکتا ہے۔ اس تغیر حال کو بعض سادہ لوح آدمی ان کی ذہنیت کے تغیر کی دلیل سمجھتے ہیں مگر واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے اب تک لالہ جی سنگھٹن کی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کی کوشش کر رہے تھے‘ اس لیے ان کے دلائل بھی عام پسند ہوتے تھے اور ان کی تقریروں میں وہی مسلمانوں کے مظالم‘ ہندوؤں کی بے چارگی‘ ہندو عورتوں کے اغوا اور سرحدی خطرہ کے ہیجان انگیز مضامین نظر آتے تھے جو عام ہندوؤں کو جوش میں لا سکتے ہیں لیکن اب عوام میں ان کی تخم ریزی کافی بار آور ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ خواص کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور ہندوؤں کے اہل دماغ طبقہ کو سنگھٹن کا حامی بنانے کے لیے فلسفیانہ دلائل کا زور صرف فرما رہے ہیں۔

چونکہ تعلیم یافتہ ہندو جماعت ان کی ہم خیال ہے اس لیے انہیں پڑھے لکھوں کی سی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن صوبہ بمبئی (مہاراشٹر کے سوا) سچے نیشنلسٹ طبقہ کا سب سے بڑا مرکز ہے اور وہاں لالہ جی کو اس جماعت سے واسطہ پڑا ہے جو ہندوستان کی متحدہ کانفرنس کو اپنی سیاسی زندگی کی عزیز ترین متاع سمجھتی ہے اس لیے انہیں سنگھٹن کی اہمیت اور حقانیت کا قائل کرنے کے لیے زبردست استدلالی قوت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لالہ جی نے ان کے سامنے فساد انگیز سنگھٹن کو جو ہندوستان میں کافی سے زیادہ خونریزی کر چکی ہے‘ نہایت معصوم اور بے گناہ صورت میں پیش کیا ہے اور فلسفہ اجتماع کے نہایت اونچے مسائل سے مدد لے کر ہندو سنگھٹن کو اس قوم کے بقاء حیات کا واحد نسخہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی بدنظمی ان کے خیال میں

ہندوستان کی تمام قوموں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس جگہ کسی مستقل تنقید کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ہم اشاعت آئندہ میں لالہ جی کے اس خطبہ صدارت پر مفصل تبصرہ کریں گے۔

* ہندوستان اور انگلستان کا فرق

ایک مدت سے ہندوستان یہ فریاد کر رہا ہے کہ اسکی نوخیز صنعتیں یورپ کی ترقی یافتہ صنعتوں کے مقابلہ میں اس وقت تک فروغ نہیں پا سکتیں۔ جب تک حکومت اس کے لیے حفاظتی ذرائع بہم نہ پہنچائے لیکن حکومت کے ارکان ہمیشہ اس جائز مطالبہ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں کہ یہ روشنی و تہذیب کا زمانہ ہے۔ جس میں آزاد تجارت (فری ٹریڈ) پر حفاظت (پروٹیکشن) کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی مگر یہی سوال جب انگلستان میں پیش ہوتا ہے تو آج اس بیسویں صدی کے زمانہ میں بھی جبکہ انگریز قوم نے اپنی صنعت و تجارت سے تمام دنیا کی قوموں کو شکست دے دی، دستانوں اور گیس کی بتیوں کی انگریزی صنعت کو جرمن مقابلہ سے محفوظ رکھنے کے لیے غیر ملکی موزوں اور دستانوں پر ساڑھے تینتیس فیصدی اور گیس کی بتیوں پر ۶ شلنگ فی گرس محصول در آمد لگا دیا جاتا ہے۔

یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ فری ٹریڈ کا اصول ایک دھوکہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ انگریز اس زریں قاعدہ پر صرف اسی وقت عمل کرنے کے لیے تیار ہیں جب وہ خود فائدہ میں ہوں اور دوسرے اس سے نقصان اٹھا رہے ہوں مگر جب ان کے اپنے فائدہ کا سوال آتا ہے تو وہ اسے فوراً بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی جنگ آزادی سے پہلے تک انگلستان کے نقشہ محصولات میں وہ بھاری بھاری ٹیکس موجود تھے۔ جن کی مدد سے انگریزی صنعتوں نے ہندوستانی صنعتوں کو فنا کیا ہے۔ اس وقت روشنی و تہذیب کا تقاضا یہی تھا لیکن جب انگریزی صنعتیں پوری طرح ترقی کر گئیں اور ہندوستان نے نئے سرے سے اپنی مردہ صنعتوں میں جان ڈالنی شروع کر دی تو پھر روشنی و تہذیب کا تقاضا یہ ہو گیا کہ ہندوستان کے بازاروں میں انگلستان کا نفیس کپڑا اسی قیمت پر فروخت ہو جس قیمت پر ہندوستان کا بھدا کپڑا فروخت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی تجارت پر دوسری قوم کا اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے۔

* حضور نظام کا گراں قدر عطیہ

یہ خبر تمام اسلامی دنیا میں نہایت تحسین و امتنان کے ساتھ سنی جائے گی کہ آج مظلومین شام کی دستگیری کے لئے بھی سب سے پہلے وہی ہاتھ آگے بڑھا ہے۔ جس نے ہر مصیبت کے وقت مسلمانوں کی مدد کی ہے۔ اس سے پہلے اعلیٰ حضرات فرزوائے دکن کے ابر کرم نے جس طرح آرہ‘ سمرنا اور مالا بار کے تشنہ کاموں کو سیراب کیا ہے‘ اس سے ہر شخص یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ شام کا آتش کدہ نکبت و الم ہرگز اس کے فیضان عام سے محروم نہ رہے گا۔ چنانچہ یہ توقع عین وقت پر پوری ہوئی اور اعلیٰ حضرت نے مصیبت زدگان شام کی اعانت کے لئے دو ہزار پونڈ (۳۰ ہزار روپیہ) کی گرانقدر رقم عطا فرمادی۔ کوہ ہند کش سے لے کر راس کماری تک اس ملک میں سینکڑوں مسلمان امراء اور رؤساء موجود ہیں جو اسی طرح شامی قوم کی فریاد سن رہے ہیں۔ جس طرح حضور نظام نے سنی ہے لیکن ان سب میں صرف ایک دل تھا جس کے اندر ان بیکس مظلوموں کے درد و الم کی ٹیس پیدا ہوئی اور صرف ایک ہاتھ تھا جو امداد و اعانت کے لئے آگے بڑھا۔ حضور نظام کی یہی وہ خوبی ہے جس کی بدولت تمام مسلمانان ہند کے قلوب پر ان کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور جس نے ہندوستان کی حدود سے تجاوز کر کے تمام مسلمانان عالم میں ان کے لئے ایک خاص عزت و محبت پیدا کر دی ہے۔

اس ہدیہ تحسین و اعتراف کے ساتھ ہم یہ تجویز بھی خدمت علیا تک پہنچا دینا چاہتے ہیں کہ برطانوی قونصل کو اس امر کی ہدایت فرما دی جائے کہ وہ اس روپے کی تقسیم کا ذریعہ مسیحی مشن کو بنانے کی بجائے فلسطین الاسلامی الاعلیٰ (سپریم مسلم کونسل) کو بنائے جو اس وقت ارض شام میں سب سے زیادہ مؤثر اسلامی جماعت ہے۔ کسی مسیحی مشن کے ذریعے اسے تقسیم کرانے میں یہ اندیشہ بے جا نہیں ہے کہ کہیں وہ اس قوت کو فاقہ کش شامیوں میں تبلیغ مسیحیت کا ذریعہ نہ بنائے۔ ہندوستان میں قحط کے مواقع پر مسیحی مشنری اکثر ایسا کرتے رہے ہیں اور مالا بار میں موپلہ بچوں اور عورتوں پر بھی یہ ہتھیار استعمال کیا جا چکا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ بندگان اعلیٰ حضرت مسلمانوں کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے ایسی تدبیر پر ضرور توجہ مبذول فرمائیں گے جس سے یہ رقم نہایت احتیاط کے ساتھ صحیح حق داروں تک پہنچ سکے۔

* جنگ ریف کا اصلی نقشہ

جنگ ریف کے متعلق ٹائمز آف انڈیا کے خاص نامہ نگار نے پیرس سے جو مفصل مراسلات بھیجے ہیں وہ متعدد حیثیات سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اب تک ریوٹر ایجنسی اور یورپین اخبارات کے ذریعے اس جنگ کے متعلق خبریں آتی رہی ہیں۔ ان میں محض میدان جنگ کے حالات اور تصادم کے نتائج مندرج ہوتے تھے اور وہ بھی زیادہ تر فرانسیسی و ہسپانی نقطہ نگاہ سے، جس سے یقیناً کوئی صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن ان مراسلات میں نامہ نگار مذکور نے بالکل غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے فریقین کی جنگی و معنوی حالت، ان کی فتح و شکست کے اسباب، ان کی فطری پوزیشن اور ان کے شش ماہہ رزم و پیکار کے صحیح نتائج پر ایک مفصل تبصرہ کیا ہے۔ جس سے ہمارے سامنے جنگ کا اصل نقشہ کھنچ جاتا ہے اور مارشل پی تین کے لاف و گزاف، پریوای ریویرا کی ڈینگوں اور موسیو پین لیو کے فتح مندانہ نعروں کی حقیقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔

اب تک یہ بات بالکل ایک معمہ تھی کہ ایک معمولی سردار قبائل جس کی مجموعی فوج ۴۰ ہزار سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔ کیونکر دو زبردست سلطنتوں کی ساڑھے تین لاکھ فوج سے لڑ کر کامیاب ہو سکا جن کے پاس ہر قسم کا بہترین سامان جنگ بھی موجود تھا اور جن کے ذرائع اس سے ہزار درجہ زیادہ وسیع تھے۔ نامہ نگار مذکور نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ کوئی معجزہ نہیں ہے جس کے اسباب سمجھ میں نہ آتے ہوں۔ بلکہ حالات و واقعات کا ایک طبعی نتیجہ ہے اور اگر اسباب کی موجودہ ترتیب پر غائر نظر ڈالی جائے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اس جنگ کا یہی نتیجہ ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس کی رائے میں ہسپانیہ و فرانس کی ناکامی کے تین وجوہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

ایک یہ کہ مچھروں کے مقابلہ میں مشین گن کا استعمال کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا دوسرے یہ کہ کوئی طاقتور سے طاقتور بیڑہ بھی دلدل میں بھی کام نہیں دے سکتا۔

تیسرے یہ کہ دو سلطنتیں متضاد مقاصد کو لے کر متحدہ جنگ نہیں کر سکتیں۔

ان تینوں وجوہ کی تشریح میں اس نے اپنے چشم دید واقعات پیش کئے ہیں اور اس

حیثیت سے کہ وہ دوران جنگ میں تمام بڑی بڑی لڑائیوں کے مواقع پر موجود رہا ہے اور متعدد فرانسیسی جرنیلوں اور فوجی ماہرین سے مل چکا ہے' اس کی معلومات اور اس کے اخذ کردہ نتائج یقیناً ایک حد تک وزن رکھتے ہیں۔

اس کی پہلی توجیہ جس میں تمثیلاً اس نے ریفی نبرو آزماؤں کو مچھروں سے تعبیر کیا ہے۔ اس حیثیت سے نہایت صحیح تشبیہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے کبھی ہسپانیہ و فرانس کے مقابلہ میں مرتب جنگ نہیں کی۔ بلکہ اس طرح منتشر طریقہ سے لڑتے رہے کہ کہیں فرانسیسی فوج کو ایک جگہ جم کر لڑنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ اسی طرح اس کی دوسری توجیہ بھی ریف کے حالات کو دیکھتے ہوئے نہایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ریف کے پہاڑی علاقہ میں ہسپانیہ و فرانس کی فوجیں اپنی زبردست طاقت کے باوجود اتنی ہی بیکار تھیں جتنا ایک عظیم الشان بیڑہ دلدل میں پھنس کر بیکار ہو جاتا ہے۔ ایک منظم و مرتب فوج کے لئے کھلا ہوا میدان ضروری ہے تاکہ وہ اپنی ترتیب کو قائم رکھ کر جنگ کر سکے لیکن اگر اسے کسی ناہموار اور دشوار گزار پہاڑی علاقہ میں چھوڑ دیا جائے تو ان قدرتی مشکلات سے وہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی اور اس کا پریشان و منتشر ہو جانا یقینی ہے۔

ایک لڑائی کے متعلق وہ اپنا چشم دید واقعہ لکھتا ہے کہ ایک فرانسیسی دستہ جس میں تقریباً ۵ ہزار سوار و پیدل فوج تھی اور ہلکی توپیں' مسلح موٹریں اور ٹینک اس کی مدد کے لئے موجود تھے۔ ریفیوں کی چھوٹی سی جمعیت کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ ریفی خود تو پہاڑ پر چڑھ گئے اور وہ ادھر ادھر بھٹکتا تگ و دو کرتا رہا اور آخر ناکام ہو کر واپس آگیا۔ توپوں کی آتش باری' فوج کی سرگرمی اور آلات کی گہما گہمی گزشتہ جنگ عظیم کی یاد تازہ کر رہی تھی مگر اس تمام جنگی کارروائی سے کچھ بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کیونکہ ریفی نہایت اطمینان سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھے آتش باری کئے جاتے تھے اور دشمن کو قریب آتا دیکھ کر پہاڑی بکریوں کی طرح چھلانگیں مارتے ہوئے کسی دوسری پہاڑی پر پہنچ جاتے تھے۔

وہ کہتا ہے کہ دو سو میل لمبے محاذ جنگ پر رات دن اسی قسم کے واقعات پیش آتے رہتے تھے اور فرانسیسی فوجوں کو دو تین میل آگے بڑھنے کے لئے کئی کئی دن تک اسی قسم کی سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ ان لڑائیوں میں فرانسیسی افسروں نے اپنے آدمیوں کو تو بہت کچھ بچا لیا مگر انہیں روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑا اور اس میں فرانسیسی

مالیات کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کی رائے میں موسیو پین لیو نے فرانسیسی نقصانات کا جو تخمینہ پیش کیا ہے' بالکل غلط ہے۔ ان کی فوج کے کم سے کم ۵ ہزار آدمی قتل اور ۱۵ ہزار آدمی زخمی ہوئے ہیں۔ جن میں فرانسیسی و الجزائری فوج کے ساتھ سینیگالی فوج کا بھی ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ مالی نقصانات کے متعلق اس کا اندازہ ہے کہ وہ کسی طرح ۱۵ کروڑ روپے سے کم نہیں ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اگر فرانسیسی اس لائن پر قائم رہنا چاہیں جس پر وہ جاڑے کی ابتدا میں تھے تو انہیں پورے موسم سرما میں تقریباً ۶ کروڑ روپے ماہانہ خرچ کرنے پڑیں گے جس کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ اپریل تک اس بے نتیجہ حالت جنگ پر فرانس کو ۳۶ کروڑ روپیہ صرف کرنا پڑے گا۔ حالانکہ اس دوران میں عبدالکریم پر کوئی غیر معمولی مصارف کا بار نہ ہوگا۔

پھر لطف یہ ہے کہ فرانس کے ان عظیم الشان ذخائر کے مقابلہ میں ان ریفیوں کو کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑا۔ نامہ نگار مذکور کا بیان ہے کہ اس پوری جنگ کے دوران میں ریف کی باقاعدہ فوج کو کبھی میدان میں آنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بلکہ عبدالکریم اپنے مرکز میں بیٹھا ہوا سرحدی قبائل کو فرانس کے خلاف لڑاتا رہا۔ جنہیں مارشل لیوتی نے ۱۲ سال کی لگاتار کوششوں سے پرچالیا تھا۔ ان قبائل سے فرانسیسی افسروں کو روزانہ امیدیں بندھتی تھیں اور روزانہ ٹوٹ جاتی تھیں۔ ہر روز ایک قبیلہ اظہار اطاعت کرتا تھا اور دوسرا اعلان بغاوت کر بیٹھتا تھا۔ ان کا معمول یہ تھا کہ جب فرانسیسی فوجیں قریب آتیں تو فوراً طلب عفو کا پیغام بھیجتے اور ان کے سردار رائفلیں کارتوس اور ذبح کئے ہوئے جانور لے کر فرانسیسی افسر کے پاس امان طلب کرنے کے لئے حاضر ہو جاتے لیکن جب یہ فوج آگے بڑھ جاتی تو پھر بغاوت کر دیتے اور پیچھے سے اس کے تمام مواصلات منقطع کر دیتے۔ ان کی اس چال سے فرانسیسی فوجوں کو سخت پریشانی ہوتی تھی۔ کیونکہ ہر قبیلہ کی سرکوبی کے لئے الگ الگ فوجیں بھیجنا اور انہیں مطیع کرنے کے لئے مستقل دستے متعین کر دینا ان کے امکان میں نہیں تھا۔

ان مشکلات کی موجودگی میں اگر فرانسیسی فوجوں نے عبدالکریم کو دریائے ورغہ کے شمالی کنارے تک ہٹا دیا جسے خود عبدالکریم بھی اپنی سلطنت کی اصلی سرحد قرار دیتا ہے اور اس علاقہ کو واپس لے لیا۔ جسے انہوں نے موسم بہار میں کھو دیا تھا تو اسے ایک فوق العادہ

کامیابی سمجھنا چاہیے لیکن نامہ نگار کی رائے میں اس کامیابی کو مستقل اور پائیدار کامیابی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت فرانس دریائے ورغہ کی سرحد پر ایک لاکھ فوج ہر وقت مستعد رکھے۔ ورنہ عبدالکریم کے ایک ہی حملہ میں اس تمام کامیابی پر پانی پھر جائے گا جو کئی کروڑ روپے اور کئی ہزار آدمیوں کی بھینٹ چڑھا کر حاصل کی گئی ہے۔

آگے چل کر یہ نامہ نگار فرانس اور ہسپانیہ کی سیاست سے بحث کرتا ہے۔ ان دونوں سلطنتوں کی ناکامی کے متعلق اس کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ ان کا اتحاد ایک مصنوعی اتحاد ہے کیونکہ ان کی اغراض مختلف ہیں اور دو حکومتیں مختلف مقاصد کو لے کر کوئی حقیقی اتحاد قائم نہیں کرسکتیں۔ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ عبدالکریم کی قوت کو توڑ دینے میں ہسپانیہ اور فرانس دونوں کے مقاصد متفق ہیں لیکن اس سے آگے بڑھ کر ان دونوں کے راستے الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ فرانس اس ہولناک تجربہ کے بعد جو اسے گزشتہ چند ماہ میں حاصل ہوا ہے۔ عبدالکریم کو مطیع کرنے یا مٹادینے کے ارادے سے قطعی دست بردار ہوچکا ہے اور اب اس کا زیادہ سے زیادہ مقصد یہ ہے کہ اس کی مراکشی سلطنت اس طاقتور امیر کی دست برد سے محفوظ رہے۔ برخلاف اس کے ہسپانیہ صرف اتنی سی بات پر قانع نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عبدالکریم نے جس علاقہ پر اپنی حکومت قائم کی ہے وہ پورے کا پورا ۱۹۰۴ء کی تقسیم کے مطابق منطقۂ ہسپانی میں آتا ہے اور اس لحاظ سے ہسپانیہ کسی طرح بھی اس سے کم پر راضی نہیں ہوسکتا کہ عبدالکریم کو نیست و نابود کرکے اس علاقہ پر اس کی حکومت قائم کردی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں اغراض ایک دوسرے سے متضاد ہیں اس لئے ممکن نہیں کہ دونوں سلطنتیں آخر وقت تک کوئی متحدہ کارروائی کرسکیں۔

نامہ نگار ٹائمز کے اس مفصل تبصرہ نے اس حقیقت کو بالکل واضح کردیا ہے کہ ریف میں غازی عبدالکریم کی پوزیشن پہلے سے کافی زیادہ مضبوط ہے اور اگر وہ اسی حسن تدبیر اور بیدار مغزی کے ساتھ کام کرتے رہے جس طرح اب تک کرتے رہے ہیں تو ہسپانیہ اور فرانس دونوں اپنی زبردست طاقتوں کے باوجود ان کے اقتدار کو کوئی ادنی سا صدمہ بھی نہ پہنچا سکیں گے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اس کی فتح کے اصلی اسباب صرف وہی نہیں ہیں جو نامہ نگار مذکور نے بتاتے ہیں۔ کیونکہ ان ساری کامیابیوں کا انحصار محض اس

تدبر، تنظیم اور عزم و استقلال پر تھا جن کی بدولت عبدالکریم نے ہسپانیہ و فرانس کی مشکلات اور ریف کے قدرتی مواقع سے فائدہ اٹھایا لیکن اس سے قطع نظر کرکے اگر ہم اس کی پیش کردہ معلومات پر نگاہ رکھیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے جنگ ریف کی اصلی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے۔

❑ فتح مدینہ

{ ۱۸؍ دسمبر ۱۹۲۵ء }

فتح مدینہ منورہ کی خبر اس سے پہلے کئی مرتبہ اڑ چکی ہے، لیکن اس مرتبہ جو پے در پے موثق ذرائع سے خبریں آئی ہیں ان سے یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ نجدی افواج کے ہاتھوں فتح ہوچکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب تک جس چیز نے **مدینۃ الرسول** ﷺ کو شریف علی کے تابع فرمان رہنے دیا تھا۔ وہ صرف سلطان ابن سعود کا جذبہ احترام تھا ورنہ شہر کی، جو کچھ حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اس میں افواج نجد کے مقابلہ کی قوت ہرگز موجود نہیں تھی۔ اہل مدینہ اپنے شرابی اور فاسق گورنر سے سخت ناراض تھے۔ محاصرہ کی ابتدا ہی میں انہوں نے شہر تسلیم کردینے کا ارادہ ظاہر کردیا تھا دوران محاصرہ وہ بار بار نجدی فوج سے درخواست کررہے تھے کہ ہمیں شریفی مظالم سے نجات دلائیں اور خود فوج کا یہ حال تھا کہ رواتب نہ ملنے کے باعث سخت بددل تھی۔ شامی و فلسطینی رضاکاروں کی ایک بڑی جماعت اپنے وطن کو واپس چلی گئی تھی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود جو چیز ابن سعود کو رسول اللہ ﷺ کے مقدس شہر پر ہجوم عام کرنے سے روکتی رہی وہ صرف یہ تھی کہ حبیب رب العالمین نے اسے اپنا حرم قرار دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ:

"لا یختل خلاھا وھو یعضد شجرھا ولا یحل فیھاسلاح لقتالہ"

اور تہدید فرمادی تھی کہ!

> **فمن احدث حدثا اواوی محدثا فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل**

مدینۃ الرسول ﷺ کا یہ احترام ابن سعود کو تو ان کثیر نقصانات اور ان بے شمار مادی و معنوی خسائر کے تحمل پر آمادہ کرتا رہا، جو ایک قابل تسخیر شہر کے محض محاصرہ کر لینے اور چودہ پندرہ مہینے تک فوجوں کو بیکار ڈالے رکھنے سے لازمی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن شریف علی اور اس کے ان حامیوں میں کوئی ایثار و قربانی کا جذبہ نہ پیدا کر سکا، جو اپنے آپ کو ہاشمیت کے علمبردار اور شرافت سادات کے پشتیبان سمجھتے ہیں۔ ان کا فرض تھا کہ جیران رسول اللہ ﷺ کو محاصرہ کی شدید تکالیف میں مبتلا ہونے سے بچاتے اور اس مہبط وحی الٰہی کو فتنہ و خونریزی سے محفوظ رکھنے کے لئے شہر حوالہ کر دیتے، مگر انہوں نے ابن سعود کے جذبات حرمت کو اپنے لئے جائے پناہ قرار دیا اور اس سے فائدہ اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے شہر کی ڈائنامائیٹ اور بم اندازی سے ایسی تواضع کی کہ وہ بالکل تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

اب کہ بعد از خرابی بسیار عزیز و محبوب شہر دفاع و جارحیت کی کشمکش سے نجات حاصل کر چکا ہے، تو یہ مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ اس کی تاراج شدہ آبادی کو ہم کیونکر اصلی حالت پر لا سکتے ہیں۔ دس سال سے رسول اکرم ﷺ کا یہ دارالہجرت جس کی تعریف میں حضور ﷺ نے "ان المدینۃ فتحت بالقرآن" فرمایا تھا اور جس کا نام محبت سے طیبہ رکھا تھا، ایسے سخت مصائب برداشت کر رہا ہے کہ اس کی آبادی ۸۰ ہزار سے صرف ڈھائی سو رہ گئی ہے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں ۲ سال تک اس نے خود حسین کے شدید محاصرہ کی مصیبت برداشت کی یہاں تک کہ اس کی تقریباً ۷۵ ہزار آبادی یا تو فاقے کر کر کے ہلاک ہو گئی یا ہجرت کر کے غریب الوطنی کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد جب فخری پاشا نے شرائط التوائے جنگ کے ماتحت اسے حوالہ کر دیا، تو حسین کی حرص و طمع اور ظالمانہ حکومت نے اس کی بچی کھچی آبادی کو مزید تختہ مشق ستم بنایا اور آخر زمانہ میں ایک فاسق و فاجر گورنر شریف شحاد نے اس پر ایسے ظلم ڈھائے کہ اگر آج ان کی تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کی جائیں، تو انہیں یہ یقین نہ آئے کہ ایک مسلمان کیونکر رسول اللہؐ کے جوار میں بیٹھ کر ایسی حرکات کر سکتا ہے پھر ان مظالم کے باوجود مدینۃ الرسول کی آبادی کچھ پنپ رہی تھی اور دور دور سے مہاجرین اپنے محبوب وطن واپس آکر اپنے کاروبار میں لگ رہے تھے کہ موجودہ محاصرہ میں شریفی فوج نے

غریب اہل مدینہ پر ایسے سخت ظلم کئے، جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اشاعت گذشتہ میں حضرت مولانا محمد عرفان صاحب کا جو کھلا خط درج کیا گیا ہے اس سے قارئین کرام اندازہ فرما سکتے ہیں کہ شریف کے آدمیوں نے کس طرح مدینہ کی آبادی کو تباہ و برباد کیا ہے۔

تاہم اب خدا نے مظلوموں کی فریاد سن لی ہے اور امید ہے کہ حجاز سے شریفی خاندان کے استیصال کلی کے بعد مدینہ منورہ کو امن و چین نصیب ہو جائے گا۔ پس اب مسلمانان ہند کو جنہوں نے لبنان، طرابلس اور سمرنا کے مظلومین کی اعانت میں روپے کے دریا بہا دیئے تھے مدینہ کے متعلق اپنا فرض یاد کرنا چاہیے اور ان کے ہزارہا بے خان و ماں باشندوں کو جوار رسول میں دوبارہ آباد کرنے، ان کو فاقہ کشی و عریانی کی مصیبت سے نجات دلانے اور ان بیشمار مکانوں کو تعمیر کرنے کے لئے، جو ڈائنامائیٹ کی نذر ہو گئے، اپنی جیبوں کے منہ کھول دینے چاہئیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی گنہگار سے گنہگار مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا، جس کے دل میں مدینہ طیبہ کی محبت نہ ہوگی، اس لئے محض ان واقعات کو **عامتہ المسلمین** تک پہنچا دینا ہمارے نزدیک کافی ہے، اس کے بعد ہمیں یقین ہے کہ ہر مسلمان خود اپنے فرض کو محسوس کرے گا۔

* مستقبل حجاز کا مسئلہ

فتح مدینہ سے ایک اور اہم سوال پیدا ہو گیا ہے۔ اب تک تو حجاز میں دو فریق تھے، جو باہم لڑ رہے تھے، اس لئے مسلمانوں کی رائے عامہ میں بھی دو فریق ہو گئے تھے، جو ان میں سے ایک ایک کی حمایت کر رہے تھے، لیکن اب وہاں عملاً کوئی جنگ باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ ایک فریق کو دوسرے پر فیصلہ کن فتح حاصل ہو چکی ہے اور فریق غالب کے مقابلہ میں فریق مغلوب کے ٹھہرنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ پس اب ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت کا کوئی سوال باقی نہیں رہا اور تمام مسلمانوں کے سامنے صرف یہ سوال درپیش ہے کہ آیا وہ حجاز پر ابن سعود کا تسلط قبول کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔

اس باب میں ان حضرات کے موقف کی نزاکت کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں، جو اب تک شریف علی کی حمایت یا ابن سعود کی مخالفت کرتے رہے ہیں، مگر یہ شخصی عصبیت

یا ذاتی حمیت یا خاص فریقانہ عقائد کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مرکز اسلام اور مہبط وحی الٰہی کے مستقبل کا مسئلہ ہے، اس لئے اگر ہمارے یہ محترم دوست ذرا حمیت جاہلیت کو اپنے دل سے نکال کر اس مسئلہ کو وسعت نظر کے ساتھ مطالعہ کریں، تو زیادہ بہتر ہے۔ انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس وقت حجاز کلیتہ ″ابن سعود کے ہاتھ میں ہے۔ علی یا کسی اور طاقت کا اب دوبارہ حجاز پر متمکن ہو جانا بظاہر ناممکن ہے۔ حجازی قوم اس کو اپنا حاکم تسلیم کر چکی ہے اور اس نے اپنے تمام مفتوحہ علاقوں میں کامل نظم حکومت قائم کر لیا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی مخالفت پر اصرار کرنا اور مسلمانوں میں اس کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے پروپیگنڈا کرنا کسی حیثیت سے بھی مفید نہیں ہے۔ ہر شخص جو ابن سعود کو جانتا ہے، اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہے کہ وہ ایک نہایت مستقیم الارادہ اور صاحب عزم و ثبات آدمی ہے۔ اس کے ساتھ وہ اتنی قوت بھی رکھتا ہے کہ تمام جزیرۃ العرب میں اس سے زیادہ طاقتور دوسرا کوئی امیر نہیں ہے۔ ایسی طاقت و حشمت اور ایسی خوبیوں کا انسان جس طرح مفید ہو سکتا ہے، اسی طرح مضر بھی ہو سکتا ہے۔ بحالت موجودہ ازراہ سیاست یا ازراہ صداقت، دنیائے اسلام کی مرضی پر عمل کرنے کے لئے تیار ہے اور عرب و حجاز کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی قوتوں کو عام مسلمانوں کی خواہش کے مطابق صرف کرنے پر آمادہ نظر آ رہا ہے، اس لئے مسلمانوں کو یہ موقع حاصل ہے کہ اس کی قوت سے فائدہ اٹھائیں اور اسلام کے مرکز ارضی کو ان خطرات سے بچانے کے لئے، جنہوں نے ہر طرف سے اسے گھیر لیا ہے، اس کے نفوذ و اثر کو استعمال کریں، لیکن اگر انہوں نے اس موقع پر تنگ نظری و عصبیت سے کام لیا اور اس کے ساتھ تعاون کرنے سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ حنفی نہیں ہے، تو اس غیر اسلامی حمیت کا انہیں یہ نتیجہ بھگتنا پڑے گا کہ وہ تحفظ جزیرۃ العرب اور تطہیر ارض حجاز کے اس بہترین موقع کو ہاتھ سے کھو دیں گے۔

* جزیرۃ العرب کے خطرات

افسوس ہے کہ مسلمانان ہند کا ایک طبقہ اب تک حنفی و حنبلی کے جھگڑے میں مبتلا ہے، حالانکہ وہاں مہد اسلام پر (خاکم بدہن، اغیار کا تسلط قائم ہو رہا ہے اور اسلام کے نقطہ

آغاز و انتہا پر ایسے شدید خطرات کا ہجوم ہے کہ اگر مسلمان آپس کے جھگڑوں میں پھنس کر ان کی طرف سے غافل ہو گئے، تو (لا قدر اللہ) وہ چیز ہی نہیں رہے گی، جس پر یہ سارا جھگڑا برپا ہے۔ ہم اپنے ان تنگ نظر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے سوچیں کہ جزیرۃ العرب اس وقت کس خطرہ سے دوچار ہے۔ ایک طرف فلسطین، شرق اردن، عقبہ، معان اور عراق پر انگریزی قبضہ ہے، جس کی بدولت تمام شمالی عرب نصاریٰ کے زیر تسلط آ گیا ہے۔ دوسری طرف جزیرہ نمائے سینا، مصر اور سوڈان پر انگریزی قبضہ ہے، جس کی بدولت حجاز کے عین سینہ پر انگریزی جہاز، توپیں تانے ہوئے کھڑے ہیں۔ تیسری طرف عدن سے مسقط تک تمام جنوبی عرب چھوٹے چھوٹے امیروں پر تقسیم ہو گیا ہے، جن میں سے ہر ایک برطانیہ کا وظیفہ خوار ہے اور برطانوی اغراض کی غلامی میں اسلامی اغراض کے خلاف سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہے۔ چوتھی طرف عمان، بحرین، الحساء اور کویت وغیرہ سواحل عرب پر انگریزی نفوذ و اثر قائم ہے اور خلیج فارس کا انگریزی بیڑہ ہر وقت مشرقی عرب پر اس طرح مسلط ہے کہ انگریزی مصالح کے خلاف اس کے نواح میں کوئی خود مختار قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔

ان سیاسی خطرات کے ساتھ ایک دوسرا خطرہ **فرنگیت** کا ہے، جو جدید تعلیم یافتہ عربوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ شام، فلسطین اور مصر کے امریکن اور فرنچ کالجوں میں تعلیم پا کر، جو عرب نوجوان نکلے ہیں، ان پر مغربیت کا بھوت سوار ہے۔ اسلامیت سے انہیں نفرت ہو گئی ہے۔ عربی قومیت کے نشہ میں "**باسم العرب نحيي وباسم العرب نموت**" کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ یورپین لباس، یورپین معاشرت، یورپین تعلیم اور یورپین تہذیب کو ترقی کی منزل مقصود قرار دیتے ہیں اور اسلامی تہذیب سے ان میں اس قدر بعد پیدا ہو گیا ہے کہ وہ عرب کی ترقی کا منتہا اس کو سمجھتے ہیں کہ مکہ و مدینہ لندن و پیرس کے نمونے بن کر رہ جائیں۔ عرب کے لئے یہ خطرہ اس سیاسی خطرے سے بھی زیادہ خوفناک ہے، جو اغیار کے روز افزوں تسلط سے پیدا ہو رہا ہے، کیونکہ انگریز تو محض عرب کے پاؤں میں بیڑیاں ہی پہنانا چاہتے ہیں، مگر یہ فرنگی مآب قوم پرست اس کے دل و دماغ کو بھی یورپ کا غلام بنا رہے ہیں اور جس طرح مہد اسلام سے اسلامی حکومت رخصت ہو رہی ہے، اسی طرح اسلامی تہذیب اور خود نفس اسلام کو بھی یہ لوگ الوداع کہہ رہے ہیں۔

* نجات کی واحد صورت

ان دو عظیم الشان خطرات سے عرب کو بچانے کی اگر کوئی صورت ہے، تو وہ صرف یہی ہے کہ ہم عرب کے ان دو طاقتور سرداروں سے کام لیں، جو خوش قسمتی سے اس وقت اجنبی نفوذ و اثر کی غلامی سے آزاد رہ گئے ہیں: ایک ابن سعود اور دوسرا امام یحیٰی۔ مسلمانوں کی بہترین مصلحت اس وقت اسی میں ہے کہ ان دونوں عربی سرداروں سے گہرے تعلقات قائم کئے جائیں۔ تائید عام سے ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ ان پر سرمایہ داری اور استعمار کے جو ڈورے ڈالے جا رہے ہیں، انہیں ان سے بچانے کی کوشش کی جائے اور انہیں اس طریقہ سے خدمت اسلام کے لئے استعمال کیا جائے کہ وہ موجودہ آزاد عربی ممالک کو تسلط اغیار سے بچالیں اور پھر باقی علاقوں کو آزاد کرانے کا ذریعہ بن سکیں۔

خصوصیت کے ساتھ ابن سعود کی پوزیشن اس وقت عربی سیاست میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ سواحل بحر احمر سے لے کر سواحل خلیج فارس تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی ہے، عرب کے نہایت شجاع اور بہادر قبائل اس کے زیر نگین ہیں۔ فلسطین، شرق اردن اور عراق سے اس کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں اور اس کی اندرونی تنظیم اس قدر زبردست ہے کہ یورپین سلطنتیں اس پر رشک کریں تو بجا ہے۔ اس قوت کے ساتھ اگر اسے دنیائے اسلام کی اخلاقی و معنوی تائید بھی حاصل ہو جائے، تو وہ اسلام کی بہترین خدمت انجام دے سکتا ہے۔ وہ نجد کے ویرانے سے نکل کر حجاز میں اس لئے آیا ہے کہ اسے کچھ کام کرکے دکھانے کے لئے میدان مل سکے۔ خلیج فارس اور سواحل الحساء پر انگریزی ریشہ دوانیوں نے اس کے لئے تجارتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کا عرصہ تنگ کردیا ہے اور وہ مجبور ہے کہ یا تو دنیائے اسلام کی تائید حاصل کرکے انگریزی مکائد کی اس جکڑ بندی کو توڑ دے، جس نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں، یا پھر وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائے، جو انگریز اس سے کرانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا اس کے لئے لابد ہے اور اس کی عربی و اسلامی حمیت نے اسے پہلی صورت اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ پس اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ

موقع کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ کر اس کا خیر مقدم کریں اور ہمت افزائی کر کے اسے اتنا مضبوط کردیں کہ وہ پوری طرح خدمت اسلام کے لئے مستعد ہوجائے اور انگریزی اغراض کی غلامی کے بجائے ان کا مقابلہ کرسکے۔

اس لئے مخالفین کو ان دونوں کو اپنی مخالفت کا نشانہ بنانے کا خیال اپنے دماغوں سے نکال دینا چاہیے، کیونکہ مستقبل عرب کی یہ امیدیں، جن سرداروں سے وابستہ ہیں، وہ دونوں سواد اعظم کے عقائد سے مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی ابن سعود حنبلی یا عرف عام میں "وہابی" ہے اور امام یحییٰ شیعہ ہیں۔ پس اگر ان دونوں سے محض ان کی شیعیت یا وہابیت کی خاطر مقاطعہ کیا گیا، تو عرب ہی سے ہاتھ دھولینا پڑے گا۔

* ابن سعود کے خلاف برطانوی اغراض

ابن سعود کی اس پوزیشن کو انگریز اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے وہ عرب میں برطانوی اغراض کی مخالفت کے لئے اٹھا ہے، انہوں نے اس کے خلاف شدید ریشہ دوانیاں شروع کردی ہیں، چنانچہ تمام دنیائے اسلام میں نہایت خفیہ طریقوں سے اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ اس کی وہابیت کے خلاف مسلمانوں میں متعصبانہ جذبات بھڑکائے جارہے ہیں اور خود عرب میں جتنی ساحلی امارتیں ان کے زیر اثر ہیں ان کے ذریعے اس کے خلاف نفرت پیدا کی جارہی ہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کی طرف سے اب تک جتنے وفود عرب بھیجے گئے ہیں، وہ سب اس حقیقت کا اپنی آنکھوں سے مطالعہ کرکے آئے ہیں کہ مسقط سے لے کر عدن تک تمام عربی امارتوں میں ابن سعود کے خلاف سخت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کو بعض سادہ لوح مذہبی جذبات پر مبنی قرار دیتے ہیں، لیکن اگر وہ اس سوال پر غور کریں کہ آخر راجہ صاحب سلیم پور سے لے کر سلطان الحج، سلطان مکلا، سلطان عقارب اور سلطان عوالق تک تمام برطانوی راجاؤں اور سلطانوں میں یہ مذہبی جذبات کیوں بھڑک اٹھے؟ اور اگر ان میں درحقیقت کوئی مذہبی روح موجود تھی، تو وہ بیت اللہ کی توہین اور مدینہ منورہ پر گولہ باری کے موقع پر کہاں غائب ہوگئی تھی، تو ان کو اچھی طرح اس مذہبی جذبہ کی حقیقت معلوم ہوجائے گی۔

عرب میں نجد کی اس جوشیلی اور تازہ دم قوت کے ظہور کو برطانوی مدبرین، جس

نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، اس کا اندازہ مانچسٹر گارجین کے ان الفاظ سے اچھی طرح ہو سکتا ہے، جو اس نے فتح مدینہ کی خبر پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

> "سقوط مدینہ نہ صرف وہابیوں کی تاریخ میں، بلکہ پوری دنیائے اسلام کی تاریخ میں ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے، کیونکہ اس سے عرب میں قطعی طور پر شریعت اسلام کا احیاء ہوگیا ہے، جس نے مشرق ادنیٰ میں یورپ کے لئے نہایت اہم مسائل پیدا کردیئے ہیں"۔

ان الفاظ کی تہ میں جو معانی پوشیدہ ہیں، ان پر اگر غور کیجئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے سرمایہ دار مستعمرین نہایت خوف کی نگاہوں سے مذہبیت کی اس نشاۃ جدید کو دیکھ رہے ہیں، جو ابن سعود جیسے دیندار اور ملت پرست شخص کے ہاتھوں عرب میں پیدا ہو رہی ہے، کیونکہ وہ اس کی ترقی میں اپنے سیاسی مصالح کی موت کا راز مضمر دیکھ رہے ہیں۔

* جنرل لیڈونر کی رپورٹ

موصل کے معاملہ میں ترکوں کو پھانسنے کیلئے جمعیت اقوام نے جو چالیں چلی ہیں، ان میں سے ایک زبردست چال جنرل لیڈونر کی رپورٹ بھی ہے۔ یورپین اقوام ہمیشہ ترکوں کے ساتھ یہ فریب کرتی رہی ہیں کہ جب کبھی ان کا کوئی سیاسی قضیہ بین الاقوامی مجالس میں زیر بحث آیا، تو فوراً انہوں نے عیسائیوں کی مظلومی کا ایک نیا افسانہ پیش کردیا اور ترکوں کے خلاف مسیحی اقوام کا جوش بھڑکا کر ان کے حقوق غصب کرلئے، چنانچہ یہی فریب اب موصل کے معاملہ میں بھی کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے برطانیہ نے شکایتیں کرنی شروع کیں کہ بروسیلز لائن کے شمال سے (یعنی ترکی علاقہ سے) ہزارہا عیسائی بھاگ کر عراق آرہے ہیں اور انہوں نے اپنے مظالم کی نہایت دردناک داستان سنائی ہے۔ یہ سن کر وہی سنگدل جمعیتہ اقوام جس نے دمشق کے ہزارہا مظلوموں کی فریاد پر ادنیٰ سی توجہ بھی نہ کی تھی، فوراً آمادہ دادرسی ہوگئی اور جنرل لیڈونر کو عراق بھیج دیا۔ دوران تحقیقات جنرل صاحب حکومت عراق کی ضیافتوں سے لذت اندوز ہوتے رہے اور چند ہفتوں تک دعوتیں اڑا لینے کے بعد ایک رپورٹ (جو غالباً دجلہ کے کنارے برطانوی ہائی کمشنر کے دفتر میں

تیار کی گئی تھی) لے کر جنیوا پہنچ گئے، جس میں پوری طرح برطانیہ کا حق نمک ادا کیا گیا ہے اور ترکوں کے مظالم نہایت دردناک لہجہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اب اس رپورٹ کو برطانیہ عظمیٰ اور مجلس اقوام ترکوں کے خلاف ایک حربہ کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں اور صاف الفاظ میں کہا جارہا ہے کہ ترکوں کے مظالم کا ہر صورت میں انتقام لیں گے اور رُیوٹر نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پیشین گوئی کر رہا ہے کہ جنرل لیڈونر کی رپورٹ شائع ہوجانے کے بعد ترکوں کو موصل ملنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ ان تمام باتوں سے اس خودساختہ رپورٹ کی اصلی غرض صاف معلوم ہوجاتی ہے۔

* بیرون ہند کے ہندوستانیوں کا خطرناک مستقبل

جنوبی افریقہ میں مسودہ امتیاز رنگ پاس کردیا گیا، جس کی رو سے معادن اور کارخانوں کے دروازے ہندوستانیوں کے لئے محض اس بناپر بند کردیئے گئے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اب انٹی ایشیا ٹک بل یونین اسمبلی میں پیش ہوا ہے اور چونکہ اس کا مخالف مسٹر الگزینڈر کی ایک چھوٹی سی لیبر پارٹی اور جنرل اسمٹس کی ایک قلیل التعداد حزب المعارضین کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اس لئے یقین ہے کہ وہ بھی تمام آئینی مدارج طے کرکے قانون کے درجہ تک پہنچ جائے گا۔ ایک طرف ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ کی سرزمین سے نکالنے کے لئے عملی اقدامات کا یہ سلسلہ نہایت تیزی کے ساتھ جاری ہے اور دوسری طرف حکومت ہند کا خیال ہے کہ اس کا وفد جنوبی افریقہ میں حالات کا "محض غور سے مطالعہ کرنے میں مصروف ہے" اور اس کے ارباب اقتدار دہلی میں "صورت حال کی رفتار" کا ملاحظہ کررہے ہیں۔ اگر مسٹر بھور کی تصریحات پر اعتماد کیا جائے، تو ہم یہ تسلیم کرسکتے ہیں کہ ہماری حکومت کے دفتر مہاجرت نے یونین گورنمنٹ سے بہت سختی کے ساتھ مراسلت و مکاتبت کی ہے، مگر جہاں تک عملی کوشش کا تعلق ہے اس کا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا اور یہی وجہ ہے کہ حکومت کے مراسلات کو یونین گورنمنٹ محض بے معنی الفاظ کا ایک مجموعہ سمجھتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ جنوبی افریقہ کا یہ سلوک ان قراردادوں کی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے، جو امپیریل وار کانفرنس نے اپنے ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۱ء کے اجلاسوں میں پاس کئے تھے اور جن کا منشا

یہ تھا کہ سلطنت برطانیہ کی زیر سایہ حکومتوں کے درمیان حسن سلوک کے تعلقات قائم کئے جائیں' اس لئے حکومت ہند جائز طور پر برطانوی گورنمنٹ سے درخواست کرسکتی ہے کہ وہ اپنے ان اختیارات کا استعمال کرے' جو جنوبی افریقہ کے آئین کی دفعہ ۶۵ کی روسے اسے حاصل ہیں' لیکن حکومت ہند کی جانب سے اس مطالبہ میں جس قدر تامل کیا جارہا ہے' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبانی ہمدردی اور مراسلہ بازی سے زیادہ ہندوستانیوں کی کوئی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور جنوبی افریقہ کی حکومت کو خود اپنے طرز عمل سے یقین دلانا چاہتی ہے کہ اس کے احتجاجی مراسلات کی تہ میں کوئی قوت موجود نہیں ہے۔

بیرون ہند کے ہندوستانیوں کی حفاظت میں حکومت کی اس سردمہری کا ہم کو یہ لازمی نتیجہ نظر آتا ہے کہ جنوبی افریقہ کی طرح دوسری تمام غیر ملکی حکومتیں بھی ہندوستانیوں کو بے وارث سمجھ کر برباد کرنے پر آمادہ ہوجائیں گی اور وہ ۲۱ لاکھ ہندوستانی جو اس وقت سمندر پار ملکوں میں مقیم ہیں' اپنے ابتدائی حقوق سے بھی محروم ہوجائیں گے۔ یہ محض اندیشہ ہی نہیں' بلکہ ایک واقعی خطرہ ہے' چنانچہ امریکہ میں خود گورنمنٹ کے اعتراف کے مطابق ہندوستانی باشندے اپنے تمام شہری حقوق سے محروم ہوچکے ہیں اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہندوستان کی گورنمنٹ اپنی رعایا کے حقوق کی حفاظت اس قدر ضروری نہیں سمجھتی' جس قدر جاپان کی گورنمنٹ سمجھتی ہے' ورنہ اگر وہ اس کے جواب میں ان سات ہزار امریکن باشندوں کو بھی ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم کردے' جو اس وقت ہندوستان میں مقیم ہیں' تو آج ہی حکومت امریکہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوجائے گی کہ ہندوستانی انسان ہیں اور اپنی پشت پر کوئی قوت رکھتے ہیں' لیکن یہ صرف ایک قوی حکومت ہی کرسکتی ہے ایک غیر قوم کی حکومت کو کیا پڑی ہے کہ وہ غلاموں کی خاطر اپنے آزاد دوستوں سے تعلقات بگاڑے۔

❑ موصل کا فیصلہ

{ ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء }

موصل کے معاملہ میں جمیعت اقوام نے جو فیصلہ کیا ہے وہ کسی حیثیت سے بھی غیر

متوقع نہیں تھا۔ ایک ایسی انجمن، جس میں برطانیہ کی غلام، نمک خوار، پروردہ، حلیف اور زیر اثر قوموں کی اکثریت ہو اور جو اپنے وجود کے لئے برطانیہ و فرانس کے متحدہ سیاسی مصالح کی منت پذیر ہو، وہ اس کے سوا اور کوئی فیصلہ کرہی نہیں سکتی تھی اور یہ جو کچھ اس نے کیا، سب اس کی فطرت کا مقتضیٰ تھا ممکن ہے کہ کسی کو یہ فیصلہ سن کر کچھ تعجب ہوا ہو، مگر جو لوگ اس کی حقیقت سے واقف ہیں، انہیں اسی وقت اس مقدمہ کا انجام معلوم ہوگیا تھا، جب لوزین کانفرنس میں اسے جمعیت اقوام کے سپرد کیا گیا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کن عناصر سے مرکب ہے اور اس کا مایہ خمیر کیا ہے، اگر محض اس کی گزشتہ تاریخ ہی پر ایک نظر ڈال لی جائے، تو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب اس کے سامنے دو ایسے فریقوں کا مقدمہ پیش ہوگا، جن میں سے ایک طاقتور ہو اور دوسرا ضعیف، تو وہ کبھی طاقتور کے خلاف فیصلہ نہ کرے گی، خواہ وہ ہر حیثیت سے ظالم ہی کیوں نہ ثابت ہوجائے۔

خود ترک بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے اور خواہ ترکی مدبرین نے مصلحتاً اس کا اظہار نہ کیا ہو، مگر ان کا آخر وقت تک اس بات پر اصرار کرنا کہ وہ توسط کے سوا جمعیت اقوام کی طرف سے مسئلہ موصل میں اور کوئی مداخلت قبول نہیں کرسکتے، در اصل اس امر کا صاف اعلان تھا کہ انہیں اس پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ترکی اخبارات نے بارہا نہایت صفائی کے ساتھ یہ لکھ دیا تھا کہ جمعیت اقوام کی حیثیت برطانیہ کے ایک سیاسی آلہ کار کے سوا کچھ نہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے محض اس وجہ سے جمعیت کی مداخلت کو قبول کرلیا کہ دنیا کو ان کی طرف سے کسی غیر معقولیت کی شکایت نہ پیدا ہو اور تمام دنیا یہ دیکھ لے کہ انہوں نے پرامن اور آئینی ذرائع سے اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ اب اس کے بعد اگر وہ کوئی غیر آئینی طریقہ اختیار کریں، تو اس تمام خونریزی و بدامنی کی ذمہ داری انہی لوگوں پر ہوگی، جنہوں نے جینوا میں بیٹھ کر علی رؤس الاشہاد ایک سیاسی ڈاکہ زنی کو حق بجانب قرار دیا ہے۔

ایک شخص یہ سوال کرسکتا ہے کہ اگر جمعیت اقوام کو یہی فیصلہ کرنا تھا، تو پھر اس نے اتنے دن تک اپنا اور تمام متعلق جماعتوں کا وقت ہی کیوں ضائع کیا؟ ایک مشرقی مذاق

کا آدمی اس مسئلہ کو ذرا مشکل سے سمجھ سکتا ہے‘ مگر جو لوگ یورپین قوموں کی چالبازیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ محض تضیع وقت نہیں تھی‘ بلکہ ایک گہری سیاسی چال تھی۔ ان قوموں کا دائمی طریق کار ہے کہ وہ جب کسی قوم میں حق طلبی کا جوش ابھرا ہوا دیکھتے ہیں‘ تو اس کو لطائف الحیل سے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اور مدتوں تک ”غور و فکر“ ”تحقیقات“ اور ”مباحثہ“ کے مختلف مدارج طے کرنے کے بعد کہیں اس وقت اپنی کاوشات کا نتیجہ پیش کرتے ہیں‘ جب اس کا جوش بڑی حد تک ٹھنڈا پڑ چکا ہوتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق انہوں نے ترکوں کو بھی ٹالنا چاہا۔ سال بھر تک فریقین کی بلا واسطہ گفت و شنید ہوتی رہی پھر معاملہ جمعیت اقوام کے سپرد کیا گیا۔ اس نے دونوں کے دعاوی سننے کے بعد ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر ”تحقیقی“ نظر ڈالے اور باشندگان موصل کی رائے بھی دریافت کرلے۔ کافی عرصہ اس تحقیقات میں بھی صرف ہوگیا۔ اس کے بعد کمیشن نے رپورٹ مرتب کرکے جمعیت کی کونسل میں پیش کی اور اس نے ایک خاص سب کمیٹی کو اس پر ”غور“ کرنے پر مامور کیا۔ وہ کچھ عرصہ اس شغل میں مشغول رہی اور اس قدر تاریخیں ڈالنے کے بعد آخر ایک دن اپنا نوٹ پیش کردیا پھر یہ ضرورت پیش آئی کہ کسی ترکیب سے ترکوں کو باندھ لیا جائے تاکہ جب فیصلہ ہو‘ تو وہ اس سے سرتابی نہ کرسکیں‘ چنانچہ ہیگ کی بین الاقوامی عدالت پہلے سے چشم براہ تھی۔ اس کے پاس **استنطاق** بھیجا گیا اور کچھ دن اس میں بھی لگ گئے۔ اس کے بعد جب ترکوں کو بزعم خود باندھ لیا گیا‘ تو مباحثہ کا دور شروع ہوا اور ایک کافی مدت اس دلچسپ مشغلہ میں گزار دی گئی۔ ان تمام لطائف الحیل سے مدعا صرف یہ تھا کہ کسی طرح ترکوں کا جوش ٹھنڈا ہوجائے اور وہ کسی چال میں آکر موصل کے ”سودائے“ خام سے باز آجائیں‘ مگر یورپ کے گرگان باراں دیدہ کو یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ وہ کسی چال میں بھی نہ آئے اور سختی کے ساتھ اپنے حق پر اڑے رہے۔ آخر انہوں نے اپنی بیاض سے وہ پرانا نسخہ نکالا‘ جو ایسے سخت مریضوں کے لئے ہمیشہ اکسیر ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ دستور کے مطابق سب سے پہلے عیسائیوں پر ترکی مظالم کی ایک داستان گھڑی گئی اور بغداد کے تارگھر سے فریاد و فغاں کا ایک شور بلند ہوا‘ جس نے جمعیت اقوام کے مستطیل ایوان میں ایک کہرام برپا کردیا۔ اس کے بعد ایک جنرل صاحب ”تحقیقات“ کے لئے بھیجے

گئے، جنہوں نے سرحد موصل پر جا کر چند لگے بندھے فریادیوں سے بیانات لے لئے اور ایک طویل رپورٹ مرتب کر کے پیش کر دی۔ اس رپورٹ کے پیش ہوتے ہی ترکوں پر لعنت و ملامت کا مینہ برسا دیا گیا اور ہر طرف سے صدائیں بلند کی گئیں کہ یہ خونی ہیں۔ اگر انہیں موصل دے دیا گیا، تو یہ تمام عیسائیوں کو پیس کر رکھ دیں گے، مگر اس تمام تگ و دو کا خالص نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ ترشی بھی ترکوں کے نشہ کو اتارنے میں ناکام ہوئی۔ آخرکار اس نے مایوس ہو کر اپنا کام ختم کر دیا تاکہ فضول وقت ضائع نہ ہو اور فریقین کو اس الجھن سے آزاد ہو کر کچھ کام کی بات کرنے کا موقع مل جائے۔

* جزیرۃ العرب میں برطانوی دسائس

سر گلبرٹ کلیٹن کے مشن کی طرف ہماری توجہ بہت کم منعطف ہوئی ہے، کیونکہ برطانوی مدبرین نے اس کی اغراض کو چھپانے میں پوری ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ خارجی دنیا کے متعلق ہمارے علم کا سب سے بڑا ذریعہ ریوٹر ہے، مگر چونکہ وہ برطانیہ کا سیاسی خادم ہے لہذا اس کے لئے ان حقائق کو ظاہر کرنا یقیناً ناممکن تھا۔ جنہیں برطانیہ کے ارباب سیاست مخفی رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ذرائع سے ہم کو جو کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، ان میں بھی ظن و تخمین کے سوا کچھ نہ تھا، جس سے ہم صرف اتنا سمجھ سکتے تھے کہ

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

لیکن اب پردہ اٹھتا جا رہا ہے اور بعض ایسے حقائق ہمارے سامنے آ رہے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نظروں سے چھپا کر عرب کی مقدس سرزمین میں مکاید و دسائس کا کیسا جال بچھایا جا رہا ہے۔ اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ **"الاتحاد العربی"** کے نامہ نگار جدہ کا ایک مراسلہ نقل کیا گیا، ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرہ کانفرنس میں سر گلبرٹ کلیٹن نے ابن سعود سے پھر بلاد جوف کا مطالبہ کیا ہے اور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ شرق اردن اور عراق کی سرحدوں کو ملا دینے کے لئے وہ پورا صحرائی علاقہ برطانوی انتداب میں دے دیا جائے، جو نجد کے زیر اثر قبائل سے آباد ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بلاد جوف کا مطالبہ کیا جا چکا ہے اور خصوصیت کے ساتھ کویت کانفرنس کی ناکامی کے

اہم ترین اسباب میں سے ایک سبب یہی تھا کہ ابن سعود نے شمالی عرب کی اس شہ رگ کو انگریزوں کے حوالہ کرنے سے انکار کردیا تھا، مگر اس کا سیاسی موقف کچھ ایسا مہتم بالشان ہے کہ انگریزی مدبرین بار بار ابن سعود سے اس کا مطالبہ کررہے ہیں اور کچھ عجب نہیں، کہ اگر وہ اس انکار پر اصرار کرتا رہا، تو جبر و قوت کے استعمال کی بھی نوبت آجائے۔

اس مقام کے لینے سے ایک یہی غرض نہیں ہے کہ شرق اردن اور عراق کی سرحد ایک ہوجائے، بلکہ سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ حیفا سے بصرہ تک ایک ریلوے لائن تعمیر کی جائے، جو عربی ممالک کے گلے میں ہمیشہ کے لئے غلامی کا آہنی طوق بنی رہے اور ہندوستان پہنچنے کے لئے ایک قریب ترین راستہ کا کام دے سکے۔ ڈیلی ہیرالڈ کے سیاسی نامہ نگار نے نہایت صفائی کے ساتھ اس مدعا کا انکشاف کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

> "سقوط مدینہ منورہ کی خبر سے تمام سرکاری حلقوں میں اضطراب کے آثار پیدا ہورہے ہیں، کیونکہ اس کی بدولت ابن سعود حجاز کے دو اہم ترین شہروں پر قابض ہوگیا ہے اور سخت اندیشہ ہے کہ اس سے نہایت اہم نتائج مترتب ہوں گے۔ اب ابن سعود مکہ میں مؤتمر اسلامی منعقد کرے گا، جو غالباً اسی کو خلیفہ مقرر کردے گی اور اس سے سرگلبرٹ کلیٹن کے مشن اور مسٹر بالڈون کے ان ارادوں کی جو انہوں نے شریف حسین کے نام اپنے خط میں ظاہر کئے ہیں، بالکل بساط الٹ جائے گی۔ اگرچہ سرگلبرٹ کلیٹن کے مشن کی غرض بظاہر صرف یہ تھی کہ نجد اور عراق و شرق اردن کی سرحدوں کا قضیہ طے کردیا جائے، مگر دراصل اس کا مقصود کچھ اور تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وزارت مستعمرات متعدد عسکری و کشوری اغراض کے تحت یہ کارنامے سرانجام دے رہی ہے"۔

* موصل کا مستقبل

موصل کے متعلق جمعیت اقوام کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد ہر شخص یہ سوال کررہا ہے کہ اب ترکوں کا طرز عمل کیا ہوگا۔ بعض لوگ ہر لحظہ اعلان جنگ کے منتظر نظر آتے ہیں۔ بعض ترکوں کی خاموشی کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض دھمکی سے کام نکالنا چاہتے

تھے، ورنہ ان میں لڑنے کی قوت بالکل نہیں ہے اور بعض حضرات کے نزدیک ترکی اخبار "جمہوریت" کے یہ الفاظ بہت پراسرار ہیں کہ ہم موصل کو بھی اسی طرح بچالیں گے، جس طرح ہم نے سمرنا، ادرنہ اور بروسہ کو بچالیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب تک حکومت انگورہ کی طرف سے جمعیت اقوام کے فیصلہ پر کوئی اظہار رائے نہ ہو، ترکوں کے طرز عمل کے متعلق کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ حالات میں ترکی مدبرین کی خاموشی اور وزارت ترکیہ کے خفیہ جلسوں کا مطلب اگر کچھ سمجھا سکتا ہے، تو وہ صرف یہ ہے کہ ترکی کے ارباب حل و عقد کوئی عملی طریقہ اختیار کرنے سے پہلے اپنے ارادوں کو راز میں رکھنا چاہتے ہیں۔

بہرحال ترکی مدبرین کا فیصلہ خواہ کچھ ہی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ جمعیت اقوام نے تمام خطرات کو اچھی طرح محسوس کرنے کے باوجود شرق اوسط میں ایک دوسرا السا س لورین پیدا کردیا ہے، جس کا نتیجہ کبھی نہ کبھی جنگ کی صورت میں ضرور نمودار ہوگا۔ ممکن ہے کہ جنگ اب نہ ہو، سال بھر بعد ہو، یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ کے لئے ملتوی ہوجائے، مگر ترکی اور عراق یا صحیح الفاظ میں (برطانوی عراق) کے درمیان عداوت کا جو بیج آج بودیا گیا ہے، وہ پھل لائے بغیر ہرگز نہ رہے گا اور اس کی بدولت دنیا کو ایک ایسی زبردست خونریزی کا منظر دیکھنا پڑے گا، جو تمام مشرقی دنیا کو لالہ زار بنادے گی۔

جدہ کی فتح

{۲۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء}

مدینہ منورہ کے فتح ہوجانے کے بعد جدہ کا فتح ہوجانا یقینی تھا، چنانچہ اس پر دو ہفتہ بھی نہ گزرے تھے کہ ہز مجسٹی امیر علی کا متمکن رہنا محال ہوگیا اور انہوں نے شہر تسلیم کرنے اور تخت و تاج چھوڑنے کی تجویز پر غور کرنا شروع کردیا۔ اب ابن سعود تمام حجاز پر بلاشرکت احدے قابض و متصرف ہے اور خاندان شریف کے اس آخری تاجدار نے دنیا کے "بے روزگار" بادشاہوں میں ایک اہم شخصیت کا اضافہ کردیا ہے، جس کا یقیناً شاہان معزول کی انجمن میں نہایت شاندار خیر مقدم کیا جائے گا۔

جدہ کا یہ انجام، جو آج پندرہ سولہ مہینے کی کشمکش کے بعد پیش آیا ہے، شاید اب

سے بہت پہلے وقوع پذیر ہوچکا ہوتا، مگر جس چیز نے "حکومت ہاشمیہ" کے لئے بے بنیاد قصر کو پیوند خاک ہونے سے بچائے رکھا، وہ صرف غیر ملکی سلطنتوں کی پشت پناہی تھی، جن کے قونصل خانے ابن سعود کو ہجوم عام کرنے سے روک رہے تھے۔ تاہم علی کو خود اس کے اعمال بد کے ہجوم سے بچانا ان کے اختیار میں بھی نہ تھا۔ اس نے حجازی قوم سے جو غداریاں کی تھیں، اہل جدہ پر جو ظلم و ستم ڈھائے تھے، شام و فلسطین کے والنٹیروں سے جو بدمعاملگی برتی تھی، ان سب کا رد عمل ابن سعود کے حملہ سے زیادہ فاتحانہ قوت رکھتا تھا، چنانچہ اسی کی بدولت آج خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر نجد کا سلطان حجاز کا حکمران ہوگیا ہے اور وہ بادشاہی جو کھوکھلی بنیادوں پر تعمیر کی گئی تھی، خود اپنے ہاتھوں سے کھودی ہوئی قبر میں فنا ہوگئی ہے۔

☐ نجد و برطانیہ کا معاہدہ

{ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۵ء }

۲۹ر نومبر کے "القلم" نے ایک معاہدہ شائع کیا ہے، جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ سلطان نجد اور سر گلبرٹ کلیٹن نے اس پر دستخط کردیئے ہیں۔ اس میں منجملہ دیگر قابل اعتراض دفعات کے ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ:۔

"سلطان ابن سعود اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ خارجی ممالک، حتیٰ کہ شام میں بھی نجدی مصالح کی نمائندگی کا حق برطانیہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے"۔

اس کے علاوہ ایک اور دفعہ کے مطابق سلطان نجد نے ریاض میں برطانوی سفیر کے بجائے مقیم دائم یا ریذیڈنٹ کے قیام کو قبول کیا ہے اور لندن میں اپنا سفیر مقرر کرنے کے ارادہ کو اس بنا پر ملتوی کردیا ہے کہ "ان کے پاس کوئی آدمی اس خدمت کو انجام دینے کے قابل نہیں ہے"۔ مزید برآں، یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ سلطان نجد نے قبائل شمر پر سے اپنے حقوق سیادت اٹھالئے ہیں اور عقبہ پر برطانوی تسلط قبول کرلیا ہے۔

اس معاہدے کو جن اخبارات نے زیادہ تر اشاعت دی ہے وہ "فتی العرب" اور "اتحاد العربی" وغیرہ ہیں، جو شریف حسین کے خاص حامیوں میں سے ہیں۔ "الشوریٰ" نے بھی اسے شائع کرکے یہ اظہار رائے کیا ہے کہ "اگر حقیقتاً یہ معاہدہ ہوگیا ہے، تو

عرب کے لئے ابن سعود سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہے"" مگر جو لوگ "الشوری" کا بالالتزام مطالعہ کرتے ہیں، وہ شریف حسین اور اس کے تعلقات سے اچھی طرح واقف ہیں اور "القلم" کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ابتداء سے شریفی اغراض کا سب سے بڑا حامی رہا ہے۔

ان تمام وجوہ کی بناپر ہمارے نزدیک یہ بیان ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس پر بلا تحقیق اعتماد کیا جائے، مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو عرب میں برطانوی دسائس سے بالکل بے خوف بھی نہ ہو جانا چاہیے۔ ابن سعود کو ہم خواہ کتنا ہی مضبوط اور غیور عرب کیوں نہ سمجھتے ہوں اور اس کی اسلامی حمیت پر ہمیں خواہ کتنا ہی اعتماد ہو، مگر پھر بھی ہم اس کو احتساب سے بری اور عالم اسلامی کی شدید نگرانی سے آزاد نہیں سمجھتے، اس لئے ہمارے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ جمعیت علماء ہند اور خلافت کمیٹی کے اکابر فوراً ابن سعود سے اس معاہدہ کی اشاعت کا مطالبہ کریں، جو سر گلبرٹ کلیٹن اور اس کے درمیان ہوا ہے۔ اس وقت نہ صرف عرب، بلکہ تمام شرق ادنیٰ کا مستقبل سخت خطرہ میں ہے اور یورپین مستعمرین اس کشمکش کے لئے جو عنقریب مشرق اور مغرب کے درمیان ہونے والی ہے، بڑی ہوشیاری کے ساتھ جوڑ توڑ میں لگے ہوئے ہیں، اس لئے ہم کو کسی ایک شخص کے ہاتھ میں اسلامی مصالح کی باگ دیکھ کر مطمئن نہ ہونا چاہیے اور خصوصیت کے ساتھ ابن سعود کی سخت نگرانی کرنی چاہیے، کیونکہ اس وقت عالم اسلامی میں اس کی پوزیشن سب سے زیادہ نازک اور اہم ہے۔

* ترکی و روس کا معاہدہ

موصل کے فیصلہ پر ابھی تک ترکی حکومت کی طرف سے کوئی رسمی اظہار خیال نہیں کیا گیا ہے، مگر ہمارے خیال میں وہ ترکی روسی عہد نامہ، جس پر فیصلہ موصل کے دوسرے ہی دن رشدی بے اور موسیو چمبرین نے دستخط کئے ہیں، اس بین الاقوامی خیانت پر بلیغ ترین اظہار رائے کا حکم رکھتا ہے اور اس سے دنیا نہایت آسانی کے ساتھ یہ معلوم کر سکتی ہے کہ ترکوں کی طرف سے جمعیت اقوام کے فیصلہ کا حقیقی جواب کیا ہوگا۔ لوکارنو میں جرمنی کو بظاہر مطمئن کر کے اور لندن میں فرانس کے ساتھ اتحاد عمل کا سمجھوتہ

کر کے برطانیہ عظمیٰ نے اپنے نزدیک مشرقی قوموں کے خلاف تمام یورپین قوتوں کی تائید حاصل کرلی تھی اور وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اب ترک موصل چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں گے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ بالڈون، چیمبرلین اور ایمری کی ان طفلانہ چالبازیوں کو دیکھ کر رشدی بے اور چرین اپنی محفلوں میں قہقہے لگا رہے تھے اور ایک ایسے معاہدہ اتفاق کی ترتیب میں مصروف تھے، جو عین موقع پر ترکی روسی اتحاد عمل کا ہوا پیش کر کے مغربی سرمایہ داروں کی تمام مسرتوں پر پانی پھیر دے۔ اگرچہ فی الحال اس معاہدہ اتفاق کی رو سے ترکی کو صرف اتنا فائدہ حاصل ہوگا کہ بالشویک روس اس کے خلاف کسی یورپین اتحاد میں شریک نہ ہو سکے گا اور جنگ کی صورت میں ترکوں کو مغرب سے کسی حملہ کا اندیشہ باقی نہ رہے گا، لیکن اگر موصل پر جنگ چھڑ گئی اور برطانیہ نے گزشتہ جنگ عظیم کی طرح پھر درہ دانیال میں داخل ہونے کی کوشش کی، تو یقین ہے کہ ترکی اور روس کے درمیان فوراً ایک دفاعی و ہجومی معاہدہ عمل میں آجائے گا اور اس کے مطابق روسی فوجیں بھی شریک جنگ ہو جائیں گی۔

اب تک ترکی کو سب سے زیادہ جو چیز نقصان پہنچا رہی تھی، وہ روس کی دشمنی تھی، مگر ایک طاقتور ہمسایہ دشمن کی حیثیت سے جتنا خطرناک ہوتا ہے دوست کی حیثیت سے اتنا ہی مفید بھی ہوتا ہے۔ پس اب کہ روس اپنی قدیم دشمنی کو ترک کر چکا ہے اور ترکی سے اس کے اغراض و مصالح متحد ہو گئے ہیں، یہ امید کرنا بیجا نہیں ہے کہ موجودہ معاہدہ دونوں کے مصالح کی حفاظت کرتا رہے گا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

* مسز نائیڈو کا خطبہ صدارت

مسز نائیڈو کے حصہ میں کانگریس کی صدارت ایسے موقع پر آئی ہے جب ہندوستان کی یہ اہم ترین سیاسی جماعت ایک شکست خوردہ سلطنت کی طرح اپنی انتہائی بدنظمی کی حالت کو پہنچ چکی ہے۔ اگرچہ یہ شکست اسے تین سال پہلے ہی نصیب ہو چکی تھی مگر گیا کوکناڈا اور بلگام میں وہ پسپا ہو رہی تھی اور اب کانپور میں وہ اسی مقام پر آگئی ہے۔ جہاں سے اس نے میدان جنگ کی طرف اقدام کیا تھا۔ اب صرف یہی نہیں کہ حکومت سے ترک موالات کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ بلکہ کانگریس اپنے ان اصولوں کو بھی چھوڑ رہی ہے جنہیں اس نے گزشتہ ۵ سال کی مدت میں اپنے مسلمات میں داخل کرلیا تھا اور اس کے بہت سے ارکان جو پسپائی کی رفتار کو نسبتاً زیادہ تیز کردینا چاہتے ہیں اس میں بھی تأمل ہوگیا ہے کہ آیا کھدر کو ایک قومی یونیفارم سے زیادہ وقعت دینا جائز ہے یا نہیں۔ اسی طرح اب کونسلوں میں مزاحمت کی پالیسی بھی ترک کی جارہی ہے اور آثار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس سال نہیں تو کم از کم آئندہ سال تک مزاحمت کے حامیوں کا بھی وہی حشر ہوگا جو پہلے مخالفین کا ہوچکا ہے۔

ایسی حالت میں مسز نائیڈو کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ ملک میں سیاسی بیداری کو باقی رکھنے اور سوراج کی منزل مقصود کی طرف جدوجہد جاری رکھنے کے لئے کوئی جدید لائحہ عمل پیش کرتیں ادراگرسی۔ز۔ ان سے ایسی توقع قائم کی تھی تو موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے وہ یقیناً غلط تھی۔ مسز نائیڈو زیادہ سے زیادہ ملک کی سیاسی رہنمائی کے لئے جو پروگرام پیش کرسکتی تھیں۔ وہ انہوں نے پیش کردیا اور اس لحاظ سے ان کا خطبہ صدارت نہایت قابل قدر ہے۔ کیونکہ اس میں انہوں نے نہ تو ملک کو کوئی سبز باغ دکھایا ہے اور نہ کسی سیاسی بھول بھلیاں میں پھنسا کر محض زور خطابت کی داد لینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تمام تر توجہ صرف اس مقصد کی طرف منعطف رہی ہے کہ ترک موالات کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد ملک کی سیاسی قوتوں میں جو بدنظمی و انتشار پھیلا ہوا نظر آتا ہے اسے دور کرکے ان کو کسی ایسے کام پر لگایا جائے جو انہیں پہلے سے زیادہ کامیاب جدوجہد کے قابل بنا سکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پانچ تدبیریں پیش کی ہیں۔

ایک یہ کہ کانگریس ایسے بے غرض کارکن مہیا کرے جو دیہات کی تنظیم کریں اور

ملک کی دیہاتی آبادی کو قعرِ ذلت سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر لائیں۔

دوسرے یہ کہ شہری آبادی میں بھی ان طبقوں کی حالت درست کی جائے جو صنعت، دولت اور محنت و مزدوری میں مشغول ہیں اور بسااوقات جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ قومی تعلیم کی اصلاح کی جائے اور ملک کے نوجوانوں کو اس ذہنی غلامی سے نکال کر جس میں وہ موجودہ تعلیم کی بدولت مبتلا ہو گئے ہیں علم و حکمت کی حقیقی روشنی سے معمور کیا جائے۔

چوتھے یہ کہ ملک کی فوجی روح کو جو اجنبی حکومت کے اثر سے بالکل مردہ ہو گئی ہے۔ دوبارہ زندہ کیا جائے اور ہندوستان کی پیشانی سے اس داغ کو دور کیا جائے کہ وہ اپنی مدافعت بھی آپ کرنے کے قابل نہیں ہے۔

پانچویں یہ کہ سیاسی پروپیگنڈے کے لئے ایک بہت بڑا نظام قائم کیا جائے' جو ایک طرف بیرونی ممالک کو ہندوستان کی اصلی حالت سے باخبر رکھے اور ان میں ہندوستان کے سیاسی مقاصد کے لئے ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کرے اور دوسری طرف ملکی عوام میں ان تمام مسائل سے واقفیت اور دلچسپی پیدا کرے۔ جو ہندوستان کی سیاسی اقتصادی اور اجتماعی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ ان تدابیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خاتون موصوف نے کون سی تجاویز سوچی ہیں مگر جہاں تک ان کی اصولی حیثیت کا تعلق ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کو شاہراہ ترقی پر لگانے کے لئے اس سے بہتر تدابیر اور کوئی نہیں ہو سکتیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اب کسی فوری انقلاب سے بہتری کی کوئی امید نہیں ہم ترک موالات میں خواہ کتنے ہی حق بجانب ہوں مگر عملی حیثیت سے اس بے تعلقی یا ترک تعاون کو کسی نتیجہ خیز جدوجہد کا ذریعہ سمجھنا اور اس سے کسی فوری آزادی کی توقع رکھنا محض ایک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے۔ پس ملکی فلاح کے لئے بہترین تدبیر اس وقت یہی ہے کہ ہر جماعت کو اپنے اپنے سیاسی مسلک کے مطابق مشغول کار چھوڑ کر کانگریس ایک ایسے تعمیری کام میں مشغول ہو جائے جس کا مقصد ہندوستان کی عام آبادی میں شعور سیاسی کو ترقی دینا اور اسے اقتصادی، اجتماعی اور جسمانی حیثیت سے مضبوط بنانا ہو تاکہ وہ مستقبل

قریب میں اپنی قوت سے آزادی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ ترک موالات کی تحریک میں ہمیں اس بات کا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عام ہندوستانیوں کا شعور سیاسی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ بلکہ دیہاتی آبادی میں سرے سے کوئی ایسا شعور موجود ہی نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسی پرجوش تحریک بھی جس کی بدولت سارا ہندوستان حرکت میں آگیا تھا، ان کی منتشر قوتوں کو حصول آزادی کے لئے مجتمع نہیں کر سکی۔ اس لئے اب ہمیں زیادہ تر اسی کی تخلیق و تہذیب میں اپنی کوششوں کو صرف کرنا چاہئے اور یہ ایسا کام ہے جس میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو کر کام کر سکتی ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ جس پر کانگریس کی محترم صدر نے توجہ کی ہے۔ ہندو مسلم نفاق کا مسئلہ ہے۔ اتحاد کی سب سے بڑی شیدائی ہونے کی حیثیت سے وہ موجود نفاق پر جتنا رنج بھی کریں بجا ہے اور ہم ان کے رنج کو لاجپت رائے اور مسٹر جیکار کے رنج کی طرح بے بنیاد نہیں سمجھ سکتے مگر ہمارے نزدیک اس افسوسناک بیماری کی یہ تشخیص کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی کی روح پیدا ہو گئی ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کی طرف سے صرف فیاضی اور رواداری کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو جس چیز نے جداگانہ حقوق کے مطالبہ پر آمادہ کیا ہے وہ صرف ہندوؤں کی غیر محدود حرص و آز ہے جس کے باعث وہ ملک کے تمام سیاسی و اقتصادی منافع کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ حرص ایک خاص حد تک محدود رہے اور برادران ہنود اپنے جائز حقوق پر قانع رہنے کے لئے تیار ہو جائیں تو ملک آج ہی اس فرقہ بندی اور آپس کی کشمکش سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ پس موجودہ بیماری کی بہترین تشخیص اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے فیاضی کی نہیں بلکہ انصاف کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کی طرف سے ضبط و تحمل کی۔

لیکن ہم مسز نائیڈو کے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ چند محب وطن ہندو مسلمانوں کی ایک جماعت کو موجودہ نفاق کا علاج کرنے کے لئے مقرر کر دینا کافی ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ طریق علاج اختیار کیا جا چکا ہے اور اسے شدید ناکامی ہوئی ہے۔ اب اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ اسے زمانہ کی ٹھوکروں کے سپرد کیا جائے جو خود بخود ہندوؤں اور مسلمانوں کو ٹھیک کر کے راہ راست پر لے آئیں گی۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۰۰۲ جمعیۃ علماء ہند کا واحد ترجمان تار کا پتہ "الجمعیۃ دہلی"

ید اللہ علی الجماعۃ

سہ روزہ

الجمعیۃ دہلی

مدیر مسئول محمد مخصوص ابوالاعلیٰ مودودی

نمبر ۱	دہلی یوم چہارشنبہ ۲۸؍رجب المرجب ۱۳۴۵ہجری مطابق ۲؍فروری ۱۹۲۷ء	جلد ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجمعیۃ دہلی

۲۸؍رجب المرجب ۱۳۴۵ھ

اسلام کا قانونِ جنگ

(۱)

دورِ جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا جبکہ پیروانِ اسلام کی شمشیرِ خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان

جس کے پیچھے مدبرینِ یورپ اور اربابِ غرض نے مزید خاک اڑانی شروع کر دی ہے۔ سوامی جی کے قتل کا الزام ایک مسلمان پر لگایا گیا ہے اور اس کی جانب یہ بیان بھی منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے جنت کی امید میں ایک کافر کا خون بہایا ہے۔ اس بیان کی خواہ کچھ حقیقت ہو یا نہ ہو مگر اسلام کے مخالفین کے لیے اسے بدنام کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلئے انہوں نے علمائے اسلام کے اعلانات اور اسلامی رہنماؤں اور اخباروں کے متفقہ بیانات کے باوجود ایک شخص کے [illegible] تک محدود رہنے کے بجائے اسلام اور بانیٔ اسلام اور قرآن کریم کے خلاف اس قسم کے الزامات عائد کرنے شروع کر دیئے کہ ان کی تعلیم مسلمانوں کو قاتل اور خونریز بناتی ہے، ان کی تعلیم امن و امان اور مسالمت کے خلاف ہے، ان کی تعلیم نے مسلمانوں کو ایسا متعصب بنا دیا ہے کہ وہ ہر کافر کو گردن زدنی سمجھتے ہیں اور اسے قتل کر کے جنت میں جانے کی امید رکھتے ہیں۔

اور بعض جدید دشمنوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ دنیا میں جب تک قرآن کی تعلیم باقی ہے اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا اس لیے اس تعلیم کو مٹا دینا چاہیے۔ دشمنانِ اسلام سے گزر کر یہ طوفان گاندھی جیسے لوگوں تک پہنچا جو اسلام کی دوستی کے مدعی ہیں۔ اور انہوں نے بھی اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ:

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

اگرچہ یہ تمام خیالات کسی تحقیق اور علمی تفحص پر مبنی نہیں ہیں، معمولی طوطے کی طرح وہی سبق دہرایا جا رہا ہے جو ناواقف لوگوں نے سکھا رکھا ہے۔ اور اسی لیے ان میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ مگر ایک غیر معمولی واقعہ نے ان اوہام میں حقیقت کا رنگ پیدا کر دیا ہے جس سے دنیا آسانی کے ساتھ دھوکہ کھا سکتی ہے۔ اشاعت اسلام کی راہ

مولانا مودودی کا شجرۂ نسب

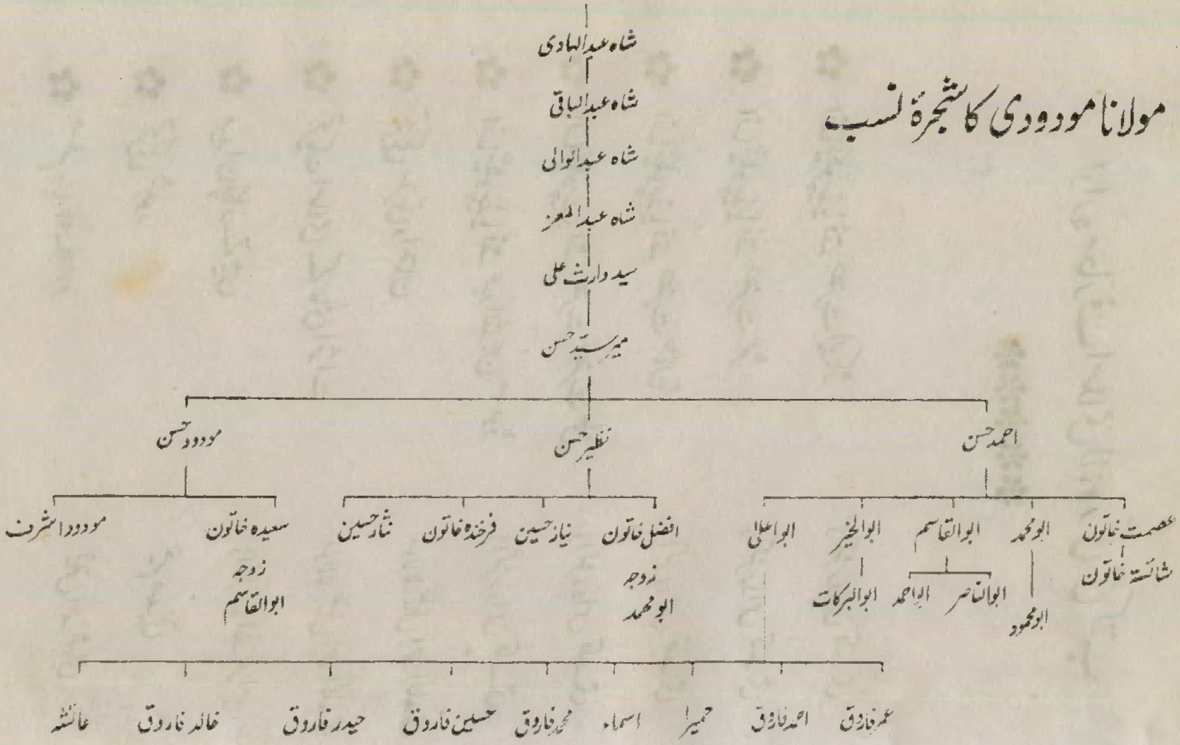
شاہ عبدالہادی
شاہ عبدالباقی
شاہ عبدالوالی
شاہ عبدالمعز
سید وارث علی
میر سید حسن
احمد حسن
نظیر حسن
مودود حسن
عصمت خاتون
شائستہ خاتون
ابو محمد
ابو محمود
ابو القاسم
ابو الناصر
ابو احمد
ابو الخیر
ابو البرکات
ابو اعلیٰ
افضل خاتون
زوجہ
ابو محمد
نیاز حسین
فرخندہ خاتون
نثار حسین
سعیدہ خاتون
زوجہ
ابو القاسم
مودود اشرف
عمر فاروق
احمد فاروق
حمیرا
اسماء
محمد فاروق
حسین فاروق
حیدر فاروق
خالد فاروق
عائشہ

ادارہ معارف اسلامی لاہور کی نئی کتب

* * *

✿ انسائیکلوپیڈیا فقہ حضرت ابوبکرؓ	ڈاکٹر رواس قلعہ جی
✿ انسائیکلوپیڈیا فقہ حضرت عمرؓ	ڈاکٹر رواس قلعہ جی
✿ انسائیکلوپیڈیا فقہ حضرت عثمانؓ	ڈاکٹر رواس قلعہ جی
✿ انسائیکلوپیڈیا فقہ حضرت حضرت علیؓ	ڈاکٹر رواس قلعہ جی
✿ انسائیکلوپیڈیا فقہ عبداللہ بن مسعودؓ	ڈاکٹر رواس قلعہ جی
✿ تحریکی سفر کی داستان	مولانا خلیل احمد الحامدی
✿ تحریک اسلامی کے عالمی اثرات	مولانا خلیل احمد الحامدی
✿ میدان پکارتے ہیں	ڈاکٹر عبداللہ عزام
✿ تحریکی شعور	نعیم صدیقی
✿ مسلم دنیا ۹۲-۱۹۹۱ء	فیض احمد شہابی

قومی زندگی کی تشکیل کے لیے قرآنی ضوابط	احسان الحق چیمہ
اقبال کا شعلہ نواء	نعیم صدیقی
شعلہ خیال	نعیم صدیقی
دیار عرب میں چند ماہ	مولانا مسعود عالم ندویؒ
اشتراکیت اور اسلام	مولانا مسعود عالم ندویؒ
ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	مولانا مسعود عالم ندویؒ
نوائے نور	نور صابری
چمن در چمن	اسلامی جمعیت طالبات
عورت معرض کشمکش میں	نعیم صدیقی

تقسیم کنندہ:

المنار بک سنٹر

منصورہ - لاہور - پاکستان

◆◆◆◆◆

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے قلم سے

سہ روزہ الجمعیتہ دہلی میں ۱۹۲۶ء کے اداریوں اور مضامین کا مجموعہ

بانگ قلم

* * *

ادارہ معارف اسلامی منصورہ کی ایک اور خوبصورت پیشکش

جس میں

۲۳ سالہ مغنی آتش نفس نے

- ملکی و بین الاقوامی مسائل کا بھرپور تجزیہ کیا۔
- متضاد نظریات کی کشمکش میں اسلامی فکر کی مدلل وکالت کی۔
- معاشرتی کمزوریوں پر انگلی رکھ کر علاج تشخیص کیا۔
- مایوس و پژمردہ ملت کے اندر امید و عزم کا صور پھونکا۔

بقول شاعر : بانگ قلم در شب تار   ہزار مغنی خفتہ کرد بیدار

جمع و ترتیب : خلیل احمد الحامدی

نیز ۲۸-۱۹۲۷ء کے مضامین اور اداریے "آداب خود آگاہی" کے نام سے زیر طبع ہیں۔

تقسیم کنندہ:

المنار بک سنٹر منصورہ - لاہور -- پاکستان